دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم
ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۶ء
جلد نمبر ۸۱ | شمارہ نمبر ۱ | فی شمارہ -/۶ | سالانہ -/۶۰
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم - دیوبند، سہارنپور یوپی
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰
PH. NO. 33429
COD - 01336
PIN - 247554

فہرست مضامین

16062
16.10.97

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

سالِ ۱۴۱۶ و ۱۴۱۷ھ

دارالعلوم دیوبند میں جدید طلبہ کے لئے ضروری

قواعد داخلہ

اور قدیم طلبہ کی ترقی و تنزل اور
تکمیلات و دیگر شعبوں میں داخلے کے ضابطے

ذمہ دارانِ مدارس عربیہ سے درخواست

حامداً و مصلیاً: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبۂ عزیزہ کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

اِنَّ رِجَالًا یَّاتُوْنَکُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ یَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّیْنِ فَاِذَا اَتَوْکُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَیْرًا۔
(رواہ الترمذی)

بے شک بہت سے لوگ زمین کے گوشہ گوشہ سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لئے تمہارے پاس آئیں گے جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لئے طلبۂ عزیزہ کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین ہے، طلبۂ عزیزہ کے لئے بہتر تعلیم، عمدہ تربیت، اچھا انتظام اور حسبِ استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے اور الحمد للہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار اس وصیت پر عمل پیرا ہیں

ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کی ترقی علم وفن کی ترقی، دین کی ترقی، اور مسلمانانِ عالم کی ترقی ہے، انہی چیزوں کے پیش نظر ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا رہا ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد سازی پر سب سے زیادہ توجہ فرمائیں اور دارالعلوم میں جس جماعت میں داخلہ کا ارادہ ہے وہاں تک قابلِ اعتماد استعداد کا پیدا ہوجانا دارالعلوم میں حاضری سے پہلے ضروری سمجھیں، اور اسی لئے چند سالوں سے ماہ رجب المرجب ہی میں ضروری اصول وضوابط کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں خدّام دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے قواعد

۱۔ دارالعلوم دیوبند کے تمام تعلیمی شعبوں کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہوگی جن میں دارالافتا، تکمیلات، کتابت، دارالصنائع کے شعبے قدیم طلبہ کے لئے ہیں بقیہ شعبوں میں قدیم طلبہ کے بعد جو عدد باقی بچے گا اس کو جدید طلبہ سے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ پر کرلیا جائے گا یعنی ہر جماعت کی مقررہ تعداد کو اونچے نمبرات سے شروع کرکے پورا کیا جائے گا۔

۲۔ آنے والے جدید طلبہ سب سے پہلے فارم برائے شرکت امتحان داخلہ پُر کریں گے یہ فارم انہیں دفتر تعلیمات سے ۸ر شوال کی شام تک دیا جائے گا، واپسی ۹ر شوال کی شام تک ضروری ہوگی۔

۳۔ سال اول، سال دوم کے لئے امتحان داخلہ تقریری ہوگا۔

۴۔ سال سوم کے امیدوار جدید طلبہ کا نفحۃ الادب اور ہدایت النحو اور نورالایضاح کا تحریری امتحان ہوگا، بقیہ تمام کتابوں کا تقریری امتحان لیا جائے گا۔

۵۔ سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم، اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحان داخلہ تحریری ہوگا، امتحان ۱۱ر شوال المکرم ۱۴۱۶ھ سے شروع ہوگا۔

۶۔ سال عربی اوّل کے لئے پرائمری درجہ پنجم کی سند یا اس کے مضامین کی صلاحیت اور فارسی و اردو، اردو رسم الخط اور نحو، صرف کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی۔

سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لئے پچھلے درجات کی تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔

سال چہارم کے لئے قدوری (از کتاب البیوع ختم)، ترجمۃ القرآن (سورۂ بقرہ یا سورۂ ق سے آخر تک)، شرح تہذیب، نفحۃ العرب اور کافیہ یا شرح شذور الذہب یا شرح جامی کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال پنجم کے لئے کنز الدقائق مع شرح وقایہ ثانی یا شرح وقایہ اول دوم، اصول الشاشی، تلخیص المفتاح یا دروس البلاغہ، ترجمۃ القرآن (آل عمران تا سورۂ مریم) یا (سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک)، اور قطبی کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ششم کے لئے ہدایہ اول، نور الانوار، مختصر المعانی، سلم العلوم، مقامات حریری کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ہفتم کے لئے جلالین، ہدایہ ثانی، حسامی، میبذی، دیوان المتنبی کا تحریری امتحان ہوگا، دورۂ حدیث کے لئے ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، بیضاوی شریف، شرح عقائد نسفی، نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا۔ نیز پارۂ عم صحیح مخارج کے ساتھ حفظ ہونا ضروری ہوگا اس کا امتحان بروقت لیا جائیگا۔

نوٹ: اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی بھی سند کسی کے پاس اگر ہو تو داخلہ فارم کے ساتھ منسلک کر دیں۔

۷۔ سالِ اول و دوم میں نا بالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا۔

۸۔ جو طالبِ علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائیگا ان کا داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

۹۔ جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا، ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع

ہو ان کو شریک امتحان نہ کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

۱۰۔ سرحدی صوبوں میں سے آسام وبنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامۂ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا، تصدیق نامہ کی اصل کاپی پیش کرنا ضروری ہوگا، فوٹو اسٹیٹ کاپی قبول نہیں جائے گی اور یہ تصدیق نامہ وطنیت کسی بھی وقت واپس نہ ہوگا۔

۱۱۔ جدید امیدواروں کو لازم ہوگا کہ وہ دارالعلوم میں آتے وقت تاریخ پیدائش کا سرٹیفکٹ لے کر آئیں یہ سرٹیفکٹ کارپوریشن، میونسپل بورڈ، ٹاؤن ایریا، یا گرام پنچایت کا ہونا ضروری ہے۔

۱۲۔ جدید امیدواروں کے لئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ اور مارک شیٹ (نمبرات کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

۱۳۔ نجی تصدیقات یا سماعت وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا۔

۱۴۔ غیر ملکی امیدوار تعلیمی ویزا لے کر آئیں، ٹورسٹ ویزا پر داخلہ نہیں ہوسکے گا۔ فارم برائے شرکت امتحان کے ساتھ پاسپورٹ و ویزا کی فوٹو اسٹیٹ پیش کریں۔

۱۵۔ بنگلہ دیشی امیدوار حسب ذیل علماء کرام سے تصدیق لے کر آئیں۔ (۱) مولانا شمس الدین صاحب قاسمی جامعہ حسینیہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ (۲) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب محلہ چوکی دیکھی سلہٹ، بنگلہ دیش۔

۱۶۔ کیرالا کے امیدوار مندرجہ ذیل علماء کرام کی تصدیق لے کر آئیں (۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) مولانا محمد کویا قاسمی۔

یہ تصدیقات درخواست برائے شرکت امتحان کے ساتھ فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں پیش کرنی ہوں گی، داخلہ فارم کے اجراء پر اصل تصدیقات پیش کرنا ضروری ہونگی۔

تنبیہ: طلبہ کو خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر

ممتحن کو دی جاتی ہیں اس لئے امیدوار صرف انہیں درجات کا امتحان دیں جن کی تیاری وہ کر چکے ہیں۔

بوقت داخلہ جدید فارم میں جو پتہ لکھا جائے گا اس میں آئندہ کبھی بھی کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی۔

قدیم طلبہ کیلئے

۱۔ تمام قدیم طلبہ کے لئے ۲۰ رشوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔

۲۔ جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دی جائے گی جو طلبہ دو کتابوں میں ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ امتحان کے ساتھ لیا جائیگا، بصورتِ کامیابی ترقی دی جائے گی ورنہ بلا امداد سال کا اعادہ کر دیا جائے گا، اعادۂ سال کی رعایت صرف ایک سال کے لئے ہوگی اگر دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

۳۔ تجوید و کتابت کے نمبرات بسلسلۂ ترقی درجہ اوسط میں شمار نہ ہوں گے البتہ فوائد مکیہ صف عربی کے نمبرات، ترقی اور اجراء امداد کے سلسلے میں شمار کئے جائیں گے۔

۴۔ حسب تجویز مجلس تعلیمی وظیفہ نیل کے بقار کے لئے اوسط کامیابی ۳۲ ہونا شرط ہے اس سے کم پر وظیفہ نیل بند کر دیا جائے گا۔

۵۔ تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہو سکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط کامیابی ۴۴ ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں نیز ان امیدواروں کا نحو و صرف اور بلاغت و انشاء کا مستقل امتحان لیا جائیگا، نحو و صرف کے لئے کافیہ اور علم الصیغہ اور بلاغت کے لئے البلاغۃ الواضحہ کے متن سے سوالات مرتب کئے جائیں گے، اور انشاء کے لئے اردو سے عربی میں ترجمہ کے سوالات دیئے جائیں گے۔ اس جماعت کے کل تین پرچے ہوں گے، باقی تکمیلات

کے لئے ۴۰ اوسط شرط ہے۔

۶۔ امیدواروں کے زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائیگا۔

۷۔ ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل کے لئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۵ اوسط حاصل کیا ہو اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو۔

۸۔ ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہو سکیں گے اِلّا یہ کہ ان کے درجۂ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہو سکا ہو۔

۹۔ دارالافتار کے فضلار کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

۱۰۔ جس کی کوئی بھی شکایت دارالاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہو اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

۱۱۔ کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلار کو فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دی جائے گی۔

۱۲۔ کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتار کے داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں

دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید حفص اردو و عربی، شعبۂ خوش نویسی دارالصنائع وغیرہ، ان شعبوں میں داخلہ کے لئے درج ذیل قواعد پر عمل ہوگا۔

دارالافتاء

۱۔ دارالافتار میں داخلہ کے امیدواروں کے لئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

۲ - دورۂ حدیث سے دارالافتاء کے لیے صرف وہ طلبہ امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۴۵ ہوگا۔

۳ - کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کے لئے سابقہ تکمیل میں اوسط ۴۶ حاصل کرنا ضروری ہے۔

۴ - ان تمام امیدواروں کا الگ سے ہدایہ اولین و ہدایہ اخیرین کا امتحان لیا جائیگا جس کے دو پرچے ہوں گے اور خط و املاء کو خاص طور سے دیکھا جائیگا۔

۵ - دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہوگی اور کوشش کی جائے گی کہ معیارِ مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبہ کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے، لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کر لی جائے گی، ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہو سکے گی۔

۶ - دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب فی الافتاء کے لئے کیا جائے گا یہ انتخاب دو سال کے لئے ہوگا اور ان کا وظیفہ -/۸۰۰ روپے ماہوار ہوگا۔

شعبۂ دینیات اردو، فارسی، شعبۂ حفظ قرآن

۱ - شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا۔

۲ - سالِ اول دینیات اردو اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کا داخلہ ہر وقت ممکن ہوگا۔

۳ - بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعطیل تک کیا جائے گا۔

شعبۂ تجوید، حفص، اردو، عربی

۱ - حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہو سکیں گے جو حافظ ہوں، قرآن کریم ان کو یاد ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں، نیز ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو۔ ان طلبہ میں ۹۰ کی امداد جاری ہو سکے گی۔

۲۔ شعبۂ حفص عربی میں ان طلبار کو داخل کیا جائے گا جنہیں قرآن کریم یاد ہو اور وہ عربی میں شرح جامی یا سال سوم کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں ان طلبہ میں دس کی امداد جاری ہو سکے گی۔
۳۔ ان طلبہ کی اوقاتِ مدرسہ میں حاضری ضروری ہو گی۔

قراءت سبعہ عشرہ

۱۔ اس درجہ میں داخلہ کے لئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سالِ چہارم تک کی جیّد استعداد رکھتے ہوں۔
۲۔ اس درجہ میں داخل طلبہ کے لئے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہے اور ان کی تعداد دس سے زائد نہ ہو گی اور ان دس کی امداد مع وظیفہ خصوصی جاری ہو سکے گی۔

شعبۂ خوش نویسی

۱۔ اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد بیس ہو گی اور ان کی امداد جاری ہو سکے گی۔
۲۔ داخلہ کے امیدوار میں فضلار دارالعلوم کو ترجیح دی جائے گی۔
۳۔ شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کا امتحان داخلہ دینا ضروری ہو گا اور صرف اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائے گا۔
۴۔ قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں تو ناظم شعبہ کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کے لئے غیر امدادی داخلہ کیا جا سکے گا بشرطیکہ کوئی شکایت نہ ہو۔
۵۔ جو طلبہ مکمل امدادی یا غیر امدادی داخلہ لیں گے ان کو اوقات مدرسہ میں پورے چھ گھنٹے درس گاہ میں بیٹھ کر مشق کرنا ضروری ہو گا۔
۶۔ جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کر چکے ہوں اور ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی تصدیق کریں تو دورۂ حدیث کے بعد مکمل داخلہ اور امداد میں ان کو ترجیح دی جائے گی۔

۷ - تمام طلبہ کے لئے طالب علمانہ وضع اختیار کرنا ضروری ہے ۔
۸ - پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا ۔

دارالصنائع

۱ - طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائے گا ۔
۲ - معلّم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں گے ان کو داخل کیا جائیگا ۔
۳ - پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کر دیا جائے گا ۔
۴ - اس شعبہ میں دس سے زائد کا داخلہ نہیں ہوگا اور ان سب کی صرف امداد طعام جاری ہو سکے گی ۔
۵ - اوقات مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا ۔

(بقیہ صـ۵۵ کا)

بارہویں فصل میں صحاح ستہ کے علاوہ دیگر محدثین اور کتب مثلاً امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل امام دارقطنی امام بیہقی وغیرہم کا بھی تعارف و تبصرہ ہے ۔

غرض یہ زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع اصول حدیث پر بڑی حد تک بھرپور ہے ۔ مدارس دینیہ کے طلبہ اس سے کافی وافی استفادہ کر سکتے ہیں ۔ اگر اس کتاب کے مباحث کو ذہن نشیں کر لیا جائے تو بڑی بڑی کتب اصول حدیث کے افہام و تفہیم میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی ہے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب باذوق طلبہ حتیٰ کہ اساتذہ بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے ۔ طلبۂ عزیز کے لئے خصوصی رعایت رکھی گئی ہے یعنی ۳۰/ روپے کی کتاب صرف ۲۰/ روپے ہیں ۔

نماز کے ضروری مسائل

نماز کے وہ مسائل جنہیں بعض نادان دوستوں نے حق و باطل کا معرکہ بنا دیا ہے

حافظ محمد اقبال رنگونی ۔ مانچسٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز اسلام کا دوسرا بڑا رکن ہے اور یہ دین کا ستون ہے ۔ نماز فرض ہے ۔ اور ابتدا سے اس کی فرضیت قائم ہوئی تاہم اس کی کیفیت و ہیئت میں تبدیلی ہوتی رہی ۔ کچھ ایسے اعمال تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اختیار فرمائے لیکن پھر انہیں ترک کر دیا ۔ جن صحابہؓ نے آپ کے اس ابتدائی عمل کو دیکھا انہوں نے اسے بھی روایت کیا اور پھر بعد والے عمل کو دیکھا تو اسے بھی نقل کیا ۔ پھر جن صحابہؓ نے آپ کے ابتدائی عمل کو دیکھا اور بعد والے عمل کو نہ دیکھ پائے انہوں نے آپ کے پہلے عمل کو ہی اپنایا لیکن جن اصحابؓ نے یہ دیکھا کہ آپ نے پہلا عمل ترک فرما دیا تھا اور پھر دوسرا عمل اختیار فرمایا تو ان سب نے پہلے عمل کو ترک کر دیا اس دوسرے عمل کو خود بھی اپنایا اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل بھی بتلایا ۔

کتب احادیث میں کئی مسائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بلکہ کئی کئی عمل بھی ملتے ہیں پھر ان میں ناسخ و منسوخ کی بحث چلتی ہے ، راجح اور مرجوح اور افضل و مفضول کا بیان بھی ہوتا ہے ۔ جو لوگ ایک عمل کو اختیار کرتے ہیں وہ دوسروں کے بارے میں یہ نہیں

کہتے کہ وہ حدیث کے خلاف چل رہے ہیں۔ یا ان کی سرے سے نماز ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے عمل کو افضل ضرور بتلاتے ہیں لیکن اسے حق و باطل کا معرکہ نہیں ٹھہراتے۔ نہ کبھی یہ آواز اٹھی ہے کہ فلاں صحابی کی نماز اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے اس بات پر عمل نہیں کیا تھا ہر فریق کے پاس اپنے دلائل ہیں اور اسی پر وہ اپنے عمل کے افضل ہونے کی بنا رکھتے ہیں مگر انہیں دوسرے فریق کو کبھی طعنہ دیتے نہیں سنا گیا اور نہ ان کی نمازوں کے کالعدم ہونے کا کبھی کسی نے اعلان کیا۔

مگر کچھ عرصہ سے یہاں (برطانیہ میں) نماز جیسی اہم عبادت کے بارے میں یہ آواز عام اٹھائی جارہی ہے کہ امت کو ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ صحابہ بھی آپس میں مختلف رہے اور آج تک نماز پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکا صرف ہم ایک گروہ (اہل حدیث) ہیں جنہیں معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز کیا تھا۔ اور پھر ان کے ہاں نماز صرف اسی کی صحیح ہے جو بخاری شریف کے مطابق ہے۔ بخاری شریف کے انگریزی ترجمے لئے یہ آواز عام لگ رہی ہے کہ جو فاتحہ خلف الامام نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ آمین زور سے نہ کہنے والا سنت سے بغض رکھتا ہے۔ حدیث پر عمل نہیں کرتا، رفع یدین عندالرکوع نہ کرنے والے کی نماز مکروہ ہے۔ ٹانگوں کو چوڑی کرکے نماز نہ پڑھنے والے شیطان کو اپنے اندر آنے کی راہ فراہم کرتے ہیں، جوتوں سمیت نماز ادا کرنا ہی عمل بالحدیث ہے۔ بیس رکعات تراویح پڑھنے والے بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرضیکہ نماز کے وہ مسائل جن میں افضل مفضول کی بحث تھی ان نادان دوستوں نے اسے حق و باطل کا معرکہ بنا کے رکھ دیا ہے اور ہر مسجد میں شور اٹھانا یہ ان کا دن رات کا مشغلہ بن چکا ہے کہ بخاری شریف میں یہ ہے اور یہ نہیں ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اگر صحیح بخاری حدیث میں حرف آخر ہوتی تو امام بخاری (۲۵۶ھ) کے بعد امام مسلم (۲۶۱ھ) کیوں ایک دوسری برابر کی کتاب صحیح مسلم تحریر فرماتے اور ان دونوں کتابوں (صحیحین) کے ہوتے ہوئے پھر امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) امام ترمذی (۲۷۹ھ) امام نسائی (۳۰۳ھ) امام ابن ماجہ (۲۷۳ھ) امام طحاوی (۳۲۸ھ) امام ابویعلی (۳۰۷ھ) اور امام بیہقی (۴۵۸ھ) وغیرہم حدیث پر

کیوں اتنی بڑی بڑی کتابیں لکھتے۔ افسوس کہ یہ دوست نہ کبھی حدیث کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ ان کے علماء انہیں بتلاتے ہیں کہ

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں — اگر دیکھئے تو مکاں اور بھی ہیں

روز روز کے اس اختلاف اور مساجد کے اس انتشار نے ہمیں مجبور کیا کہ ان نادان دوستوں نے جن مسائل کو حق و باطل کا معرکہ قرار دے کر ایک طبقے کے بارے میں بدظن کرنے کی جو مہم اٹھائی ہے اس مہم کا کچھ جائزہ لیا جائے اور اختصار کے ساتھ ان مسائل کو کتاب و سنت بلکہ غیر مقلد علماء کرام کے اپنے اقرارات سے بھی واضح کر دیا جائے۔ تاکہ جو لوگ مسلسل یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ صرف غیر مقلد دوستوں کا طریقہ نماز ہی صحیح ہے دوسروں کا غلط تو انہیں پتہ چل جائے کہ ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے۔ اور ایک پروپیگنڈہ ہے جس سے ملت اسلامیہ کے جلیل القدر اکابر پر سے اعتماد بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مساعی کسی اہل سنت والجماعت سے وابستہ شخص یا جماعت سے نہیں ہو سکتیں۔

آئیے اب ہم نماز کے ان مسائل کا کچھ جائزہ لیں۔

۱۔ جرابوں اور موزوں پر مسح کا مسئلہ

چمڑے کے وہ موزے جن میں پاؤں ٹخنوں تک چھپے رہیں اس طرح وہ جرابیں جو چمڑے کی طرح سخت اور موٹے کپڑے کی بنی ہوئی ہوں یا وہ اونی اور سوتی جرابیں جن پر چمڑا لگایا گیا ہو ان پر وضو میں مسح کرنا جائز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے موزوں پر مسح کرنا تواتر سے ثابت ہے اور خبر متواتر سے قرآن کریم کی آیت (جس میں پاؤں کے دھونے کا حکم ہے) کے حکم سے ہم نکل سکتے ہیں۔ موزوں پر مسح کرنا تمام صحابہ کرام کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے۔

غیر مقلد علماء جو وہ عام جرابوں جو سوت یا اون یا نائیلون کی بنی ہوئی ہیں ان پر مسح کرنے کو جائز کہتے ہیں بلکہ یہاں (برطانیہ) میں ان کے ائمہ مساجد انہی جرابوں پر (سردی کے دنوں میں) مسح کر کے نماز پڑھاتے ہیں حالانکہ یہ جرابیں موزوں کے حکم میں نہیں آ سکتیں نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس قسم کے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ اس لئے جو امام

اس قسم کی جرابیں پہن کر ان پر مسح کرتے ہیں اور امامت کراتے ہیں، ان کا نہ وضو ہوتا ہے نہ ان کی نماز درست ہوتی ہے اور نہ ان کے مقتدیوں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتیاط کرتے ہیں۔

ان ائمہ مساجد کو بتلایا جائے تو وہ اسے صرف حنفیوں کا مسئلہ بتلا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات خود ان کے بڑے علماء بھی کہہ چکے ہیں۔ غیر مقلدوں کے مرکزی عالم شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلوی مرحوم سے سوال کیا گیا کہ ادنی یا سوتی جرابوں پر مسح جائز ہے یا نہیں آپ نے لکھا کہ:

مذکورہ جرابوں پر مسح جائز نہیں کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں اور مجوزین نے جن چیزوں سے استدلال کیا ہے اس میں خدشات ہیں۔۔۔۔ الغرض ان جرابوں پر مسح کرنے کی کوئی دلیل نہیں نہ کتاب اللہ سے نہ سنت رسول اللہ سے نہ اجماع سے نہ قیاس سے۔

(فتاویٰ نذیریہ جلد ۱ ص۳۲۷)

مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں:

والحاصل عندی انه ليس فی باب المسح علی الجورب حدیث صحیح مرفوع خال عن الكلام۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۳۳۳)

حاصل کلام میرے نزدیک یہ ہے کہ جرابوں پر مسح کے متعلق کوئی صحیح مرفوع حدیث موجود نہیں ہے جو جرح سے خالی ہو۔ (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۴۴۲)

غیر مقلد حضرات کے مشہور مجتہد مولانا عبداللہ روپڑی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

مسح شرع میں یہ ہے کہ پانی اوپر رہے اندر نہ جائے اور پتلی جراب میں پانی اندر چلا جائے گا تو مسح نہ ہوا۔ (فتاویٰ اہل حدیث جلد ۲ ص۱۲)

غیر مقلد عالم مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی لکھتے ہیں:

(جرابوں پر مسح کا حکم) نہ قرآن سے ثابت ہوا نہ حدیث مرفوع صحیح سے نہ اجماع سے نہ قیاس صحیح سے نہ چند صحابہ کے فعل اور اس کے دلائل سے اور غسل رجلین (پاؤں کا دھونا) نص قرآنی سے ثابت ہے لہٰذا خف چرمی (چمڑے

کا موزہ) کے سوا جراب پر مسح کرنا ثابت نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۴۴۲)
اس دور کا جو غیر مقلد عالم یہ کہے کہ یہ چاروں علماء حدیث میں پختہ علم نہ رکھتے تھے
تو ہم اس پر اور حوالے بھی گذارش کر سکیں گے۔

۲۔ ننگے سر نماز پڑھنے کا مسئلہ

نماز پڑھتے وقت اپنے سر کو ڈھانپنا سنت ہے۔ اگر بوجہ مجبوری سر نہ ڈھانپ سکے تو نماز درست ہوگی لیکن ننگے سر نماز پڑھنے کو معمول بنانا اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کہنا بہت زیادتی کی بات ہے یہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں نیز مساجد میں جو لوگ سر ڈھانپنے کی سہولت ہوتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھنے کی عادت ڈالتے ہیں اور اسے فیشن کہا جاتا ہے یہ صحیح نہیں۔ مشہور غیر مقلد عالم مولانا سید محمد داؤد غزنوی صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس عاجز کی نظر سے کوئی ایسی روایت نہیں گذری جس میں بصراحت یہ مذکور ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرام نے مسجد میں اور وہ بھی نماز باجماعت میں ننگے سر نماز پڑھی ہو چہ جائے کہ معمول بنالیا ہو۔ اس لئے اس رسم بد کو جو چیل رہی ہے بند کرنا چاہیے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور جلد ۱۱ ع ۱۸)

مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں:

نماز کا مسنون طریقہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالدوام ثابت ہے یعنی بدن پر کپڑا اور سر ڈھکا ہوا ہو۔ پگڑی سے یا ٹوپی سے (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۵۹۲)

مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی لکھتے ہیں:

ہمیشہ ننگے سر کو نماز کا شعار بنانا ایجاد بندہ ہے اور خلاف سنت (ایضاً جلد ۱ ص۵۹۲)

مولانا عبد الغفار سلفی لکھتے ہیں:

ٹوپی یا عمامہ سے نماز پڑھنا اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ ٹوپی اور عمامہ باعث زیب وزینت ہیں۔ (فتاویٰ ستاریہ جلد ۳ ص۵۹)

مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجرانوالہ) لکھتے ہیں :

کسی حدیث شریف سے بلاعذر ننگے سر نماز کی عادت اختیار کرنا ثابت نہیں محض بےعملی یا بدعملی یا کسل کی وجہ سے یہ رواج بڑھ رہا ہے بلکہ جہلا تو اسے سنت سمجھنے لگے ہیں ..... کپڑا موجود ہو تو ننگے سر نماز پڑھنا یا ضد سے ہوگا یا قلت عقل سے ۔

(فتاویٰ علماء اہل حدیث جلد ۴ ص ۲۸۹)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ بلا کسی عذر کے ننگے سر نماز پڑھتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل نہیں کرتے یہ لوگ صرف ضد کی وجہ سے ننگے سر نماز ادا کرتے ہیں ۔ اگر یہ عمل ضد اور جہالت کی وجہ سے نہیں تو پھر مولانا مرحوم کے نزدیک ایسے لوگ قلت عقل کا شکار ضرور ہیں ۔

جو غیر مقلد عالم یہ ثابت کر دے کہ ان کے یہ پانچ علماء علم حدیث سے بے بہرہ تھے تو ہم ان کے اس موقف کو تسلیم کر لیں گے ۔

۳ ۔ جوتوں سمیت نماز پڑھنے کا مسئلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جوتوں سمیت نماز جائز ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ آپ نے جن جوتوں میں نماز ادا فرمائی یہ وہ جوتے (SHOE) نہیں تھے جو آج کل استعمال ہوتے ہیں ۔ وہ جوتیاں کھلی ہوئی تھیں اور پاؤں کی انگلیاں صاف نظر آتی تھیں ۔ نماز میں سجدہ کرتے ہوئے پاؤں کی انگلیاں زمین پر لگی ہوئی ہوتی تھیں ۔ کیونکہ سجدہ میں پاؤں کی انگلیوں کا زمین سے لگنا ضروری ہے ، ان کا سجدہ تبھی تو ہے کہ یہ زمین سے لگیں ۔

آج کل جو لوگ جوتے میں نماز ادا کرتے ہیں ان کے پیر ہر طرف سے بند ہوتے ہیں ۔ ان کی انگلیاں زمین پر نہیں لگتی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور یہ صرف فرمان نبوی نہیں بلکہ حکم خداوندی بھی ہے ۔ آپ اسے امر خداوندی کے طور پر ذکر فرماتے ہیں :

امرت ان اسجد علی سبعة اعظم علی الجبهة واشار بیده علی
انفه والیدین والرکبتین واطراف القدمین ۔ (الحدیث)
(صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۱۲)

(ترجمہ) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء (یعنی سات ہڈیوں) پر سجدہ کروں
پیشانی مع ناک ۔ دو ہاتھ ۔ دو گھٹنے اور پاؤں کی انگلیوں پر۔
پھر سجدہ میں پاؤں کی انگلیوں کا زمین پر ٹکا ہونا کافی نہیں بلکہ سجدہ میں انگلیوں کا قبلہ رخ ہونا بھی ضروری ہے ۔

اذا سجد ..... واستقبل باطراف اصابع رجلیه القبلة ۔(صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۱۴)

اس کے باوجود بعض غیر مقلد احباب جوتوں سمیت نماز ادا کرتے ہیں۔ جب انہیں کہا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ جوتوں میں نماز پڑھنا چاہئے کیونکہ اس سے اہل کتاب کی مخالفت ہوتی ہے ۔ اور حدیث خالفوا اهل الکتاب اس باب میں پیش کرتے ہیں۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۹۵)
جواباً گذارش ہے کہ یہ اس دور کی بات ہے جب اہل کتاب بوقت عبادت اپنے جوتے اتار دیا کرتے تھے ۔ آج ان کے چرچ اور سینگاگ میں آنے والے جوتوں سمیت آتے ہیں اور اسی ہیئت پر عبادت کرتے ہیں ۔ خالفوا اهل الکتاب پر عمل کرنا ہے تو پھر مساجد اور دوسری جگہوں میں نماز پڑھتے ہوئے جوتے اتار دینے چاہئیں نہ کہ جوتوں سمیت نماز ادا کر کے اہل کتاب کی مشابہت اختیار کی جائے ۔

محدثین شرح ابی داؤد میں لکھتے ہیں کہ :

دل هذا الحدیث علی ان الصلوة فی النعال کانت ماموره لمخالفة الیهود واما فی زماننا فینبغی ان تکون الصلوٰة ماموره بهلحافیا لمخالفة النصاری فانهم یصلون متنعلاً لا یخلعونها عن ارجلهم ۔ (بذل جلد ۱ ص ۳۵۸)

جو لوگ اس حدیث کو قابل عمل بتاتے ہیں وہ ابوداؤد ہی کے اسی صفحہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل کیوں نہیں دیکھتے کہ :

رایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی یوم الفتح و وضع نعلیہ عن یسارہ ۔ (سنن ابوداؤد جلد ا صفحہ ۹۵)

(ترجمہ) عبداللہ بن سائبؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ اپنے نعلین بائیں طرف رکھے ہوئے تھے۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ روپڑی صاحب لکھتے ہیں:

میری تحقیق یہ ہے کہ بغیر جوتے کے نماز افضل ہے اور اسی کو ترجیح ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جوتے کے ساتھ نماز کے سنن وآداب پوری طرح ادا نہیں ہوتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا عام طریق یہ ہے کہ سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں اور پہلے التحیات میں ایک پاؤں کھڑا کرتے جس کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں اور دوسرا پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے اور دوسرے التحیات میں دونوں پاؤں ایک طرف نکال کر بیٹھتے اور ظاہر ہے کہ جوتے کے ساتھ یہ سب باتیں مشکل ہیں اس لئے بغیر جوتے کے نماز افضل ہے اس کے علاوہ مساجد کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (فتاویٰ اہل حدیث جلد ا صفحہ ۳۴۹)

عرب کی زمین زیادہ تر ریتیلی ہے اور وہاں بارش عام نہیں ہوتی۔ جوتے چلتے وقت زمین سے اس طرح گھسٹتے ہیں کہ تلے کے نیچے جو ناپاکی لگے وہ فوراً رگڑ جاتی ہے اور جوتا ناپاک نہیں رہتا بخلاف پاک وہند کی زمین کے کہ وہاں جوتے کا پاک رہنا بہت مشکل ہے۔

۴۔ نماز میں ٹانگیں چوڑی کرنے کی ممانعت

نماز پڑھنے والا اگر تنہا ہے تو اسے پورے وقار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہئے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو خلاف وقار ہو۔ اگر وہ باجماعت نماز ادا کر رہا ہے تو پھر صفوں کی درستگی بہت ضروری ہے۔ کندھوں سے کندھا ملا ہونا اور اپنے پیر کو اس طرح رکھنا کہ صفیں آگے پیچھے نظر نہ آئیں اس کی اسلام میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اقیموا صفوفکم ۔ (صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۱۰۰)

پھر آپ کا یہ ارشاد بھی ہے :

رصوا صفوفکم وقاربوا بینھا وحاذوا بالاعناق فو الذی نفسی بیدہ انی لاری الشیطان یدخل من خلل الصف کانھا الحذف.

(سنن ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۹۷)

(ترجمہ) اپنی صفیں خوب ملاکر رکھو اور قریب قریب کھڑے رہو اور گردنیں ایک سیدھ میں رکھو۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری ذات ہے میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان گھس آتا ہے جیسے بکری کا بچہ گھس آئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ نماز میں اپنی ٹانگیں بہت زیادہ چوڑی کی جائیں اور دوسرے نمازی کے قدم کے ساتھ قدم لگا کر ہی رکھا جائے۔ حدیث پاک میں رصوا صفوفکم کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ آپ کا منشا رصفوف کی درستگی کی تاکید کرنا ہے۔ کہ صف اس طرح نہ ہو کہ کندھوں کے درمیان فاصلہ رہ جائے۔ اس سے آپ نے منع فرمایا اور اسے داخل وعید بتلایا۔ لیکن اپنے پاؤں کو دوسرے کے پاؤں کے ساتھ اس طرح ملانے کی کوشش کرتے چلے جانا کہ دوسرے نمازی کی نماز میں خلل واقع ہو نہ یہ آپ کی سنت ہے نہ یہ آپ کا حکم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم کچھ کہیں مولانا عبداللہ روپڑی صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمادیں :

"اگر کوئی شخص جہالت کی وجہ سے (نماز میں) پاؤں کو ہٹاتا جائے اور دوسرے پاؤں کو پھیلاتا ہوا اس کے نزدیک کرتا جائے یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نمازی کو حکم ہے کہ دوسرے کے کندھے سے اپنا کندھا اور پاؤں سے پاؤں ملالے ..... جو شخص خواہ مخواہ اپنا پاؤں دوسرے کے نیچے کرتا جائے وہ شخص اپنی حد توڑ کر اس حکم کے خلاف کیوں کرتا ہے۔ اور اپنی نماز میں بھی خلل کیوں ڈالتا ہے۔ پاؤں ملانا اسی حد تک ہے جو شرع نے اس کے لئے مقرر کی ہے نہ کہ دوسرے کے نیچے داخل ہو جائے۔ اور بعض جاہل پاؤں کو خوب چوڑے کرتے رہتے ہیں۔ اور کندھوں کا خیال ہی نہیں کرتے۔ کندھوں کے انداز سے پاؤں بالکل چوڑے نہ کرنے چاہئے تاکہ پاؤں اور کندھے دونوں مل سکیں"۔ (فتاویٰ اہل حدیث جلد ۲ صفحہ ۹۰ لاہور، ماخوذ از صلوٰۃ الرسول)

اس کے باوجود جو غیر مقلد دوست یہ کہتے ہیں کہ نماز میں اپنے دونوں پاؤں اتنے پھیلانے چاہئے کہ دوسرے کے پاؤں سے لگتے چلے جائیں تاکہ ان دونوں کے پاؤں کے درمیان سے بکری کا بچہ تک نہ جاسکے۔ وہ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ جس بکری کے بچے کو روکنے کے لئے انہوں نے دوسرے کے قدموں پر اپنا پاؤں چڑھالیا ہے اور اپنے پاؤں چوڑے کر دیئے ہیں اس میں سے تو صرف بچہ نہیں بلکہ پورا بکرا بھی گذر سکتا ہے۔ سواعتدال اور سنت کی راہ یہ ہے کہ کندھے کو کندھے کے ساتھ ملانا چاہئے اور پاؤں اس طرح رکھے کہ اس سے صف سیدھی ہونے میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔ صفوں کے درمیان خالی جگہ چھوڑنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

۵۔ تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ

تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل سامنے رہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا کبر رفع یدیہ حتی یحاذی بہما اذنیہ وفی روایۃ حتی یحاذی بہما فروع اذنیہ۔ (صحیح مسلم جلد ۱ ص۱۶۸)

(ترجمہ) مالک بن حویرث کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر (تحریمہ) کہتے تو اپنے ہاتھ یہاں تک اٹھاتے کہ وہ آپ کے دونوں کانوں کے برابر ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کو اپنے کانوں کی لووں کے برابر لاتے۔

حضرت وائل بن حجر کی روایت میں حیال اذنیہ (مسلم جلد ۱ ص۱۷۳) ایک روایت میں ہے۔

حتی رایت ابہامیہ قریبًا من اذنیہ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ ص۲۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کانوں کے برابر تک ہونا چاہئے۔ جو لوگ صرف اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھ کندھے تک اٹھائے جائیں ان کا یہ اصرار درست نہیں۔ جن روایات میں کندھے تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ملتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک کندھوں تک ہوتی جس سے آپ کی انگلیاں کانوں کے برابر ہو جاتیں۔ وائل بن حجر

کی اس روایت میں یہ تصریح موجود ہے ۔ حتی کا نتا بحیال منکبیہ و حاذی بابھا میہ اذ نیہ (سنن ابو داؤد جلد ۱ ص۱۰۵) کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی صورت میں تمام احادیث میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کی سنت پر عمل ہو جاتا ہے جبکہ کندھوں تک ہاتھ اٹھانے سے یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی ۔ البتہ عورتوں کے لئے یہ حکم ہے کہ اپنے ہاتھ کندھے تک اٹھائیں کیونکہ یہ عمل ان کے لئے ستر کا باعث ہے ۔ اور یہ حیا اور نسوانی شرافت کے زیادہ قریب بھی۔

۶ ۔ نماز میں ہاتھ باندھنے کا مسئلہ

تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ کہاں باندھے جائیں اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ حضرت وائل رضؓ بن حجر سے ملاحظہ فرمائیے :

رایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضع یمینہ علی شمالہ فی الصلوٰۃ تحت السرۃ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ ص۳۴۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ کو حضرت علی المرتضیٰ رضؓ سنت کہہ کر ذکر کرتے ہیں:

عن علیؓ قال ان من السنۃ فی الصلوٰۃ وضع الکف علی الکف تحت السرۃ۔ (سنن کبریٰ للبیہقی مع الجوہر النقی جلد ۲ ص۳۱)

عن علیؓ قال من سنۃ الصلوٰۃ وضع الایدی علی الایدی تحت السرۃ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ ص۳۴۳)

حضرت ابو ہریرہ رضؓ بھی اس کے قائل ہیں ۔

عن ابی ھریرۃؓ قال وضع الکف علی الکف فی الصلوٰۃ تحت السرۃ ۔

(الجوہر النقی جلد ۲ ص۳۱)

جہاں تک علی صدرہ کا تعلق ہے تو یہ روایت نہ بخاری میں ہے نہ مسلم میں ۔ پھر یہ روایت حضرت سفیان سے صرف مؤمل بن اسماعیل نقل کرتے ہیں (قالہ الحافظ ابن قیم فی اعلام) اور حضرات محدثین کی مؤمل پر کڑی تنقید بھی کسی اہل علم سے مخفی نہ ہو گی ۔

تاہم اگر علی صدرہ کی روایت کسی درجے میں درست بھی مان لی جائے تو بھی اسے

سنت کہیں نہیں کہا گیا حضرت علیؓ مرتضیٰ نے تحت السرۃ والے عمل کو سنت کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ بلکہ ابن حزمؒ حضرت انسؓ کے واسطے سے تحت السرۃ کو اخلاق النبوۃ میں سے سمجھتے ہیں۔

قال ابن حزم ورویناعن انسؓ قال ثلاث من اخلاق النبوۃ تعجیل الأفطار وتاخیر السحور ووضع الید الیمنی علی الیسریٰ فی الصلوٰۃ تحت السرۃ (الجوھر النقی جلد ۲ ص۳۲)

حضرات محدثین نے کبھی اس کا التزام نہ کیا کہ ہاتھ سینہ پر ہی باندھے جائیں، اور ہر دوسرے طریقہ کو خلاف سنت کہا جائے۔ ان کے ہاں اس باب میں جو وسعت ہے وہ امام ترمذی کے بیان سے سنئے: محدثین کی یہ وسعت آپ کو غیر مقلدین میں نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ہرگز محدثین کے طریقے پر نہیں ہیں۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:

وکل ذلك واسع عندھم (جامع ترمذی جلد ۱ ص۳۵)

۷۔ نماز میں قرأت کا مسئلہ

نماز میں قرآن کریم کا پڑھنا فرض ہے۔ فاقرءوا ماتیسر من القرآن (پ۲۹ المزمل) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: لاصلوٰۃ الا بقرأۃ (صحیح مسلم جلد ۱ ص۱۷۰) قرأت کم از کم ایک آیت طویلہ یا تین چھوٹی آیتیں ضروری ہیں۔ نماز پڑھنے والا اگر تنہا ہے تو اسے سورۃ فاتحہ اور قرآن کی دوسری آیت کا پڑھنا ضروری ہے۔ لا تجوز صلوۃ لا یقرء فیھا بفاتحۃ الکتاب وآیتین فصاعداً۔ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ ص۳۶۰) ہاں اگر وہ مقتدی ہے یعنی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے تو اس پر نہ سورہ فاتحہ ضروری ہے نہ اور کوئی آیت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذا قرئ القرآن فاستمعوالہ وانصتوا۔ (پ۹ الاعراف)

(ترجمہ) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔

امام بخاری کے استاذ امام عبداللہ محمد بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) المصنف میں نقل کرتے

ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من کان لہ امام فقراءتہ لہ قرأۃ. (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ا ص۳۳۰) عن جابرؓ وعن عبدؓ اللہ بن شداد)

امام محمدؒ (۲۸۹ھ) اپنی موطا میں امام ابوحنیفہؒ کی سند سے اسے یوں روایت کرتے ہیں:

من صلی خلف الامام فان قراءۃ الامام لہ قرأۃ. (مؤطا امام محمد ص۹۸)

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور ہمیں نماز سکھلائی جس میں آپ نے فرمایا: واذا قرء فانصتوا (صحیح مسلم جلد ا ص۱۷۴، المصنف لابن ابی شیبہ جلد ا ص۳۳۱، مسند ابی یعلی جلد ۶ ص۲۱۸) جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو. کاتبین وحی میں سے اول درجہ کے کاتب قرآن اور مجتہد عالی شان حضرت زیدؓ بن ثابت سے قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: لا قرأۃ مع الامام فی شئی (صحیح مسلم جلد ا ص۲۱۵) آپ یہ بھی فرماتے ہیں لا یقرء خلف الامام ان جہر ولا ان خافت (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ا ص۳۳۱)

ان صحیح اور مستند روایات کی روشنی میں امت کے جلیل القدر اکابر ائمہ مقتدی کیلئے قرأت خلف الامام کو فرض نہیں سمجھتے لیکن غیر مقلد علماء نہ صرف یہ کہ مقتدیوں کے لئے قرأۃ خلف الامام کو فرض قرار دیتے ہیں بلکہ نہ پڑھنے والوں کی نمازوں کے باطل ہونے کا فتویٰ بھی دیتے ہیں.

سو یاد رکھئے کہ منفرد کے لئے سورہ فاتحہ بھی ضروری ہے اور قرآن کی دوسری آیت بھی. لیکن مقتدی کے لئے خاموشی چاہیئے کہ قرآن وسنت سے یہ ہی ثابت ہے. فاتحہ خلف الامام کے بارے میں علامہ حافظ ابن تیمیہؒ کا یہ بیان غیر مقلد علماء کو غور سے ملاحظہ کرلینا چاہیئے. آپ لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفین لکن الذین ینہون عن القرأۃ خلف الامام جمہور السلف والخلف ومعہم الکتاب والسنۃ الصحیحہ والذین اوجبوہا علی الماموم فحدیثہم ضعفہ الائمہ. (تنوع العبادات ص۸۹)

جو لوگ امام کے پیچھے قرأت (فاتحہ ہو یا اور کوئی آیت) کرنے کو ممنوع بتلاتے ہیں وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جن لوگوں نے مقتدی پر قرأت کرنا واجب سمجھا ہے اور اس سلسلے میں جو حدیث پیش کرتے ہیں، ائمہ حدیث نے ان کو کمزور بتلایا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کے اس بیان میں قابل غور بات یہ ہے کہ آپ قرأت خلف الامام کے مانعین کو کتاب اللہ اور سنت صحیحہ پہ عمل کرنے والے کہتے ہیں۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ ان کے پاس صرف حدیث ہے بلکہ سنۃ صحیحۃ فرماتے ہیں جبکہ قائلین کے بارے میں حافظ صاحبؒ حدیث کا لفظ استعمال فرماتے ہیں اور ائمہ کرام سے ان کی تضعیف نقل کرتے ہیں اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث صحیح اور ضعیف دونوں طرح کی ہے جبکہ سنت ہمیشہ صحیح ہوا کرتی ہے کسی سنت کے ضعیف ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔

۸۔ مسئلہ آمین

نماز پڑھنے والا اگر منفرد ہے تو وہ ہمیشہ آمین آہستہ کہتا ہے لیکن جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو اور امام قرأت جہراً کر رہا ہو تو امام کو تو حق ہے کہ آمین جہر سے کہے لیکن مقتدی بھی بلند آواز سے آمین کہیں یہ مذہب امام شافعیؒ کا بھی نہیں ہے۔ سو مقتدی آمین کس طرح کہیں۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ آمین آہستہ کہیں۔ یہ اسلئے کہ آمین ایک دعا ہے اور قرآن کریم میں دعا آہستہ کرنے کا حکم ہے۔ امام اھدنا الصراط المستقیم سے والضآلین تک دعا مانگتا ہے۔ مقتدی اس دعا کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ میں بھی یہی دعا کرتا ہوں تو اسے قبول فرما۔ امام کے والضالین کہنے پر اگر مقتدی آہستہ سے آمین نہیں کہتا تو اس کا یہ عمل کوئی اچھا عمل نہیں ہے اور یہ دعا سے گویا ایک اعراض ہے۔ آمین دعا ہے۔ یہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ قال عطاء امین دعاء (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷) اور دعا کے بارے میں اصل اخفا ہے۔ ادعوا ربکم تضرعاً و خفیہ انه لا یحب المعتدین (پ ۸ الاعراف ۵۵) (پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ اس کو خوش

نہیں آتے حد سے بڑھنے والے) اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ دعا میں اس روش سے ہٹتے ہیں جو قرآن نے بیان کی ہے وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور وہ خدا کو خوش نہیں آتے۔

ہاں امام کا آمین بالجہر کہنا اگر تعلیماً ہو تو اس میں حرج نہیں مگر مقتدیوں کی یہ گونج کہاں سے نکل آئی۔ امام بخاریؒ باوجود شدت ضرورت کے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی کوئی شہادت پیش نہیں کر سکے۔

جس روایت میں امام کے بلند آواز سے آمین کہنے کا ذکر ملتا ہے وہ تعلیماً ہے یعنی یہ بتلانا مقصود تھا کہ ولا الضالین کے بعد آمین کہنی چاہئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو بلند آواز سے آمین کہنے کا ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آہستہ کہنے کی تعلیم دیں۔ ابھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا ارشاد نہ ملا جس سے ثابت ہو کہ مقتدی بلند آواز سے آمین کہیں۔ آپ کو یہاں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دور کی بات کہنی پڑی جو لوگ صحیح بخاری میں ہے کہہ کر یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہراً آمین کہنے کی تعلیم دی تھی ان کا یہ کہنا درست نہیں۔ اسے امام بخاری کا موقف تو کہا جا سکتا ہے لیکن ارشاد نبوی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آہستہ سے آمین کہنا اس حدیث میں دیکھئے جسے حضرت وائلؓ بن حجر روایت کرتے ہیں اور اسے امام بخاری کے شاگرد امام ترمذی نقل کرتے ہیں کہ:

ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلم قرء غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقال امین وخفض بہا صوتہ (جامع ترمذی جلد ۱ ص۳۴)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آمین کہی۔ بعض حضرات نے اس حدیث پر یہاں طور کلام کیا ہے کہ اس روایت میں شعبہ نے تین مواقع پر غلطی کی ہے اور اس پر محدثین کو کلام ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ حضرت امام شعبہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) نے

لکھا ہے کہ:

تخطئة مثل شعبة خطأ وكيف وهو امير المومنين فی الحديث

(عمدۃ القاری جلد ۶ ص۵۱)

(ترجمہ) امام شعبہ جیسے بڑے آدمی کی غلطیاں نکالنا یہ خود ایک بڑی غلطی ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں ان سے ایسی غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔

جہاں تک حضرت سفیان کا تعلق ہے تو خود امام ترمذی نے ان کا اپنا عمل نہیں بیان کیا۔ یہ کیوں؟ اسلئے کہ حضرت سفیان اہل الکوفہ میں سے تھے اور اہل کوفہ کا عمل اس باب میں آہستہ کہنے کا تھا۔ رہا امام ترمذی کا یہ کہنا کہ امام بخاری کے نزدیک سفیان والی روایت اصح ہے تو اس کے یہ معنی یہ نہیں کہ شعبہ والی روایت ضعیف ہے۔ امام بخاری ان دونوں کو صحیح مانتے ہوئے ان دونوں میں سفیان والی روایت کو اصح کہتے ہیں۔ اور یہ بھی صرف امام کے آمین کہنے کا مسئلہ ہے۔ لیکن جو لوگ صرف قرآن و حدیث کی پیروی کا نام لیتے ہیں انہیں تو کم از کم امام بخاری کی تقلید میں یہ بات کہنی زیب نہیں دیتی کہ شعبہ کی روایت بالکل ضعیف ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ہم امام بخاری کو اسلئے مانتے اور ان کی تقلید کرتے ہیں کہ آپ ۲۵۶ھ میں فوت ہوئے اور آپ نے بخاری شریف لکھی ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ امام شعبہ (۱۶۰ھ) تو ان سے بھی بہت پہلے کے امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ اگر امام بخاری (۲۵۶ھ) امام شعبہ (۱۶۰ھ) سے اختلاف کر سکتے ہیں تو امام طحاوی (۳۲۸ھ) امام بخاریؒ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے کو جو تعلیم فرمائی ہے وہ اس طرح ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:

يعلمنا يقول لا تبادروا الامام اذا كبر فكبروا واذا قال ولا الضالين فقولوا آمين واذا ركع فاركعوا واذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا اللهم ربنا لك الحمد۔ (صحیح مسلم جلد ۱ ص۱۷۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح تعلیم دی کہ امام سے جلدی نہ کرو جب

وہ تکبیر کہے تو پھر تم تکبیر کہو اور جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو۔

جس طرح امام زور سے اللہ اکبر کہتا ہے مقتدی نہیں کہتے آہستہ ہی کہتے ہیں۔ امام سمع اللہ لمن حمدہ زور سے کہتا ہے، مقتدی بلند آواز سے اللہم ربنا لک الحمد نہیں کہتے، آہستہ کہتے ہیں۔ اسی طرح امام ولا الضالین کہے تو مقتدی آمین آہستہ کہیں یہاں بلند آواز سے آمین کہنے کا حکم نہیں ہے۔ اگر آمین بلند آواز سے کہنا ضروری ہے تو پھر امام کے ساتھ اللہ اکبر اور اللہم ربنا لک الحمد بھی بلند آواز سے کہی جائے کہ جس سے مسجد گونج اٹھے لیکن ہمارے غیر مقلد دوست بھی اس قدر گونج کے حق میں نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ کرام جن میں حضرت عمرؓ فاروق، حضرت علیؓ المرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ہیں ان کا اس باب میں کیا عمل رہا اسے دیکھئے:

۱۔ عن ابی وائل قال لم یکن عمر و علی یجہران ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ولا بآمین (سنن کبریٰ للبیہقی مع الجوہر النقی جلد ۲ ص ۴۸)

۲۔ عن عبداللہ بن مسعودؓ قال یخفی الامام ثلاثا الاستعاذہ وبسم اللہ الرحمٰن الرحیم وآمین۔ (المحلی جلد ۳ ص ۱۸۳)

حضرت علامہ علاء الدین بن علی المارد ینی (الشہیر بابن الترکمانی ۷۴۵ھ) لکھتے ہیں کہ آمین آہستہ کہنا اکثر صحابہ اور تابعین کا عمل تھا۔ محدثین لکھتے ہیں:

وان کنت مختاراً خفض الصوت بہا اذ کان اکثر الصحابۃ والتابعین علی ذلک (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۵۸)

اگر تجھے کسی ایک جانب کا التزام کرنا ہی ہے تو ان موقعوں پہ آواز دبی رکھ اکثر صحابہ اور تابعین کا اسی پر عمل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آمین آواز سے کہنا تعلیم کے لئے تھا اس کی دلیل خود

حضرت وائلؓ بن حجر کی اس روایت میں ملتی ہے۔

اقرء غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال آمین یمد بھا صوتہ ما اراہ الا یعلمنا (رواہ ابو بشر الدولابی فی کتاب الاسماء والکنی اعلاء السنن جلد۲ صفحہ۲۱۶)۔

قطع نظر اس سے کہ مد اور جہر میں کیا فرق ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ آپ کا اس طرح آمین کہنا تعلیم کے لئے تھا۔ غیر مقلد علماء محدث عثمانی کی نقل کردہ اس روایت سے متفق نہ ہوں تو ہم انہیں حافظ قیم سے بھی اس کی تائید دکھا دیتے ہیں۔ آپ قنوت کی بحث میں لکھتے ہیں کہ اگر کبھی امام قنوت کو جہر کے ساتھ پڑھ لے تاکہ مقتدی اس سے واقف ہوجائیں تو کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اگر کبھی امام جہراً آمین کہہ دے تاکہ مقتدیوں کو پتہ چل جائے کہ نماز میں آمین کہنی ہے تو کوئی حرج نہیں۔

فاذا جھر بہ الامام احیاناً لیعلم المامومین فلا بأس بذلک فقد جھر عمر بالافتتاح لیعلم المامومین وجھر ابن عباس بقراءۃ الفاتحۃ فی صلاۃ الجنازۃ لیعلمھم انھا سنۃ ومن ھذا ایضاً جھر الامام بالتامین (زاد المعاد جلد ۱ صفحہ)

جس طرح حضرت عمرؓ کا ثنا جہراً پڑھنا تعلیماً تھا اسی طرح آمین کا بلند آواز سے پڑھنا بھی تعلیماً تھا۔ اگر آمین زور سے کہنا ہو تو پھر ثنا بھی جہراً پڑھی جاتی لیکن کوئی غیر مقلد عالم اس کا قائل نہیں۔

بعض غیر مقلد دوست سنن ابن ماجہ صفحہ۶۱ کے الفاظ فیرتج بھا المسجد سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ آمین اتنی زور سے کہی جائے کہ پوری مسجد گونج اٹھے۔ لیکن وہ پوری روایت پر نظر نہیں کرتے۔ روایت کے شروع ہی میں الفاظ موجود ہیں۔ ترک الناس التامین۔ کہ لوگ (اونچی آواز سے) آمین کہنا چھوڑ چکے ہیں سو یہ مسجد کی گونج اس سے پہلے کبھی ہوتی رہی ہے اب صحابہ آمین بالجہر نہ کہتے تھے۔ اور حضورؐ کا عمل بھی اس روایت میں یہی بتلاتے ہیں کہ صرف پہلی صف سن پاتی تھی۔ حتی یسمع اھل

الصف الاول۔ کیا اسے پوری مسجد کا گونجنا کہہ سکتے ہیں؟ نہیں۔

اب آپ ہی سوچیں کہ پہلے تو یہ کہا جارہا ہے کہ لوگوں نے آمین جہراً کہنا چھوڑ دیا ہے۔ پھر کہا جارہا ہے کہ امام کی آمین صرف پہلی صف والے ہی سنتے تھے۔ پھر یہ کہا کہ ساری مسجد گونج اٹھی۔ ان تین باتوں کا کیا جوڑ ہے؟ اگر ساری مسجد ہی گونج اٹھتی تھی تو صف اول سے اس کی کیا خصوصیت رہی۔؟ یہی وجہ ہے کہ یہ یرتج بہا المسجد کے الفاظ دوسرے محدثین روایت نہیں کرتے۔ یہ روایت ابو داؤد میں بھی موجود ہے اس میں فیرتج بہا المسجد کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ (سنن ابی داؤد جلد ا ص۱۳۵) اور مسند ابی یعلی جلد ۵ ص۴۵۱ میں بھی یہ روایت ملتی ہے لیکن اس میں بھی یہ الفاظ نہیں ملتے۔ یہ الفاظ کہاں سے آگئے اور یہ کس راوی کا ادراج ہے اس پر مزید غور وفکر اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ روایت کہیں بھی ہو ابو داؤد میں یا مسند ابی یعلی میں یا سنن ابن ماجہ میں بوجہ بشر بن رافع ضعیف ہے۔

۹۔ نماز میں رفع یدین کا مسئلہ

تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنا سنت ہے۔ یہ نماز کی ابتدا ر ہے دوران نماز (رکوع کرنے رکوع سے اٹھنے اور سجدوں کے درمیان) رفع یدین نہ کرے یہ حدیث اسکنوا فی الصلاۃ کے خلاف ہے۔ نماز میں سکون مطلوب ہے جتنی حرکت کم ہو بہتر ہے۔ یہ نماز کے خشوع و خضوع کی علامت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ آیت کریمہ الذین ھم فی صلاتھم خاشعون (پ۱۸ المومنون ۲) کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں۔ لا یرفعون ایدیھم فی صلاتھم (تفسیر ابن عباس ص۲۱۲) نماز میں خشوع کرنے والے نماز کے اندر رفع یدین نہیں کرتے۔ شروع کا رفع یدین نماز کے اندر کا نہیں ہے۔ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین فرماتے تھے۔ فرفع یدیہ اول مرۃ ثم لا یعود۔ (سنن نسائی جلد ا ص۱۵۸) آپ نے صرف شروع میں رفع یدین کیا پھر

دوبارہ نہ کیا۔

عن الأسود قال رأيت عمر بن الخطاب يرفع يديه فی اول تكبيرة ثم لا يعود۔ (طحاوی شریف جلد ۱ ص۱۱۱)

حضرت علی مرتضیٰؓ کا عمل بھی دیکھ لیجئے:

عن عاصم بن كليب عن ابيه ان عليًّا كان يرفع يديه اذا افتتح الصلوٰة ثم لا يعود۔ (جلد ۱ ص۲۱۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جلیل القدر خلفاء عظام کے عمل سے واضح ہوتا ہے کہ نماز میں سوائے تکبیر تحریمہ کے اور مقامات پر رفع یدین کرنا بہتر نہیں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ:

لا اعرف رفع اليدين فی شیٔ من تكبير الصلوٰة لا فی خفض ولا فی رفع الا فی افتتاح الصلوٰة۔

امام مالک کے خاص شاگرد امام ابن قاسم فرماتے ہیں کہ:

كان رفع اليدين عند مالك ضعيفا الا فی تكبير الاحرام۔

(مدونہ۔ از اوجز المسالک جلد ۱ ص۲۰۷)

(ترجمہ) امام مالک کے نزدیک شروع نماز کے سوا رفع یدین جہاں بھی کرے مکروہ ہوگا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے رفع یدین عندالرکوع کی حدیث بہت مضبوط ہے اور اسے حضرت امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ) حجۃ اللہ علی الخلق کہہ کے اتمام حجت کرتے ہیں۔ تو ہم ان کی خدمت میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس حدیث سے استدلال اور اس پہ اصرار بایں طور درست نہیں کہ یہ حدیث کئی طرح کا اضطراب رکھتی ہے جس کی تفصیل اپنے مقامات پہ موجود ہے۔ تاہم یہ بات پیش نظر رہے کہ جس حدیث کو حجۃ اللہ علی الخلق کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے وہی صحابی راوی روایت (یعنی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ) اپنی ہی روایت کے خلاف عمل پیرا رہتے۔ امام مدینیؒ تو خیبہ (۲۳۴ھ) کے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر کے تلمیذ رشید اور مشہور تابعی امام حضرت امام مجاہد (۱۰۰ھ) حضرت عبداللہ بن عمر کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الا في التكبيرة الاولى من الصلوة ۔ (طحاوی شریف جلد ا صلا ۔ المصنف لابن ابی شیبہ جلد ا صـ۲۱۳)

میں نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پیچھے نماز پڑھی آپ نے سوائے تکبیر تحریمہ کے وقت کے اور کہیں رفع یدین نہیں کیا۔

یہ روایت امام بخاری کے استاذ امام ابو بکر عبداللہ بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) نے اپنی مصنف میں بھی نقل فرمائی ہے۔ یہ حجۃ اللہ علی الخلق والی روایت اس لئے بھی قابل عمل نہیں رہتی کہ راوی حدیث جب خود اپنی روایت کے خلاف عمل کرے تو اس سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ رفع یدین کا یہ بیان جو راوی نے کہا ہے وہ کسی پہلے دور کا ہوگا۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول رفع یدین کا رہا ہو اور راوی اس حدیث کو بیان کرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتا تو پھر صحابی کی دیانت مجروح ہو جاتی ہے۔ اور کسی صحابی کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ اہل سنت ہرگز نہیں رکھ سکتے۔

رہی یہ حدیث کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آخر تک یہ ہی عمل کرتے رہے فما زالت تلك صلوته حتى لقى الله تعالىٰ. تو یہ روایت اہل تحقیق کے ہاں موضوع ہے۔ اس کے الفاظ بالکل وضعی ہیں۔ روایت میں اس جملے کی زیادتی ایک راوی عبدالرحمٰن بن قریشی نے کی ہے۔

یہ صاحب امام بخاریؒ کے استاذ یحییٰ بن معین کے نزدیک کذاب یضع الحدیث سمجھے گئے ہیں۔ اس زیادتی کی تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے

ہیں کہ غیر مقلد علماء بھی اس زیادتی کو انتہائی ضعیف قرار دیئے بغیر نہ رہ سکے مشہور غیر مقلد عالم مولانا عطاء اللہ حنیف نسائی شریف کی تعلیقات میں اس بات کا اقرار کرتے ہیں ۔

وحدیث البیہقی مازالت آہ ضعیف جداً ۔ (التعلیقات السلفیہ ص۱۰۲)

مولانا عطاء اللہ نے یہاں انصاف نہیں کیا۔ اس حدیث کو شدید درجے کی ضعیف کہا ہے۔ انہیں اس حصہ روایت کو کھل کر موضوع کہنا چاہئے تھا۔

جاری

(بقیہ ص۴۷ کا)

اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ زندگی عطاء فرمائی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کا قائم کردہ ادارہ "جامعہ تعلیم القرآن" ان کے تلامذہ، ان کی تصنیفات، ضلع کپواڑہ کے اندر ان کی ملی خدمات صدیوں تک اپنی زبان حال وقال سے ان کی داستان حیات سناتے رہیں گے ۔

لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ان کی شہادت کا سانحہ پورے ملک کے لئے نہ سہی تو کم از کم اسلامیان کشمیر کے لئے ایک عظیم ترین سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے ۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں پناہ دے ۔ آمین ۔

مقالہ نگار: احمد الشنوانی

مترجم: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، لکچرر شعبۂ عربی اے ایم یو علی گڑھ

تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں ایسے علماء اسلام رہے ہیں جن سے امت مسلمہ دینی اور دنیوی امور میں اسلامی نقطۂ نظر دریافت کرتی رہی ہے اور وہ قرآن کریم و حدیث شریف نیز اجتہاد کی بنیاد پر انہیں شرعی حیثیت بتاتے رہے۔ انہیں شرعی اصطلاح میں مفتی کہا جاتا ہے۔ آج بھی اسلامی ممالک نے فتاوے کے شعبے قائم کئے ہیں۔ اور اس شعبے میں متعدد مفتیان کو تقرر دیئے گئے ہیں یہاں پر چند مفتیان مصر کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

شیخ حسونہ بن عبداللہ النواوی حنفی

آپ ۱۸۳۹ء میں "نواي" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو ملوی کا مرکزی مقام تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ "اسیوط" کے حدود میں شامل ہے۔ آپ نے حفظ کرنے کے بعد ازہر میں داخلہ لیا اور وہاں نامور اساتذۂ کرام کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا، اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کی بنا پر اعلیٰ مقام حاصل کیا، انہیں علم و فنون کے حصول کا بہت شوق تھا، قدرت نے انہیں حد درجہ قوت فہم عطا کی تھی، مطالعہ و تحقیق ہی اصل ان کی توجہ کے مرکز تھے۔ اس طرح انہوں نے عالمیت کی سند حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تدریسی میدان میں قدم رکھا، اپنی علمی شہرت کی بنا پر انہیں دارالعلوم اور کلیۃ الحقوق میں فقہ کا استاذ مقرر کیا گیا۔

۱۸۹۴ء میں جامعۂ ازہر کے نائب سکریٹری بنائے گئے، انہوں نے جامعہ ازہر میں اصلاحات کے اقدامات شروع کئے تو آپ کی معاونت کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، ۱۸۹۹ء میں ایک قرار داد پاس کرکے جامعۂ ازہر کا شیخ الشیوخ متعین کیا گیا اور اسی سال انہیں اس منصب پر برقرار رکھتے ہوئے محاکم شرعیہ کی اعلیٰ باڈی کا رکن منتخب کیا گیا۔ آگے چل کر جب انہیں خدیو اسماعیل کی پالیسیاں پسند نہ آئیں تو انہوں نے شیخ الشیوخ کے منصب سے استعفاء دیدیا۔ خدیو نے یہ عہدہ انہیں دوبارہ پیش کیا لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بعد میں انہیں مفتی مصر کے عہدہ سے سرفراز کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ شیخ الشیوخ کا بھی۔ چنانچہ ۱۳۱۳ھ سے ۱۳۱۷ھ تک اسی حیثیت سے اپنی خدمات جلیلہ سے علمی دنیا کو فیض یاب کیا۔ اس مدت میں انہوں نے ۲۸۷ فتاوے جاری کئے۔

آپ ایک فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور و معروف صاحبِ قلم بھی تھے آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ ایک کتاب کا نام "سلم المسترشدین فی احکام الفقہ والدین" ہے۔

شیخ محمد عبدہ

شیخ محمد عبدہ ۱۸۴۹ء میں بحیرہ کے علاقہ میں "نصر" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے، انہوں نے قرآن کریم حفظ کیا اور فن تجوید میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں جامعۂ ازہر گئے اور وہاں سے ۱۸۷۷ء میں عالمیت کی سند حاصل کی۔ انہیں وہاں پر مشہور اساتذہ سے استفادہ کے مواقع ہاتھ آئے۔ آپ اپنے وقت کے ایک عظیم عالم اور کثیر المعلومات تھے۔

آپ نے ازہر، مدرسہ دارالعلوم اور مدرسۃ السنہ میں مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیں۔ مصر کے مشہور اخبار "الوقائع المصریہ" کی ادارت بھی انجام دی ۱۸۸۳ء میں شام کا سفر کیا اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں پیرس میں جمال الدین افغانی سے ملاقات کی جہاں سے دونوں شخصیتوں نے مشہور رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" جاری کیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ بیروت آگئے اور یہاں پر اپنی مشہور کتاب "توحید" کو ترتیب دیا۔ یہاں سے ۱۸۸۸ء میں جب مصر واپس آئے تو انہیں محاکم شرعیہ کا قاضی بنا دیا گیا۔ بعد میں انہیں کورٹ آف اپیل

کا مشیر بنایا گیا۔ اس کے بعد جامعۂ ازہر کی مجلس انتظامیہ کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں مجلس شوریٰ کے رکن ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں انہیں مصر کا مفتی بنایا گیا۔ آپ نے ازہر کے اندر بے شمار اصلاحات کیں۔ ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تعلیمی نصاب کا ایک خاکہ تیار کیا اسی طرح محاکم شرعیہ، شرعی قوانین نیز اوقاف میں قابل ذکر اصلاحات کیں۔ ان کے علاوہ قوم کے اندر سیاسی، دینی اور اخلاقی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور اس طرح ۱۹۰۵ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شیخ بکری صدقی

آپ اسیوط کے علاقہ بمقام "صرفا" پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت ایک علمی اور دینی گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد محترم محمد عاشور صدقی جید علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں رہے اور ان کی وجہ سے اپنے علم وفن میں حد درجہ اضافہ کیا۔ عربی زبان وادب اور دین اسلام کی ابتدائی باتیں انہیں اپنے والد ہی سے معلوم ہوئیں۔ اس کے بعد قرآن حفظ کیا اور فن تجوید میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد جامعۂ ازہر میں داخلہ لیا، جہاں انہیں عظیم اساتذہ سے استفادے کے مواقع ملے، آپ نے اپنے اساتذۂ کرام کے بلند کردار کو اپنایا، یہی وجہ ہے کہ ایک وقت وہ آیا کہ خود انہیں نامور علماء کرام میں شمار کیا جانے لگا۔ آپ ایک کشادہ ذہن کے مالک تھے، حاضر دماغی آپ کا طرۂ امتیاز تھی، اللہ تعالیٰ نے بیک وقت آپ کو متعدد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تلاش علم وعرفان ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو انہوں نے عالمیت کی سند اول درجہ سے حاصل کی۔

آپ کو جامعۂ ازہر میں تدریسی فریضہ انجام دینے کا موقع ہاتھ آیا، اس کے علاوہ وہ اپنے گھر پر بھی طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ آپ کی رہائش گاہ ازہر سے متصل تھی۔ جامعۂ ازہر کے بعد آپ نے اپنی خدمات شرعی عدالت کے سپرد کر دیں، رفتہ رفتہ آپ دار القضاء کی سب سے بڑی پوسٹ پر فائز ہو گئے۔ ۱۸ رمضان ۱۳۲۳ھ کو آپ مصر کے مفتیٔ اعظم کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ۴ صفر ۱۳۳۲ھ تک اس منصب عظیم پر

جلوہ افروز رہے۔اس مدت میں آپ نے ۱۱۸۰ فتاوے جاری کئے جو دارالافتار میں محفوظ ہیں۔

پاکیزگی اور خوش مزاجی آپ کے نمایاں اوصاف میں تھی جبکہ آپ علمی اور دنیوی حیثیت سے ایک اعلیٰ مقام پر فائز تھے، علمی اور عملی اعتبار سے آپ اسلامی شعائر کے سخت پابند تھے۔آپ کی پوری زندگی تدریس وافتار میں بسر ہوئی اور اس طرح مارچ ۱۹۱۹ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شیخ محمد بخیت مطیعی آپ ضلع اسیوط کے ایک اہم شہر "مطیعہ" میں (۱۲۷۱ھ ۱۸۵۶ء) پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کا آغاز انھوں نے اپنے شہر کے مکتب سے کیا۔جہاں ابتدائی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا اور فن تجوید سے متعارف ہوئے۔ ۱۲۸۲ھ میں جامعہ ازہر پہنچے۔ازہر سے علوم شرعیہ اور عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کی، ازہری شیوخ کے علاوہ باہری اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔ ۱۲۹۲ھ میں درجہ اول سے عالمیت کی سند حاصل کی۔ان کے علم وفضل کو دیکھتے ہوئے انہیں تشریعی ڈریس (کسوۃ التشریعۃ) سے نوازا گیا۔علمی اعزاز کے باوجود مستقل ازہری شیوخ سے استفادہ کرتے رہے۔

۱۲۹۵ھ سے انہوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز فقہ، توحید اور منطق کے استاذ کی حیثیت سے شروع کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں قاضی بنائے گئے، اسی عہدے سے ترقی کرتے کرتے وزارت عدل کی جانب سے ۱۳۱۰ھ میں مقام حقانیہ میں شرعی انسپکٹر منتخب ہوئے اس کے بعد اسکندریہ کے قاضی ہوئے اور ۱۳۱۱ھ میں اس کی شرعی کمیٹی کے صدر بنے، اور پھر مصر کی شرعی عدالت کے رکن ہوئے اور مصر کی علمی مجلس کے صدر بھی ہوئے اسی اثنار میں قاضی مصر شیخ عبداللہ جمال الدین کے نائب کی حیثیت سے کام کیا اور پھر انہی کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔

۱۹۱۲ء میں انہیں حقانیہ کے دارالافتار کی جانب روانہ کیا گیا اور قاضی نسیب آفندی کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی۔ ۱۳۲۳ھ میں انہیں قاضی مصر

کے منصب پر بٹھایا گیا۔ جہاں انہوں نے یہ فریضہ ۱۶ رشوال ۱۳۳۸ھ تک انجام دیا۔ اس دوران ۲۸۰۳۰ فتاوے صادر کئے، ان کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ جس شہر میں جاتے وہاں لوگوں کو علوم شرعیہ کی تعلیم ضرور دیتے۔ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حکومتی کاموں میں بھی خوب دل چسپی لیتے انہوں نے بیس سے زائد تصانیف ترتیب دیں، یہاں ان میں سے کچھ عناوین دیئے جا رہے ہیں۔ (۱) ارشاد الأمة الی احکام اهل الذمه، (۲) احسن الکلام فیما یتعلق بالسنة والبدع من الاحکام (۳) حسن البیان فی دفع ما ورد من الشبه علی القرآن (۴) ازاحة الوهم (۵) فی مسألتی الفونوغراف والسکورتاه والکلمات الحسان فی الاحرف السبعة وجمع القرآن (۶) القول المفید فی علم التوحید (۷) الاجوبة المصریة عن الأسئلة التونسیة (۸) البدر الساطع علی جمیع الجوامع (۹) فی اصول الفقه وحقیقة الاسلام واصول الحکم (۱۰) والمرهفات الیمانیة (۱۱) فی وقف الذریة و ارشاد العباد فی الوقف علی الاولاد (۱۲) القول الجامع (۱۳) فی الطلاق والکلمات الطیبات (۱۴) فی الاسراء والمعراج ورفع الاخلاق عن مشروع السراح والطلاق۔

شیخ محمد اسماعیل بردیسی

آپ جرجا میں بردیس کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا اس انصار گھرانے سے تعلق تھا جو علم وفضل، دینداری اور حسن اخلاق میں اپنی مثال آپ تھا، یہی وجہ ہے کہ یہ صفات حمیدہ آپ کے اندر سرایت کر گئیں۔ اپنی بلند کرداری، نیک ماحول، شرم وحیا اور تواضع وانکساری کی بنا پر عوامی مجلسوں سے دور رہتے۔

پہلے آپ نے قرآن حفظ کیا اور اس کے بعد تجوید میں اعلیٰ مقام حاصل کیا علم ومعرفت کے بہت سے گوشوں کی سیر کی، جامعۂ ازہر میں داخلہ لے کر جید علماء کی خدمات جلیلہ سے آگاہی حاصل کی۔ وہ مستقل علمی چیزوں میں محو رہتے اور مطالعہ، تحقیق کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ اس طرح عالمیت کی سند حاصل کی، اپنے علم وفضل کی بنیاد پر نامور اور معروف علماء،

میں شمار کئے جانے لگے ۔

عملی زندگی کا آغاز دارالقضاء کی ملازمت سے کیا ۔ بعد میں قاضی ہوئے اور دارالقضاء کے انسپکٹر بنائے گئے ۔ اور ترقی کرکے مصر کی اعلیٰ شرعی عدالت کے نائب ہوئے اور جب محمد بخیت مطیعی نے مفتی مصر کا عہدہ خالی کیا تو انہیں ۲۵ شوال ۱۳۳۸ھ / ۱۲ جون ۱۹۲۰ء کو اس عظیم عہدہ پر فائز کیا گیا ۔ اس پر بہت تھوڑی مدت یعنی چھ ماہ کام کیا ۔ اس قلیل عرصہ میں انہوں نے ۲۰۶ فتاوے جاری کئے ۔

آپ نہایت متحمل مزاج اور بردبار تھے ، عفت و پاکدامنی آپ کی فطرتِ ثانیہ تھی ، آپ کے فتاوے مدلل اور عالمانہ شان کے حامل تھے ۔ شرعی مسائل میں زبردست استدلال کی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے ، ان کی علمی شہرت سے پورا مصر واقف تھا ، ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان اور تہذیب و تمدن سے بھی بخوبی واقف تھے ۔

شیخ عبدالرحمٰن قراعہ ۱۲۷۹ھ میں بمقام اسیوط تولد پذیر ہوئے ، وہ اسیوط کے قاضی علامہ شیخ محمود قراعہ کے لڑکے تھے ۔ آپ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو شریعت اسلامیہ کے علوم و فنون میں اپنی مثال آپ تھا ۔ آپ اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے ۔ والدین نے دینی اور سنجیدہ ماحول میں آپ کی پرورش کی ۔ پہلے آپ نے قرآن حفظ کیا اس کے بعد تجوید کی تعلیم سے آشنا ہوئے ۔ اور نو سال کی عمر میں اپنے والد سے تمام ابتدائی علوم سے فارغ ہو گئے ۔ اور اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی ذہانت و فطانت کے آثار ظاہر و باہر ہو گئے ۔

ان کے والد محترم نے انہیں ازہر روانہ کیا ، جہاں ازہری علماء و شیوخ کی مساعدت و معاونت سے علوم و فنون کے سمندر تک رسائی ہوئی ۔ انہوں نے ازہر کی کتب سے استفادہ کرنے میں کسی غفلت و لاپرواہی کو قریب آنے نہیں دیا ۔ ادبی اور لغوی کتب کا کثرت سے مطالعہ کرتے ، عربی زبان و ادب کے ارتقاء میں ان کا نمایاں رول رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عظیم ادباء اور مشہور شعراء میں شمار ہے ۔

ازہر میں تدریسی فریضہ کی ادائگی سے اپنی زندگی کا دوسرا دور شروع کیا وہ نامور

اساتذۂ کرام میں شامل تھے۔ انہوں نے اسناد، اسماء الرجال اور ان کے طبقات پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ کتب تفاسیر کا بھی انہوں نے خصوصی مطالعہ کیا جس علمی شاخ سے استفادہ کرنا چاہا کیا، بیشمار ازہری طلبہ آپ کے علم و فضل سے مستفیض ہوئے۔

۱۸۹۷ء میں جرجا ضلع کے دارالافتاء سے وابستہ ہوگئے، وہاں پر دستور عدل کی بنیاد ڈالی، اور علم و فضل کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حقانیہ وزارت کو آپ کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ اسوان ضلع کے قاضی ہوئے تو آپ کی عفت و شرافت اور خوش اخلاقی کا خوب چرچا ہوا۔ یہ بات پوری طرح عام ہوگئی کہ جھگڑوں اور عداوتوں کے مقدمات نہایت خوش اسلوبی سے طے کرتے ہیں۔ ان کی ان خصوصیات کے پیش نظر ۱۹۰۸ء میں انہیں دقہلیہ کا قاضی متعین کیا گیا۔

جب محاکم شرعیہ کی تنظیم عمل میں آئی تو ۱۹۱۱ء میں آپ کو بنی سویف کی شرعی عدالت کا قاضی متعین کیا گیا۔ بعد میں ترقی کر کے شرعی عدالت عالیہ کے رکن ہوئے۔ پھر اس کے نائب ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں وہ جامعۂ ازہر کے منتظم (مدیر) بنائے گئے۔

۳۰ ربیع الآخر ۱۳۳۹ھ/ ۹ فروری ۱۹۲۱ء کو مصر کے مفتیٔ اعظم بنائے گئے۔ اور یہ فریضہ ۲۰/۱/۱۹۲۸ء تک انجام دیتے رہے۔ اس دوران آپ نے ۳۰۶۵ فتوے دیئے۔ ان فتاووں میں مختلف طرح کے اٹھائے گئے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔

شیخ عبدالمجید سلیم

۱۳ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو منوفیہ میں بیت شہالہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے قرآن کریم حفظ کیا، تجوید سیکھی، اس کے بعد ازہر میں داخلہ لیا، انہیں ذہن رسا ملا تھا، مطالعہ و تحقیق میں غرق رہتے۔ تمام علوم کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے۔ انہوں نے اپنی معلومات کا دائرہ صرف ازہری علوم تک محدود نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے فلسفہ پر بھی خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے اپنے احباب میں ابن سینا کے نام سے مشہور ہوئے ۱۹۰۸ء میں اعلیٰ درجہ سے عالمیت کی سند حاصل کی۔

آپ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے مختلف دینی اداروں اور مدرسۃ

170652
14.10.97

القضاء الشرعی میں پڑھایا نیز دار القضاء کو ان کی سرپرستی بھی حاصل رہی اور اس شعبہ میں اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر مختلف عہدوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ ۲۲ر مئی ۱۹۲۸ء کو انہیں مفتیٔ مصر بنایا گیا اور تقریباً بیس سال تک دار القضاء کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور اس مدت میں زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق نہایت قیمتی مسائل کے حل پیش کئے اور اسلامی نقطۂ نظر سے جدید دنیا کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ آپ نے اپنی مدت کار میں پندرہ ہزار سے زائد فتاوے دیئے۔

۸ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو آپ کو ازہر کے شیخ الشیوخ کے منصب سے معزز کیا گیا ۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو اس وقت انہیں اپنے منصب سے سبکدوش ہونا پڑا جب انہوں نے حکومت مصر کو ازہر کے بجٹ میں کٹوتی کرنے کی وجہ سے ہدف تنقید بنایا۔ اس کے بعد ایک بار پھر انہیں ۱۰ر فروری ۱۹۵۲ء کو ازہر کا شیخ الشیوخ بنایا گیا تو انہوں نے کچھ مدت کام کرکے ۱۷ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس سے استعفیٰ دیا۔

شیخ محمد حسن مخلوف

آپ کی ولادت قاہرہ میں بمقام باب الفتوح ۶ر مئی ۱۸۹۰ء کو ہوئی۔ آپ نے قرآن حفظ کیا اور صحن ازہر میں تجوید کی تعلیم لی۔ جس وقت جامعہ ازہر میں داخلہ لیا تو گیارہ سال کے تھے۔ آپ نے اس وقت کے مشہور شیوخ سے استفادہ کیا۔ ازہری علوم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ قضاء کے شعبہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۱۴ء میں نہایت اچھے نمبروں سے عالمیت کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۴ر سال تھی۔

جامعہ ازہر کے طالب علم ہونے کے ناطے وہاں اعزازی طور پر تدریس شروع کر دی اور ۱۹۱۶ء میں محاکم شرعیہ کے قاضی منتخب ہوئے اور یہاں تیزی سے اعلیٰ عہدوں پر ترقی کرتے رہے۔ ۱۹۴۱ء میں اسکندریہ کے کالج میں شعبۂ فقہ کے صدر ہوئے اور اس کے بعد وزارت عدل تفتیش شرعی کے صدر ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں ازہر کی علماء تنظیم کے رکن ہوئے۔

پانچ جنوری ۱۹۴۶ء کو انہیں مفتیٔ مصر کا اعزاز دیا گیا۔ اور اس منصب پر ۴ر مئی ۱۹۵۰ء

تک کام کرتے رہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گوشۂ گمنامی میں پوشیدہ ہونے کے بجائے روزنامہ المنشد الحسنی میں درس دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارچ ۱۹۵۲ء میں انہیں دوبارہ مفتی مصر بنایا گیا۔ یہ خدمت ۹ دسمبر ۱۹۵۴ء تک انجام دی اور اس کے ایک طویل عرصہ تک ازہر کی "لجنۃ الفتوی" کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

شیخ علام نصار
آپ ۲۰ فروری ۱۸۹۱ء کو منوفیہ میں قویسنا کے مقام پر پیدا ہوئے پہلے گاؤں کے مکتب میں داخلہ لیا، اور قرآن حفظ کیا، اس کے بعد تجوید سیکھی پھر طنطا کے جامع احمدی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ قضاء شرعی کا رخ کیا اور وہاں اپنی تعلیم کو مستقل جاری رکھتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں فراغت حاصل کی اس کے فوراً ہی بعد وہ محاکم شرعیہ میں شرعی قاضی بنا دیئے گئے۔ آپ نیک خلقی، عفت و پاکیزگی اور عدل و انصاف میں اپنی مثال آپ تھے، آپ کی آراء و نظریات بہت مشہور تھے۔ مستقل قضاء شرعی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کے اہم ترین عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تفتیش قضاء شرعی کے صدر متعین ہوئے، اس کے بعد شرعی عدالت عالیہ کے رکن ہوئے۔ قضاء شرعی کے شعبہ میں وہ مستقل اپنی عدالتی اور تدریسی خدمات میں مصروف رہے۔ ۲۱ مئی ۱۹۵۰ء کو انہیں دیار مصر کا مفتی بنایا گیا، جہاں انہوں نے ۲۳ فروری ۱۹۵۲ء تک کام کیا۔ اس قلیل عرصہ میں انہوں نے ۲۱۸۹ فتاوے صادر کئے۔

شیخ حسن مامون
۱۳ جون ۱۸۹۴ء کو آپ اس دار فانی میں تشریف لے آئے۔ ان کے والد محترم جو قصر عابدین کی مسجد کے امام تھے، انہوں نے بچپن ہی سے ان کی سخت دینی تربیت کی۔ پہلے قرآن حفظ کیا اس کے بعد تجوید کی تعلیم سے خود کو آراستہ کیا۔ اس کے بعد ازہر میں داخلہ لیا، یہاں سے فراغت کے بعد مدرسہ قضاء شرعی کا رخ کیا اور ۱۹۱۶ء میں وہاں سے فارغ ہوئے۔ آپ عربی کے ساتھ فرانسیسی علوم سے بھی واقف تھے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں زقا قیق کی شرعی عدالت میں ایک ملازم کی حیثیت سے کام شروع کیا، جون سنہ ۱۹۲۰ء میں انہیں قاہرہ کی شرعی عدالت میں منتقل کر دیا گیا۔ دارالقضاء میں مستقل ترقی کی سیڑھیاں طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تین جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کو سوڈان میں قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے خوش اسلوبی سے اپنا فریضہ انجام دیا تقریباً چھ سال تک اس منصب پر کام کیا۔ اس کے بعد ۱۷ر فروری سنہ ۱۹۴۷ء میں انہیں قاہرہ کی ابتدائی شرعی کورٹ کا صدر چن لیا گیا۔ پہلی مارچ سنہ ۱۹۵۵ء کو انہیں مصر کا مفتیٔ اعظم منتخب کیا گیا۔ اپنا یہ فریضہ انجام دے ہی رہے تھے کہ جمہوریہ مصر کی ایک قرارداد کے مطابق انہیں ازہر کے شیخ الشیوخ کے اعزاز سے نوازا گیا۔

شیخ عبد العال ہریدی

۱۵ر مئی سنہ ۱۹۰۶ء کو بنی سویف کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم حفظ کیا اور تجوید سیکھی نیز تجوید کے قواعد وضوابط پر دسترس حاصل کی، ان کے والد اپنے بیٹے کے اندر جب ذکاوت و فطانت کے آثار دیکھے تو مزید تعلیم کے لئے جامعہ ازہر میں داخلہ دلوایا۔ جہاں انہوں نے چند معروف شیوخ سے استفادہ کیا۔ چنانچہ عالیہ کی سند کے حصول کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں قضاء شرعی میں تخصص کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ہی قضاء شرعی سے وابستہ ہو گئے اور قاہرہ کے عظیم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ شرعی عدالت کے صدر بھی بنے۔ نہایت ذہین، مختلف صلاحیتوں کے مالک، مدلل گفتگو کے عادی اور حاضر دماغ تھے علم و تحقیق کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو دارالقضاء میں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ ان کی وجہ سے عدالت پر بہت سی عائد پابندیاں اٹھالی گئیں۔ انہوں نے بہت سے جرأت مندانہ اقدامات کئے۔ جن سے ان کا ذہنی ترفع، عادلانہ فکر، اور بلند کرداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۲۰ر جون سنہ ۱۹۶۰ء کو انہیں مصر کا مفتیٔ اعظم بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں وہ اپنی سبکدوشی کی عمر کو پہنچ گئے۔ لیکن ان کے علم و فضل کو

دیکھتے ہوئے انہیں اس منصب پر قائم رہنے دیا گیا۔ ۷ ارمئی ۱۹۷۰ء کو "مجمع البحوث الاسلامیہ" کے رکن بنے نیز "مجمع اللغۃ العربیہ" اور "الشئون الاسلامیہ" کے اراکین میں شامل ہوئے۔

شیخ محمد خاطر الشیخ

۷ راگست ۱۹۱۳ء کو دقہلیہ کے علاقہ میں ضہید نامی گاؤں میں پیدا ہوئے، پہلے انہوں نے قرآن حفظ کیا اور قرآن کریم کو ایک اہم فقیہہ کی نگرانی میں قواعد وضوابط اور تجوید کے مطابق پڑھا۔ اس کے بعد ازہر گئے۔ ۱۹۳۹ء میں کلیۃ الشریعہ سے فراغت حاصل کی اور ۱۹۴۱ء میں قضا شرعی سے تخصص کی سند حاصل کی۔

۱۹۴۳ء میں اپنی ملازمت کا آغاز دارالقضا سے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں محاکم شرعیہ کے قاضی ہوئے۔ ترقی کرتے ہوئے دارالقضا میں وزارت عدل کی جانب سے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ قضا شرعی جب قضا وطنی میں ضم ہو گئی تو شخصی معاملات کی نیابت کے لئے آپ کو صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد کورٹ آف اپیل کے مشیر بنائے گئے۔

۳۱ راکتوبر ۱۹۷۰ء میں انہیں مصر کا مفتی اعظم بنا یا گیا۔ اپنی ریٹائرڈ منٹ تک یہ فریضہ انجام دیا۔ آپ کو مختلف اکیڈمیوں مثلاً مجمع البحوث الاسلامیہ، الشئون الاسلامیہ کی مجلس اعلیٰ، اور لجنۃ الشریعہ کی مجلس اعلیٰ کا رکن بننے کا شرف حاصل رہا۔ سبکدوشی کے بعد فیصل اسلامی بینک کی جوڈیشیل باڈی کے صدر چنے گئے۔ انہوں نے یہاں نہایت بنیادی قواعد تشکیل دیئے نیز اسلامی اقتصادیات پر بہت سے خطبے دیئے۔

ڈاکٹر محمد سید طنطاوی

آپ ۲۸ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو سوہاج کے علاقہ میں طما ضلع کے شرقیہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں اسکندریہ کے معہد ازہر میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۵۴ء میں سکنڈری اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد کلیۃ اصول الدین میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۸ء

ین وہاں سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں "بنواسرائیل فی القرآن السنہ" کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۶۸ء میں اسیوط کے کلیہ اصول الدین میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں پروفیسر اور اسی سال کالج کے پرنسپل ہوئے اور یہ فریضہ ۱۹۸۰ء تک انجام دیتے رہے۔ انہیں عراق، لیبیا اور سعودیہ عربیہ کی مختلف جامعات میں لکچرز کے لئے بلایا گیا۔ شعبہ تفسیر کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے بڑے قابل فخر کام انجام دیئے۔

۲۸ راکتوبر ۱۹۸۶ء کو انہیں مصر کا مفتی بنایا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جامعہ ازہر کسی استاد کو اس منصب پر فائز کیا گیا۔ کیونکہ اب تک جامعہ ازہر کے اساتذہ کی رسائی وزارتِ عدل میں صرف شرعی عدالتوں میں بڑے بڑے قاضیوں کے مناصب تک محدود تھی۔

آپ متعدد کتب کے مصنف بھی ہیں۔ آپ نے میڈیا کے مختلف ذرائع سے دینی پروگرامز پیش کئے۔ نیز اسلامی اور عربی ممالک کی مختلف دینی کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی جمال الدین شہید

از: احمد سعید شاہ قاسمی مہتمم دارالعلوم قاسمیہ کشمیر

اسلامی نقطۂ نگاہ سے موت وجودی شئی ہے نہ کہ عدمی، خالق کائنات نے واضح الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے، ارشاد ہے: خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا یعنی انسان کے اعمال کا حسن و قبح جاننے کے لئے موت و حیات کا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے، گویا کہ موت ایک دوسری زندگی کا آغاز ہے نہ کہ حیات کا اختتام، بلکہ اصل زندگی مابعد الموت ہی کی ہے۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے ؎

ہائے وقت مرگ مجھ پہ یہ حقیقت کھل گئی
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

دانائے راز علامہ اقبال نے بھی موت کی یہ حقیقت بیان کی ہے۔ ؎

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سب کی موت یک جیسی نہیں ہے، کسی کی موت پورے عالم کے لئے راحت ہے، کسی کی موت پر پورا عالم ماتم کدہ بن جاتا ہے، کوئی مرتا ہے تو پورا عالم اطمینان کا سانس لیتا ہے، کوئی جاتا ہے تو صدیوں اس کی تلافی نہیں ہوتی ہے۔

اور پھر موت کی بھی قسمیں ہیں، کسی کی موت بستر کی موت ہے، کوئی میدان کارزار میں لڑتے لڑتے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے، کوئی کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، کوئی اللہ اللہ کرکے جان دیتا ہے، کوئی عمر بھر گناہوں میں مبتلا رہ کر

اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

اسلام میں سب سے اعلیٰ موت شہید کی موت ہے، اندازہ لگائیے کہ وہ ذات جس کیلئے یہ ساری کائنات وجود میں لائی گئی ہے جس کو آخرت میں مقام محمود ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے جسے نمعلوم آخرت میں کیا کیا مراتب و مقامات عطا ہونے کے وعدے کئے گئے وہ بھی فرما رہے ہیں کہ کاش میں خدا کے راستے میں شہید کیا جاتا اور پھر زندہ کر دیا جاتا اور پھر شہید کیا جاتا اور پھر بار بار ایسا ہوتا، اسی ذات اقدس کے پیروکار اور تربیت یافتہ جاں نثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس موت کے لئے زبردست استبدادی قوتوں سے ٹکرلی، سینکڑوں لاکھوں میں گھس جاتے تھے تاکہ شہادت نصیب ہو۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے تو فرمایا کہ میں کبھی دشمن کو زیر کرنے کے لئے نہیں لڑا بلکہ اپنی شہادت کی تلاش میں صفوں کے اندر گھس جاتا اور بڑے بڑے فوجی دستوں پر حملہ کرتا، لیکن افسوس اللہ نے میری قسمت میں شہادت کی موت نہیں لکھی تھی۔

کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کو اللہ یہ مقام نصیب فرمائے۔ اللہ قبول فرمائے حضرت مولانا مفتی جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کو، کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انکو اس اعزاز سے نوازے گا۔ سچ ہے:

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شہید موصوف کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محنت، لگن، جذبہ ایثار، خدمت دین، خدمتِ خلق کا صلہ دنیا ہی میں عطا فرمایا، اور قیامت تک جریدہ عالم پر اپنا نقشہ حیات ثبت کر گیا۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبتست بر جریدۂ عالم دوام ما

موصوف جن خوبیوں اور جس صلاحیت کے مالک تھے، وہ دیگر مضامین میں آچکا ہے۔ مجھے صرف اتنا بتانا مقصود ہے انکی موت موت نہیں ہے بلکہ حیات جاودانی ہے۔

(بقیہ ص۳۳ پر)

ابوعمار زاہد الراشدی چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم، خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب مرزا طاہر احمد صاحب سربراہ قادیانی جماعت مقیم ٹلفورڈ لندن

السلام علی من اتبع الہدیٰ

گذارش ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس سال پھر اپنی سالانہ رپورٹ میں پاکستان میں قادیانی جماعت کے مبینہ انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر کیا ہے اور متعدد قادیانیوں کے خلاف درج مقدمات کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے حکومت پاکستان کو اس کا ملزم ٹھہرایا ہے۔

میں اس خط کے ذریعہ اس اہم مسئلہ پر آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں کیونکہ یہ مسئلہ اس وقت نہ صرف مسلمانوں اور قادیانیوں کے مابین تنازعہ اور کشیدگی میں شدت کا باعث بنا ہوا ہے بلکہ بین الاقوامی اداروں اور لابیوں کے ہاتھ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کو حقائق و مسلمات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ سے کوئی ایسا معقول طرز عمل اختیار کرنے کی اپیل کی جائے جو اس کشیدگی میں کمی کا باعث بن سکے اور فریقین اپنی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں اس محاذ آرائی پر صرف کرنے کی بجائے انہیں مثبت مقاصد کے لئے استعمال میں لا سکیں۔

جناب مرزا صاحب! آپ کے دادا مرزا غلام احمد قادیانی نے آج سے ایک صدی قبل نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور نئی وحیِ الٰہی کے حوالے سے اپنی تعلیمات پیش کرنے کا آغاز کیا تھا جسے امتِ مسلمہ کے تمام علمی و دینی حلقوں نے اسلام کے بنیادی عقیدۂ ختم نبوت اور اس کی تیرہ سو سالہ اجماعی تعبیر سے انحراف قرار دیتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مرزا صاحب اور ان کے پیروکاروں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے کر ان سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کیا تھا جب کہ دوسری طرف مرزا صاحب اور ان کے جانشینوں نے مرزا صاحب پر نازل ہونے والی مبینہ وحیِ الٰہی پر ایمان لانے کو ضروری گردانتے ہوئے ایمان نہ لانے والوں یعنی دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنا ہم مذہب تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اس طرح مسلمان اور قادیانی دونوں فریق اس نکتہ پر متفق ہو گئے تھے کہ دونوں گروہ ایک مذہب کے پیروکار نہیں ہیں بلکہ دونوں کا مذہب الگ الگ ہے اور ان میں مذہبی طور پر کوئی نقطۂ اتحاد موجود نہیں ہے۔

یہ ایک واقعاتی حقیقت ہی نہیں بلکہ مذاہبِ عالم کے درمیان ہزاروں سال سے کارفرما ایک مسلّمہ اصول بھی ہے جس کی بنیاد پر مذاہب ہمیشہ سے ایک دوسرے سے الگ شمار ہوتے چلے آرہے ہیں، لیکن قادیانی جماعت عملاً اس حقیقت اور اصول پر عمل پیرا ہونے کے باوجود خود کو مسلمان کہلانے پر اصرار کر کے اس اصول کی مسلسل خلاف ورزی کر رہی ہے جو مسلمانوں اور قادیانیوں کے بین موجودہ تنازعہ اور کشیدگی میں اصل وجہِ نزاع ہے۔

قادیانی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ وہ قرآن کریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہے اس لئے اسے مسلمان کہلانے کا حق ہے، لیکن یہ موقف مذاہبِ عالم کے تاریخی تسلسل میں کسی طور پر بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

آپ خود تاریخ پر نظر ڈال لیجئے یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں جب کہ عیسائی بھی ان دونوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کو بھی مانتے ہیں اس لئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

اور تورات پر ایمان رکھنے کے باوجود یہودی نہیں کہلاتے بلکہ ایک الگ مذہب کے پیروکار شمار ہوتے ہیں اسی طرح مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمیت تمام انبیاء سابقین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور تورات، زبور اور انجیل سمیت تمام سابقہ کتب وصحائف کو سچا مانتے ہیں لیکن چونکہ وہ ان سب کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کریم پر بھی ایمان رکھتے ہیں اسلئے وہ نہ یہودی کہلا سکتے ہیں نہ عیسائی بلکہ ان دونوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار تسلیم کئے جاتے ہیں، یہ مذاہب عالم کا تاریخی تسلسل ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے اور مسلمانوں کا یہ موقف اسی تاریخی تسلسل کا حصہ ہے کہ قادیانی گروہ چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور ان پر نازل ہونے والی مبینہ وحی پر ایمان رکھتا ہے اور اس ایمان کو اپنے مذہب میں شمولیت کی لازمی شرط قرار دیتا ہے اسلئے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم پر ایمان کے دعوے کے باوجود ملتِ اسلامیہ کا حصہ نہیں ہے بلکہ ایک الگ اور نئے مذہب کا پیروکار ہے۔ مذاہب عالم کے مسلّمہ اصول اور تاریخی تسلسل کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے درمیان جداگانہ شناخت اور پہچان کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ قادیانی گروہ چونکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنا ہم مذہب تسلیم نہیں کرتا اسلئے وہ ان سے اپنی شناخت الگ کرے اور الگ نام اختیار کرنے کے علاوہ مذہبی علامات اور اصطلاحات بھی الگ وضع کرے تاکہ دونوں کے درمیان جداگانہ تشخص اور امتیاز قائم ہو جائے اور کوئی فریق دوسرے کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو سکے یہی وجہ ہے کہ علماء امت نے قادیانیوں کے بارے میں اس بات سے قطع نظر کہ نبوت کے لئے دعویداروں کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ وخلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کی روشنی میں ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟ مفکر پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی تجویز پر صرف اس بات پر قناعت کر لی کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان جداگانہ مذہبی تشخص قائم کر دیا جائے اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کا پیروکار تسلیم کر لیا جائے چنانچہ پاکستان میں قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور قانونی طور پر اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مذہبی علامات واصطلاحات کے استعمال سے روک دینے کے اقدامات کئے گئے جنہیں آج قادیانیوں کے انسانی حقوق کی پامالی کا

عنوان دے کر ملّتِ اسلامیہ اور پاکستان کے خلاف مسلسل مہم چلائی جارہی ہے ۔

جناب مرزا صاحب! "انسانی حقوق" کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اصل صورت حال اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ مذہبی تشخص اور ملّی شناخت کے تحفظ کا حق دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے اور انہیں مسلّمہ طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی ایسے گروہ کو اپنا نام استعمال نہ کرنے دیں اور اپنی مذہبی اصطلاحات و علامات کے استعمال سے روکیں جو ان سے الگ مذہب رکھتا ہے اور وہ اپنا یہ جائز حق استعمال کر کے کسی پر زیادتی نہیں کر رہے اور نہ کسی کا کوئی حق پامال کر رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس قادیانی جماعت اپنے مذہب کو مسلمانوں کے مذہب سے الگ قرار دیتے ہوئے بھی اسلام کا نام اور مسلمانوں کی علامات واصطلاحات کے استعمال پر اصرار کر کے مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مجروح کر رہی ہے اور ان کے جداگانہ مذہبی تشخص کو پامال کر رہی ہے جو دنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہے ۔

قادیانی جماعت کا یہ طرز عمل مذاہب عالم کے تاریخی تسلسل اور مذاہب کے درمیان فرق و امتیاز کے مسلّمہ اصول سے انحراف ہے اور مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان موجودہ تنازعہ اور کشیدگی میں یہی اصل وجہ نزاع ہے ۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی جماعت کی دو معاصر تحریکوں کے طرز عمل کا بھی حوالہ دیا جائے ایک امریکہ کے سیاہ فام لیڈر آلیجہ محمد کی تحریک ہے جنہوں نے اسی صدی کے دوران اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا لیکن ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا اور نئی مبینہ وحی کے حوالے سے اپنی تعلیمات پیش کیں جنہیں ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے مسترد کر دیا آلیجہ محمد کے پیرکاروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے لیکن اس کے فرزند جناب وارث دین محمد نے حق کے واضح ہونے کے بعد اپنے باپ کے غلط عقائد سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ کے اجماعی عقائد کو قبول کرنے اور امت کے اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا اور آج وہ امریکہ میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کی قیادت کر رہے ہیں اور دوسری تحریک ایران کے بابیوں اور بہائیوں کی ہے جس کے

بانی محمد علی باب اور بہاء اللہ نے نبوت اور نئی وحی کا دعویٰ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی مذاہب عالم کے مسلّمہ اصول کا احترام کرتے ہوئے اپنا نام اور مذہبی شناخت مسلمانوں سے الگ کرلی اور مسلمان کہلانے یا خود کو مسلمانوں کی صف میں شامل رکھنے پر اصرار نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ مذہب کے بنیادی اختلاف کے باوجود ان کے ساتھ مسلمانوں کا اس طرز کا کوئی تنازعہ موجود نہیں ہے جس طرح کا تنازعہ قادیانیوں کے ساتھ چل رہا ہے۔

جناب مرزا صاحب! یہ ایک نظر آنے والی واضح حقیقت ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان موجودہ کشمکش کی اصل وجہ مذہب کا اختلاف نہیں بلکہ مذہبی اختلاف کے منطقی نتائج کو تسلیم نہ کرنا ہے اور امر واقعہ ہے کہ اس تسلیم نہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری قادیانی جماعت پر عائد ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کا موقف بالکل واضح ہے کہ قادیانی گروہ کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ہے اسلئے وہ مسلمانوں کا نام اور اصطلاحات استعمال کرکے اشتباہ پیدا نہ کرے اور نہ ہی مسلمانوں کی مذہبی شناخت اور تشخص کو مجروح کرے بلکہ اپنے لئے الگ نام اور علامات واصطلاحات وضع کرکے اس کشیدگی کے خاتمہ کی طرف قدم بڑھائے۔

ان گذارشات کے ساتھ میں آنجناب سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ ایک غلط اور غیر منطقی موقف پر ضد کرکے نہ خود پریشان ہوں اور نہ مسلمانوں کو پریشان کریں بلکہ بہتر بات تو یہ ہے کہ جناب وارث دین محمد کی طرح غلط عقائد سے توبہ کرکے ملّتِ اسلامیہ کے اجماعی عقائد کی بنیاد پر امت مسلمہ کے اجتماعی دھارے میں شامل ہوجائیں آپ کے اس حقیقت پسندانہ فیصلہ کا پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے خیر مقدم کیا جائے گا اور اگر یہ آپ کے مقدر میں نہیں ہے تو بابیوں اور بہائیوں کی طرح اپنی مذہبی شناخت مسلمانوں سے الگ کرلیں اور پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کا جمہوری فیصلہ قبول کرکے غیر مسلم اقلیت کا جائز اور منطقی کردار اختیار کرلیں اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ معقولیت اور انصاف کا راستہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ مغربی حکومتوں اور لابیوں کے سہارے کسی غلط اور نامعقول موقف کو مسلمانوں سے منوا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ گذارشات آپ کو مثبت اور صحیح رُخ پر سوچنے کے لئے ضرور آمادہ کرسکیں گی۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

تبصرہ نگار : عبد الحمید نعمانی

کتاب کا نام : شرح مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ۔ شارح : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند۔ صفحات : ۱۷۶ ۔ طباعت گٹ اپ خوبصورت۔ قیمت ۱۴ روپے طلبہ کے لئے خصوصی رعایت۔ ملنے کا پتہ : مرکز دعوت وتحقیق دیوبند۔

احادیث وروایات کی تفہیم اوران کے درجات کی تعیین کے لئے اصول حدیث سے واقفیت ضروری ہے اس لئے ہم تدوین حدیث کے شانہ بشانہ اصول حدیث کو بھی دیکھتے ہیں۔ اصول حدیث پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن جو اشاعت وشہرت حافظ ابن حجرؒ کی نخبۃ الفکر اور مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو ملی، وہ متعلقہ موضوع کی کسی اور کتاب کو نہیں ملی ہندوستان کے جن بڑے مدارس میں (جیسے دارالعلوم دیوبند) میں اصول حدیث داخل نصاب ہے۔ وہاں عموماً یہی دونوں کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں کچھ مدارس میں مقدمہ ابن الصلاح بھی پڑھایا جاتا ہے

زیر تبصرہ کتاب مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی انتہائی جامع اورخوبصورت شرح ہے اوراس تبصرہ نگار کے علم کی حد تک یہ پہلی شرح ہے۔ اس شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ مقدمہ کے اغلاط اورمبہم الفاظ کی تصحیح وتوضیح لمعات التنقیح (عربی) اشعۃ اللمعات (فارسی) اورشرح سفرالسعادت سے مقابلہ اور دیگر شواہد وقرائن سے کردی گئی ہے۔ طلبہ کے ذہن ومزاج کو خصوصی طور سے سامنے رکھتے ہوئے۔ ہر مسئلہ کو بہت ہی واضح اورسیدھے سادے اسلوب میں بیان کیا ہے، زبان بالکل صاف ستھری اور واضح ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اگر حدیث کی کسی قسم کی مجمل ومبہم تعریف کی ہے تو شارح مدظلہ نے توضیح وتفصیل کے ساتھ دیگر متعلقہ اقسام کو بھی اصول حدیث کی

دوسری کتابوں کی روشنی میں بیان فرما دیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اگر حضرت شیخ نے جمہور کی تعریف سے ہٹ کر تعریف کی ہے تو اس کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ طالب علمانہ تشویشات و خلجانات کو بڑی حد تک تشفی بخش طور پر دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بات کو مزید مدلل اور واضح کرنے کے ساتھ موضوع سے متعلق مطبوعہ کتب کے ساتھ قلمی مخطوط سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کام کس قدر دقت طلب اور دشوار ہے۔ اہل علم و تحقیق پر مخفی نہیں ہے۔

شرح میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پوری ایک فصل کا پورا اصل متن (عربی) دیا گیا ہے اور فصل (باب) میں جتنے امور و مسایل ہیں ہر ایک کا بہت سلیس ترجمہ اور پھر توضیح و تشریح کی گئی ہے یہ سلسلہ آخر تک بارہ فصول (ابواب برائے تفہیم) تک چلا گیا ہے۔ پیش لفظ میں شرح لکھنے کی غرض و غایت تحریر کی گئی ہے پھر صاحب مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مختصر حالات زندگی اور علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے آغاز حدیث کی تعریف اور اس کے انواع و اقسام کی تفصیلات سے کیا گیا ہے، پہلی فصل میں سند، متن اور ان کے متعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فصل میں حدیث مرسل اور تدلیس کی جو بحث آئی ہے وہ انتہائی اہم ہے تفصیلات پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ تو طلبہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اساتذہ تک بسا اوقات الجھ جاتے ہیں۔ شارح مدظلہٗ نے جو بحث و گفتگو کی ہے اس سے ہر طرح کے مغالطے اور ابہام کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

دوسری فصل میں شاذ، منکر، معلل اور اعتبار کی بحث ہے۔ مثلہٗ اور نحوہٗ اور متابع اور شاہد کا فرق بتلایا ہے۔

تیسری فصل میں صحیح اور ضعیف احادیث اور ان کے متعلقات کی بحث پر مشتمل ہے۔ چوتھی فصل میں عدالت اور وجوہ طعن کے مسایل اٹھائے گئے ہیں۔ اس فصل میں شارح مدظلہٗ نے خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اور کہنا چاہیئے کہ ہر بات کو آئینہ کر دیا ہے۔ اور زیر بحث متعلقہ مسائل کے ہر جزئے کا احاطہ کر لیا ہے۔ پانچویں فصل میں روایات میں ضبط کے تعلق سے وجوہ طعن کو تفصیل سے گنایا ہے۔ یہ بہت نازک اور دقیق بحث ہے، سوء حفظ، سیٔ الحفظ، کثیر الغفلت، کثیر الغلط، میں بڑا باریک اعتباری فرق ہے، تھوڑی سی بے توجہی سے خلط مبحث ہو جاتا ہے جضرت شارح

نے بہت واضح اور دو اور دو چار کی طرح فنی علمی پیچیدگیوں کو دور کیا ہے اور بڑی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ چھٹی فصل غریب، عزیز، مشہور اور متواتر کی تعریفات واقسام اور ان کے متعلقات پر مشتمل ہے، کتاب کی ساتویں فصل میں ضعیف اور صحیح کے مراتب سے بحث وگفتگو کی گئی ہے۔

علم حدیث کے طالب علم کے لئے ایک اہم مسئلہ امام ترمذی کی اصطلاحات کی تفہیم کا ہے اس کے پیش نظر آٹھویں فصل میں اصطلاحاتِ ترمذی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بسا اوقات حضرت امام ترمذی ایک روایت کے اوصاف صحیح حسن غریب ایک ساتھ بیان کر دیتے ہیں، اس صورت میں ایک روایت کا بیک وقت متعدد ومختلف درجات کا حامل ہونا ثابت ہوتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس اشکال واعتراض کا دفعیہ حضرت شارح نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

نویں فصل میں صحیح، حسن اور ضعیف روایتوں سے استدلال واحتجاج کی بحث ہے۔ صحیح اور حسن سے استدلال واحتجاج کی بات تو صاف ہے، لیکن ضعیف روایتوں سے استدلال واحتجاج میں بہت زیادہ مغالطہ ہے۔ اور عموماً بہت سے پڑھے لکھے علما بھی یہ مطلق انداز میں کہہ دیتے ہیں کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف روایت کا بیان کرنا جائز ہے لیکن بات ایسی نہیں ہے نہ تو یہ ائمہ محدثین کے نزدیک متفق علیہ ہے اور نہ ہی مطلق ہے بلکہ مشروط ہے زیر تبصرہ کتاب میں متعلقہ مسئلے کی قدرے تفصیلی بحث موجود ہے۔

دسویں فصل میں صحیح بخاری اور صحیح احادیث کے درجات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ضمناً تمام متعلقہ امور کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے۔ گیارہویں فصل میں بتایا ہے کہ حضرت امام بخاری اور امام مسلم نے صحیح روایتوں کا احاطہ واستیعاب نہیں کر لیا ہے بلکہ دیگر کتب احادیث میں ہی صحیح روایتیں موجود ہیں۔ اس تعلق سے شارح مدظلہ نے ایک مستقل عنوان کے تحت ۹ / صفحات میں بتایا ہے کہ صحیحین کے علاوہ اور کون کون سی کتب احادیث ہیں جن کے مصنفین نے صحیح حدیثوں کی تخریج کا اہتمام کیا ہے۔ لگے ہاتھوں شارح مدظلہ نے ایسے محدثین کا مختصر تعارف اور حالات زندگی بھی بیان کر دیئے ہیں۔

(بقیہ صـ۱۱ پر)

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع [illegible]
کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے [illegible]
[illegible] ں کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور [illegible]
[illegible] جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی مجبین
و مخلصین [illegible] رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے
بہتر ہے کہ ایک [illegible] رتبہ اچھی رقم لگا دی جائے۔ اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کا [illegible]
[illegible] نجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے [illegible]
[illegible] صوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید
[illegible] ھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد [illegible]

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس
[illegible] کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی
[illegible] ں مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے
اس کار خیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اسکی ترغیب دی [illegible]
اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی [illegible]
[illegible] ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 6 0076 ج

اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر [illegible]: (حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۲	فی شمارہ -/۶	سالانہ -/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم - دیوبند، سہارنپور یوپی

سالانہ بدل اشتراک:

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰

PH. NO. 22420

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

دسویں صدی ہجری کا آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے شروع کا زمانہ ہندوستان میں اسلام اور حامیانِ اسلام کیلئے انتہائی نازک شمار کیا جاتا ہے جبکہ مغل تاجدار جلال الدین اکبر (۹۶۳ = ۱۰۱۴) نے شہنشاہیت کی ترنگ اور عقلیت کے نشہ میں عقل وہوش سے بے نیاز ہوکر "دینِ اسلام" کے متوازی "دینِ الٰہیہ" کے نام سے ایک جدید مذہب کی تحریک برپا کی۔

دربارِ اکبری سے منسلک ایک ثقہ عالم اور مستند مؤرخ "ملّا عبدالقادر بدایونی" اس جدید مذہب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اکبر کا حال یہ تھا کہ جب اس کے سامنے کسی معاملہ سے متعلق شرعی ثبوت پیش کئے جاتے تو برہم ہوکر یہ کہتا تھا کہ یہ سب ملاؤں کی باتیں ہیں مجھ سے تو عقل وحکمت ہی کی باتیں بیان اور دریافت کی جائیں (منتخب التواریخ ص۳۰۰) اس عقلیت پرستی کے دور میں عام طور پر یہ بات مشہور کردی گئی تھی کہ دین کا مدار عقل پر ہے نقل پر نہیں ہے۔" (م ص۲۱) مؤرخ بدایونی نے اس سے بھی خطرناک روش کی اطلاع دی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ برخود غلط مجتہد اور امام وحی الٰہی کو محال قرار دیتا۔ غیب اور عالم غیب سے متعلق ارشاداتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی برملا تکذیب کرتا اور فرشتوں، جنات، معجزات، بعث بعد الموت، حساب کتاب اور ثواب عذاب کا کھلے لفظوں میں انکار کرتا تھا (ص۲۰۰) اس الحاد وزندقہ میں صرف اکبر ہی تنہا نہیں گرفتار تھا بلکہ اس کے ارد گرد رہنے والوں میں اکثر لوگوں کا حال یہی تھا۔ معجزاتِ نبوی کے ساتھ استہزاء کی کیفیت کو ملّا بدایونی نے یوں بیان کیا ہے کہ "بھرے دربار میں ایک پیر پر کھڑے ہوکر معراجِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ جب میں اپنا دوسرا پیر اٹھاکر کھڑا نہیں رہ سکتا تو راتوں رات ایک شخص آسمان سے اوپر کیسے پہونچ گیا، پھر خدا سے باتیں بھی کیں اور جب واپس ہوا تو بستر تک گرم تھا" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مذاق واستہزاء کا یہی معاملہ شق القمر اور دیگر معجزات کے ساتھ بھی تھا (ص۲۱۰) اکبر کے اس سطحی طریقِ استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدعیانِ عقل کی عقل وفہم کو کس طرح زائل فرمادیتے ہیں۔

ائمہ دین اور مجتہدینِ اسلام کی توہین وتحقیر برسرِ عام کی جاتی تھی اور انھیں فقیہ کور، رجعت پسند،

رفتارِ زمانہ سے ناواقف، خشک ملّا اور متعصب جیسے اہانت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ دربار اکبری کا ممتاز محقق، دینِ الٰہیہ کا مرتب ابوالفضل فقہاءِ کرام کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کردیا کرتا تھا کہ ان مٹھائی فروخت کرنے والوں، جوتا گانٹھنے والوں اور چمڑا فروشوں کی بات کیسے مان لوں (صنہ۲) یہ ائمہ فقہ شمس الدین عبدالعزیز بن احمد الحلوانی متوفی سنہ ۴۹۸ھ اور شیخ احمد بن عمر خصاف متوفی سنہ ۲۶۱ھ کی نسبتوں کی طرف تعریض ہے۔

دینِ اسلام کی بیخ کنی کی ان عملی کوششوں کے ساتھ علمی طور پر اسلامی عقائد و اعمال کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے آج کل کی اصطلاح میں اسلام کا آزاد سائنٹفک مطالعہ کے لئے قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں۔ اس کمیٹی میں اسلامی عقائد اور مسلمات سے متعلق عقل کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے اور اسلامی معتقدات کا مذاق اڑایا جاتا اگر کسی ممبر کی ایمانی غیرت بیدار ہوجاتی اور وہ ان فیصلوں پر اختلافی نوٹ لکھنا چاہتا تو اسے روک دیا جاتا تھا۔ صنہ۲۱۷

غرضیکہ ایک عظیم تحریک تھی جو ایک مطلق العنان، خودسر بادشاہ کی سرپرستی میں دینِ اسلام کے خلاف چلائی جارہی تھی اور مظلوم اسلام انتہائی کس مپرسی کے ساتھ اس کی مخالفانہ اور معاندانہ یورشوں کو برداشت کررہا تھا، لیکن وہ اسلام جو دنیا میں سربلندی کیلئے برپا کیا گیا تھا آخر کب تک اس کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں رہتا۔ الف ثانی کے اس محرف اعظم کی دینِ اسلام میں تحریفات دیکھ کر سرہند میں آباد خانوادۂ فاروقی کے ایک فرزند رشید شیخ احمد فاروقی کی رگِ فاروقیت پھڑک اٹھی اور وہ اپنی تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود برصغیر کی اس سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے۔ ابتدا میں اگرچہ چندے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن آخر میں دنیا نے دیکھ لیا کہ محرف الف ثانی کے مقابلہ میں فتح و کامرانی مجدّد الف ثانی ہی کے حصہ میں آئی۔ اور جس گھر سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کی تحریک چلی تھی اسی گھر میں اورنگ زیب عالمگیر جیسا اسلام دوست اور شاہی میں فقیری اداؤں کا رمز شناس بادشاہ پیدا ہوا، جس نے اسلامی حمیت کا قابلِ ستائش مظاہرہ کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کیا کہ "جدّ ما اکفر بود"

تین چار صدی تک کنجِ گمنامی میں پوشیدہ رہنے کے بعد عقلیت پرستی کا یہ اکبری فتنہ پھر سر

اٹھا رہا ہے اور کبھی قادیانیت کا لباس اوڑھ کر رسالت کے مقدس عقیدہ میں رخنہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور کبھی نیچریت کے نام سے غیب اور متعلقاتِ غیب، جن، فرشتہ، دوزخ، جنت اور حساب کتاب کے عقیدہ سے مسلمانوں کو منحرف کرنا چاہتا ہے، اور کبھی بہائیت کے عنوان سے ارکانِ اسلام اور دین کے ستون پر کلہاڑا چلاتا ہے اور کبھی شیعیت مودودیت کے نام سے امت کے رشتے کو سلف صالحین اور صحابہ کرام سے کاٹنے کی ناروا کوشش کرتا ہے۔ یہ سارے کے سارے فتنے اپنے نام و لباس کے اعتبار سے اگرچہ مختلف ہیں لیکن ان سب کی روح اور آئیڈیل فتنۂ اکبری ہی ہے۔

الحاصل شراب وہی پرانی ہے لیکن پیمانے بدل بدل کر پیش کئے جا رہے ہیں، فتنہ تو وہی قدیم ہے مگر اسے مختلف رنگ برنگ لباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ اربابِ بصیرت جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی معرفت کی دولت سے نوازا ہے وہ تو پہلی ہی نظر میں اصل حقیقت کو تاڑ لیتے ہیں اور انھیں دیکھ کر برملا پکار اٹھتے ہیں کہ

بہر رنگ کہ خواہی جامہ پوشی
من انداز قدت را می شناسم

لیکن جنھیں دین کی پوری بصیرت حاصل نہیں ہوتی وہ بسا اوقات ظروف کی جدت اور لباس کی تراش و خراش سے متأثر ہو کر مبتلائے فریب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حضراتِ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان فتنوں کی حقیقت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کریں اور جس طرح حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے ان فتنوں کے مرجع و منشاء یعنی فتنۂ اکبری کا مقابلہ ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر کیا اور اس سلسلے میں ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے کیا، آج اسی جرأت ایمانی کے ساتھ ہر اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ان موجودہ فتنوں کا مقابلہ کریں اور ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے سدِ سکندری بن کر کھڑے ہو جائیں۔

اہل تصوف اور جذبہ جہاد

از: ڈاکٹر عبد المعید ۔ کھیری باغ روڈ ۔ مئو ۲۷۵۱۰۱

عام طور پر تصوف کے بارے میں یہ بے اصل بات مشہور ہے کہ یہ تعطل دبے عملی حالات سے شکست خوردگی ۔ دنیا سے بے گانگی اور میدان جہد وعمل سے فرار کا نام ہے ۔ لیکن اگر ہم تعصب اور گروہی عصبیت سے بے نیاز ہو کر تاریخ تصوف کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کے خلاف بے شمار شہادتیں ملیں گی کہ یہ حضرات نہایت ہی فعّال اور ابوالوقت تھے اور تنہا طاغوتی طاقتوں اور باطل نظریات کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئے اور زمانے کا دھارا موڑنے میں کامیاب رہے ۔ اُن کے پیش نظر ہمیشہ خداوند قدوس کا یہ فرمان رہا کہ :

ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسہم واموالہم بانّ لہم الجنّۃ ۔

(بے شک اللہ نے مومنین کی جان اور مال کو جنت کے عوض میں خرید لیا ہے ۔)

اس لئے انھوں نے کبھی بھی اپنے جان اور مال میں اپنا حق نہیں سمجھا اور اُسے اللہ کی امانت سمجھتے ہوئے قربان کر دینے کے بعد بھی انہیں ہمیشہ یہی حسرت رہی کہ ؎

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مشہور امریکن صحافی رابرٹ جاکسن نے "مردِ قرآنی" میں مجاہد جلیل شیخ حسن البناء شہیدؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

"میں نے ان سے تصوف اور صوفیہ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ بھی اسلام کا جزء ہے؟ یہ سوال میں نے ان سے اس لئے کیا کہ بعض رسالوں میں ایک مضمون شائع ہوا کہ شیخ مغرب کے طریقہ شاذلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ خالص تصوف جو غلو سے پاک ہو وہ تو اسلام کی اصل روح ہے۔ یہ اسلام کا وہ درجہ ہے کہ مخلص وحق پرست ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی تصوف انسان کے اندر جہاد ومقابلہ کی روح اور اپنے فکر و نظریہ کو اسلامی حقائق کے سامنے ہیچ سمجھنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے ساتھی اس مقام کو حاصل کرلیں، اخوانیوں کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ مظاہر تصوّف کے پس پردہ جو گہری حقیقتیں پوشیدہ ہیں ان کو اپنائیں اور دعوت میں شامل کریں[۱]"

چنانچہ شیخ حسن البناءؒ کے اندر سرفروشی، جاں بازی، جہاد وقربانی اور تجدید وانقلاب، فتح وتسخیر کا جو جذبہ پیدا ہوا وہ ان کی روحانی وقلبی قوت کا نتیجہ تھا جو اہل تصوف کی صحبت اور ان کے طریق پر مدت مدید تک چلنے کے بعد ہی پید ہوا تھا۔

شیخ حسن البناءؒ اپنی بیعت کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میں سراپا شوق، سراپا عقیدت اور سراپا انتظار تھا کہ کب سید عبدالوہاب الحصافی .... تشریف لائیں اور میں ان کی زیارت کروں اور ان سے طریقت اور آداب طریقت سیکھوں[۲] ..... رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ کی چار تاریخ تھی نماز عصر کے بعد ملاقات ہوئی ــ وہ اتوار کا دن تھا۔ اس ملاقات میں میں نے سید عبدالوہابؒ سے سلسلہ حصافیہ شاذلیہ کی بیعت لی۔ انہوں نے مجھے اس سلسلے کے تمام اوراد اور وظائف کی اجازت مرحمت فرمائی۔"[۳]

---

[۱] شیخ حسن البناء ص۴۶۔ [۲] حسن البناء شہید کی ڈائری ص۱۲۵۔ [۳] ایضاً ص۱۲۶-۱۲۷

شیخ حسن البنار ان اوراد و وظائف پرتا زیست مستقیم رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"ان کے خواص اور معتمدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اوراد اور معمولات کے پابند رہے۔ اخوان کی پانچویں مؤتمر میں انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے:

ایک ایسی جماعت جس میں سلف کی دعوت، اہل سنت کا طریقہ، تصوف کی حقیقت، سیاست، ریاضت علم و ثقافت، اقتصادی تعاون اور اجتماعی فکریں جمع ہیں"۔ [۱]

تصوف کے بارے میں شیخ حسن البنار تحریر فرماتے ہیں:

"علوم تصوف کی یہ قسم جسے میں "علوم تربیت وسلوک" کا نام دیتا ہوں۔ بلاشبہ صوفیار کرام نے اس علم کی بدولت قلوب کے علاج واصلاح اور تہذیب وتزکیہ میں وہ اونچا مقام حاصل کرلیا ہے کہ دوسرے ماہرین تربیت واصلاح اس مرتبے تک ہرگز نہیں پہنچ سکے۔ صوفیار نے اس اسلوب کی مدد سے لوگوں کو اللہ کے بتائے ہوئے فرائض ادا کرنے۔ اس کے نواہی سے اجتناب کرنے اور اس کے ساتھ سچی توجہ رکھنے کا ایک عملی نمونہ اور منصوبہ بتایا اور اس پر چلایا"۔ [۲]

مزید فرماتے ہیں:

"اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تصوف وطریقت بہت سے ممالک میں اسلام کی اشاعت اور اسلام کو ایسے دور دراز گوشوں تک پہنچانے کا بہت بڑا عامل رہا ہے جہاں صوفیار کرام کی کوششوں کے بغیر اسلام نہ پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً افریقہ کے مختلف شہروں اور صحراؤں میں اور وسطا فریقہ میں اسلام کا داخلہ اہل تصوف کی بدولت ہی

---

[۱] تزکیہ واحسان ص ۱۲۲۔ [۲] حسن البنار کی ڈائری ص ۱۳۱۔

ہوا بلکہ آج تک ہو رہا ہے۔ ایشیا کے بہت سے ممالک میں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے۔ نیز یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ تربیت و سلوک کے بارے میں تصوف کے قواعد و ضوابط پر عمل در آمد نفس و قلب پر بڑا مضبوط اثر پیدا کرتا ہے جو کسی دوسرے انسان کے کلام کو نصیب نہیں ہے۔" [1]

تصوف کے عنوان کے تحت آخر میں فرماتے ہیں:

"اگر ازہر (جامعہ ازہر) کی علمی طاقت اور سلسلہ صوفیاء کی روحانی طاقت اور اسلامی تحریکوں کی عملی طاقت تینوں متحد و ہم آمیز ہو جائیں تو یہ قوم بے نظیر امت کا روپ دھار لیتی۔ ایسی امت جو دوسروں کی رہنما ہوتی نہ کہ دوسروں کی پیروکار، دوسروں کی قائد ہوتی نہ کہ دوسروں کی مطیع، دوسروں پر اثر انداز ہوتی نہ کہ دوسروں سے اثر پذیر اور وہ امت اس موجودہ جمعیت کو سیدھی راہ سے ہمکنار کرتی۔" [2]

حسن البناؒ کو اپنے دام فریب میں پھانسنے کے لئے سامراجی قوتوں نے بہت کوشش کیں لیکن اس مرد حق اور مجاہد جلیل نے کبھی بھی اُن سے دین و ایمان کا سودا کرنا گوارا نہیں کیا۔ امریکن صحافی رابرٹ جاکسن نے ان کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے:

"میں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ حسن البناء عورت اور جاہ و مال کے پھندے میں نہ آسکے۔ اور یہی وہ تین پُرکشش چیزیں اور خاص حربے تھے جنکو سامراجیوں نے مجاہدین پر سب سے زیادہ استعمال کیا۔ مگر اس عقابی روح رکھنے والے شخص کو دام فریب میں لانے کی ساری تدبیریں ناکام رہیں۔ ان سارے فتنوں اور آزمائشوں سے بچنے میں اُن کے سچے تصوف اور فطری زہد کو بڑا دخل تھا۔" [3]

یہ تفصیل اس لئے کی گئی کہ آج معاصر دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تحریک ہے اور عالم عربی کے لئے تو وہ احیاء دین اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے جس کی قربانیاں اور جذبۂ جہاد اظہر من الشمس ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین کے دوران اخوان کی رضاکار فوجوں نے عربوں کی طرف

---

[1] حسن البناء کی ڈائری ص۱۴۰۔ [2] ایضاً ص۱۴۳۔ [3] شیخ حسن البناء ص۲۳-۲۴۔

سے جنگ کرنے والی باقاعدہ افواج سے زیادہ ثابت قدمی اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس تحریک نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے جو اس کے بانی شیخ حسن البنا شہیدؒ کا اخلاص وللہیت، ان کا روحانی علو مرتبت، صفائی باطن، تہذیب نفس اور ان کی ریاضت وعبادت ہی کے نتائج ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام میں جن حضرات نے بھی مجددانہ اور مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں اُن میں سے اکثر روحانی اعتبار سے نہایت ہی بلند مقام پر فائز تھے۔ گذشتہ صدی پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو پورے عالم اسلام میں یہی حضرات علَم جہاد بلند کئے ہوئے نظر آئیں گے۔ سوڈان میں محمد احمد سوڈانی جو مہدی سوڈانی کے لقب سے مشہور رہیں۔ امیر عبدالقادر الجزائری مجاہد الجزائر، سید احمد شریف السنوسی (امام سنوسی)۔ امام شامل مجاہد داغستان ترکی میں بدیع الزماں سعید نورسی، ہندوستان میں سید احمد شہید اور ان کے رفقاء، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ تصوف وجہاد کی درخشاں مثالیں ہیں۔

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک عظیم مصلح بھی تھے انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ اپنی تمام زندگی احکام اسلام کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدی سوڈانی تصوف کے سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہوگئے۔ انہوں نے کئی سال سے دریائے نیل کے ایک جزیرے آبا (ABA) میں رہائش اختیار کرلی تھی اور یہیں سے انہوں نے اپنی تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک ۱۹ جون ۱۸۸۰ء کو اس وقت شروع ہوئی جب مہدی سوڈانی نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب وسنت کی بالادستی قائم کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس مقصد کے لئے تیار رہنا چاہئے اور یہ کہ ان کے پیروؤں

کو چاہئے کہ وہ ہجرت کر کے جزیرۂ آبا میں آجائیں۔[1]

مہدی سوڈانی کے پیروؤں نے جو درویش کہلاتے تھے دو سال کے اندر اندر پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریز قابض ہو چکے تھے چنانچہ مصری حکومت نے جو انگریزوں کی محکوم تھی بغاوت کچلنے کے لئے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں لیکن گورڈن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء میں خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔

مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل اُم درمان کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ مہدی سوڈانی نے حکومت سنبھالتے ہی اصلاحات شروع کر دیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے۔ ان لوگوں کو جن کو سابقہ حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ اُن کو ان کی زمینیں واپس کر دی گئیں۔ ان رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور عورتوں کو پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ شادی بیاہ پر فضول خرچیوں کو روکا گیا۔ مہدی سوڈانی اپنے پیروؤں سے حسب ذیل حلف لیتے تھے۔

"ہم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے زنا نہیں کریں گے اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خیرباد کہہ دیں گے اور اللہ کی خوشنودی کے لئے کام کریں گے۔ اور جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے۔"

مہدی سوڈانی کا جانشین خلیفہ عبداللہ (۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۸ء) حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہو گیا۔ اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچنر کی قیادت میں ۱۸۹۸ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔

---

[1] ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ص ۵۷۱-۵۷۲ از ثروت صولت۔

درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن جدید اسلحہ سے لیس فوج کا وہ مقابلہ نہ کرسکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر ۱۸۹۹ء میں جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر برطانوی تسلط قائم ہوگیا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں مشہور درویش سپہ سالار عثمان دغنہ جس نے مہدی سوڈانی کے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا تھا گرفتار ہوگیا۔ سنجر نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوکر مہدی سوڈانی کی قبر کھدوادی اور ان کی ہڈیاں جلاڈالیں۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء میں درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن وہ کچل دی گئیں۔ انگریزوں نے مہدی سوڈانی کے پیروؤں کو اپنے دور میں بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اب سوڈان میں مہدی سوڈانی کو سوڈان کی تحریک بیداری کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ [1]

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی تاتاریوں کی یورش ہوئی تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ سے جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے۔ وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے۔ [2] جس کے تزکیہ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حمیّت، کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کردی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے اور نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مؤرخین نے ان کی شجاعت، عدل وانصاف، نرمی ومہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔ یہ مجاہد عملاً و ذوقاً صوفی و شیخ طریقت تھا اور امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:

"امیر عبدالقادر پورے عالم وادیب، عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے۔ صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صوفی تھے۔ تصوف میں ان کی ایک کتاب "المواقف" ہے۔ وہ اس سلسلہ کے یکتائے روزگار لوگوں میں تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہوسکے۔ [3]

---

[1] ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ص ۵۲۲-۵۲۳۔ [2] مہدی محمد احمد سوڈانی کا تذکرہ اوپر آچکا۔
[3] تزکیہ واحسان ص ۱۱۴-۱۱۵۔

دمشق کے زمانہ قیام کا تذکرہ اور ان کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"روزانہ فجر کو اُٹھتے۔ صبح کی نماز اپنے گھر کے قریب کی مسجد میں جو محلہ "العمارہ" میں واقع ہے پڑھتے۔ سوائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا۔ تہجّد کے عادی تھے اور رمضان میں حضرات صوفیہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے۔ برابر سلوک و تقویٰ اور اخلاق فاصلانہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا"۔ [1]

۱۸۱۲ء میں جب طاغستان پر روسیوں کا تسلّط ہوا تو ان کے مقابلہ میں نقشبندی شیوخ تھے۔ جنہوں نے علَم جہاد بلند کیا۔ اور اس کا مطالبہ اور جد وجہد کی کہ معاملات و مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں۔ اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے۔

امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں:

"اس جہاد کے علمبردار طاغستان کے علماء اور طریقۂ نقشبندیہ کے (جو طاغستان اور چیچینیا میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہنچتا ہے جو خطابات، عہدہ واقتدار، جھوٹی قیادت اور سرداری، عیش ولذت اور تمغوں اور مرتبوں کے لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سمجھ کر انھوں نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت مطہرہ کے مطابق ہو نہ کہ قوم کی جاہلی عادات کے۔ اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے جن کو روسی غازی ملّا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علوم عربیہ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارے میں ان کی ایک تصنیف (اقامۃ البرھان علی ارتداد عرفاء طاغستان) (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔ [2]

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے اور ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے۔ اس

---

[1] تزکیہ واحسان ص ۱۱۵۔ [2] ایضاً ص ۱۱۶-۱۱۷۔

کے بعد شیخ شاملؒ نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی۔

امام شاملؒ نے پچیس سال تک داغستان کے ہر حصہ سے روسیوں کو نکال دیا لیکن روسی بار بار حملہ آور ہوتے تھے اور امام شامل کے لئے ان کی کثیر تعداد فوجوں کا جو بہترین اسلحہ سے لیس ہوتی تھیں، تنہا مقابلہ ممکن نہیں رہا۔ انہوں نے سلطنتِ عثمانیہ اور برطانیہ سے مدد حاصل کرنی چاہی۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر کار انہوں نے ۲۵ راگست ۱۸۵۹ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔ موجودہ چیچینیا میں جہاد کے بانی اور پیش رو آپ ہی ہیں۔

امام شامل کی عظمت محض ان کے دلیرانہ جنگ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ انکی سیاسی بصیرت سوجھ بوجھ، انتظامی صلاحیت اور کردار کی بلندی نے عبدالقادر الجزائری اور ٹیپو سلطان کی طرح ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کا زمانہ داغستان کی تاریخ میں "شریعت کا دور" کہلاتا ہے۔ امام شامل تصوف کے نقشبندی سلسلے کے سربراہ تھے۔ ان کے مرتب کردہ انتظامی اور قانونی ضابطے "نظام شامل"، کہلاتے ہیں، اس کے تحت داغستان ۳۲ رانتظامی اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ انتظامیہ اور عدلیہ الگ الگ تھے۔ ہر ضلع کا مفتی عدالت کے محکمہ کا ذمہ دار تھا اور ضلع کا حاکم ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ ہر مفتی کے تحت چار قاضی ہوتے تھے۔ اگر کسی معاملہ کو قاضی طے نہ کر سکتے تھے، تو وہ مفتی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور مفتی اس معاملہ کو امام شامل یا مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرتا تھا جس کو دیوان کا نام دیا گیا تھا۔ امام شامل نے احتساب کا محکمہ بھی قائم کیا تھا جس کے ذریعہ عہدے داروں پر نگرانی رکھی جاتی تھی۔ فوجیوں کی تنظیم بھی جدید ترین طرز پر کی گئی تھی۔ فوجی تربیت کے لئے جو مراکز قائم کئے گئے تھے ان میں قید کئے جانے والے روسی افسر تربیت دیتے تھے۔ [1]

تصوف وجہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی

---

[1] ملت اسلامیہ مختصر تاریخ ص۴۳۴ حصہ دوم۔

کی ہے وہ تصوف کے سلسلہ خضریہ کے شیخ تھے۔ بقول محترمہ مریم جمیلہ کے "سنوسی تحریک کی داستان دور حاضر کی اسلامی تاریخ کا اندوہناک المیہ ہے۔ المیہ اس لئے کہ یہ تحریک جن نظریات کی علمبردار تھی اگر وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے تو اس کا نتیجہ سارے عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں روحانی نشأۃ ثانیہ کی صورت میں نکلتا"۔[1]

اطالیوں نے برقہ و طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا۔ نوآبادیوں اور آبادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا یہ اطالیوں کی ناتجربہ کاری ہے اس مہم میں ممکن ہے تین مہینہ لگ جائیں۔ لیکن نہ پندرہ دن نہ تین مہینہ، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کر سکے۔ یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد الشریف السنوسی کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے نہیں دیا۔ امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامہ نے ثابت کر دیا کہ طریقہ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں جو سنوسی رکھتے ہیں۔[2]

بدیع الزماں سعید نورسی جنہیں اللہ تعالیٰ نے مصطفےٰ کمال اتاترک کے بدنام عہد حکومت کے مروجہ مفاسد اور برائیوں سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو عطا کیا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کے ۸۶ سال میدان جہاد اور قید و بند کی آزمائشوں میں گذار دیئے۔

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا تو بدیع الزماں کی مٹ بھیڑ ایک سیاسی تنظیم مجلس اتحاد و ترقی سے ہوئی۔ اس جماعت نے اگرچہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے لیکن درحقیقت ان کی قیادت فریمیسنوں کے ہاتھ میں تھی۔ بدیع الزماں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور اتحاد محمدی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ انہوں نے اپنی دعوت کو فروغ دینے کے لئے مضامین لکھے۔ لوگوں کو قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور اسے

---

[1] اسلام ایک نظریہ ایک تحریک ص۱۷۳۔ [2] تزکیہ و احسان ص۱۱۷۔

نہ چھوڑنے کی تاکید کی۔ مجلس اتحاد و ترقی کے رہنما اس کو برداشت نہیں کر سکے۔ اور مارچ ۱۹۱۹ء میں بدیع الزّماں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے ۱۹ رفیق پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ جس عدالت نے ان لوگوں کو سزائے موت دی اُسی نے بدیع الزّماں کے مقدمے کی سماعت کی۔ ۱۵ اور رفقاء کو سزائے موت دینے کا اعلان کرنے کے بعد جج خود پاشا بدیع الزّماں کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا تم بھی اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہو؟ بدیع الزّماں نے جواب دیا: "اگر مجھے ایک ہزار بھی زندگیاں مل جائیں تو میں انہیں اسلام کی خاطر بصد مسرّت قربان کر دوں گا۔ میں ہر اُس چیز کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ عملاً میں عالم برزخ میں سفر آخرت کے لئے پابرکاب کھڑا ہوں۔ میں اپنے ان ساتھیوں سے جا ملنا چاہتا ہوں جو پھانسی پاکر تمہارے ظلم و ستم سے نجات پا چکے ہیں۔ میں آخرت کی زندگی کے لئے بے تاب ہوں"۔ بدیع الزماں پر مقدمہ چلا لیکن عوام کے شدید احتجاج پر فوجی عدالت نے انہیں بری کر دیا۔ [1]

پہلی جنگ عظیم چھڑی تو بدیع الزماں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اُنہوں نے مختلف میدانوں میں سرفروشی اور بہادری کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جلد ہی ترقی دے کر افسر بنا دیا گیا۔ بدیع الزماں اپنے کیمپ میں قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر درس دیا کرتے تھے۔ ایک جنگ میں ان کی بٹالین کے تقریباً تمام جوان شہید ہو گئے۔ وہ اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایک نہر میں چھپ گئے۔ ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، بایں ہمہ وہ ۳۳ گھنٹے تک رائفلیں ہاتھ میں لئے ڈٹے رہے۔ آخر کار روسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

ایک روز روسی جنرل نے جنگی قیدیوں کے کیمپ کا دورہ کیا۔ جونہی وہ پہنچا سارے قیدی اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور اُسے سلامی دی لیکن بدیع الزماں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ جنرل نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ بدیع الزماں

---

[1] اسلام ایک نظریہ ایک تحریک ص ۲۲۱ - ۲۲۲۔

نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا: "ہاں میں خوب جانتا ہوں. تم نکولاس نکولاوش ہو. لیکن تم جو کچھ بھی ہو مجھے کیا؟ میں ایک مسلمان ہوں، میرے نزدیک مسلمان کافر سے برتر و فائق ہے. میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، تمہاری تعظیم نہیں کر سکتا۔" بدیع الزماں کا کورٹ مارشل ہوا اور فوجی عدالت نے سزائے موت دینے کا حکم دیا. جب روسی انہیں گولی مارنے کے لئے لے گئے تو انہوں نے درخواست کی کہ پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے. ان کے بعض دوستوں نے کہا کہ وہ روسی جنرل سے معافی مانگ لیں. لیکن اُن کا صرف ایک جواب تھا: "شاید یہ سزا مجھے ابدی جنت میں پہنچا دے۔"

آخر روسی جنرل اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے معذرت چاہی، اور اُس نے کہا:

"میں آپ کی جرأت اور اپنے مذہب کے ساتھ مخلصانہ وابستگی سے بے حد متاثر ہوا ہوں، چنانچہ آپ کی سزا منسوخ کی جاتی ہے۔" [1]

بدیع الزماں ڈھائی برس سائبیریا میں مقید رہے۔ پھر فرار ہو گئے۔ اور پیٹرزبرگ، وارسا اور ویانا کے راستے استنبول پہنچ گئے جہاں علماء و مشائخ اور عامۃ المسلمین نے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا. ۱۹۲۰ء میں ترکی میں انقلاب آیا تو مصطفےٰ کمال اتاترک نے انہیں انقرہ آنے اور یومِ استقلال میں شریک ہونے کی دعوت دی. بدیع الزماں انقرہ پہنچے، لیکن یہ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہوئے کہ مصطفےٰ کمال میں ایمان و کردار کا شائبہ تک نہیں. چنانچہ تقریب میں شرکت کئے بغیر انقرہ سے چلے گئے۔ مصطفےٰ کمال نے انہیں اناطولیہ میر واعظ اور دار الحکمت یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کا رکن نامزد کر دیا. رہائش کے لئے ایک عالی شان عمارت دی لیکن انہوں نے سب ٹھکرا دیا اور وان کے نزدیک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے. یہاں انہوں نے گرد و نواح کے نوجوانوں کو اکٹھا کر کے قرآن کی تعلیم دینی شروع

---

[1] اسلام ایک نظریہ ایک تحریک صـ ۲۲۴.

کر دی۔ ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ان کے گرد جاں نثاروں کا ایک گروہ جمع ہو گیا۔ جلد ہی حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا اور ان کے ساتھیوں کو بھی حوالہ زنداں کر دیا گیا۔ بدیع الزماں کو آٹھ سال کے لئے بارلا جیل بھیج دیا گیا۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے کڑے پہرے اور قید تنہائی میں گذارا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیل کے پہریداران سے متاثر ہونے لگے اور آخر اُن کے پُرجوش مرید بن گئے۔ یہیں انہوں نے قرآن کی تفسیر "رسالہ نور" کے عنوان سے لکھنا شروع کی۔ پہریداروں کے ذریعہ یہ رسائل جیل کی چہار دیواری کے باہر پہنچے اور لوگ اس کی نقلیں اُتار اُتار کر چاروں طرف پھیلانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں قلمی پمفلٹ دیہات، قصبات، شہروں، اسکولوں کالجوں اور سرکاری دفاتر میں پہنچ گئے۔

سات سال کے بعد رہا ہوئے تو اسپارٹا چلے گئے اور وہاں کچھ مدت تک تن تنہا رہے یہاں تک کہ انہیں ۱۲۰ مریدوں کے ساتھ دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی ہے۔ عسکی شہر کی فوجداری عدالت میں اُن پر مقدمہ چلا گیا۔ بدیع الزماں نے اپنی صفائی میں ایک طویل بیان دیا۔ آخر میں فرمایا کہ:

"میرا ایک جرم یہ بھی ہے کہ میں صوفی ہوں۔ حالانکہ انسان بغیر صوفی بنے تو جنت میں داخل ہو سکتا ہے لیکن اللہ پر ایمان لائے اور اُس کے قوانین کی پابندی کئے بغیر آخرت کی اُس مسرت بخش زندگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔"

چند سال کے بعد بدیع الزماں پر بغاوت کے الزام میں آفیوں کی عدالت میں پھر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جلد ہی عدالت عالیہ نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ بدیع الزماں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

"میری ساری زندگی جنگ کے میدانوں، جنگی قیدیوں کے کیمپوں، جیل خانوں اور عدالتوں میں پے در پے پیشیاں بھگتنے میں گذری مجھے دنیاوی مسرتوں سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ رسائل نور لکھ کر میں نے پانچ لاکھ مسلمانوں کو عذاب آخرت سے

بچا لیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اگر زمین قرآن کے ماننے والوں سے خالی ہو تو میں جنت میں رہ کر بھی مضطرب اور پریشان رہوں گا۔ اس کے برعکس اگر میں دیکھوں کہ میرے ملک میں دین حق محفوظ و سلامت ہے تو آتش جہنم میں جلتے ہوئے بھی میں مسرور و شادماں رہوں گا۔"

اس طرح اسلام کی راہ میں جلاوطنی اور قید و بند کے مصائب سہتے ہوئے ۲۷ رمضان ۱۳۷۹ھ کو بدیع الزماں کی مجاہدانہ زندگی ختم ہو گئی ۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ہندوستان میں تصوف اور جہاد کی درخشاں مثال حضرت سید احمد شہید بریلوی کی ذات با برکت اور ان کی جماعت ہے۔ پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد سکھوں کو پنجاب میں عروج حاصل ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کو ان کی شورش دبانے کے لئے بار بار پنجاب آنا پڑا لیکن جیسے ہی وہ واپس جاتا سکھ میدان میں آجاتے۔ احمد شاہ ابدالی کے لڑکے زماں شاہ نے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۹ء) کو پنجاب کا والی بنا دیا، لیکن ۱۸۰۱ء میں اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے ۱۸۱۸ء میں ملتان پر، ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر اور ۱۸۳۳ء میں پشاور پر قبضہ کر لیا۔

اس کے دور میں شاہی مسجد کا صحن گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوتا تھا مسقف حصہ میں فوجی گودام تھا اور مرکزی محراب میں بیت الخلاء قائم تھا، نماز اور اذان پر پابندی تھی اور مسلمان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ سید احمد (جو کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خلیفہ اور سلسلہ نقشبندیہ کے نامور مشائخ میں تھے) کو جب سکھوں کے ان مظالم کا علم ہوا کہ پنجاب میں نماز اور اذان تک کی اجازت نہیں۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً چکلوں میں بٹھائی جاتی ہیں تو انہوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ مجاہدین کی جماعت بہاولپور، حیدرآباد (سندھ) شکارپور، درۂ بولان، قندھار اور کابل ہوتی ہوئی خیبر کے راستے پشاور پہنچ گئی اور شہر پر قبضہ کر کے سید احمد نے ۱۱ جنوری

---

[1] اسلام ایک نظریہ ایک تحریک ص ۲۲۶ تا ۲۳۰

۱۸۲۷ء کو اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی [1]

ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اس میں انہوں نے ٹھیک اُسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل وانصاف، وہی حدودِ شرعیہ..... وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو سے انہوں نے اُس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی حضرت صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ نے کی تھی۔

مجاہدین کی چار سال تک سکھوں سے لڑائیاں جاری رہیں اور مسلمانوں نے پشاور، مردان اور ہزارہ کے ضلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اسلامی علاقہ میں شراب، بھنگ اور افیون کی دکانیں بند کر دی گئیں، گنہگار مرد اور عورتوں نے بے حیائی کے کام بند کر دیئے اور سید صاحبؒ نے کئی غلط قسم کے مقامی رسم ورواج بدل دیئے۔ لیکن ان اصلاحات کی وجہ سے مقامی پٹھان جن کی صحیح اسلامی تربیت نہیں ہوئی تھی، اپنے بعض خودغرض سرداروں کے بہکاوے میں آکر سید احمد صاحبؒ اور جماعت مجاہدین کے خلاف ہوگئے اور سید صاحبؒ کو پشاور چھوڑ کر ہزارہ جانا پڑا جہاں ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے قریب سکھوں نے اچانک حملہ کر کے سید احمد صاحبؒ شاہ اسمٰعیل صاحبؒ اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا۔ اور یہ تحریک مجاہدین اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی۔

سید صاحبؒ کے بعد مولانا ولایت علی (متوفی ۱۸۵۲ء) اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی (متوفی ۱۸۵۸ء) نے تحریک جہاد کو جاری رکھا۔ اب اُن کا رخ انگریزوں کی طرف تھا۔ مجاہدین نے مالاکنڈ کے علاقے میں ستھانہ کے مقام پر اپنا مرکز قائم کر لیا جہاں سے وہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں انگریزوں کی جارحانہ کارروائیوں کا برسوں مقابلہ کرتے رہے۔ [2]

---

[1] ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ص ۲۴۰-۲۴۱ ۔ [2] ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ص ۲۴۱، ۲۴۲-۲۴۳، ۲۴۳

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد، دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ گیر نظر نہیں آتے ۱۸۵۷ء کے غدر میں شاملی کے میدان میں مشائخ چشت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ حضرت حافظ ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر اکابر انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ جہاد کی تفصیل شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اعلان کردیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو قاضی بنایا گیا اور مولانا منیر صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کو میمنہ اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔ [۱]

مذکورہ بالا حضرات نے جہاد کا فیصلہ کرلیا اور یہ صاحبان اپنی بزرگی، پرہیزگاری، اور شخصیت کے اعتبار سے باأثر تھے۔ اس لئے چاروں طرف سے لوگ جہاد کیلئے آکر تھانہ بھون میں جمع ہوگئے۔ یہ اجتماع ان ہی امیرالمؤمنین حاجی صاحب کے گرد جمع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ان حضرات نے تھانہ بھون اور اطراف وجوانب میں اپنی حکومت قائم کرلی اور انگریزی حاکموں کو نکال باہر کیا۔ پھر معلوم ہوا کہ شاملی ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون کے قریب ہے.... جو ان دنوں انگریزوں کا فوجی مرکزی مقام بھی تھا، انگریز اپنا توپ خانہ بھیج رہے ہیں۔ اس خبر سے مجاہدین کو تشویش لاحق ہوئی اور ان کے استیصال کے لئے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو مقرر کیا گیا حضرت مولانا مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ مولانا رشید احمد صاحب کو تیس ۳۰ یا چالیس ۴۰ مجاہدین پر حضرت حاجی صاحبؒ نے افسر مقرر کردیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں

---

۱ نقش حیات ص ۴۴۳۔

کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم دیا پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں سب کے سب یکدم فیر کرنا چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گذری سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کتنے آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے حضرت گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ [۱]

بعد ازاں ان حضرات نے سوچا کہ شاملی پر حملہ کرنا چاہئے چنانچہ وہاں مولانا قاسم صاحبؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے سخت حملے کئے اور تحصیل کے دروازے کو آگ لگا دی، ناگاہ ایسا پانسا پلٹا کہ حافظ ضامن صاحبؒ کے ناف کے نیچے گولی لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ اب انگریزوں کی فوج کا پلّہ بھاری ہوا اور مجاہدین کی پسپائی ہوئی۔ خانقاہ امدادیہ کو آگ لگا دی گئی، مجاہدین کو وارنٹ جاری ہوئے حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ ہجرت فرمائی۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ تین دن تک گھر میں چھپے رہے پھر باہر نکلے لیکن حکومت کے ہاتھ نہیں آئے۔ مولانا گنگوہیؒ حکیم ضیاء الدین صاحبؒ رامپور منہیاران ضلع سہارنپور کے مکان سے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے۔ آخر ثبوت نہ ملنے کے باعث چھ ماہ بعد رہا ہوئے۔ [۲]

پھر قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے شاگرد اور خلیفہ اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کرکے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ملک کی زمام کار ان کے ہاتھ میں ہو۔ انہوں نے آزادی ہند کی وہ بین الاقوامی تحریک چلائی جو "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے معروف ہے۔ دیکھنے میں مشت استخوان کفر و باطل کے لئے ایک ناقابل تسخیر چٹان۔ [۳]

---

[۱] نقش حیات ص ۴۷ ۔ [۲] حیات امداد ص ۷۹

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ساری عمر جہاد اور اس کی تیاری میں گذری۔ جب وفات کا وقت آیا تو طبیعت پر آزردگی دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھے کہ شاید موت کی فکر ہے، لیکن پوچھا گیا تو جواب دیا کہ "آرزو یہ تھی کہ کسی میدان کارزار میں موت آتی۔ سر کہیں ہوتا اور دھڑ کہیں، غم اس کا ہے کہ آج بستر پر مر رہا ہوں" [1]

پھر شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام مجاہد جلیل مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ جو حضرت شیخ الہند کے ان جاں نثاروں میں تھے جنہوں نے اپنے شیخ کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور ان کے مقصد زندگی کو پورا کرنے کے لئے جان و تن کی بازی لگادی۔ ان کی وفاداری و جاں سپاری کی صرف ایک مثال پیش کردینا کافی ہوگا۔

کراچی کے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں جس وقت حضرت شیخ الاسلامؒ بحیثیت ملزم پیش کئے گئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے بیان کے آخر میں جو الفاظ فرمائے وہ أفضل الجهاد كلمةُ حقٍّ عند سلطانٍ جائرٍ کا بہترین نمونہ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"اگر لارڈ ریڈنگ اسلئے ہندوستان بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں اور حدیث کو مٹادیں اور فقہ کی کتابوں کو تباہ و برباد کردیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنیوالا میں ہوں گا"

جب عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے پُر جوش اور جذبات سے بھری ہوئی آواز میں آپ نے آخری جملہ فرمایا تو تمام مجمع نے بلند آواز سے جزاک اللہ اور مرحبا کہا اور مولانا محمد علی نے آگے بڑھ کر شیخ الاسلامؒ کے قدم چوم لئے [2]

ان تاریخی شہادتوں کے موجود ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک مناسب ہے کہ تعطل و بے عملی، حالات سے شکست خوردگی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ خانقاہوں کا مقصد کسی انسان کو دنیاوی مشاغل سے چھڑا کر بے کار محض بنانا نہیں تھا بلکہ اُن کے عظیم مقاصد میں سے ایسے رجال کار کی تربیت تھی جو صحیح معنوں میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور امامت کی قیادت سنبھال سکیں۔

---

[1] جہان دیدہ صـ۲۰ [2] آثر شیخ الاسلام صـ۱۴۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و نشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین وبارک وسلم۔ اما بعد۔

محترم ارکین جمعیۃ، نمائندگان عظام اور معزز حاضرین! آج سے تیرہ سال قبل ۱۹۸۳ء میں شہر بمبئی میں جمعیۃ علماء ہند کا چوبیسواں اجلاس عام منعقد ہوا تھا لیل ونہار اور ماہ وسال کے طویل فاصلے طے کر کے کاروان ملت آج پھر اسی عروس البلاد میں خیمہ زن ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

حضرات! جمعیۃ علماء ہند کے اس پچیسویں اجلاس عام کی صدارت کے لئے آپ نے اس عاجز کو منتخب فرمایا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی عزت ہے جو ہندوستان

کی اسلامی آبادی میں کسی خادم قوم و ملت کو حاصل ہوسکتی ہے لیکن یہ عزت ادائے فرض و مسئولیت کا بارگراں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ میں آپ تمام بزرگان ملت کا شکرگزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے لطف و کرم نے میری بے مائگی اور بے بضاعتی کو قبول کرلیا ہے اسی طرح آپ کی رفاقت و مساعدت میری ناتوانیوں اور درماندگیوں کے لئے بھی پردہ پوش ہوگی۔

چونکہ ہمارا یہ اجتماع ایک اجتماعی عمل ہے ہم سب جمع ہوئے ہیں کہ ملت کی متاع گمشدہ کی جستجو کریں ہمارا مقصد نہایت عظیم ہے۔ اس لئے آئیے ہم بارگاہ ایزدی میں پوری دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کریں کہ: اللّٰھم اجعل عملی کلہ صالحا واجعلہ لوجھك خالصا و لا تجعل لاحد فیہ شیئا۔ بارالٰہا ہمارے سارے اعمال کو صالح بنادے اور انہیں اپنی رضا کے لئے مخصوص فرما اور انہیں اوروں کی شرکت سے بچالے۔

ملک کے حالات

حضرات ہمارا ملک ہندوستان دستوری اعتبار سے جمہوریت اور سیکولرزم کا پابند ہے اور ہر سیاسی جماعت یہاں تک کہ بھاجپا جیسی کمیونل پارٹی بھی جمہوریت اور سیکولرزم کا نعرہ بلند کرکے کرسیٔ اقتدار تک پہونچنے کی کوشش کرتی ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا جمہوریت کا نعرہ بلند کردینے یا کسی ملک کو سیکولر اسٹیٹ کہدینے سے وہ صحیح معنوں میں جمہوری و سیکولر ہوجائے گا؟ آج کل رائے شماری کو اصل جمہوریت قرار دیا جارہا ہے۔ اس سے بڑھ کر خود فریبی اور کیا ہوگی کہ تشکیل حکومت کے اس طریقے کو روح جمہوریت سمجھ لیا جائے حقیقی جمہوریت تو یہ ہے کہ رنگ و نسل دولت و ثروت کے ہر امتیاز کو مٹا کر یہ اعلان کرے کہ۔ کلکم بنوا دم وادم من تراب۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔ حقیقی جمہوریت تو وہ احساس اخوت ہے جو سچے دل سے اعتراف کرے کہ۔ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے بندے بھائی بھائی ہیں۔ حقیقی

جمہوریت تو یہ ہے کہ عدل وانصاف میں جو اپنے اور پرائے دوست و دشمن میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے۔ لا یجرمنکم شنئان قوم علی ان لا تعدلوا۔ تمہیں کسی قوم کی دشمنی بے انصافی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ حقیقی جمہوریت تو وہ آزادی ضمیر و آزادی رائے ہے جو دین و مذہب کے بارے میں کسی قسم کی زور زبردستی کو روا نہ رکھے سچی جمہوریت کے یہ وہ زریں اصول ہیں جو دستور ہند میں واضح الفاظ میں موجود ہیں مگر اب تک کی ساری حکومتیں جمہوریت کے ان بنیادی اصولوں کو پامال کرتی چلی آرہی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ان کے حقوق کی پامالی کا اظہار مسٹر ایم، این، ایچ رٹائرڈ مجسٹریٹ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آزادی کے بعد سے آج تک کوئی مسلمان وزیر اعظم نہیں ہوا۔ اور نہ ہونے کی امید ہے کچھ مسلمانوں کو غیر اہم اور معمولی محکمے مثلاً وقف، جیل، ٹرانسپورٹ وغیرہ دے کر وزیر بنا دیا جاتا ہے جو برائے نام ہی ہوتے ہیں یہی حال سروسز کا بھی ہے۔ سول پولیس، دفاع اور نوکریوں میں مسلمان برائے نام ہیں کوئی بھی مسلمان ٹاٹا، برلا، مفت لال کی طرح صنعت کار نہیں ہے پاکستان بننے کے بعد تقریباً ہر مسلمان کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے یہاں تک کہ آج اونچے افسران مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آج سے پچیس برس پہلے کی بات مجھے یاد ہے جبکہ میں ضلع مجسٹریٹ تھا کہ جب کبھی لا اینڈ آرڈر کی بات آتی تو مجھے گورنمنٹ سے خفیہ ہدایت ملتی تھی کہ مسلمانوں کے لائسنسی ہتھیاروں کو بھی ضبط کرلیا جائے لیکن ہندوؤں کے متعلق کبھی بھی اس قسم کی ہدایت نہیں آئی"۔

حالانکہ پاکستان کے ساتھ تین جنگوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان دھوکہ باز نہیں ملک کے وفادار ہیں ان پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے (مسلم انڈیا ۱۲ دسمبر ۱۹۹۰)

فسادات | تقسیم ملک کے بعد قتل وغارت گری کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا

وہ حکومتوں کی مجرمانہ چشم پوشی اور حکومت کے اہل کاروں اور امن و قانون کے ذمے داروں کی سازش سے مسلمانوں کے لئے ایک ناسور بن چکا ہے صرف ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک نو سال کے عرصہ میں سرکاری رپورٹوں کے مطابق نو ہزار تین سو اننسٹھ مسلمان فرقہ وارفسادات میں شہید کئے گئے۔ واقعات و تجربات کی شہادت پر یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ اعداد و شمار عادت کے مطابق گھٹا کر پیش کئے گئے ہیں اسی پر بقیہ سالوں کو قیاس کرلیا جائے۔

یہ تو صرف جانی نقصان کی فہرست ہے تجارتی، صنعتی اور مالی نقصانات کا اندازہ تو اربوں کھربوں تک پہنچ سکتا ہے۔

ان فسادات سے متعلق یہ رویہ بھی غیر جمہوری اور غیر انسانی ہے کہ لاانیڈآرڈر اور جان و مال کی حفاظت میں متعلقہ افسران کی واضح ناکامی کے باوجود ان سے کسی قسم کی بازپرس محض اس لئے نہیں کی جاتی کہ یہ لٹنے والے مسلمان تھے اس کے برعکس اگر غیر مسلموں کے بارے میں افسران سے ایسی غفلت و لاپرواہی سرزد ہوجائے تو پوری حکومت حرکت میں آجاتی ہے اور غفلت کے مرتکب افسران کے خلاف بلا تاخیر ایکشن لیا جاتا ہے۔

فسادات کے زمانے میں فرقہ پرست، فساد انگیز اخبارات کو کھلی چھوٹ دے دی جاتی ہے وہ خود ساختہ اشتعال انگیز خبریں شائع کرکے ماحول کو انتہائی گرم اور دحشت ناک بنادیتے ہیں مگر ان کی اشتعال انگیزیوں پہ کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ ابھی سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ علی گڑھ میں فساد کے موقع پر بعض اخبارات نے یہ من گھڑت خبر شائع کردی کہ علی گڑھ میڈیکل کالج میں دو سو غیر مسلموں کو قتل کردیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس خبر سے کس قدر اشتعال پیدا ہوا ہوگا مگر اس غلط خبر کی اشاعت پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔

مسلمانوں کی پانچ سو سالہ قدیم تاریخی بابری مسجد قانون اور عدالتی احکامات کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے سرکاری افسران اور فورسز کی موجودگی میں

مسمار کر دی گئی اور صوبائی حکومت حفاظت کا جھوٹا وعدہ پورا نہ کر سکی اس سے مسلمانوں کا متاثر ہونا فطری امر تھا جس کے نتیجے میں پورے ملک میں ان کا قتل عام کر دیا گیا۔

آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیمیں جن کا اوڑھنا، بچھونا ہی ملک میں مختلف ناموں سے منافرت پھیلانا اور فسادات کی آگ بھڑکانا نئی نئی اصطلاحیں گڑھنا متعارف اصولوں کو بدلنا نوجوانوں کو خونخوار اور جبر و ظلم کا عادی بنانا انسانیت سے کوسوں دور کر دینا ہے انہیں نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ ان کے جرائم کی پردہ پوشی کر کے ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے جبکہ خود حکومت کے مقرر کردہ متعدد کمیشنوں نے اپنی رپورٹوں میں واضح الفاظ میں نام لے کر انہیں اور ان کے لیڈروں کو فساد کا مجرم گردانا ہے مگر ان کے خلاف ایکشن لینا تو دور کی بات ہے انہیں مجرم کہنا اور سمجھنا ہماری نام نہاد حکومتوں کو گوارا نہیں۔ اور ایسی تنظیموں کو ختم کرنے پر تیار نہیں، دوسری طرف اگر ملک کے امن پسند افسران فساد کی صحیح اطلاع دے کر فسادیوں کو ان کے منصوبے میں ناکام بنانے اور امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس پر ان کی ہمت افزائی نہیں کی کی جاتی بلکہ فسادیوں کی طرف سے دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ ہم تمہارا تبادلہ کرا دینگے۔ اور عموماً ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اگر ذمہ دار افسران فساد نہ چاہیں تو فساد ہرگز نہیں ہو سکتا اور اگر کسی سرپھرے کی شرارت سے شروع بھی ہو جائے تو لمحوں میں دبایا جا سکتا ہے۔ بڑودہ کے پولیس کمشنر نے ایک فساد کے موقعہ پر کہا کہ جب تک میں نہیں چاہوں گا ہرگز فساد نہیں ہو سکتا۔ اور بڑودہ جیسے حساس شہر میں کر کے دکھا بھی دیا۔

لیکن جہاں افسران فساد چاہتے ہیں وہاں فسادیوں کو کھلی چھوٹ دے دی جاتی ہے اور سیکڑوں اور ہزاروں کا قتل عام کر دیا جاتا ہے۔ کروڑوں کا مال و اسباب لوٹا اور جلایا جاتا ہے اور انسانیت سوز مظالم کئے جاتے ہیں۔

عورتوں بچوں تک نشانہ بنایا جاتا ہے اور یہ سب حکومت کی مشینری کی سرپرستی میں ہوتا ہے اگر کوئی مظلوم مسلمان مرد و عورت پولیس میں ایف آئی آر درج کراکے قانونی رعایت حاصل کرنا چاہے تو قانونی سہولت تو دور کی بات ہے اسلئے ان کو مارپیٹ کر حوالات میں بند کردیا جاتا ہے۔ پولیس آر ایس ایس کے والینٹرد وں کے ساتھ انسانیت سوز حرکتیں کرتی ہے۔ اور ایسے مظلوموں کو ان کے گھروں سے دروازے توڑ توڑ کر گرفتار کیا جاتا ہے۔ جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے بیس بیس گھنٹے پانی تک نہیں دیا جاتا۔ کئی کئی برس ان پر مقدمات کی تباہی رہتی ہے۔

بمبئی بم دھماکہ کیس کے نام پر گرفتاریوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن بابری مسجد کی شہادت اور بمبئی فساد کے اقراری مجرم بغیر کسی قدغن کے آزاد پھر رہے ہیں اور حکومت کے اہم ذمہ داران کی تقریبوں میں شرکت کرکے ان کو عزت ووقار کی سند فراہم کر رہے ہیں۔ آخر یہ من و تو کا فرق وامتیاز کس بات کا غماز ہے اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ذمہ داران حکومت خود بتائیں۔ ع

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

لاءاینڈ آرڈر اور جان ومال کے بنیادی حق کے سلسلے میں جمہوریت کی دعویدار حکومتوں کا یہ جانبدارانہ رویہ اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ ان کے غیر منصفانہ بلکہ مجرمانہ سلوک کی یہ خونچکاں داستان اس قدر دل گداز اور غم انگیز ہے کہ اسے سن کر پتھر کا دل رکھنے والے بھی خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتے مگر سرمستان بادۂ اقتدار کا طرز عمل بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کے خون سے رنگین ارض وطن کو دیکھ کر وہ اس طرح خوش ہیں کہ جیسے باد بہاری نے صحن چمن میں لالہ و گل بکھیر دیئے ہیں۔

ہماری قومی حکومتوں کی یہ دورخی پالیسی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں فرقہ واریت، تعصب، جانبداری، اور تنگ نظری

کی کارفرمائی عام ہے۔ تعلیم، صنعت، تجارت، سیاست، ملازمت وغیرہ ہر شعبۂ حیات سے بزور طاقت اور کبھی بحیلہ و تدبیر مسلمانوں کو بیدخل کرنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔

مختلف شعبہ جات زندگی میں امتیازی برتاؤ سرکاری اور پرائیوٹ اداروں میں مقابلہ کے عنوان سے مسلم طلبہ کو مختلف بہانوں سے داخلہ سے محروم کردیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اقلیتی اداروں میں بزور زبردستی غیر مسلم طلبہ کو داخلہ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ صنعت وحرفت کے مقابلہ میں بھی بعینہ اسی پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے کہ اس سلسلے کی ہر قسم کی سرکاری مراعات ایک خاص فرقہ کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں بلکہ بعض وہ صنعتیں جو کسی حد تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں انہیں قوانین وضابطوں کی زنجیروں سے اس طرح جکڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی موت آپ مرجائیں۔

تجارت وزراعت کے فروغ کے لئے نت نئی اسکیمیں تیار کی جارہی ہیں تاجروں اور کاشت کاروں کو بڑی بڑی رعایتیں دی جارہی ہیں لیکن یہ سب کچھ پوری احتیاط کے ساتھ ایک خاص دائرے میں محدود کردی گئی ہیں اور شاذونادر ہی کسی مسلمان کو ان اسکیموں سے نفع اندوز ہونے کا موقع مل پاتا ہے ملازمتوں کا حال اس سے بھی خراب ہے اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمان کا تناسب دو فی صدی بھی نہ ہوگا۔ فوج اور سیکورٹی فورسیز میں تو برائے نام بھی کسی مسلمان کو نہیں لیا جاتا۔ اور تمام مراحل میں کامیاب ہوجانے کے باوجود صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ تم مسلمان ہو اس لئے نہ لئے جاؤگے۔

پارلیمنٹ واسمبلی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے ان کی نمائندگی غیر معمولی حد تک کم ہے اور اس کمی میں دن بدن اضافہ ہی ہورہا ہے۔ دوسری طرف فرقہ پرست جماعتوں کے افراد

کثرت سے حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز کئے جاتے ہیں۔ نیچے کی اسامیوں میں اپنے لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں اس طرح سیکولرزم اور جمہوریت کے پردے میں پوری مشنری پر فرقہ پرستوں کو مسلط کر دیا گیا ہے اور خود حکومت کے زیر سایہ فرقہ واریت کو پروان چڑھایا جا رہا ہے یہ عمل آج نہیں بلکہ لمبے عرصے سے جاری ہے

مسلم اوقاف

مسلم اوقاف اپنے دور رس فوائد و ثمرات کے لحاظ سے مسلمانوں کی ترقیات میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں لیکن آزادی کے بعد سے ان کی بربادی و تباہی کا ایک غیر متناہی سلسلہ جاری ہے اس اہم مسئلہ میں حکومت کو برابر خصوصی توجہ دلائی جاتی رہی ہے کہ مسلم اوقاف کی حفاظت اور ان کے صحیح استعمال میں لانے کے لئے مناسب ترمیمی وقف بل منظور کر کے بلا تاخیر اس کا نفاذ کیا جائے۔

جمعیۃ کی مساعی

جمعیۃ علماء ہند نے سب سے پہلے آزادی کے بعد وقف بل پیش کر کے منظور کرایا تھا لیکن وہ صحیح طور پر منظور نہیں ہو سکا تھا اس لئے شروع ہی سے اس میں جمعیۃ علماء ہند ترمیم کے لئے کوشاں تھی ۱۹۷۰ء میں یونس سلیم صاحب کی وزارت میں وقف انکوائری کمیٹی بنی جس نے تین سال بعد ۷۳ء میں عبوری رپورٹ دی اور مزید تین سال بعد ۷۶ء میں فائنل رپورٹ پیش کی۔ لیکن اس کے بعد بھی ترمیمی بل پیش نہیں ہوا تو جمعیۃ علماءِ ہند نے اوقاف کانفرنس فروری ۱۹۷۹ء میں کی اس کے نتیجہ میں ۸۴ء میں ڈاکٹر راجندر کمار باجپئی نے کمیٹی بنائی جس میں ۸۴ء کے ترمیمی قانون پر اعتراضات کا جائزہ لیا گیا۔ لیکن اس پر بھی ٹال مٹول ہوتی رہی۔

پچھلے دنوں میری براہ راست وزیر اعظم سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلے سیشن میں اسے ضرور پیش کر دیا جائے گا چنانچہ پارلیمنٹ کے اجلاس کی تاریخ قریب آگئی۔ تو میں نے بذریعہ خط انہیں اس وعدہ کی یاد دہانی کرائی مگر اس وعدہ اور یاد دہانی کے باوجود ترمیمی وقف بل پیش نہیں کیا گیا۔ جمعیۃ

علماء ہند اور ملک کی دیگر تنظیموں کے مسلسل مطالبے کے باوجود جان بوجھ کر یہ وقف بل پیش کرنے میں تاخیر کا مقصد آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ ملی املاک یونہی تباہ ہوتی رہیں اور مسلمان ان سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکیں اب جبکہ آفتاب اقتدار مغربی افق کو چھو رہا ہے اور الیکشن سر پر آگیا ہے تو یہ بل دس بارہ سال کی تاخیر سے پیش کر دیا گیا ہے۔ جو پارلیمنٹ سے منظور ہو کر صدر جمہوریہ ہند کی منظوری حاصل کرنے میں اٹکا ہوا ہے اور مسلم اوقاف کے مخالفین اس کے خلاف اثر و رسوخ استعمال کر رہے ہیں۔ دیکھئے کہ حکومت اور صدر جمہوریہ ہند کیا کرتے ہیں یہ ہے حکومت کا معاملہ مسلم اوقاف کے ساتھ۔

اسی طرح سے اوقاف کو رینٹ کنٹرول سے مستثنیٰ قرار دینے کا مطالبہ ایک طویل عرصہ سے جاری ہے مگر مرکزی حکومت نے اس جائز مطالبہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی حالانکہ مرکزی حکومت دہلی اور مرکز کے زیر انتظام صوبوں میں نافذ کر سکتی ہے۔

یوپی کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اپنے زمانہ حکومت میں اس مطالبہ کو منظور کر کے اوقاف کو رینٹ کنٹرول سے مستثنیٰ کر دیا لیکن مختلف ذرائع سے یہ سننے میں آیا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی مایاوتی حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ ملائم سنگھ کے اس پاس کردہ قانون کو منسوخ کر دے یا اس میں ترمیم کر دے اب دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے۔

ٹاڈا ٹاڈا قانون ۱۹۸۵ء میں مسئلہ پنجاب کے پیش نظر دو سال کے لئے نافذ کیا گیا تھا لیکن مخصوص مقاصد کے تحت اس کا دائرہ وسیع کر کے پورے ملک پر محیط کر دیا گیا اور ہر دو سال پر اس کی مدت میں توسیع کی جاتی رہی اور اس بے دردی کے ساتھ اس کا ناجائز استعمال کیا گیا کہ پوری انسانیت چیخ اٹھی حتیٰ کہ سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مسٹر شرد پوار نے مرکزی وزراء، ممبران اور وکلاء کی ایک جماعت کی موجودگی میں یہ بیان دیا کہ ٹاڈا ایک وحشت ناک قانون

ہے اور ان کے مقرر کردہ تحقیقاتی کمیشن کے مطابق پچاس فیصد ٹاڈا کے قیدی یک سر غلط النزام میں گرفتار کئے گئے ہیں۔

ملک کے قانون داں طبقہ کی انجمن بار ایسوسی ایشن آف انڈیا کے صدر مسٹر ایف، ایس نریمان نے بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا ٹاڈا کے ذریعہ مقدمات کا اندازہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم ابھی کتنے پچھڑے ہوئے ہیں سی بی آئی نے اپنی رپورٹ میں واضح طور پر یہ کہا کہ گجرات کے فسادات میں گرفتار شدہ سیکڑوں مسلمانوں کے خلاف ٹاڈا کا غلط استعمال ہوا ہے۔ کانگریس اقلیتی سیل کے چیرمین مسٹر طارق انور نے بھی اظہار و اعتراف کیا کہ مہاراشٹر، گجرات اور راجستھان میں ٹاڈا کے تحت گرفتار شدہ مسلمان مظالم کے شکار بنائے گئے ہیں۔

غرضیکہ ٹاڈا قانون کے نام پر کھلی لاقانونیت کا مظاہرہ ہوتا رہا جس کے بطور خاص نشانہ مسلمان بنائے گئے۔ جب پانی حد سے گزر گیا تو حکومت اس کی میعاد ختم ہو جانے پر اس میں توسیع نہیں کر سکی اس طرح گویا یہ قانون منسوخ ہو گیا مگر یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ٹاڈا میں پھنسائے ہوئے سیکڑوں مظلوم آج تک جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ ان پر کیا گزر رہی ہے اس کی کسی کو کیا فکر ؎

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

یکساں سول کوڈ آئین ہند میں بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۲۵ میں ہندستان کے ہر شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے لیکن یکساں سول کوڈ کے نام پر مسلمانوں سے دستور کے اس بنیادی حق کو چھین لینے کی سازشیں عرصہ سے جاری ہیں اور کسی نہ کسی بہانے سے اس مسئلہ کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ اور اب کئی مرتبہ سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ دستور و قانون سے تجاوز کر کے بطور حکمت عملی کے عدالت کسی ضروری مقدمہ کا فیصلہ دیتے ہوئے "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کے طور پر حکومت کو یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے مشورہ یا ہدایت دیتی ہے

اور حکومت حالات کی نبض دیکھ کر راہ عمل اختیار کرتی ہے جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ حکومت مسلم پرسنل لار کے تحفظ کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں سے ان کے مذہبی حق کو سلب کرلینے کے لئے بہانے تلاش کر رہی ہے۔

اسلامی درسگاہیں مسلم اقلیت کے دینی مدارس اور تعلیمی ادارے جو مسلمانوں میں مذہبی و دینی بیداری پیدا کرنے میں بنیادی اور موثر کردار ادا کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات و روایات کے اس ملک میں سب سے بڑے امین ہیں، اسلامی تہذیب و ثقافت کے یہی وہ سرچشمے ہیں جن سے ملت اسلامیہ اپنی دینی و اخلاقی پیاس بجھاتی ہے، رہنمائی اور رجال کار پاتی ہے۔ علم و اخلاق، روحانیت و انسانیت کے ان میناروں کے خلاف ایک انتہائی خطرناک حکمت عملی یہ ایجاد کی گئی ہے کہ انہیں دہشت گردوں کی پناہ گاہ اور پاکستانی جاسوسوں کا اڈہ بتایا جارہا ہے اور بغیر کسی قانونی ثبوت کے رات کی تاریکیوں میں ان پر مسلح چھاپے مارے جارہے ہیں اور مدارس کے بے گناہ ذمہ داروں اور طلبہ کو خوف زدہ اور پریشان کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جاتی ہے اس طرح مسلمانوں کو ان کے اپنے مذہبی امور سے بیگانہ بنانے کے لئے ان کے مذہبی چشموں کے سوتوں کو بند کرنے کے لئے ایک جدید حکمت عملی اختیار کی جارہی ہے۔

دراندازی کا ہوّا اسی طرح بنگلہ دیشیوں کی دراندازی کا ہوا کھڑا کرکے (حالانکہ برسوں سے بنگلہ دیش سے آنے والے ۹۹ فیصد صرف ہندو ہوتے ہیں اور وہ سب ہندوستان کے شہری بنا لیے جاتے ہیں مگر غیر قانونی طور پر آنے والوں اور واپس نہ جانے والوں کی صرف تعداد بتاکر) ہندوستانی مسلمانوں کو طرح طرح پریشان کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کی پوری کی پوری بستیوں کو اور نسلاً بعد نسل ملک میں رہنے والوں کو حق شہریت اور ووٹ کے حق سے محروم کرنے کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے اور اپنے مخصوص فاسد اغراض کے تحت ملک کے شہریوں سے شہریت کے ثبوت کے لئے ایسی اسناد کا مطالبہ کیا جارہا ہے جن کو

بہم پہنچانا عام شہریوں کے امکان سے باہر ہے بلکہ سرکاری مناصب پر فائز آفیسران اور وزراء تک ان اسناد کو عام حالات میں پیش نہیں کر سکتے۔

ملک میں جگہ جگہ اور اسی شہر بمبئی میں مسلمانوں سے بذریعہ نوٹس شہریت ثابت کرنے کی ہدایت کی گئی اور ان سے اس سلسلے میں پاسپورٹ یا پیدائش کا سرٹیفکیٹ یا مردم شماری کے نیشنل رجسٹر میں اندراج کا سرٹیفکیٹ وغیرہ طلب کی گئیں پولیس افسران سے رابطہ قائم کر کے ان سے پوچھا گیا کہ صرف مسلمانوں پر یہ چشم کرم کیوں ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم تو آرڈر کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وزیراعلیٰ شرد پوار سے مسلم لیڈروں نے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ الیکشن کمیشن کے حکم کے مطابق یہ کارروائی انجام دی جا رہی ہے الیکشن کمیشن سے معلوم کیا گیا تو وہاں سے جواب ملا کہ ہم نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ووٹر لسٹ میں غیر ملکیوں کے نام نہ ہوں گویا کہ مسلمانوں کو ان بنیادی حق شہریت سے محروم کرنے کی اس سازش میں کسی نہ کسی حد تک نیچے سے اوپر تک سبھی شریک تھے۔ ”این خانہ ہمہ آفتاب است“!

یہ تو ایک مثال ہے، دہلی، آسام، راجستھان، یوپی، بہار وغیرہ ملک کے اکثر صوبوں میں سازش کا یہ جال پھیلا ہوا ہے جو درحقیقت ہندوستان کو جمہوریت اور سیکولرزم سے محروم کر کے ہندو راشٹر کی طرف لے جانے کی ایک ہمہ گیر سازش ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں ملک آج گھرا ہوا ہے جس کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ کمیونل اور فاشسٹ تنظیموں کی جانب سے جب بھی تعصب اور فرقہ واریت پر مبنی کوئی غلط، خلاف قانون اور غیر دستوری نظریہ سامنے آتا ہے تو ہماری حکومت زبان سے تو انکار کر دیتی ہے لیکن عمل اسی کمیونل نظریہ کے مطابق کرتی ہے حکومت کے اس دورخے رویے نے حالات کو سنگین سے سنگین تر بنا دیا ہے اور ان ہی حالات نے ان مسائل کو جنم دیا ہے جنہوں نے ملت اسلامیہ کے آگے مشکلات و مصائب کے

پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ جن کی وجہ سے خود اپنے ملک و وطن میں آج ہمارے لئے عزت و عافیت اور وقار و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا دوبھر ہو گیا ہے ہمارے معابد و معابد تعصب و نفرت کی زد میں ہیں۔ ہمارے ملی و مذہبی تشخص و شناخت کو مٹا دینے کی نت نئی اسکیمیں تیار کی جا رہی ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف یہ ساری منصوبہ بند شازشیں صرف اس لئے ہیں کہ مسلمان اپنے اسلامی عقائد و اعمال، مذہبی تشخص و شناخت اور دینی زندگی سے دستبردار ہو کر ذہنی اور تہذیبی طور پر اس نازی ازم کے غلام بن جائیں۔ جو فرقہ پرست اور ان کی معاون طاقتوں کا منتہائے مقصود ہے بالفاظ دیگر جس طرح بدھ مت، جین مت، سکھ مت وغیرہ اپنے مذہبی تشخصات و امتیازات سے دست بردار ہو کر ہندوازم میں ضم ہو گئے۔ اور جس طرح اس ملک کے کروڑوں باشندوں کو تمام انسانی حقوق و کرامت سے محروم کر کے شدر بنا لیا گیا تھا اسی طرح مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو تمام حقوق، مساوات اور عزت و کرامت، قانون و انصاف سے محروم کر دیا جائے اور ان مظالم سے تنگ آکر یہ ملت مسلمہ بھی اپنے دین و مذہب سے بیگانہ ہو کر ان کی خود ساختہ تہذیب و تمدن کی اسیر بن جائے۔ اور اس طرح جمہوریہ ہند کو ہندو راشٹر میں تبدیل کر دینے کا ان کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے۔ جس کا اظہار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ناتھو رام گوڈسے نے گاندھی جی کو قتل کر کے جج کے سامنے کیا تھا، ملک کے باشندوں کی بڑی تعداد ملک کے وسائل، رفاہیت اور عزت و احترام سے محروم ہے اسے نان شبینہ سے فرصت نہیں ملتی صرف دس پندرہ فیصد لوگ ملک کے تمام وسائل و ذرائع غصب کر کے عیش و آرام کر رہے ہیں پورے ملک کی دولت و ثروت سے ان چند لوگوں کے عیش و عشرت کے قہوہ خانے آباد ہیں۔

اگر مسلمان ان حالات میں ان مظلوم اقلیتوں کے ساتھ ہاتھ ملانے، تعاون

کرنے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کو انسانی عزت واحترام دینے کے لئے آمادہ وتیار ہو جائیں تو بلاشبہ اس ملک کا مقدر بدل سکتا ہے۔

جب اسلام میں ذات برادری، اونچ نیچ کا تصور نہیں جیسا کہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ۔ کلکم بنو آدم وآدم من تراب، لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی۔ تو مسلمان برہمن، بنئے، راجپوت اور شدر میں فرق کیوں کرتے ہیں اور اس پسماندہ طبقے کو انسانی عزت واحترام کیوں نہیں نہیں دیتے۔ اگر ہم نے اسلامی ہدایت کا راستہ اختیار نہ کیا تو حالات کے سنگین انتقام سے بچ نہ سکیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے ملک ووطن کو مشکلات ومصائب سے نکالنے، اس کے مستقبل کو سنوارنے اور اس کے مقدر کو جگمگانے کے لئے اگر اپنے فرض منصبی کا ہمیں صحیح ادراک ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ بڑی سے بڑی انسانی طاقت بھی ہمیں ہمارے حقوق سے محروم نہیں رکھ سکتی بلکہ وطن عزیز فرقہ واریت کے جس دلدل میں پھنس گیا ہے اس سے باہر بھی نکل سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

نماز کے ضروری مسائل

نماز کے وہ مسائل جنہیں بعض نادان دوستوں نے حق و باطل کا معرکہ بنادیا ہے

حافظ محمد اقبال رنگونی ۔ مانچسٹر

قسط ۲

۱۰۔ جلسہ استراحت کا مسئلہ

نماز میں پہلی رکعت مکمل کر کے جب دوسری رکعت کے لئے اٹھے تو اسے سجدہ سے سیدھے کھڑا ہونا چاہئے۔ پہلے بیٹھنا اور پھر کھڑا ہونا یہ جلسہ استراحت اور آرام کرنا ہے یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور سنت ثابت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ دوسری رکعت کے لئے سجدہ سے سیدھے کھڑے ہوتے تھے۔ جلسہ استراحت نہیں فرماتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنے پیروں کے پنجوں پر زور دے کر کھڑے ہوتے تھے۔ کان ینھض فی الصلوٰۃ علی صدور قدمیہ (جامع ترمذی جلد ۱ صفحہ ۳۸) حضرات صحابہ کرام کا بھی اسی پر عمل رہا، امام شعبی نقل کرتے ہیں کہ۔ ان عمر و علیا و اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھضون فی الصلوٰۃ علی صدور اقدامھم۔ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۶) مشہور تابعی نعمان بن ابی عیاش نے کئی صحابہ کو دیکھا تھا وہ سب کا عمل یہی بتلاتے ہیں

قال ادرکت غیر واحد من اصحاب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فکان اذا رفع احدھم راسہ من السجدۃ الثانیۃ فی الرکعۃ الاولیٰ والثالثہ نہض کما ھو ولم یجلس۔ (المصنف جلد ۱ ص ۳۹۴ الدرایہ جلد ۱ ص ۱۴۷)

تمام اہل علم کا بھی یہی معمول رہا ہے اور یہی طریقہ سنت سمجھا گیا ہے۔ امام بخاری کے شاگرد امام ترمذیؒ کہتے ہیں:

وعلیہ العمل عند اھل العلم یختارون ان ینہض الرجل فی الصلوٰۃ علی صدور قدمیہ۔ (جامع ترمذی جلد ۱ ص ۳۸)

جو حضرات صحیح بخاری سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جلسہ استراحت ثابت ہے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پیش نہیں کرتے بلکہ ایک بزرگ حضرت عمرؓ بن سلمہ کا عمل پیش کرتے ہیں۔ ان کے شاگرد حضرت ایوبؒ کہتے ہیں کہ:

کان یفعل شیئا لم ارھم یفعلونہ۔ (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۱۳)

(ترجمہ) آپ ایک ایسی چیز (ایک ایسا عمل) کرتے تھے کہ دوسرے لوگوں کو اس طرح کرتے میں نے نہیں دیکھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جلسہ استراحت ان کے زمانہ میں عام طور سے نہیں ہوتا تھا حضرت ایوبؒ تابعی ہیں ظاہر ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام کو دیکھا۔ اگر کسی صحابی سے یہ عمل ثابت ہوتا تو آپ ضرور صحابہ کرام سے اس عمل کو بیان فرماتے۔ حضرت عمرؓ بن مسلمہ کا ایسا کرنا بھی پتہ دیتا ہے کہ انہوں نے یہ عمل کسی عارض کی وجہ سے کیا تھا۔ اگر جلسۂ استراحت مسنون ہوتا تو صحابہ کرام اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔ بہتر ہوگا ہم یہاں حافظ ابن قیمؒ کے بیان سے یہ مسئلہ واضح کر دیں۔

وقد روی عن عدۃ من اصحاب النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم من وصف صلاتہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یذکر ھذہ الجلسۃ وانما ذکرت فی حدیث ابی حمید ومالک بن الحویرث ولو کان ھدیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فعلہا دائما لذکرھا

کل واصف لصلاته صلی اللّٰہ علیه وسلم و مجرد فعله صلی اللّٰہ علیه وسلم لها لا یدل علی انها من سنن الصلاۃ الا اذا علم انه فعلها سنة یقتدی به فیها واما اذا قدر انه فعلها للحاجة لم یدل علی کونها سنة من سنن الصلاۃ فهذا من تحقیق المناط فی هذه المسئلة۔ (زادالمعاد جلد ۱ صفحہ ۲۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہ اور وہ حضرات جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں اس جلسہ استراحت کا ذکر نہیں فرمایا سوائے ابوحمیدؓ اور مالکؓ بن الحویرث کی روایت کے۔ اگر یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ ہوتا اور آپ کا یہ فعل ہمیشہ کا ہوتا تو وہ تمام حضرات جنہوں نے آپ کی نماز کا نقشہ بیان کیا ہے اس جلسہ استراحت کو ضرور بیان کرتے۔ اور صرف آپ کا اس فعل کو کرنا اس پہ دلالت نہیں کرتا کہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ہے جب تک اس بات کا علم نہ ہو جائے کہ آپ نے یہ عمل بطورِ سنت کے کیا ہے کہ جس کی اقتدار کی جائے۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کسی ضرورت کے تحت کیا ہے تو پھر یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور اس مسئلہ میں تحقیق مناط یہی ہے۔

جس طرح نماز کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے (فرض ہو یا نفل) لیکن اگر کسی عارض کی وجہ سے فرض یا نفل بیٹھ کر پڑھے تو یہ ممنوع نہیں، لیکن بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھنے والا اگر یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیٹھ کر نوافل پڑھے ہیں اسلئے بیٹھ کر نفل پڑھنا سنت ہے تو اس کا یہ کہنا درست نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر میں جسم کے ذرا بھاری ہو جانے کی وجہ سے بیٹھ کر نوافل ادا فرمائے ہیں۔ ورنہ آپ کا عام معمول کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنے کا تھا اسیطرح بیٹھ کر نماز پڑھنے میں اگر جلسہ استراحت

آگیا تو یہ سنت نہیں بلکہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔

۱۱۔ فرض نماز کے بعد دعا کا مسئلہ

دعا کرنا بہت بڑی نیکی اور عبادت کا مغز ہے۔ الدعاء مخ العبادۃ۔ فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کی بڑی فضیلت ہے گو یہ فرض واجب نہیں۔ فرائض ادا کرنے کے بعد انفرادی ہو یا اجتماعی دعا کرنا مستحب ہے۔ اللہ کے ہاں یہ دعا قبولیت پاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض نمازوں کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے۔ فلما سلم انحرف ورفع یدیہ ودعا۔ (اعلاء السنن جلد ۳ ص۲۰۰) آپ سلام پھیرنے کے بعد ایک طرف مڑ کے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی۔ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر جہراً دعا کرنے کو جو لوگ فرض و واجب کہتے ہیں اور اس کے تارک کو باعث ملامت گردانتے ہیں ان کا یہ کہنا صحیح نہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عمل ثابت ہے۔ غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب لکھتے ہیں:

> صاحب فہم پر مخفی نہیں کہ بعد نماز فرائض کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز اور مستحب ہے اور زید (جو اس کو بدعت کہتا ہے مخطی ہے ...... ان احادیث سے بعد نماز فرض کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا قولاً و فعلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ جلد ص۵۶۶)

مولانا عبداللہ روپڑی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

> بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی حدیث کو ہم نے حسن ثابت کیا ہے بلکہ بعض اسانید حسن لذاتہ ہیں اسلئے ہاتھ اٹھانے میں کوئی خدشہ نہیں بلکہ استحباب ہے۔ ہاں لازمی سمجھنا بری بات ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث جلد ۲ ص۱۹۱)

مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب لکھتے ہیں:

> بعد نماز کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بعض روایات میں ثابت ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۵۲۷)

مولانا محمد شرف الدین دہلوی لکھتے ہیں:

فرض نماز کے بعد دعا مانگو اور جب مانگو تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ (فتاوی نذیریہ جلد ۱ ص۵۶۷)

یہ چار حوالے غیر مقلد علماء کے ہیں افسوس کہ غیر مقلد عوام مطلق تقلید سے انکار کے باعث خود اپنے ان علماء کی بات ماننے کو بھی تیار نہیں۔

۱۲۔ نماز وتر کا مسئلہ

وتر کی کم از کم تین رکعات ہیں اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام عمل تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھتے تھے (ثم یصلی ثلاثًا)۔ (صحیح بخاری جلد ۱ ص۱۵۴، صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۵۴) حضرت عبداللہ بن عباس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ تین وتر ادا کرتے تھے۔ ثم اوتر بثلاث (صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۶۱) پھر ان تینوں رکعات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے ان کا ذکر بھی کتب حدیث میں موجود ہے (دیکھئے جامع ترمذی جلد ۱ ص۹۳) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تین وتر پڑھنا نہیں چھوڑوں گا حتی کہ اگر مجھے کوئی اس کے بدلے کتنے ہی سرخ اونٹ پیش کرے تو بھی میں یہ عمل ترک نہیں کر سکتا۔

ما احب انی ترکت الوتر بثلاث وان لی حمر النعم۔ (موطا امام محمد ص۱۵۰، سنن نسائی جلد ۱ ص۲۴۸)

جمہور صحابہ کرام تین وتر پڑھنا ہی پسند کرتے تھے۔ امام ترمذی لکھتے ہیں:

وقد ذهب قوم من اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم وغیرهم الی هذا ورأوا ان یوتر الرجل بثلاث ..... قال سفیان والذی استحب ان یوتر بثلاث رکعات وهو قول ابن المبارك واهل الکوفة۔ (جامع ترمذی جلد ۱ ص۶۱)

جولوگ حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت ہے۔ سو یہ صحیح نہیں۔ امام دارالہجرہ امام مالکؒ اس حدیث پہ بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ولیس علی ھذہ العمل عندنا ولکن ادنی الوتر ثلاث۔

(موطا امام مالک صہ ۴۷)

(ترجمہ) ہمارے ہاں اس پر عمل نہیں ہے وتر کی کم از کم مقدار تین رکعت ہے۔

حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد کے نزدیک ایک رکعت کے ساتھ وتر کرنا جائز ہے لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وتر تین ہی ہیں۔ گو دو سلام سے ہوں۔ جولوگ رمضان میں عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ائمہ حرمین تین رکعات وتر ہی پڑھتے ہیں مگر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ نہ جاننے والے لوگ آخری رکعت کو بوجہ درمیان میں سلام پھیرنے کے ایک رکعت سمجھنے لگتے ہیں ایسا ہرگز نہیں۔ اگر ان کے نزدیک وتر صرف اور صرف ایک ہی رکعت ہوتی تو اس ایک رکعت سے قبل ادا کی گئی دو رکعتوں کو وہ کیا کہتے ہوں گے۔ یہ بھی ان سے معلوم فرمالیجئے۔ کیا وہ تراویح بائیس ۲۲ رکعت پڑھتے ہوں گے۔

جولوگ نماز عشاء کے چار فرض اور دو سنت ادا کرنے کے بعد صرف ایک رکعت وتر ادا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل درست نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ایک رکعت نماز سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتیرا سے منع فرمایا ہے۔

نہی عن البتیرا ان یصلی الرجل واحدۃ یوتر بہا۔ (اعلاء السنن جلد ۶ صہ ۵۳، بحوالہ کتاب التمہید لابن عبدالبر)۔

(ترجمہ) حضورؐ نے نماز بترا سے منع فرمایا ہے وہ نماز یہ ہے کہ کوئی شخص ایک رکعت پڑھکر اسے ایک ہی رکھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

ما اجزأت رکعة قط۔ (موطا امام محمد ص۱۵۱) کہ ایک رکعت کبھی کفایت نہیں کرتی۔
رہی یہ بات کہ وتر میں سلام کس وقت کیا جائے۔ دو رکعت پڑھکر سلام کرے یا تیسری رکعت کے آخر میں۔؟ تو پیش نظر رہے کہ حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں سلام پھیرتے تھے۔ ولا یسلم الا فی آخرھن (سنن نسائی جلد ا ص۲۵۱) حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ آپ وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہ پھیرتے تھے۔ لا یسلم فی رکعتی الوتر۔ (طحاوی جلد ا ص۱۳۱) سیدنا حضرت ابوبکر کی تدفین رات کے وقت تھی حضرت عمر نے ابھی وتر نہیں پڑھے تھے حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی تدفین کے بعد حضرت عمر نے فرمایا۔

انی لم اوتر فقام وصففنا وراثہ فصلی بنا ثلاث رکعات لم یسلم الا فی آخرھن (معانی الآثار)

میں نے ابھی تک وتر نہیں پڑھے پس آپ وتر پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے ہم نے آپ کے پیچھے صف باندھ لی انہوں نے وتر کی تین رکعات پڑھائیں اور صرف آخری رکعت پر سلام پھیرا (امداد الباری جلد ا ص۲۳)

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ۔ صلوۃ المغرب وتر صلوۃ النہار (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ ص۸۱، موطا امام مالک ص۴۷) جس طرح مغرب کی نماز کی دوسری رکعت پر سلام نہیں پھیرا جاتا آخر میں سلام پھیرتے ہیں اسی طرح رات کی وتر میں بھی سلام آخر میں پھیرا جائے حضرت انس کا بھی اس پر عمل تھا۔ انہ اوتر بثلاث لم یسلم الا فی آخرھن۔ (المصنف جلد ۲ ص۹۱) پھر آگے تابعین کا طریقہ بھی یہی رہا جس کی تفصیل کتب حدیث میں موجود ہے۔ جو لوگ صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں اور صل رکعۃ واحدۃ سے دلیل لاتے ہیں حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی (۸۵۲ھ) تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال کہ وتر کی ایک ہی رکعت ہے صحیح نہیں۔

وتعقب بانہ لیس صریحًا فی الفصل فیحتمل ان یرید بقولہ صل رکعۃ واحدۃ ای مضافۃ الی رکعتین مما مضی۔
(فتح الباری جلد ۵ ص۱۶۲)

(ترجمہ) وتر کی ایک رکعت صریحاً ثابت کرنے پر تعاقب کیا گیا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے آپؐ کے ارشاد صل رکعۃ واحدۃ کا مطلب یہ لیا جائے کہ اس رکعت کو پہلی دو رکعتوں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ (یہی تین وتروں کی کم از کم مقدار ہے)۔

حافظ ابن حجر علامہ ابن صلاح سے نقل کرتے ہیں کہ:

لا نعلم فی روایات الوتر مع کثرتھا انہ علیہ الصلاۃ والسلام اوتر بواحدۃ فحسب (تلخیص الحبیر جلد ۲ صـ۱۵)

وتر کی روایات باوجود کثیر ہونے کے ہم نہیں جانتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی صرف ایک رکعت کبھی پڑھی ہے۔

۱۳۔ وتر میں دعائے قنوت کا مسئلہ

وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت رکوع سے قبل تکبیر کے بعد پڑھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول رہا ہے۔ البتہ آپ نے مخصوص حالات میں رکوع سے بعد بھی قنوت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن عام حالات میں آپ رکوع سے قبل ہی قنوت پڑھتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا گیا کہ قنوت رکوع سے قبل ہے یا بعد؟ آپ نے فرمایا کہ پہلے۔ آپ سے کہا گیا کہ کسی نے آپ سے یہ بات منسوب کی ہے کہ آپ کہتے ہیں قنوت رکوع کے بعد ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جھوٹ کہتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف ایک ماہ قنوت رکوع کے بعد پڑھی تھی۔

قال قبلہ قلت فان فلانا اخبرنی عنک انک قلت بعد الرکوع فقال کذب انما قنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الرکوع شھرًا۔ (صحیح بخاری جلد ۱ صـ۱۳۶)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قنوت کے بارے میں عام معمول اسے رکوع سے پہلے پڑھنا ہے۔ اگر آپ کا معمول ہمیشہ رکوع کے بعد قنوت پڑھنا

ہوتا تو حضرت انس کبھی یہ نہ کہتے کہ آپ نے صرف ایک ماہ اس طرح کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب بھی فرماتے ہیں کہ دعائے قنوت آپ رکوع سے قبل ہی پڑھا کرتے تھے۔ ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کان یوتر فیقنت قبل الرکوع۔ (نسائی جلد ۱ ص۲۴۸ / ابن ماجہ ص۸۴)۔

حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔

عن علقمۃ ان ابن مسعود واصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوایقنتون فی الوترقبل الرکوع۔ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ ص۹۷)

حضرت عبداللہ بن عمر کا طریقہ بھی یہ ہے۔

ان ابن عمر قنت فی الوترقبل الرکوع۔ (ایضاً جلد ۲ ص۹۶)

یہ آپ کی ہمیشہ کی سنت نہ تھی۔

۱۴۔ فجر کی دو سنتوں کا مسئلہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو سنتوں کی بہت زیادہ پابندی اور حفاظت فرماتے تھے۔ اشد تعاھدًا منہ علی رکعتی الفجر (صحیح بخاری جلد ۱ ص۱۵۶، صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۵۱) آپ یہ بھی فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز سے قبل دو رکعتیں پڑھنے کی جو جلدی ہوا کرتی تھی کسی اور نفل کی اتنی نہیں ہوتی تھی۔ اسرع منہ الی الرکعتین قبل الفجر (صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۵) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بھی ان دو رکعتوں کی پابندی کی شدید تاکید فرمائی اور اس پر سختی سے عمل کرنے کا حکم فرمایا۔ یہاں تک ارشاد فرمایا کہ تم فجر کی دو رکعتوں کو نہ چھوڑنا خواہ تمہیں گھوڑے روند ڈالیں۔ (سنن ابی داؤد جلد ۱ ص۱۹۵) قضا نمازوں میں عام طور سے فرائض وواجبات کی ادائے گی ہوتی ہے۔ سنن ونوافل کی نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ التعریس میں نماز فجر کی قضا کرتے ہوئے فجر کی دو سنت کو بھی قضا فرمایا (صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۳۸۔ ابو داؤد جلد ۱ ص۷۹) اس سے پتہ

چلتا ہے کہ فجر کی دو سنت کا درجہ دوسری سنن و نوافل سے کہیں بڑھا ہوا ہے اور وجوب کے قریب قریب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تاکیدات کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب فرض نماز کھڑی ہو جائے تو مقتدیوں کو چاہیئے کہ جماعت میں شریک ہوں لیکن نماز فجر کی جماعت میں شامل ہونے سے قبل سنت ادا کریں بشرطیکہ جماعت فوت ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ حضرت نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو نماز فجر کے لئے اٹھایا اس وقت نماز کے لئے اقامت کہی جا چکی تھی۔ تاہم حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے جماعت میں شامل ہونے سے قبل دو رکعت سنت ادا کی۔

وقد اقیمت الصلوٰۃ فقام فصلی رکعتین۔ (طحاوی جلد ا صـ۱۸۳)

حضرت عبد اللہ بن عباس ایک مرتبہ نماز فجر کے لئے آئے اس وقت امام نماز فجر شروع کر چکا تھا اور آپ نے ابھی دو رکعت سنت ادا نہ کی تھی چنانچہ آپ نے پہلے دو رکعت سنت ادا فرمائی پھر جماعت میں شامل ہو گئے۔

فصلی عبد اللہ بن عباس الرکعتین خلف الامام ثم دخل معہم۔ (ایضاً)

حضرت ابوالدرداءؓ کا بھی یہی عمل رہا کہ اگر جماعت کھڑی ہو گئی ہوتی اور آپ نے سنت ادا نہ کی ہوتی تو پہلے آپ دو رکعت سنت ادا فرماتے پھر جماعت میں مل جاتے (ایضاً) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ساتھ بھی ایک مرتبہ یہی واقعہ پیش آیا آپ نے بھی اسی طرح کیا۔ اس وقت حضرت ابو موسی اشعریؓ اور حضرت حذیفہؓ بھی موجود تھے دونوں حضرات نے آپ پر کوئی نکیر نہ فرمائی۔

لا ینکران ذلک علیہ فدل ذلک علی موافقتہما ایاہ۔ (ایضاً۔ المصنف لعبد الرزاق جلد ۲ صـ۴۴۴)

حضرت ابو عثمان النہدی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کے دور میں آپ نمازؓ

شروع کر چکے ہوتے اور ہم نے سنت ادا نہ کی ہوتی تو ہم مسجد کے ایک گوشے میں سنت ادا کرتے پھر جماعت میں مل جاتے۔ فنصلی الرکعتین فی آخر المسجد ثم ندخل مع القوم فی صلاتہم (طحاوی)

حضرت عمر فاروق کا اس پر انکار کرنا کہیں نہیں ملتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے کہ نماز فجر شروع ہو چکی ہو اور اس نے سنت ادا نہ کی ہو تو اسے دو سنت پڑھنے کی اجازت ہے حضرات صحابہ کرام کا اس پر عمل رہا ہے۔ ہاں اگر دو سنت ادا کرنے میں جماعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر جماعت میں شامل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو سنتوں میں چھوٹی چھوٹی سورتوں کو تلاوت کرنے کی تعلیم دی ہے۔

رہی یہ بات کہ حدیث میں اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ وارد ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے منع فرماتے ہیں کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو تم کوئی نماز پڑھو۔ تو پیش نظر رہے کہ یہ عند التحقیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں۔ صحیح بخاری میں یہ امام بخاری کا اپنا ترجمۃ الباب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض طرق میں اسے حضورؐ کا ارشاد بھی بتلایا گیا، مگر تحقیقاً یہ حضرت ابو ہریرہ کا ارشاد ہے۔ اس روایت کے ایک مرکزی راوی حضرت عمرو بن دینار ہیں آپ کے شاگرد حضرت حماد بن زید جو پہلے اس روایت کو ایوب بحوالہ عمرو بن دینار مرفوعاً سن چکے تھے جب عمرو بن دینار سے خود ملے تو انہوں نے اسے موقوف بتلایا جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت مرفوع نہیں، آپ خود فرماتے ہیں ثم لقیت عمروا فحدثنی ہ ولم یرفعہ (صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۴۷)

حضرت امام بخاری کے ترجمۃ الباب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو یہ روایت ملی تھی آپ نے اسے متن میں جگہ نہیں دی۔

۲۔ اگر اس بیان کا مطلب صرف یہی ہوتا کہ نماز فجر کی جماعت شروع ہو جائے

تو پھر کوئی نماز نہ پڑھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جلیل القدر صحابہ کرام فجر کی جماعت ہوتے ہوئے دوسنت کس لئے ادا فرماتے تھے۔ ان کا عمل واضح کررہا ہے کہ نمازِ فجر کی جماعت میں شامل ہونے کی امید ہو تو دوسنت ادا کرلینا اس روایت کے معارض نہیں ہے۔ جو احباب اس مسئلے میں اپنے موقف پر اصرار کرتے ہیں اور دوسروں کو رد کرتے ہیں اور عمل کرنے والوں کو مخالف حدیث کے طعنے دیتے ہیں وہ کوئی حدیث کی خدمت نہیں کررہے ہیں۔

(نوٹ) اس حدیث کے آخری الفاظ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ ۔ میں جگہ کی کوئی قید مذکور نہیں ظاہر یہ ہے کہ اگر ایک جگہ فرض نماز کھڑی ہو جائے تو اب کہیں بھی کوئی اور نماز نہ ہو سکے گی؟ پورے شہر میں؟ کسی دوسری مسجد میں بھی نہ ہو سکے گی؟ گھر میں بھی کوئی شخص سنتیں نہ پڑھ سکے گا؟ کچھ تو حد بندی ہونی چاہئے کہ کہاں تک نہ ہو سکے گی؟ افسوس کہ مانعین اب تک اس پر کوئی حدیث پیش نہیں کرسکے۔ سو حدیث کو اگر اس کے ظاہر پر رکھا جائے تو پھر کہیں بھی کسی اور کی نماز نہ ہو سکے گی لازم باطل ہے تو ملزوم بھی باطل ٹھہریگا۔

۱۵۔ جمع بین الصلوٰتین کا مسئلہ

اللہ نے ہر فرض نماز کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے۔ ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابًا موقوتا (پ النساء) بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقررہ وقتوں میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ فصلوا الصلوٰۃ لوقتہا (المصنف جلد ۲ ص۳۷۲) نماز اپنے وقت میں ادا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کوئی نماز بغیر وقت کے نہیں پڑھی (سوائے ایام حج میں عرفات اور مزدلفہ میں) (نسائی جلد ۲ ص۳۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ان للصلوٰۃ وقتا کوقت الحج (المصنف لعبدالرزاق جلد ۲ ص۳۷۲) نماز کا ایک وقت مقرر ہے جس طرح حج کا ایک وقت مقرر ہے۔ جس طرح حج کے ایام اور اس کے اوقات مقرر

ہیں یعنی ذی الحج کا مہینہ اور اس کے پانچ دن۔ (اس کے علاوہ دنوں میں خانہ کعبہ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں جانے والا کوئی شخص اگر یہ کہے کہ میں نے حج کرلیا ہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں) اسی طرح نماز کو اپنے وقت سے پہلے ادا کرنے والے کی نماز نہیں ہوتی اور موخر کرکے پڑھنے والا قضا کرنے والا شمار ہوتا ہے ادا کرنے والا نہیں اور وہ گنہگار ہوتا ہے۔ جو لوگ بغیر کسی عذر کے اپنی نمازوں کو موخر کرکے دوسری نمازوں کے ساتھ ادا کرتے ہیں وہ گناہ کا کام کرتے ہیں حضرت عمر فاروق نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ:

ان جمعًا بین الصلوتین من الکبائر الا من عذر (المصنف جلد۲ ص۵۵۲)

آپ یہ بھی فرماتے ہیں:

الجمع بین الصلوتین فی وقت واحد کبیرة من الکبائر۔

(موطا امام محمد ص۱۳۲)

ایک وقت میں دو نمازوں کو جمع کرکے پڑھنا گناہ کبیرہ میں سے ہے۔

۱۶۔ جمع بین الصلوتین کی چند صورتیں۔

۱۔ ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت ادا کرنا۔ ۲۔ ظہر اور عصر کو عصر کے وقت ادا کرنا۔
۳۔ مغرب اور عشاء کو مغرب کے وقت ادا کرنا۔ ۴۔ مغرب اور عشاء کو عشاء کے وقت ادا کرنا

پہلی اور تیسری صورت جمع تقدیمی ہے اور دوسری اور چوتھی صورت جمع تاخیری ہے۔ آپ دیکھیں کہ پہلی اور تیسری صورت میں ایک ایک نماز اپنے غیر وقت میں ادا کی گئی اور دوسری اور چوتھی صورت میں بھی ایک نماز اپنے غیر وقت میں ہوئی جبکہ قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر نماز کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ اب یہ غیر وقت میں ادا کی گئی نماز کسطرح درست اور جائز سمجھی جائے گی۔ جو لوگ صحیح بخاری کے حوالہ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ نے نماز فجر کو غیر وقت میں ادا کیا ہے۔ صلی الفجر قبل میقاتہا۔ اس لئے غیر وقت میں

نماز ادا کرنا حدیث سے ثابت ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس حدیث سے ان کا یہ استدلال درست نہیں ۔ اس حدیث کے معنی یہ نہیں جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کا جو روزانہ کا معمول تھا اس معمول سے کچھ پہلے آپ نے ادا کی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو اپنے وقت کے علاوہ میں ادا کریں ۔ امام نووی لکھتے ہیں :

قبل میقاتہا ھو قبل وقتہا المعتاد لا قبل طلوع الفجر لان ذلک لیس بجائز باجماع المسلمین ۔ (نووی شرح مسلم جلد ا ص۴۱۷)

رہی یہ بات کہ میدان عرفات میں ظہر اور عصر کو جمع تقدیمی کے ساتھ اور مزدلفہ میں مغرب و عشاء کو جمع تاخیری کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر سے ثابت ہے ۔ اس لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے ۔ (نسائی جلد ا ص۱۰۱)

سو جمع بین الصلوتین کی یہ مذکورہ صورت سوائے عرفات اور مزدلفہ کے کہیں جائز نہیں ہے ۔ اور احادیث میں اس کے علاوہ جمع کی جو صورتیں سامنے آئی ہیں وہ جمع صوری ہیں جمع حقیقی نہیں ۔

جمع صوری کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز اپنے وقت میں ادا کی گئی یعنی پہلی نماز کو اس کے آخر وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے اول وقت میں ۔ بظاہر یہ جمع نظر آ رہی ہے لیکن یہ صرف صورۃً ہے ۔ دیکھنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ دونوں کو اکھٹے پڑھا ۔ لیکن حقیقت میں دونوں اپنے اپنے وقت میں ادا کی گئیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرفات اور مزدلفہ کے علاوہ جمع بین الصلوتین کا جو عمل ملتا ہے وہ اسی صورت پر مبنی ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ :

ما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلوٰۃ بغیر میقاتہا الا صلوتین جمع بین المغرب والعشاء ۔ (صحیح بخاری جلد ا ص۲۲۸)

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز غیر وقت میں ادا کی ہو سوائے دو نمازوں کے (کہ آپ نے موسم حج میں) مغرب اور عشاء کو جمع فرمایا۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر نماز کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ اور اسی وقت مقرر میں نماز ادا کی جانی چاہئے۔ برطانیہ میں غیر مقلد دوستوں نے اس مسئلے کو یہ رنگ دے رکھا ہے کہ سفر و حضر دونوں حالتوں میں جمع بین الصلوٰتین کی عام اجازت ہے اور جمع بین الصلوٰتین سے ان کی مراد جمع تقدیم و جمع تاخیر ہوتی ہے۔ یہاں غیر مقلد دوست جب کسی جلسے میں آتے جاتے ہیں تو راستے میں موٹروے پر ایک جگہ بس کھڑی کر کے ایک ہی وقت میں دونوں نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں اپنے وقت کی نماز ادا کی جائے اور اس سے اگلی نماز اس کے وقت میں ادا ہو۔ تو وہ فوراً یہ جواب دیتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی حالت میں دونوں نمازوں کو ایک ہی وقت میں جمع کر کے پڑھا ہے۔ اور یہ بات حدیث سے ثابت ہے۔

ان حضرات کا حدیث سے استدلال درست نہیں۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز (سوائے ایام حج میں عرفات و مزدلفہ کے) اپنے غیر وقت میں ادا نہ فرمائی۔ آپؐ سے جہاں جمع کی صورتیں ملتی ہیں وہ جمع صوری ہی ہیں۔ مسلم شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں:

> اس حدیث میں جمع بین الصلوٰتین سے مراد جمع صوری ہے یعنی ظہر کو اسکے آخر وقت میں اور عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھا و علیٰ ہٰذا القیاس مغرب اور عشاء کو پڑھا۔ اس جواب کو علامہ قرطبی نے پسند کیا اور امام الحرمین نے اس کو ترجیح دی ہے اور رقد ماریں سے

ابن الماجشون اور طحاوی نے اسی کے ساتھ جزم کیا ہے اور ابن سیدالناس نے اس کو قوی بتایا ہے اس وجہ سے کہ اس حدیث کے راوی ابوالشعثاء (جنہوں نے اس کو حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے) کا بھی یہی خیال ہے کہ اس حدیث میں جمع سے جمع صوری مراد ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں جمع سے جمع صوری مراد ہونا متعین ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ جلد ۱ ص۶۴۵)

بعض غیر مقلد دوست صحیح بخاری کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ جمع بین الصلوٰتین (یعنی جمع تقدیم و جمع تاخیر) جائز ہے۔ معروف غیر مقلد عالم مولانا شرف الدین دہلوی فرماتے ہیں کہ اس روایت سے استدلال درست نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

استدلال صحیح نہیں۔ اسلئے کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث مجمل اور مختصر ہے اس سے گو بظاہر جمع حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ جمع صوری ہے (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۶۱۵)

سو جمع بین الصلوتین جمع صوری کی صورت میں بالاتفاق جائز ہے لیکن جمع تقدیم اور جمع تاخیر یعنی نمازوں کو اس کے غیر وقت میں ادا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف ہے۔ اور خود قرآنی حکم کی مخالفت ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ نے حضر میں بلا کسی عذر کے جمع بین الصلوتین کیا تھا تو یہ صحیح نہیں اور نہ ہی آج تک کسی کا اس پر عمل رہا ہے۔ حضرت م ترمذی لکھتے ہیں کہ ترمذی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اعمال نقل کئے گئے اس پر کسی نہ کسی کا کسی نہ کسی درجے میں عمل رہا لیکن اس پر کسی کا عمل نہیں رہا۔ اگر یہ بات ثابت ہوتی تو کسی نہ کسی کا اس پر ضرور عمل ہوتا۔ امام ترمذی لکھتے ہیں:

جمیع مافی ھذا الکتاب من الحدیث ھو معمول بہ وبہ اخذ بعض اھل العلم ماخلا حدیثین حدیث ابن عباس

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جمع بین الظہر والعصر بالمدینۃ والمغرب والعشاء من غیر خوف ولا سفر ولا مطر۔
(جامع ترمذی جلد ۲ ص ۲۳۵)

۱۷۔ جمعہ کی دو اذان کا مسئلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین کے دور میں جمعہ کے لئے ایک اذان ہوا کرتی تھی جو خطیب کے سامنے دی جاتی تھی، جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا اور لوگوں کی کثرت ہوگئی تو حضرت عثمانؓ نے اس اذان سے قبل ایک اور اذان دینے کا حکم فرمایا، صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ کسی نے بھی آپ کے اس فرمان پر اعتراض نہیں کیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ سب صحابہ نے آپ کی تصدیق و تائید کی۔ یہ گویا صحابہ کرام کا اجماع تھا۔ کتب احادیث میں کہیں بسند صحیح اس بات کی تصریح نہیں کہ کسی ایک صحابی نے بھی آپ پر نکیر فرمائی ہو۔ حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ جس وقت یہ بات پیش آئی۔ موذن نے اذان دی۔ فثبت الامر علی ذلک (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۲۴) یعنی اس پر صحابہ کا اجماع ہوگیا۔

غیر مقلد علماء جمعہ کے دن اذان اول کو بدعت عثمانی کہہ کر اس پر عمل نہیں کرتے اور جو لوگ عمل کرتے ہیں انہیں حضرت عثمانؓ کی تقلید کا طعنہ دیتے ہیں۔ جس طرح بیس رکعات تراویح پڑھنے کو بدعت عمری کہتے ہیں اور یہ لوگ بیس رکعات پڑھنے والے کو بدعتی کہتے ذرا نہیں شرماتے۔ حق یہ ہے کہ جمعہ کے دن اذان اول دینا کوئی بدعت نہیں بلکہ سنت ہے۔ اور ہم یہ دونوں باتیں غیر مقلدین کے پیشوا شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلوی مرحوم سے پیش کئے دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"جب حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ ہوا اور آپ نے لوگوں کی کثرت دیکھی آپ نے خطبہ کی اذان سے پہلے ایک اور اذان صحابہ کرام کی موجودگی میں جاری

کی اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اور جب یہ ہے تو اذان مذکورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خلفائے راشدین کی سنت میں داخل ہے۔ جو لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں یہ ان کی غلط فہمی ہے"۔ (فتاویٰ نذیریہ جلد ۔ فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۴۳۶)

جمعہ کی دو اذان کو بدعت کہنے والے مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد جوناگڑھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صریح بدعت ہے کسی طرح جائز نہیں (فتاویٰ اہلحدیث جلد ۲ ص۱۰۶) مولانا شرف الدین دہلوی کے نزدیک اسے بدعت کہنے والے صحابہ کی دیانت پر حملہ کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"جب حضرت عثمان نے یہ اذان کہلوائی تو اس وقت ہزارہا صحابہ موجود تھے کسی نے اس کو نہیں بدلوایا نہ عام طور پر مخالفت کی پھر جمہور صحابہ پر حملے کرنا کس قدر جرأت ہے" (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۴۳۵)

مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

میرے نزدیک بروز جمعہ دو اذانیں سنت ہیں . . . . لہٰذا بروز جمعہ دو اذانیں سنت ہیں (فتاویٰ علماء اہل حدیث جلد ۲ ص۱۷۸)

(جاری)

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام
کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور
اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزین کرنے کا فیصلہ
کیا جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی محبین
و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے
بہتر ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام
سر انجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس
طرح بھی خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید
سرگرمی کے ساتھ بھرپور تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائینگے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس
میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی
کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے
اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقربا کو بھی اسکی ترغیب دیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات
چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 6007 ح

اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

دارالعلوم

کی خصوصی اشاعت وفیات نمبر

ماہ ذیقعدہ تا صفر المظفر سنہ ۱۴۱۷ھ

مطابق اپریل تا جولائی سنہ ۱۹۹۶ء

فی شمارہ -/۶ سالانہ -/۶۰

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند سہارنپور، یوپی

سالانہ بدل اشتراک:
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۴۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰ ہندوستان سے -/۶۰

PH NO 35428 COD - 01336 PIN - 247554

ختم خریداری کی اطلاع

- ◯ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ● چوں کہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- ● پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤدو الابراہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- ● بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

موت ! زندوں اور مردوں کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کر دیتی ہے جس سے ان کے مابین زندگی میں موجود سارے روابط ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے اس دنیا میں جن شخصیتوں سے کسی بھی نوعیت کا رابطہ ہوتا ہے ان کے یہاں سے رخصت ہو کر دار آخرت کی طرف روانہ ہونے پر غم ایک فطری جذبہ ہے، جس کا اظہار آنسوؤں اور جانے والے کے اوصاف و کمالات کی یادوں سے ہوتا ہے۔ غم کے یہی آنسو جب قلم کے ذریعہ صفحہ قرطاس پر ثبت ہو جاتے ہیں تو انہیں تاریخ ادب میں وفیات سے موسوم کیا جاتا ہے ــ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کا یہ خصوصی شمارہ" وفیات نمبر" ان مضامین کا مجموعہ ہے جو تقریباً بارہ سال کی مدت میں جانے والوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ بلاشبہ اس میں بعض اہم بزرگوں اور علمی و ادبی شخصیتوں کا تذکرہ نہیں جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کا دارالعلوم دیوبند سے کوئی رابطہ نہیں تھا یا جان بوجھ کر ان سے اعراض برتا گیا ہے بلکہ اس کی خاص وجہ میری مصروفیات ہیں کہ باوجود اس ارادہ کے ان پر کچھ لکھا جائے، بسا اوقات یہ مصروفیتیں ارادہ و عمل کے درمیان حائل ہو گئیں۔

حرفِ آغاز کی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ ملک کے مشہور اسلامی مورخ حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے سانحہ ارتحال کی اندوہناک خبر ملی بلاشبہ حضرت قاضی صاحب کی وفات سے علمی و تاریخی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا پُر ہونا دور حاضر میں بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ آئندہ شمارہ میں انشاء اللہ حضرت قاضی صاحب پر مفصل مضمون لکھا جائے گا۔

∴ ∴ ∴

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

رحمۃ اللہ علیہ

واحسرتاہ! کہ ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء یوم دوشنبہ کو دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم خطیب العصر حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب نبیرہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ طویل علالت کے بعد اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ نور اللہ مرقدہٗ و برد اللہ مضجعہ۔

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر مسافر کی آخری منزل موت ہے اور یکے بعد دیگرے سب کو اس منزل پر پہنچنا ہے۔ اس لئے اس دنیا سے کسی کا کوچ کر جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض شخصیتیں ایسی گوناگوں خصوصیات اور ہمہ گیر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں کہ ان کا اس عالم سے رخصت ہو جانا واقعتاً ایک عظیم حادثہ ہوتا ہے جن کے فراق اور جدائی سے پوری قوم و ملّت سوگوار ہو جاتی ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی ذات گرامی ان ہی ممتاز و منفرد شخصیتوں میں سے ایک تھی۔

حضرت قاری صاحب مرحوم و مغفور اس دور میں نہ صرف ہندوپاک بلکہ پورے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور مشہور ترین رجال علم دین میں سے تھے۔ شخصی وجاہت اور علمی تبحر کے ساتھ خطابت و تقریر میں آپ کو ایسا ملکہ حاصل تھا جس کی نظیر اس دور میں پیش نہیں کی جا سکتی، اسرار و حکم بالخصوص فلسفۂ ولی اللّٰہی اور حکمت قاسمی کی توضیح و تشریح آپ کا دلچسپ موضوع تھا مسلک دیوبند

کے ترجمان وشارح کی حیثیت سے علمار کی صف میں جو مقام حاصل تھا وہ ان کے
معاصرین میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ عالمی شہرت ووقعت کے بلند تر مقام پر فائز
ہوتے ہوئے تواضع، انکساری اور شرافت نفس کا مجسمہ تھے، متانت وقار، رافت
ومروت اور لحاظ وپاسداری آپ کی عادت ثانیہ تھی۔ تصنیف وتالیف کا نہایت
ستھرا ذوق پایا تھا۔ دارالعلوم کے اہتمام کی ہمہ جہت مصروفیات اور کثرت اسفار
کے باوجود تصنیفات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ آپ کی علمی یادگار رہے جس میں بعض
کتابیں اپنے موضوع کی گیرائی اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر
میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

تاریخ ولادت اور علمی نشوونما

محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء یک شنبہ کو آپ کی پیدائش ہوئی، تاریخی
نام مظفرالدین اور اصلی نام محمد طیّب تجویز ہوا۔ حضرت قاری صاحب نے ایسے
گہوارے میں آنکھ کھولی جو علم وفضل کا مرکز تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا
حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب نسبت عالم ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند
کے مہتمم اور مرجع علمار وفضلار تھے۔ اس لئے گھر کا پورا ماحول علم دین اور نیت دعا
کی خوشبو سے رچا بسا تھا جس کا طبعی طور پر حضرت قاری صاحب کی نشوونما
پر نہایت اچھا اثر پڑا اور بچپن ہی سے دل ودماغ علم وعلمار کی عظمت ومحبت
سے مانوس ہوگئے تھے۔

سن شعور کو پہنچے تو خاندانی روایت کے مطابق علمار وصلحار کے ایک
بڑے مجمع میں آپ کی رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور مکتب میں بٹھادیا گیا۔ حضرت مولانا
فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیان دارالعلوم نے موقع کی مناسبت سے اسوقت
ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا۔

مکتب طیب کی مبارک تقریب　　　کچھ عجب طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
رَبِّ یَسِّرْ جو کہا اس نے تو بے روئے رہا　　　فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر
مقطع کے آخری جملہ تمم بالخیر سے رسم بسم اللہ کی تاریخ نکلتی ہے جو ۱۳۲۴ھ ہے۔

حفظ قرآن اور تحصیل وتجوید

حضرت قاری صاحب کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں اساتذۂ دارالعلوم بالخصوص حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہم نے آپ کی آبائی نسبت اور خاندانی وجاہت وشرافت کے پیش نظر خصوصی توجہ سے کام لیا اور خود آپ کے والد ماجد کو بھی اس کا خاصا اہتمام تھا چنانچہ عام روش کے برخلاف آپ کو حفظ قرآن تجوید کے ساتھ کرایا گیا اور اس کے لئے مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب الہ آبادی کو ذاتی طور پر بلا کر اپنے گھر پر رکھا بعد میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے مشورہ سے قاری صاحب موصوف کو باقاعدہ دارالعلوم میں مدرس رکھ لیا گیا تو حضرت قاری صاحب بجائے گھر میں پڑھنے کے باقاعدہ دارالعلوم میں داخل ہو گئے اور دو سال کی قلیل مدت میں پورا قرآن مجید با تجوید حفظ کر کے ۱۳۲۶ھ میں شعبہ تحفیظ القرآن سے فارغ ہو گئے۔ اسی وقت سے لفظ قاری آپ کے نام کے ساتھ لگ گیا اور پھر اس طرح چسپاں ہوا کہ نام کا گویا جزء بن گیا۔

ابتدا عمر میں قاری صاحب کی آواز نہایت بلند اور دلکش تھی، اپنے ہم عصر طلبہ میں خوش آوازی میں ممتاز ومنفرد درجہ رکھتے تھے۔ حضرت قطب ارشاد مولانا گنگوہی کے خلف اکبر مولانا حکیم مسعود احمد قدس سرہٗ اور دیگر اکابر دارالعلوم بطور خاص آپ سے قرآن کریم کا رکوع پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

تعلیم فارسی

حفظ قرآن سے فراغت کے بعد ۱۳۲۷ھ میں آپ کو درجۂ فارسی میں داخل کیا گیا اور تین سال کی مدت میں فارسی کے

مروجہ نصاب کی تکمیل کے ساتھ ریاضی، حساب، جغرافیہ وغیرہ کی بھی تحصیل کرلی اور اسی کے ساتھ ساتھ تجوید کی کتابیں بھی پڑھتے رہے آپ کے فارسی کے اساتذہ میں مولانا محمد لیٰسین صاحب والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مولانا موصوف فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اپنے طویل تجربہ اور طریقۂ تعلیم کی خوبی کی بنا پر مختصر سی مدت میں اپنے تلامذہ کے اندر فارسی زبان کا اچھا خاصا ذوق پیدا کر دیتے تھے چنانچہ ایک طرف استاد کی حسن تعلیم و تربیت اور دوسری جانب آپ کی خداداد ذہانت و فطانت دونوں نے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام کیا کہ دوران تعلیم ہی میں آپ اردو اور فارسی میں غزلیں اور قصائد کہنے لگے تھے۔ فارسی زبان میں اسی پختہ استعداد کا ثمرہ تھا۔ کہ جب آپ نے ۱۳۵۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے نمایندہ کی حیثیت سے افغانستان کا سفر فرمایا تو وہاں آپ نے بالعموم فارسی زبان ہی میں تقریریں کیں اور علمی و دینی سوالات کے جوابات دیئے۔ جس کا وہاں کے لوگوں پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

درجہ عربی میں داخلہ اور درس نظامی کی تحصیل

۱۳۲۹ھ میں درجۂ فارسی کی تکمیل کر کے اگلے سال درس نظامی کی تعلیم و تحصیل کا آغاز کر دیا۔ اور سات سال کے عرصہ میں صرف، نحو، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ، ہیئت، فقہ، اصول فقہ، عقائد، تفسیر وغیرہ پڑھ کر آٹھویں سال دورۂ حدیث میں داخل ہوئے اور محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم سے کتب صحاح ستہ وغیرہ پڑھ کر ۱۳۳۷ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

اسے حضرت قاری صاحب کی خوش نصیبی کہئے یا قدرت کا خصوصی انعام

کہ انہیں تعلیم وتربیت کے ابتدائی دور ہی سے ماہرفن اور پختہ کار اساتذہ کی رہنمائی حاصل رہی، چنانچہ حفظ وتجوید اپنے دور کے ممتاز قاری مولانا قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی سے پڑھا۔ فارسی کی تحصیل مولانا محمد یٰسین دیوبندی سے کی جو فارسی دانی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، فن معقولات میں آپ کے اساتذہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی اور حضرت مولانا غلام رسول خاں جیسے جہابذہ تھے۔ علم فقہ میں اپنے وقت کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور حدیث شریف کی تعلیم اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جو اپنی کثرت معلومات، وسعت مطالعہ، قوت حافظہ اور وقت نظر میں ابن حجر ثانی تھے۔ اور معاصر علماء میں چلتا پھرتا کتب خانہ کے نام سے مشہور تھے۔

درس وتدریس

چونکہ حضرت قاری صاحب کی ابتداء سے لے کر انتہا تک پوری تعلیم دارالعلوم ہی میں ہوئی تھی، آپ کی طالب علمی کا مکمل زمانہ حضرات اکابر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ آپ کی آبائی نسبت، طبعی ذہانت، طبعی شرافت ومتانت اور علمی مناسبت روز روشن کی طرح سب پر آشکارا تھی، اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کو دارالعلوم کے شعبۂ تدریس میں لے لیا گیا اور شروع میں ابتدائی درجات کی کتابیں آپ کے زیر درس رکھی گئیں۔ علمی استعداد اور زبان وبیان پر قابو یافتہ ہونے کی بناء پر آپ کے درس کو تھوڑی ہی مدت میں قبول عام حاصل ہوگیا اور چند ہی سالوں میں وسطی اور علیا کی کتابیں آپ کے زیر درس آگئیں۔ تدریس کا یہ سلسلہ آخر تک

قائم رہا اگرچہ اسفار کی کثرت اور کار اہتمام میں مشغولیت کی بنا پر درس کا موقع کم ہی ملتا تھا لیکن جب بھی فرصت ملجاتی تو حجۃ اللہ البالغہ یا کسی حدیث کی کتاب کا درس ضرور دیتے تھے۔

تدریس سے مسند اہتمام پر

ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں جب آپ کے والد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم نظام دکن کی تجویز و طلب پر مشاہرہ ایک ہزار روپئے ماہانہ ریاست دکن کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے مفتی ہوکر حیدرآباد چلے گئے اور اہتمام کی ساری ذمہ داری حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نائب مہتمم پر آپڑی تو اس وقت کی مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا عثمانیؒ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے حضرت قاری صاحب کو نائب مہتمم ثانی مقرر کیا پھر ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ کے اجلاس شوریٰ میں جبکہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (جو حیدرآباد میں قیام کے باوجود منصب اہتمام پر فائز تھے) کو ان کی کبرسنی اور طول علالت کی بنا پر بجائے مہتمم کے اعزازی صدر مہتمم منتخب کیا گیا اور انکی جگہ پر حضرت مولانا عثمانی صاحبؒ مہتمم بنائے گئے، تو حضرت قاری صاحب کو نائب مہتمم اول مقرر کیا گیا مگر ایک جماعت کے اختلاف کی بنا پر جس میں بعض اہم ترین اکابر بھی شامل تھے (۱) حضرت قاری صاحب نے اہتمام کی ذمہ داریوں سے استعفا دیدیا۔ جسے مجلس شوریٰ نے منظور کر کے بمشاہرہ یک صد روپیہ انہیں دوبارہ تدریس میں منتقل کر دیا لیکن دو ڈھائی ماہ کے بعد حضرت مولانا عثمانی کی تحریک و تجویز پر حضرت قاری صاحب کو دوبارہ منصب اہتمام پر فائز کر دیا گیا اور رجب ۱۳۴۸ھ میں حضرت مولانا عثمانی مہتمم دارالعلوم کے سانحہ وفات کے بعد حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ

سرپرست مدرسہ کی حسب ذیل تجویز کے مطابق قائم مقام مہتمم بنا دیئے گئے۔

تجویز حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ

مصالح مدرسہ پر نظر کرکے حتی الامکان جلد سے جلد تجویز ہے کہ ارکان شوریٰ کا جلسہ منعقد کرکے نسبت تقرر مہتمم مستقل و دیگر ضروریات وقتیہ کا فیصلہ کیا جائے جب تک جلسہ میں معاملات مصالح مدرسہ پر نظر کرکے فیصلہ نہ ہو مناسب معلوم ہوا کہ مولوی طیب صاحب کو جو اس وقت تک نائب مہتمم ہیں فوری طور پر عارضی مہتمم مقرر کردیا جائے پھر جلسۂ شوریٰ جو کچھ باقاعدہ طے کرے اس کا اعلان دوبارہ کر دیا جائے گا۔ مزید احتیاطاً اس کی بھی ضروری محسوس ہوئی کہ انعقاد جلسہ اور مسئلہ اہتمام طے ہونے تک قائم مقام مہتمم کی امداد و تقویت کے لئے حضرت مولانا حسین احمد صدر مدرس مدرسہ ہٰذا اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب مدرس مدرسہ اور مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن ناظم تعلیمات مدرسہ کو ان کا مشیر مقرر کیا جائے کہ معمولی کاموں کے علاوہ جو امر اہم پیش آجائے ان تینوں حضرات سے مشورہ کرکے عمل کریں اگر اتفاقاً باہم اختلاف ہو تو سرپرست ایک شق کو ترجیح دے سکے گا۔

اشرف علی رجب ۱۳۴۸ھ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی تجویز کے مطابق اکابر ثلثہ کی رائے اور مشورہ کے ساتھ بحیثیت قائم مقام مہتمم کے آپ نے تقریباً تین ساڑھے تین ماہ کار اہتمام انجام دیا۔ بالآخر شوال ۱۳۴۸ھ کے جلسہ شوریٰ میں باتفاق ارکان مجلس آپ مہتمم منتخب ہوئے اور اپنے علم و فضل، حلم و تدبر اور اہلیت کار کی بنا پر بہت جلد پورے ملک میں مقبولیت و شہرت حاصل کرلی جس

سے دارالعلوم کی عظمت و وقعت میں بھی اضافہ ہوا، اور مکمل نیکنامی اور عزت
واحترام کے ساتھ ۱۴۰۱ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔

خدائے بزرگ وبرتر کا حضرت قاری صاحب کے ساتھ یہ خاص فضل
واحسان رہا کہ ابتداءِ اہتمام ہی سے انہیں معاملہ فہم، مخلص، خیرخواہ اور
صاحب صلاح وتقویٰ بزرگوں کی رفاقت حاصل رہی جس سے ان کے
جوہر کمال کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا چنانچہ جس وقت پورے طور
پر نیابت اہتمام کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اس وقت حضرت مولانا
حبیب الرحمٰن عثمانی علا مسند اہتمام کے صدر نشین تھے۔ حضرت مولانا عثمانی
رحمۃ اللہ علیہ کا تدبر اور فہم وبصیرت آج بھی حلقۂ دارالعلوم میں ضرب المثل
ہے چونکہ حضرت مولانا عثمانیؒ کو خانوادہ قاسمی سے بڑا خاص تعلق تھا خاص
طور پر حضرت قاری صاحب کو تو وہ ایک بیٹے کی طرح سے مانتے جانتے تھے
اور قاری صاحب کی تعلیم وتربیت کے بیشتر مراحل انہی کی زیر نگرانی طے
پائے تھے۔ اس لئے یہ مربیانہ رفاقت اور مشفقانہ اشتراک عمل، اس
ابتدائی دور میں بہت مفید اور کار آمد ثابت ہوا۔ حضرت مولانا عثمانی قدس
سرہٗ کے وصال کے بعد ۱۳۴۸ھ سے ۱۳۷۷ھ تک حضرت شیخ الاسلام مولانا
مدنی جیسی جامع صفات اور ہمہ گیر اثرات کی مالک شخصیت آپ کی معاون اور
مددگار رہی۔ حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ کی رحلت کے بعد ۱۳۹۲ھ تک
یکے بعد دیگرے حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ اور خاتم المحدثین حضرت
مولانا فخرالدین مرادآبادی آپ کے دستِ راست بنے رہے اور دارالعلوم کا
علمی قافلہ اپنی تابندہ روایات کے مطابق منزل کی جانب رواں دواں رہا۔
لیکن آخر میں جبکہ بتقاضائے عمر قویٰ اور اعصاب بڑی حد تک جواب دے گئے

تھے اور فکر و عمل میں پہلی جیسی توانائی باقی نہیں رہی تھی اس طبعی ضعف اور فطری اضمحلال کے دور میں آپ کے گرد اتفاقاً ایسے افراد کا حلقہ اکٹھا ہو گیا جنہیں دارالعلوم اور حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی ذات و خدمات کے مقابلے میں اپنے مقاصد و مصالح زیادہ عزیز تھے جس کے نتیجے میں ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے کہ ان سے نہ صرف دارالعلوم کی عظمت و شہرت غبار آلود ہوئی بلکہ خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی و علمی وجاہت اور پچاس ساٹھ سالہ روشن خدمات بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ جس مجلس شوریٰ کے اقتدار اور بالادستی کو وہ زندگی بھر عملی طور پر تسلیم کرتے رہے اور جس کے ایک ایک ارکان کے فضائل و محاسن کی اپنی تازہ ترین طویل نظم "ارمغان دارالعلوم" میں دل کھول کر تعریف و توصیف کی تھی۔ یاروں نے اپنی اغراض پسندی اور مقصد برآری کے پیش نظر حضرت قاری صاحب کو اسی مجلس کے مدمقابل لاکر کھڑا کر دیا۔ حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی تاریخ زندگی کا یہ ایسا اندوہناک باب ہے جہاں پہنچ کر مؤرخ کا قلم آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت قاری صاحب کی سلامتی مزاج، وسعتِ قلبی، اور صلح جوافتادِ طبع کے پیش نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر انہیں کھلے ماحول میں آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع ان کے گرد و پیش کے لوگوں کی طرف سے مل گیا ہوتا تو اس طرح کے تکلیف دہ اور افسوسناک حالات قطعاً نہ پیش آتے یہی وجہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے تمام تر ارکان، اساتذۂ دارالعلوم اور ہمدردان جو بھی صحیح صورت حال سے واقف تھے وہ ان معاملات میں حضرت قاری صاحب کو معذور ہی سمجھتے رہے اور شروع سے آخر تک ان کی یہ خواہش رہی کہ

حضرت قاری صاحب کو اغراض پسندوں کے اس نرغے سے نکال کر انہیں ان کے بلند مرتبہ کے مطابق صحیح مقام پہ فائز رکھا جائے مگر ساری کوششیں ناکام رہیں اور قضا و قدر کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا۔ (ماشاء اللہ کان ومالم یشالم یکن)

تحصیل علوم باطنی

حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی ذات والاصفات علوم ظاہر کے ساتھ علوم باطنی سے بھی آراستہ و پیراستہ تھی۔ ابتدا میں آپ نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے بیعت کی تھی لیکن ابھی تعلیم وتلقین کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ حضرت شیخ الہند کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ اور یہ سعادت بخش سلسلہ منقطع ہو گیا، اس کے بعد اپنے استاذ حدیث حضرت علّامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے اور ایک عرصہ تک انہیں کی رہنمائی میں سلوک کے منازل طے کرتے رہے مگر جب ۱۳۴۵ھ میں اہتمام اور حضرت محدث کشمیریؒ اور ان کے رفقاء کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کر لی اور حضرت شاہ صاحب مع اپنے رفقاء حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کے دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے تو اسی کے ساتھ اصلاح و تربیت کا یہ تعلق بھی قائم نہ رہا، اس لئے اپنے مربّی خاص حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے ایماء پر جماعت دیوبند کے عظیم المرتبت شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے چونکہ صلاحیت واستعداد پہلے ہی سے موجود تھی مزید بر اں شیخ کامل کی صحبت و رہنمائی بھی حاصل ہو گئی اس لئے تھوڑے سے ہی عرصہ میں آپ کو حضرت تھانویؒ کے متوسلین میں ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی اور نہایت برق رفتاری سے سلوک و تصوف کے جملہ مراحل طے کر کے خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے تحصیل خلافت کے بعد بزرگوں کے طریقہ کے مطابق بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور جو

کوئی آپ سے منسلک ہو نا چاہتا اسے سلسلے میں داخل فرمالیا کرتے تھے۔ اس راہ سے بھی حضرت قاری صاحب کی خدمت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ملک و بیرون ملک کے ہزاروں تشنگان معرفت آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔

تصنیف وتالیف مضمون نگاری اور انشاء پردازی کا سلسلہ آپ نے زمانہ طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا اس وقت کے رسالہ القاسم وغیرہ میں آپ کے علمی و تحقیقی مقالات چھپتے رہتے تھے اور علمی حلقوں میں وقعت و پسندیدگی سے پڑھے جاتے تھے۔

قلمی افادہ کا یہ سلسلہ وفات سے پانچ چھ سال پہلے تک برابر جاری رہا اور مختلف دینی، علمی اور تاریخی موضوعات پر تقریباً سو سے زائد مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسالے اور کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:
(۱) التشبہ فی الاسلام (۲) سائنس اور اسلام (۳) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقدام (۴) اصول دعوت اسلام (۵) اسلام اور فرقہ واریت (۶) اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام (۷) اسلامی مساوات (۸) الثمر فی مسئلۃ القضاء والقدر (۹) دین و سیاست (۱۰) مسئلہ اُردو زبان ہندوستان میں (۱۱) اسباب عروج و زوال اقوام (۱۲) الاجتہاد والتقلید (۱۳) تفسیر سورۂ فیل (۱۴) فطری حکومت (۱۵) شانِ رسالت (۱۶) فلسفۂ نماز (۱۷) شرعی پردہ (۱۸) داڑھی کی شرعی حیثیت (۱۹) علم غیب (۲۰) خاتم النبیین (۲۱) نظریہ دو فرقوں پر ایک نظر (۲۲) فلسفۂ طہارت (۲۴) آفتاب رسالت (۲۵) حدیث رسول کا قرآنی معیار (۲۶) انسانیت کا امتیاز (۲۷) اسلام کا اخلاقی نظام (۲۸) مشاہیر امت (۲۹) شہید کربلا اور یزید (۳۰) حاشیہ عقیدۃ الطحاوی وغیرہ۔

فنِ خطابت

خطابت و تقریر میں حضرت قاری صاحب کو خداداد قدرت اور ملکہ حاصل تھا، حقیقت تو یہ ہے کہ خطابت و تقریر میں اس وقت علماء کی صف میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جس وقت آپ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ علوم و معارف اور اسرار و حکم کا ایک چشمۂ ذخار ہے جو پوری توانائی کے ساتھ اُبل رہا ہے پیرایہ بیان اتنا مؤثر اور دل پذیر ہوتا تھا کہ سامعین دو دو تین تین گھنٹے سراپا گوش بنے بیٹھے رہتے تھے اور کوئی ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ تقریر کی یہ اثر اندازی علماء طلبہ اور مذہبی حلقہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی آپ کے حکیمانہ اسلوب بیان سے بہت متاثر تھا۔ بالخصوص مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، وغیرہ جامعات میں آپ کی تقریریں بہت پسند کی جاتی تھیں۔

شعر و شاعری

بلند پایہ مصنف اور خطیب ہونے کے ساتھ آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور جب کبھی کہنے پر آتے تھے تو چار چار پانچ پانچ سو اشعار پر مشتمل طویل نظمیں کہہ ڈالتے تھے جس پر آپ کے شعری مجموعے (۱) جنونِ شباب (۲) عرفانِ عارف (۳) آنکھ کی کہانی اور ارمغان دار العلوم شاہد ہیں۔

تبلیغی و دعوتی اسفار

دار العلوم کے اہتمام پر مسند نشین اکابر میں تنہا حضرت قاری صاحب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ کے دعوتی اور تبلیغی اسفار صرف ہندوستان کی حدود تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، برما، جنوبی افریقہ زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، اتھوپیا، مصر، سعودیہ عربیہ

انگلینڈ، فرانس، جرمنی، امریکہ وغیرہ دور دراز ممالک تک ان علمی وعرفانی اسفار کا دائرہ وسیع ہے، جس سے ایک طرف خود حضرت قاری صاحب کو عالمگیر شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور آپ کا دعوتی وروحانی فیض عام ہوا تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند اور جماعت دیوبند کا عالمی پیمانہ پر تعارف ہوا اور حلقۂ اثر میں توسیع ہوئی۔

زندگی کے آخری ایام

ادھر دو ایک سال سے ضعف پیری کے ساتھ امراض کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جس میں چند ماہ سے مزید شدت پیدا ہو گئی تھی طول علالت کی بنا پر کبھی تشویشناک حد تک ضعف پہنچ جاتا اور کبھی دوا علاج سے اطمینان بخش افاقہ ہو جاتا تھا۔ مرض وصحت کا یہ سلسلہ یونہی جاری تھا کہ وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل مرض کا شدید حملہ ہوا جس سے غذا بالکل ختم ہو گئی اور ضعف ونقاہت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ بغیر سہارے چارپائی سے اٹھ بھی نہیں پاتے تھے۔ دوا علاج سے اس کیفیت میں کچھ کمی پیدا ہوئی تو آپ کو دہلی پنتھ اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں ایک ہفتہ سے کچھ زائد دنوں تک زیر علاج رہے اور بظاہر مرض ختم ہو گیا، تھوڑی تھوڑی غذا بھی لینے لگے ضعف ونقاہت میں کافی حد تک کمی ہو گئی یہاں تک کہ بغیر کسی سہارے کے دو چار قدم چلنے لگے تھے جس روز وفات کا سانحہ پیش آیا اس دن بھی طبیعت اچھی خاصی تھی باہر بیٹھک میں لیٹے ہوئے حکیم محمود دیوبندی سے مرض اور مزاج کی کیفیت دیر تک بیان کرتے رہے، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب بھی پاس بیٹھے یہ گفتگو سن رہے تھے انہیں اس کی کیا خبر تھی کہ ریاض رسول کا یہ چہکتا ہوا بلبل ابھی چند سکنڈ میں ہمیشہ ہمیشہ کے خاموش ہو جانے والا ہے

حکیم محمود صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک آنکھیں بند ہوگئیں حکیم صاحب نے سمجھا کہ طول کلام کی بنا پر تکان ہوگئی ہے اس لئے آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر مولانا محمد سالم صاحب نے جب چہرے کو بغور دیکھا تو انہیں تشویش ہوئی اور حکیم صاحب کو متوجہ کیا کہ نبض دیکھئے علامت کچھ اچھی نہیں نظر آتی۔ چنانچہ حکیم صاحب نے جب نبض پہ ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ نبض ڈوب چکی ہے اور علوم قاسمی کا امین، اکابر کا ادا شناس، مسلک دیوبند کا شارح اور علم و دین کا سچّا خادم اپنے مالک کے حضور پہنچ چکا ہے۔

ذمہ داران دارالعلوم میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدرالمدرسین حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب شیخ الحدیث و نائب مہتمم، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات وغیرہ نے تعزیت مسنونہ کے بعد مخدوم زادگان سے خواہش ظاہر کی کہ حضرت کی نماز جنازہ اندرون دارالعلوم ادا کی جائے جسے ان حضرات نے منظور کرلیا۔ چنانچہ اسی وقت دارالعلوم کے لاؤڈاسپیکر سے یہ اعلان کردیا گیا کہ خدام دارالعلوم کی درخواست پر مخدوم زادہ مولانا محمد سالم صاحب نے دارالعلوم کے اندر نماز جنازہ ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔ لہٰذا بعد نماز عشاء دارالعلوم میں جنازہ کی نماز ادا کی جائے گی اور اسی وقت یہ بھی اعلان کردیا گیا کہ اس حادثہ جاں کاہ پر دارالعلوم دیوبند میں تین یوم کی تعطیل رہے گی اور ان تین دنوں میں روزانہ صبح و شام قرآن مجید اور آیت کریمہ کا ختم کر کے ایصال ثواب کیا جائے گا، تمام طلباء حضرات اساتذہ اور کارکنان صبح و شام حاضر ہو کر ایصال ثواب میں شرکت کریں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم اس وقت اپنے

وطن بجنور میں تشریف فرما تھے۔ انہیں اس حادثہ فاجعہ سے مطلع کرنے کا اسی وقت انتظام کیا گیا چنانچہ موصوف اطلاع ملتے ہی بجنور سے روانہ ہو گئے اور مغرب و عشار کے درمیان دیوبند پہنچ گئے اور سیدھے صاحبزادگان کے پاس جاکر تعزیت مسنونہ کی پھر دارالعلوم تشریف لائے، حضرت مہتمم صاحب کی تشریف آوری سے کچھ پہلے حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی یہاں پہنچ چکے تھے۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علمار ہند اس دن بمبئی سے دفتر جمعیۃ کی اطلاع پر بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچے اور پھر بذریعہ کار دہلی سے دیوبند کے لئے روانہ ہوئے اور عشار سے کچھ پہلے وہ بھی دیوبند پہنچ گئے، اتفاق سے حضرت مولانا مدنی سخت نزلہ اور بخار میں گرفتار تھے اور سفر کی صعوبت برداشت کرنے کی بالکل ہمت و طاقت نہیں تھی لیکن انہوں نے اپنے اوپر جبر کر کے نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کی غرض سے یہ مشقت برداشت کی۔

اعلان اور طے شدہ پروگرام کے مطابق تقریباً دس بجے مولانا معراج الحق صاحب، مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری وغیرہ اساتذہ دارالعلوم اور حضرت مرحوم کے متعلقین و معتقدین کی مشایعت میں جنازہ صدر دروازہ سے دارالعلوم میں داخل ہوا اور احاطہ مولسری میں نودرہ کے درمیانی دروازہ کے سامنے رکھا گیا۔ تمام طلبار دارالعلوم اور حضرات اساتذہ و کارکنان عشار کی نماز سے فارغ ہو کر پہلے ہی سے جنازہ کے انتظار میں احاطہ مولسری میں جمع تھے۔ قصبہ دیوبند اور اطراف و جوانب کے تقریباً پانچ چھ ہزار سے زائد متعلقین و معتقدین بھی اپنے سربراہ کے آخری حقوق کی ادائیگی کے لئے اکٹھا تھے،

مخدوم زادہ مولانا محمد سالم صاحب کی اقتدار میں پورے مجمع نے نماز جنازہ ادا کی اور تقریباً ۱۱ بجے شب میں حکمت قاسمی کے سب سے بڑے شارح و امین کو اس حکمت کے موجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

دوسرے دن ۷ رشوال کو بعد نماز ظہر دارالعلوم میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم کی زیر صدارت جلسۂ تعزیت منعقد کیا گیا جس میں حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب ممبر مجلس شوریٰ، حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب نائب ناظم تعلیمات نے تقریریں کیں اور حضرت قاری صاحبؒ کے اوصاف و کمالات اور محاسن و برکات پر روشنی ڈالی۔

صدر جلسہ حضرت مہتمم صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں حضرت مرحوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت قاری صاحبؒ اس دور میں علماء دیوبند کے ترجمان تھے ان کے مواعظ و مقالات سے دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم کو بیحد تقویت پہنچی ہے عوام ہی میں نہیں بلکہ طبقۂ علماء میں عرصۂ دراز تک ان کی کمی محسوس کی جاتی رہے گی۔

حضرت قاضی صاحب رکن شوریٰ نے اپنی تقریر میں خانوادہ قاسمی سے اپنے خاندانی قدیم تعلقات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ حضرت قاری صاحبؒ اس قدیم تعلقات کو زندگی بھر نباہتے رہے۔ اور کبھی بھی اس میں کمی و فرق نہیں آنے دیا۔ قاضی صاحب نے حضرت قدس سرہٗ کے علمی کمالات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ علمی استحضار اور دقیق سے دقیق مسائل کو سہل ترین اسلوب میں بیان کر دینے پر جو قدرت قاری صاحب کو حاصل تھی صفِ علماء میں اسکی

نظیر کمتر ہی ملے گی۔

حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں حضرت مرحوم ومغفور کے اوصاف، حلم تواضع، تحمل وغیرہ کو واقعات اور دلائل کی روشنی میں بیان کیا اور فرمایا کہ اڑتیس سالہ اپنے تجربہ کی بنیاد پہ مجھے اس بات پر پورا یقین اور اعتماد ہے کہ عالمی شہرت ومقبولیت کے باوجود قاری صاحب کے حلم وتواضع میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات نے حضرات اساتذہ اور کارکنانِ دارالعلوم کے تئیں حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے طرز عمل پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ قاری صاحبؒ اپنے ماتحتوں پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور حتی الامکان انہیں سہولت اور راحت دینے کی کوشش فرماتے تھے اور معمولی سے معمولی کارکن کے ساتھ نہایت عزت واحترام کا معاملہ فرماتے تھے جس کی بناء پر قاری صاحب ہر دلعزیز تھے اور کارکنوں سے کام لینے میں انہیں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کے اوصاف کمالات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم پر اللہ جل مجدہٗ کا یہ خاص فضل وکرم تھا کہ اس دنیا میں نیک نامی کے ساتھ زندگی گذارنے کیلئے جن اوصاف واسباب کی ضرورت پڑتی ہے قسام ازل نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان تمام اوصاف وکمالات سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ اور انشاء اللہ آخرت میں بھی سُرخ رو رہیں گے۔ حضرت کی یہ ایک بڑی خوش قسمتی ہے، برزخ میں اکابر رحمہم اللہ کی ارواح اگر ان سے سوال کریں گی کہ دارالعلوم کو کس کے حوالے چھوڑ کر آئے ہو تو وہ بلا تامل یہ جواب دے سکیں گے کہ دارالعلوم کو ایک ایسے شخص کی نگرانی میں چھوڑ کر آیا ہوں جو خود دارالعلوم کا فیض یافتہ اکابر دارالعلوم کے طرز مسلک

کا شیدائی۔ انتظامی امور کی نزاکتوں کو پوری طرح سمجھنے والا، نہایت دیانت دار اور ایثار پسند ہے جس نے دار العلوم کے لئے اپنے رئیسانہ آرام و راحت کو خیر باد کہہ کر دار العلوم کی فقیرانہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ جلسہ کے آخر میں ایک تعزیتی تجویز منظور کی گئی پھر ایصال ثواب اور دعاء مغفرت پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

تجویز تعزیت یہ ہے

دار العلوم دیوبند کے طلباء و اساتذہ اور ارباب انتظام کا یہ جلسہ عام حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات حسرت آیات پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت موصوف کو خدا تعالیٰ نے بہت سے اوصاف ظاہری و باطنی سے مالا مال کیا تھا۔ آپ محدث جلیل استاذ الاساتذہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو منصب خلافت حاصل تھا، علوم دینیہ بالخصوص تفسیر و حدیث و کلام میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ عرصہ دراز تک آپ نے درس و تدریس کی اہم کتابوں اور بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ کا دار العلوم میں درس دیا۔ اور سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اپنے جد عالی مقام حضرت اقدس نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے علوم و معارف سے طلبہ دار العلوم کو مستفید کیا۔

آپ کو خدا تعالیٰ نے قوت بیانیہ کا کمال عطا فرمایا تھا، علماء و عوام اور قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ سب ہی آپ کی تقریر دل پذیر سے متاثر ہوتے تھے۔ تقریباً نصف صدی سے آپ دار العلوم کے سب سے بڑے انتظامی عہدہ اہتمام پر فائز رہے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ

حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت فخر المحدثین مولانا فخر الدین صاحبؒ کے پہلو بہ پہلو دار العلوم کی اعلیٰ خدمات انجام دے کر اس کی عظمت وشوکت کو چار چاند لگائے۔

آپ نے نہ صرف زبانی بلکہ قلم سے بھی علمی دینی واصلاحی و دعوتی اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ اور درجنوں بلند پایہ اور کثیر النفع کتب ورسائل تحریر کیے۔ آپ کے انہیں اوصاف کمالات کی وجہ سے پوری جماعت دیوبند آپ کو اپنا سربراہ تسلیم کرتی تھی، افسوس صد افسوس کہ علوم ومعارف کا یہ درخشاں ستارہ آج غروب ہوگیا۔ اور نہ صرف دار العلوم بلکہ پورا عالم اسلام اس کی ضیا بخشی سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالےٰ سے دعا رہے کہ حضرت رحمہ اللہ کی روح پر فتوح کو جنت الفردوس میں مقام بلند عطا فرمائے۔ اور منتسبین دار العلوم اور اہل خانہ ان خصوصاً فرزندان گرامی کو صبر عطا فرمائے۔

اس حادثۂ عظیم کے بعد پے در پے دو اور حادثوں سے دار العلوم کو دوچار ہونا پڑا۔

جناب محمد شمیم صاحب دیوبندی جو دار العلوم کے قدیم وفادار اور ملازم اور مہمان خانہ دار العلوم کے محافظ ونگراں تھے، مہمانوں کی تواضع اور خدمت کا خاص سلیقہ رکھتے تھے چند یوم کی علالت کے بعد مؤرخہ ۱۳ر اگست ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے۔ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

دوسرے مولانا محمد گل صاحب ناظم شعبۂ تنظیم وترقی جو ایک طویل عرصہ سے اس عہدہ پر فائز تھے اور اپنے کام پر قابو یافتہ تھے مرحوم بہت ہی مخلص اور ٹوٹ کر محنت کرنے والے تھے، ان کے اس وصف کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ کام کرنے والا عملہ بلکہ دار العلوم سے متعلق ہر فرد ان سے محبت کا

تعلق رکھتا تھا۔ آخر میں کبرسنی اور مسلسل امراض کی بنا پر مزاج میں پہلی جیسی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی پھر بھی ان کی ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تقریباً بیس بائیس یوم مرض فالج میں مبتلا رہ کر مورخہ ۲۴ر اگست صبح ۵ر بجے دہلی کے رام منوہر لوہیا اسپتال میں انتقال کر گئے۔ اسی دن میت بذریعہ ایمبولینس دیوبند لائی گئی، اور بعد نماز عصر تجہیز وتکفین عمل میں آئی۔

(ماہنامہ دارالعلوم جولائی واگست ۱۹۸۳ء)

یذھب الصالحون الاول فالاول

علماء راسخین سے علمی محفلیں بس تیزی کے ساتھ خالی ہوتی جا رہی ہیں اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی "یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لا یبالیھم اللہ" کا مصداق اصلی آج ہی کا دورِ پُرفتن ہے۔

ملت مسلمہ ابھی خلاصۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ کا غم ابھی بھولی نہیں تھی کہ جولائی ۱۹۸۳ء کو خطیب العصر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ کے حادثۂ وفات سے دوچار ہوگئی۔ اور ابھی حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ والغفران کی تعزیت کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اخبارات نے یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ اگست ۱۹۸۳ء کو برصغیر کے نامور عالم ومحقق حضرت مولانا شمس الحق افغانی رہگزارِ عالم جاودانی ہو گئے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)۔

مولانا افغانی مرحوم ایک جید عالم دین، بلند پایہ محقق، بہتوں مصنف، صاحب نسبت بزرگ اور اکابر علماء دیوبند کی یادگار تھے۔ اس قحط انسانیت

عام انحطاط کے دور میں مولانا افغانی کا حادثہ وفات ایک بڑا علمی حادثہ ہے۔

ابتدائی حالات

مولانا افغانی ضلع پشاور کے قصبہ ترنگ کے ایک علمی خاندان میں ۷، رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا غلام حیدر سے حاصل کی جو مولانا عبدالحلیم لکھنوی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ بعد ازاں سرحد و افغانستان کے مشاہیر علماء سے اکتساب فیوض کیا۔ اور فنون کی تمام کتابیں پڑھ کر دورہ حدیث کی تکمیل کیلئے دارالعلوم دیوبند کا علمی سفر کیا اور ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء میں دارالعلوم میں باقاعدہ داخلہ لے کر اس وقت کے صدر المدرسین و شیخ الحدیث امام العصر علامہ انور شاہ محدث کشمیری، حضرت مولانا اصغر حسین محدث دیوبندی، جامع معقول و منقول مولانا غلام رسول خاں ہزاروی وغیرہ سے صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی تحصیل و تکمیل کر کے ۱۳۳۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

تبلیغی خدمت

مولانا افغانی زمانہ طالب علمی ہی میں علمی شغف اور ذہانت و ذکاوت کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ فراغت تعلیم کے بعد حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ اس مبارک سفر سے واپس ہوئے تو اکابر دارالعلوم نے آپ کو دارالعلوم بلالیا اور شدھی تحریک کی روک تھام کے لئے مبلغین کے ایک قافلہ کا قائد بنا کر آپ کو راجپوتانہ بھیج دیا، وہاں پہنچ کر آپ نے آریہ مبلغین سے متعدد مناظرے کئے اور انہیں شکست فاش دے کر میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

آپ کی مخلصانہ و مؤثرانہ تبلیغی مساعی سے ہزاروں غیر مسلم و مرتد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، فتنہ ارتداد کے خاتمہ پہ کامیاب و کامراں ہو کر جب

آپ دارالعلوم دیوبند واپس ہوئے تو اس مبارک کامیابی کی خوشی میں دارالحدیث میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آپ نے تبلیغی حالات وکوائف پر ایک مبسوط تقریر کی جسے سن کر اکابرِ دارالعلوم نے آپ کو بڑی دُعائیں دیں۔

تدریس وتعلیم اس مہم کے سرانجام دینے کے بعد مولانا افغانی نے اپنے اکابر واساتذہ کے طریقہ کے مطابق درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور مظہر العلوم کھڈہ کراچی، قاسم العلوم شیرانوالہ لاہور، دارالرشاد جھنڈہ سندھ وغیرہ مدارس میں صدر مدرس کی حیثیت سے ۱۳۵۳ھ تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۵۴ھ میں انہیں دارالعلوم بلالیا گیا۔ اور شیخ التفسیر کا اہم ترین منصب انہیں تفویض کیا گیا۔ تقریباً تین سال تک دارالعلوم میں حدیث وتفسیر کی کتابوں کا درس دینے کے بعد ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں ریاست خلافت کے وزیر تعلیم کے اہم ترین عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور تقریباً ۱۱ برس تک اس منصب پر رہ کر مفید ترین خدمات انجام دیں بعد میں وزارتِ تعلیم سے استعفیٰ دے کر پھر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، جامعہ اسلامیہ بھاولپور اور اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ وغیرہ سے منسلک رہ کر علمی خدمات انجام دیتے رہے۔

تصنیف وتالیف درس وتدریس کے علاوہ مولانا افغانی نے تحریر وتقریر کے ذریعہ گرانقدر علمی ودینی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ آپ کی تصانیف میں معین القضاۃ والمفتین عربی ایک معرکۃ الآراء کتاب مانی جاتی ہے جسے پورے عالمِ اسلام کے علماء وقعت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس اہم ترین کتاب کے علاوہ آپ کی حسب ذیل کتابیں بھی علمی حلقوں میں مشہور ومعروف ہیں۔

(۲) شرعی ضابطہ دیوانی (۳) علوم القرآن، یہ کتاب پشاور یونیورسٹی ایم، اے، اسلامیات کے نصاب میں داخل ہے۔ (۴) ترقی اور اسلام (۵) سوشلزم اور اسلام (۶) سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا موازنہ اسلام سے (۷) اسلام دین فطرت ہے (۸) اسلام عالمگیر مذہب ہے۔ (۹) عالمی مشکلات اور اس کا قرآنی حل (۱۰) مدارس کا معاشرہ پر اثر (۱۱) آئینہ اریہ (۱۲) تصوف اور تعمیر کردار (۱۳) اسلامی جہاد (۱۴) کمیونزم اور اسلام (۱۵) احکام القرآن (۱۶) مفردات القرآن (۱۷) مشکلات القرآن (۱۸) حقیقت زمان و مکان (۱۹) تنقیح الشذی علی جامع الترمذی (۲۰) معدن السرور فی فتاوی بھاول پور۔

ارشاد و سلوک مولانا افغانی مرحوم علمی تبحر کے ساتھ ارشاد و سلوک میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور سلسلۂ قادریہ، سلسلہ نقشبندیہ اور سلسلۂ چشتیہ تینوں سلسلوں میں آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی، جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) سلسلۂ قادریہ میں اپنے والد ماجد مولانا غلام حیدر سے بیعت تھے اور تکمیل حضرت مولانا غلام محمد دین پوری سے کی (۲) سلسلۂ نقشبندیہ سرزمین حجاز میں شیخ عثمانی علاؤالدین عراقی سے حاصل کیا (۳) اور سلسلۂ چشتیہ صابریہ کی بیعت حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی سے اور اجازت حضرت مفتی محمد حسن سے حاصل ہوئی۔

تلامذہ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں بہت ہے جن میں سے چند مشاہیر یہ ہیں۔ (۱) مولانا احتشام الحق تھانوی (۲) مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب استاذ حدیث خیر المدارس ملتان (۳) مولانا محمد شریف صاحب استاذ حدیث خیر المدارس (۴) مولانا نور محمد صاحب

شیخ الحدیث مدرسہ ہاشمیہ کراچی (۵) فضل احمد صاحب شیخ الحدیث مظہر العلوم کھڈہ کراچی (۶) مولانا عبدالرحمٰن شیخ الحدیث تعلیم القرآن راولپنڈی (۷) مولانا مجاہد الحسینی صاحب خطیب جامع مسجد لائلپور (۸) مولانا عبدالرؤف صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ چارسرہ وغیرہ۔

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۸۳ء)

مفتی محمد یٰسین مبارکپوری

بقلم محمد عثمان معروفی

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحبؒ ابن شیخ عبدالسبحان متوفی محرم ۱۳۶۷ھ محلہ پرانی بستی قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۳۲۲ھ کے لگ بھگ آپ کی پیدائش ہوئی چراغ حسن سے سال ولادت برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی۔ اس وقت حضرت مولانا علی احمد صاحب کوثریاپاری متوفی ۱۳۷۹ھ / ۱۹۶۱ء احیاء العلوم میں مدرس تھے۔ جو بہت ہی ذی استعداد عالم تھے، حضرت مفتی صاحب آپ سے بہت مانوس تھے۔ پھر مولانا علی احمد صاحب احیاء العلوم سے جدا ہو کر مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں مدرس ہو گئے تو مفتی صاحب بھی ناصر العلوم میں چلے گئے اور وہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی، مئوناتھ بھنجن میں بھی کچھ دنوں تک رہ کر حضرت مولانا ابوالحسن صاحب مئوی متوفی ۱۳۶۱ھ

سے پڑھا۔ ۶ر شوال ۱۳۴۲ھ کو بغرض تحصیل علم دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں تین سال تک بڑی محنت و جانفشانی سے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام، ادب، منطق اور ہیئت وفلسفہ کی متوسطات اور انتہائی کتابیں پڑھ کر ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے. آپ کے اساتذہ میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۴ھ اور حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی متوفی ۱۳۸۷ھ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے نمایاں اساتذہ یہ ہیں حضرت مولانا محمد محمود صاحب معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء، مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء مولانا نعمت اللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۱۳۶۲ھ اور مولانا علی احمد صاحب کوئریا پاری. مئو ناتھ بھنجن میں حضرت مولانا ابوالحسن صاحب مئوی۔

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند سے آپ کو درج ذیل سارٹیفکٹ دیا گیا۔

۱۲۱۶ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ سارٹیفکٹ منجانب دارالعلوم دیوبند۔

"ہم تصدیق کرتے ہیں کہ مولوی محمد یٰسین ولد شیخ عبدالسبحان صاحب ساکن مبارکپور ضلع اعظم گڑھ ۶ر شوال المکرم ۱۳۴۲ھ کو بغرض تحصیل علوم عربیہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تقریباً تین سال رہ کر علوم مندرجہ ذیل، تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، ادب، منطق، فلسفہ، ہیئت کو نہایت محنت وشوق سے پڑھا۔ امتحانات سالانہ وغیرہ میں بہت اچھی کامیابی حاصل کرتے رہے زمانہ تعلیم میں اساتذۂ کرام و اراکین مدرسہ ان سے خوش و رضامند رہے، وہ چال چلن کے نیک، ہونہار و مستعد شخص ہیں وہ اپنی لیاقت علمی و اخلاقی حیثیت سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو دارالعلوم کی جانب سے ایک سارٹیفکٹ دیا جائے

اور اس میں ظاہر کر دیا جائے کہ جو خدمات علمیہ وغیرہ ان کے سپرد کی جائیں گی وہ ان کو نہایت مستعدی و خوش اسلوبی سے انجام دے کر ہمیشہ نیکنامی حاصل کرتے رہیں گے۔"

محمد طیب غفرلہٗ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۴ ر رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

اس سارٹیفکٹ کے علاوہ جو سند فراغ دارالعلوم سے عطا ہوئی اس کا نمبر ۱۲۸۵ اور تاریخ اجراء ۱۴ ر ذوالقعدہ ۱۳۴۵ھ ہے۔ اس سند پر جلی خط میں "قادر علی الافادۃ والاستفادۃ" کی شہادت مرقوم ہے اور کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ تفسیر بیضاوی، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابو داؤد شریف، نسائی شریف، طحاوی، ابن ماجہ، موطا امام مالک، موطا امام محمد، ہدایہ اخیرین، درمختار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت، امور عامہ، دیوان متنبی، حمد اللہ، قاضی، میرزاہد رسالہ مع غلام یحییٰ، صدرا، شمس بازغہ، تصریح، شرح چغمینی۔

فراغت کے بعد آپ بحیثیت مدرس چند ماہ کے لئے پٹنہ (بہار) تشریف لے گئے۔ اس کے بعد موضع ابراہیم پور میں جو مبارکپور سے جانب مشرق تین میل کے فاصلے سے ہے چند ماہ کے لئے مدرس ہوئے۔ وہاں فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم تھی۔

۱۳۴۶ھ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں مدرس منتخب ہوئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے، شوریٰ کے ممبر، ناظم تعلیمات، صدر المدرسین اور مفتی جامعہ۔ ابتدائی کتابوں میں علم الصیغہ بہت عمدہ پڑھاتے تھے، جسے پڑھا دیتے اسے پورے طور پر صیغوں کی شناخت ہو جاتی تھی۔ آخر میں آپ

کے زیر درس صرف بخاری شریف جلد ثانی رہتی تھی۔ بقیہ اوقات میں افتار کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ فتویٰ نویسی میں ملک کے اندر آپ کو ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ فتویٰ کی عبارت ایسی آراستہ پیراستہ اور مہذب ہوتی تھی کہ کہیں ایک لفظ گھٹانے بڑھانے کی گنجائش نہیں۔ اگر ایک لفظ کہیں سے نکال دیا جائے تو جیسے عمارت کی ایک اینٹ نکل جانے سے پوری عمارت میں تزلزل آجائے۔ فتویٰ نویسی میں آپ کی ذات ایک سند بن گئی تھی۔ اور آپ صرف "مفتی صاحب" کے نام سے متعارف و مشہور تھے۔ دور دراز مقامات سے استفتار و سوالات کثرت سے آتے رہتے تھے اور شب و روز زبانی مسائل دریافت کرنے کے لئے قصبہ و بیرون قصبہ سے لوگ آتے رہتے اور تشفی بخش جواب حاصل کر کے جاتے۔

آپ کو مسائل کا استحضار تھا۔ ہر سائل کو زبانی جواب دیتے مگر سائل کے اطمینانِ قلب کے لئے اسے حوالہ اور کتاب کی عبارت بھی ضرور دکھا دیا کرتے تھے۔ احیار العلوم میں افتار کا کام آپ نے ۱۳۵۰ھ سے شروع کیا اور ۱۳۶۰ھ سے باقاعدہ نقولِ فتاویٰ کا رجسٹر رکھا۔

احیار العلوم کے سابق مہتمم حضرت مولانا شکر اللہ صاحبؒ جب بغرض علاج لکھنؤ میں مقیم تھے تو حضرت مفتی صاحبؒ عیادت کے لئے پہونچے، وہاں مولانا شکر اللہ صاحبؒ نے حسب ذیل وصیت فرمائی جو ماہنامہ الفرقان بریلی ربیع الاول ۱۳۶۱ھ کے شمارہ سے منقول ہے:

"ہمیشہ دینی کام کرنا، تم سے مجھ کو بہت فائدہ پہنچا خصوصاً فتویٰ میں، مسائل میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ سے ہمیشہ رجوع کرنا اور ان پر اعتماد کرنا حضرت مولانا حسین احمد صاحب و حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہما کو

ہمیشہ ایک نظر سے دیکھنا۔ دونوں ملت کے مسلمہ بزرگ ہیں۔ میرے دل میں ان دونوں حضرات کی قدر و منزلت یکساں ہے۔"

قصبہ میں آپ قاضی کی حیثیت رکھتے تھے۔ نکاح پڑھانا، نماز جنازہ اور جمعہ و عیدین کی امامت کی ذمہ داری آپ ہی کے سر تھی۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اطمینان قلب کے لئے ایک ایک بات کی تحقیق کئی کئی آدمی سے کرتے، نماز جماعت کے لئے اپنی گھڑی مسجد کی گھڑی سے ملائے رہتے تھے پھر بھی گاہے گاہے دوسروں سے وقت دریافت کرتے رہتے۔ آپ کا قیام شب و روز مدرسہ میں رہتا تھا، صرف دو ایک گھنٹہ کے لئے مکان پر چلے جاتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ جو طالب علم سامنے آجاتا پہلے اس سے پوچھتے کہ کیا پڑھتے ہو؟ پھر اس کی کتاب کا زبانی سوال اس سے ضرور کرتے اگر جواب دیدیا تو بہت خوش ہوتے ورنہ اس کو محنت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے، محنتی طلبہ سے بہت خوش رہتے۔ جو طالب علم نماز جماعت میں حاضر نہ ہوتا اس کو سزا دیتے۔

۱۳۶۵ھ میں حج و زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ آپ فطرۃً نحیف الجثہ اور کمزور تھے۔ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ لیکن کتب بینی اور مدرسہ کا کام نہیں چھوڑتے تھے۔ اپنی درس گاہ میں کتابوں کے انبار میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں تپائیوں پر کتابیں لدی رہتی تھیں۔ مزید براں چند بڑی بڑی الماریاں کتابوں سے پُر تھیں جن میں بہت بڑا حصہ آپ کی ذاتی کتابوں کا تھا یعنی تنہا آپ کا کمرہ ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اطراف کے مدارس میں ممتحن اور مقرر کی حیثیت سے بھی بلائے جاتے تھے، آپ کا وعظ نہایت مؤثر اور دل پذیر ہوتا تھا۔ جہاں جس قسم کا موقع و محل ہوتا اسی کے مناسب اور حسب حال آپ کی تقریر ہوا کرتی تھی۔ مزید براں آپ بہت سی خوبیوں کے

مالک، سادگی وجفاکشی کے مظہراور بلند اخلاق وانکساری کے پیکر تھے۔

قریب دس ماہ گھر پہ آپ نے علالت کے ایام گذارے بالآخر شنبہ کی شب میں ساڑھے بارہ بجے ۲۱ر محرم ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر بجلی کی طرح اطراف میں پھیل گئی۔ بہت سے مدارس بند کر دیئے گئے۔ مئو، کوپا گنج، گھوسی، پورہ معروف محمد آباد، خیرآباد، ولید پور، بھیرہ، ابراہیم پور، جہانا گنج، بہادر گنج، غازیپور، بنارس وغیرہ دوسرے اضلاع سے بھی آدمی اس کثرت سے مبارک پور میں امنڈ پڑے کہ مجمع پر کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا۔ غسل کے بعد آپ کی نعش ایک بار پھر جامعہ عربیہ احیاءالعلوم کے صحن میں لاکر رکھی گئی جہاں مشتاقان دیدار نے آخری دیدار کیا۔ بیس ہزار کے قریب مجمع تھا جس میں ہزاروں علمائے کرام جمع ہوگئے تھے۔ بریلوی حضرات کے بعض علماء بھی جیسے مولانا ظفرادیبی سابق استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور نماز جنازہ و تدفین میں شریک رہے۔

سمودی عیدگاہ کے سامنے میدان میں تین بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے استاذ محترم سابق مہتمم جامعہ عربیہ احیاءالعلوم، مجاہد حریت حضرت مولانا شکراللہ صاحب متوفی ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء کی قبر کے سرہانے دفن کئے گئے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ کی عمر ۸۲ بیاسی سال کی تھی۔ چراغ حسن (۱۳۲۲ھ) سے ولادت اور فروغ حسن (۱۴۰۴ھ) سے رحلت کا سال برآمد کیا جا سکتا ہے۔ ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

(ماہنامہ دارالعلوم دسمبر ۱۹۸۳ء)

مفتی عتیق الرحمٰن

باسمہٖ تعالیٰ

قادرِ مطلق کی مشیّت ہے ایک عجیب چل چلاؤ لگ رہا ہے، ہر ہر شعبہ کی اہم اہم شخصیتیں اٹھتی جارہی ہیں اور کوئی بھی اپنا بدل اور جانشیں نہیں چھوڑ رہا ہے۔ ابھی آج ہی ۱۲ رمئی کو عصر کی نماز کے بعد اس غمناک سانحہ کی اطلاع ملی کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صدر مسلم مجلس مشاورت و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا دلی میں وصال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ۔

حضرت مفتی صاحب دیوبند کے مشہور قدیم علمی خانوادہ کے ایک ممتاز فرد تھے، آزادیٔ ضمیر، اصابت رائے، معاملہ فہمی، اور نکتہ رسی میں ایک خاص شان کے مالک تھے، علمی، سماجی، اور سیاسی تمام حلقوں میں آپ کو یکساں مقبولیت حاصل تھی، درجنوں علمی و دینی اداروں کے ممبر اور رکن تھے۔

مرحوم عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے خلف رشید تھے ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام "ظفر الحق" ہے۔ ۹ ربرس کی عمر میں حفظ قرآن کریم سے فارغ ہوکر اردو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کی، آپ کی تمام تر تعلیم دارالعلوم دیوبند ہی میں ہوئی ۱۳۳۶ھ میں حضرت محدّث عصر علامہ انور شاہ کشمیری اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، دو تین سال مطالعہ کتب میں مصروف رہے بعد ازاں

۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم میں معین المدرس مقرر ہوئے، تدریس کے ساتھ اپنے والد ماجد کی زیر نگرانی افتاء کا کام بھی کرتے رہے ۱۳۴۵ھ میں جب ارباب انتظام اور حضرت محدّث کشمیریؒ کے مابین اختلاف پیدا ہوا تو حضرت مفتی صاحب نے اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کی ہمنوائی کی اور انہیں کے ساتھ دارالعلوم کو چھوڑ کر ۱۳۴۶ھ میں ڈابھیل چلے گئے، اور تقریباً پانچ سال تک ڈابھیل میں ہی درس وافتاء کی خدمت انجام دی۔

پھر انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی وغیرہ سے متاثر ہوکر اپنے رفیق حضرت مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہوکر سیاسی میدان میں آگئے اور پانچ سال کلکتہ میں مقیم رہ کر سیاسی امور کی انجام دہی کے ساتھ تفسیر وافتاء اور تبلیغ دین کی اہم خدمت میں بھی مصروف رہے کلکتہ میں مفتی صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور آپ کا حلقۂ اثر یہاں بہت وسیع ہوگیا۔ اسی زمانہ میں مفتی صاحب کے ذہن میں ندوۃ المصنفین کا خاکہ آیا بالآخر اپنے رفقاءِ کار حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ کے مشورہ سے ۱۳۵۰ھ میں قرول باغ دہلی میں اس ادارہ کی بنیاد رکھدی، اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی علوم وفنون کی اہم کتابوں کو اس سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کے حسن انتظام اور جد وجہد کی بدولت اس ادارہ نے مختصر سی مدت میں اہم ترین کتابیں شائع کر دیں اور اس وقت اس کی مطبوعات کی تعداد سو سے اوپر تک پہنچ چکی ہے جو تفسیر، حدیث، تاریخ لغت، اخلاق اور سیاسیات کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب ندوۃ المصنفین کے ابتدار قیام سے زندگی کی آخری سانس تک اس کے ناظم اور نگراں رہے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جبکہ دلی

میں فسطائی عناصر نے دل کھول کر مسلمانوں کا قتل عام کیا اس موقع پر ندوۃ المصنفین کو بھی لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا تھا یہ ایسا زبردست اور عظیم حادثہ تھا کہ اس قسم کے حوادثات کے بعد کسی ادارہ کا سنبھلنا مشکل ہی ہوتا ہے لیکن حضرت مفتی صاحب کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس تباہی کے بعد نہ صرف ندوۃ المصنفین کو زندہ رکھا بلکہ اپنی جرأت وہمت اور انتظامی صلاحیتوں سے اس میں حیات تازہ پیدا کر دی اور اس اجڑے ہوئے چمنستان علم کو پھر سے گلزار بنا دیا۔

آپ جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ ابتدا سے وابستہ رہے اور قومی وملی کاموں میں حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ہمیشہ دست و بازو بنے رہے۔ حضرت مجاہد ملت کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے ورکنگ صدر منتخب ہوئے لیکن مرحوم اس عہدہ پر تا دیر قائم نہ رہ سکے اور نہ صرف یہ کہ اس عہدہ سے الگ ہو گئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جمعیۃ ہی سے اپنا سلسلہ منقطع کر لیا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ فیصلہ ان کی اصابتِ فکر و رائے کے باوجود ملی حلقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ ادھر ایک طرف مجلس مشاورت کی صدارت کے منصب پر فائز تھے اور اسی کے پلیٹ فارم سے جو کچھ بن پڑتا تھا قومی و ملی خدمت انجام دیتے تھے مفتی صاحب کی سابقہ قومی خدمات کی بنا پر حکومت وقت ان کی باتوں کا بہت لحاظ کرتی تھی اور ان کی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی۔

مرحوم بہت سے دینی وعلمی اداروں کے سرپرست اور مشیر کار تھے۔ اور ان کی مجلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور اپنے صحیح مشوروں سے کارکنوں کی رہنمائی کرتے تھے، مفتی صاحب کی بالغ نظری اور اصابتِ فکر و رائے

کے پیش نظر ۱۳۹۸ھ میں انہیں دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا گیا جس پر وہ آخری دم تک باقی رہے، اور بیماری سے پہلے پابندی کے ساتھ شوریٰ کی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، مفتی صاحبؒ کی رائے کا شوریٰ میں ایک خاص وزن تھا۔

دارالعلوم کے حالیہ بحران کے زمانہ میں بدقسمتی سے حضرت مفتی صاحب کا نقطۂ نظر مجلس شوریٰ کے موافق نہیں رہا جس کی بنا پر مجلسِ شوریٰ کو بعض مواقع پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود ارکان شوریٰ اور اربابِ دارالعلوم کے دلوں میں مفتی صاحب کی عزت و وقعت بدستور باقی تھی اور ان کا اعزاز و احترام پہلے ہی کی طرح قائم تھا۔

مفتی صاحب کو تقریر و تحریر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ندوۃ المصنفین اور قومی و ملّی کاموں کی مصروفیت کی بنا پر اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کر سکے، لیکن ندوۃ المصنفین کی مطبوعات پر انہوں نے پیش لفظ یا تعارف کے طور پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی تصنیفی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے مفتی صاحبؒ اگرچہ خود تو مصنف نہ بن سکے لیکن انہوں نے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کر کے انہیں بلند پایہ محقق و مصنف بنا دیا۔

مرحوم تقریباً ایک سال سے صاحبِ فراش تھے، گذشتہ سال دارالمصنفین اعظم گڈھ کے سیمینار میں شرکت کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ ہی میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، چند یوم لکھنؤ زیر علاج رہ کر دہلی آ گئے اس وقت سے صاحبِ فراش ہی رہے، ادھر چند مہینوں سے کینسر کا موذی مرض بھی لاحق ہو گیا تھا، اور حکومتِ وقت کی زیر نگرانی خصوصی علاج و معالجہ کے باوجود بھی اس مرض نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور بالآخر اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم کے وصال کی اطلاع دارالعلوم کو دیر سے ملی کیونکہ دہلی سے دارالعلوم کو خبر پہنچانے کا کوئی نظم ان کے متعلقین نے نہیں کیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اطلاع ملی اسی وقت دارالعلوم میں تعطیل کردی گئی اور تمام اساتذہ، طلبہ اور کارکنان نے قرآن کریم اور کلمہ طیبہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا کیونکہ زندوں کی جانب سے مرنے والوں کو اس سے اچھا اور عمدہ تحفہ اور کوئی نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے جملہ کارکنان حضرت مفتی صاحبؒ کے متعلقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ آمین۔

(ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۸۴ء)

مولانا محمد عثمان صاحبؒ

زیر نظر رسالہ کتابت کے مراحل سے گذر کر پریس میں جانے ہی والا تھا کہ اچانک حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نبیرۂ حضرت شیخ الہند و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا سانحہ انتقال پیش آگیا۔ اس لئے بعجلت تمام یہ چند سطور لکھ کر اس شمارہ میں شامل کی جارہی ہیں آئندہ کسی شمارہ میں انشاء اللہ مرحوم ومغفور کے مفصل اور ضروری سوانح حیات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مرحوم حضرت مولانا شیخ الہند کے نواسہ، شہر دیوبند کے ہر دلعزیز اور محبوب لیڈر اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم وابستگان میں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ حق گوئی اور بیباکی میں تو اپنی مثال نہیں رکھتے تھے جو بات ہوتی تھی صاحب معاملہ کے منہ پر نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دیتے۔ بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ حق کہنے میں تو جری ہوتے ہیں لیکن اپنے خلاف حق سننے کی ان کے اندر

طاقت نہیں ہوتی۔ مگر مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جس طرح حق کہتے تھے بالکل اسی طرح سے پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے خلاف سننے کیلئے بھی تیار رہتے تھے۔ اس طرح کے لوگ اب کہاں سے تلاش کئے جائیں۔

مولانا مرحوم کو ادھر چار پانچ ماہ سے ضعف قلب کی شکایت ہو گئی تھی، ذیابیطس کا عارضہ تو پرانا تھا ہی۔ ان دونوں مرضوں نے انہیں دو تین ماہ کے اندر بالکل نڈھال کر دیا تھا، لیکن تحمل اور برداشت کی فطری صلاحیت کی بنا پر یہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور انتہائی ضعف کی حالت میں بھی مدرسہ آتے رہتے تھے، چنانچہ ۶؍ شعبان کو جس دن یہ سانحہ پیش آیا حسب معمول مدرسہ تشریف لائے اور اپنے دفتر میں کچھ دیر بیٹھے لیکن تکلیف زیادہ تھی اس لئے بےچینی کی حالت میں کبھی لیٹ جاتے اور پھر کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے، مولانا کا یہ حال دیکھ کر ان سے کہا گیا کہ آپ گھر چلے جائیں لیکن اس کے لئے تیار نہیں ہو رہے تھے بدقت تمام ان کی مرضی کے بغیر رکشا منگوا کر ان کے ایک عزیز کے ذریعہ انہیں گھر روانہ کر دیا گیا۔ گھر پہنچتے ہی ڈاکٹر بلائے گئے، ڈاکٹروں نے یہ حالت دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا اور آکسیجن چڑھانا تجویز کیا مگر ابھی اس کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ مولانا مرحوم کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا اور تین بار کلمہ پڑھا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، بجلی کی طرح یہ خبر دارالعلوم اور پورے شہر میں پھیل گئی، جو بھی اس خبر کو سنتا ایک لمحہ کے لئے سناٹے میں آجاتا۔ دارالعلوم میں اسی وقت کلمہ طیبہ کے ختم کا انتظام کیا گیا جس میں تمام طلبہ کارکنان اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ شریک ہوئے کلمہ طیبہ کے ورد اور دعائے مغفرت کے بعد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا مرحوم کے احوال وسوانح پر روشنی

ڈالی اور مولانا مرحوم کے اوصاف حسنہ تفصیل سے بیان فرمائے بعد میں دارالعلوم
میں عام تعطیل کردی گئی۔ نماز جنازہ بعد العصر احاطہ مولسری دارالعلوم میں مولانا سید
ارشد مدنی نے ادا کرائی، اور قبیل مغرب حضرت شیخ الہند کی اس آخری یادگار کو
مزار قاسمی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے

(ماہنامہ دار العلوم مئی ۱۹۸۵ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد: "ان اللہ لا یقبض العلم
انتزاعًا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء۔
الخ متفق علیہ) کا ظہور آجکل اس کثرت سے ہو رہا ہے کہ علم و دین کی اہم شخصیات
اٹھتی جا رہی ہیں اور کوئی بھی اپنا بدل نہیں چھوڑ رہا ہے۔ ابھی ۶؍شعبان کو
حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی آخری نشانی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم
دارالعلوم دیوبند کا سانحہ ارتحال پیش آیا، مرحوم کا غم تازہ ہی تھا کہ دفتر جمعیۃ علماء
ہند دہلی سے اطلاع آئی کہ حضرت شیخ التفسیر مولانا لاہوریؒ کے فرزند رشید
و جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انور کا لاہور کے میو ہسپتال میں ۷؍شعبان کو انتقال
ہو گیا۔ اس دوہرے غم کے آنسو ابھی خشک نہیں ہو پائے تھے کہ حضرت مولانا محمد سجاد
صاحب جونپوری خلیفہ حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری ۱۴؍شعبان کو داغِ مفارقت
دے گئے۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر علم و عرفان کی ان اہم شخصیات کا اٹھ جانا ملت

کا اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس پر جتنا بھی غم کیا جائے اور آنسو بہایا جائے کم ہے ان مرحومین کی تعزیت کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۲۴ رمضان کو ریڈیو پاکستان نے اپنے صبح کے نشریہ میں یہ اندوہناک خبر نشر کی کہ برصغیر کے نامور عالم دین، بلند پایہ مصنّف، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا کل انتقال ہوگیا، مرحوم تقریباً سات آٹھ ماہ سے علیل چل رہے تھے، علاج و معالجہ کی غرض سے اپنی صاحبزادی اور داماد کے اصرار پر پاکستان گئے ہوئے تھے وہیں یہ حادثہ پیش آیا۔

مولانا مرحوم تقریباً ۱۳۲۵ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بچھراوں ضلع مرادآباد تھا لیکن آپ کی پیدائش اور نشوونما آگرہ میں ہوئی (جہاں آپ کے والد ماجد مقیم تھے) اس لئے اکبرآبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد کی زیر نگرانی گھر ہی پر ہوئی خانگی تعلیم کے بعد آپ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل کردیا گیا۔ جہاں آپ نے متوسطات تک پڑھا پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند آئے اور تقریباً تین سال یہاں رہ کر محدّث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب محدّث دیوبندیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم سے درسیات کی تکمیل کی اور ۱۳۴۴ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، اس کے بعد اورنٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا جس کی اس وقت بڑی اہمیت تھی۔ تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور دو سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمت انجام دے کر مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں السنۂ شرقیہ کے استاذ کی حیثیت سے چلے آئے، یہیں کے زمانۂ تدریس میں سینٹ کالج دہلی سے ایم۔ اے کیا، بعد میں اسی کالج میں لکچرار ہوگئے پھر یہاں سے ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل

منتخب ہوئے اور ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کے صدر کے منصب پر فائز ہوئے، جس وقت مولانا اکبرآبادی مرحوم وہاں پہنچے اس وقت شعبۂ دینیات انتہائی بے حیثیت اور کسمپرسی کی حالت میں تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی فعال و متحرک شخصیت اور بے لوث جد وجہد سے علمی اور انتظامی دونوں حیثیتوں سے اس شعبہ کو ترقی دے کر یونیورسٹی کے دیگر اعلیٰ شعبوں کے معیار پر پہنچا دیا۔ یہ مولانا اکبرآبادی کا ایسا اہم کارنامہ ہے جسے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ دینیات میں پی، ایچ، ڈی کے شعبہ کا قیام بھی مولانا مرحوم ہی کی سعیٔ مشکور کا نتیجہ ہے۔ علی گڑھ سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں تک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تغلق آباد میں علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں۔

مولانا مرحوم ۱۳۵۷ھ سے آخری سانس تک ندوۃ المصنفین دہلی کے کے بلند پایہ علمی مجلّہ "برہان" کے مدیر رہے۔ آپ کے اداریے بڑے مدلّل اور فکر انگیز ہوتے تھے اور قدیم وجدید دونوں حلقوں میں شوق اور وقعت سے پڑھے جاتے تھے۔ مرحوم تقریباً ایک درجن محققانہ کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں غلامانِ اسلام، وحی الٰہی، فہم قرآن، مسلمانوں کا عروج و زوال، صدیق اکبر، عثمان ذی النورین اپنے اپنے موضوع پر نہایت گرانقدر اور بیش بہا معلومات کی حامل ہیں، اُن کے علاوہ مختلف دینی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی موضوعات پر آپ کے سیکڑوں سے زائد تحقیقی مقالے بھی ملک و بیرون ملک کے جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوئی صاحب ذوق انہیں مرتب کر کے شائع کر دے تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔

مولانا مرحوم ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔ ملک کے علاوہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے علمی سمیناروں اور ادبی و تحقیقی تقریبوں میں آپ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں آپ پاکستان، مصر، کناڈا،

روس اور افریقہ وغیرہ کے متعدد اسفار کر چکے تھے۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں کناڈا کی مشہور میک گل یونیورسٹی میں وزٹینگ پروفیسر بھی رہے۔

مولانا اکبرآبادی صاحب ایک بلند پایہ مصنف و محقق ہونے کے ساتھ بہترین خطیب و مقرر بھی تھے، اُردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں تقریر کرتے تھے آپ کے خطبات بڑے فکر انگیز اور مؤثر ہوتے تھے اور خاص طور سے جدید حلقے میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔

ان علمی کمالات کے ساتھ مرحوم ایک اچھے انسان بھی تھے۔ شہرت و مقبولیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتے ہوئے، غرور علم سے آپ کا دامن حیات بالکل پاک و صاف تھا۔ تواضع اور انکساری آپ کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اپنے خوردوں اور شاگردوں کے لئے بھی تواضعًا کھڑے ہو جاتے تھے۔

آپ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے، جہاں پہنچ کر آدمی میں بالعموم خشکی اور یبوست پیدا ہو جاتی ہے لیکن مرحوم کے مزاج کی شگفتگی اور سبک روحی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا جس مجلس میں بھی ہوتے اسے اپنی نکتہ سنجیوں اور جولانیٔ طبع سے باغ و بہار بنائے رہتے۔

دارالعلوم دیوبند سے مرحوم کو فطری تعلق تھا ۱۳۸۲ھ سے اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے۔ اور ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم میں شیخ الہند اکاڈمی کے نام سے تصنیف و تالیف کے ایک جدید شعبہ کا قیام عمل میں آیا تو مرحوم اس کے صدر منتخب ہوئے اس وقت سے آپ کا مستقل قیام دارالعلوم میں ہو گیا تھا۔ اکاڈمی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے ساتھ فارغ التحصیل طلبہ کو حجۃ اللہ البالغہ کا درس بھی دیتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت اور ہمت افزائی کا معاملہ کرتے تھے۔

دارالعلوم میں مرحوم کے قیام سے نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ اور ارباب انتظام

کو بھی بہت فائدہ تھا۔ اساتذہ کو علمی پیچیدگیوں اور انتظامیہ کی انتظامی گتھیوں کے سلجھانے میں مرحوم کے علم و تجربہ سے بڑی مدد ملتی تھی۔ افسوس کہ مولانا کی وفات سے دارالعلوم اپنے ایک قابل قدر فرزند، فعّال و متحرک کارکن اور بے لوث و مخلص سرپرست سے محروم ہوگیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجات سے ہم کنار فرمائے اور دارالعلوم اور ملّت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل نصیب فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ دارالعلوم جون ۱۹۸۵ء)

بھائی جی مرحوم

بقلم مولانا نسیم احمد فریدی

بھائی جی مرحوم بھی ۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ کو دار آخرت کو سدھار گئے اللہ تعالےٰ کو پیارے ہوگئے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ رب غفور مغفرت فرمائے میں ۱۳۵۵ھ میں دارالعلوم کا طالب علم بنا تو حضرت شیخ الاسلامؒ کی مجلس میں یا مزار قاسمی کے احاطہ میں اس شخصیت کو آتے جاتے دیکھا۔ اسی وقت سے دل ان سے متاثر تھا۔ مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ حضرت گنگوہیؒ کے پوتے ہیں، بس اتنا معلوم تھا کہ یہ بھی ابتدائی کتابوں کے ایک مدرس ہیں۔ پھر دارالعلوم سے جانے کے مدتوں بعد جب یہ پتہ چلا کہ یہ تو حضرت گنگوہیؒ سے نسبت رکھنے والے بزرگ ہیں۔ تو ان کی خدمت میں حاضری دینے کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ اس کے بعد جب کبھی دیوبند گیا، ان کی خدمت میں پہونچنے کی کوشش کی، بڑی محبت فرماتے تھے اور اپنی دعاؤں سے نوازتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت گنگوہیؒ عمر کے آخری

حصہ میں جب عید یا بقرعید کی نماز کو عیدگاہ جاتے تھے تو بصارت نہ ہونے
کی وجہ سے پالکی میں سوار ہوتے تھے، علماء کا ایک جم غفیر اس پالکی کے ساتھ
ہوتا تھا اور علماء ہی اس پالکی کو کاندھا لگاتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے
اس کا ذکر "آپ بیتی" میں کیا ہے اور میں نے بعض دوسرے معتبر اشخاص سے
بھی، جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ سنا ہے۔ کیا آپ بھی اس پالکی میں ہوتے
تھے؟

فرمایا۔ ہاں، میں بھی ہوتا تھا۔

میں نے مکاتیب رشیدیہ کی تلخیص الفرقان میں شائع کرائی ہے۔
ایک مکتوب گرامی میں حضرت گنگوہیؒ نے اپنے اس یتیم پوتے کا ذکر کیا ہے،
اس کے فٹ نوٹ میں بھائی جی مرحوم کا مختصر تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ مولانا نعمانی مدظلہ
نے اس فٹ نوٹ سے ہی پہلی مرتبہ یہ جانا کہ بھائی جی حضرت گنگوہیؒ کے پوتے
ہیں وہ اس سے پہلے انہیں حضرتؒ کا نواسہ سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا قاری
محمد طیب قاسمیؒ نے بھائی جی کو دارالعلوم میں لاکر رکھا اور اس نسبت عالی کو ملحوظ
رکھا جس کے وہ حامل تھے۔ ان کی ذاتِ گرامی، درحقیقت دارالعلوم کے لئے
ایک بڑا تبرک تھی۔ افسوس کہ دارالعلوم ایسی بے بہا شخصیت سے محروم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

مرحوم واقعی بے ہمہ اور باہمہ تھے۔ ان کا طریقہ مرنجاں مرنج تھا۔ انہوں
نے اپنا تعارف بہت کم کرایا۔ اور وہ گوشۂ گمنامی میں رہے مگر اپنی خوش خصالی
اور میانہ روی نیز ذکر الٰہی اور فکر عقبیٰ کے ذریعہ حیاتِ جاوید حاصل کر لی۔ ؏

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

حضرت گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک مولانا حکیم مسعود احمدؒ، دوسرے حافظ محمود احمدؒ، اوّل الذکر کے دو صاحبزادے ہوئے جن میں بڑے مولانا حکیم عبدالرشید محمود عرف حکیم ننھو میاں صاحب گنگوہی مدظلہٗ ہیں، اور حافظ محمود احمدؒ کے اکلوتے بیٹے مولانا سعید احمد عرف بھائی جی مرحوم تھے حافظ محمود احمد مرحوم کا انتقال عالم شباب میں ہی ہوگیا تھا، انہوں نے فقط ایک بچہ یادگار چھوڑا تھا جس کا نام سعید احمد تھا، جو بڑے ہوکر بھائی جی کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ "تذکرۃ الرشید" حصہ دوم ص۴۵ پر حافظ محمود احمد مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"ایک موقع پر حضرت امام ربانی (حضرت گنگوہی قدس سرہ کی زبان سے یہ الفاظ بھی صادر ہوئے کہ "محمود احمد" نے میری کمر توڑ دی"۔

مولانا میرٹھیؒ نے ایک اور جگہ بھی تذکرۃ الرشید جلد دوم ہی میں صفحہ ۵۱، ۵۲ پر حضرت گنگوہیؒ کے تأثرات مندرجہ ذیل الفاظ میں نقل کئے ہیں۔

"ایک مرتبہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے کہ آج کہتا ہوں بارہ ۱۲ برس ہوگئے جب سے محمود مرا ہے مجھے ہنسی نہیں آئی اور ایک خط میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۶ ارجمادی الاول کو میرے فرزند حافظ محمود احمد کا اسہال دموی میں انتقال ہوگیا یہ صدمہ اس قدر جانکاہ ہوا کہ کیا کہوں؟ حق تعالےٰ اس کو بخشے۔ ایک فرزند دو ماہ کا اس نے چھوڑا، حق تعالیٰ اس کی عمر کرے کہ اس سے ہی دل بہلاویں"۔

حضرت گنگوہیؒ اپنے ایک مکتوب گرامی میں یوں اظہار غم فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔ بندہ (کو) سال گذشتہ میں صدمہ فوت ہونے حافظ محمد اسحاق نواسۂ کلاں کا ہنوز فراموش نہ ہوا تھا کہ اب دوسرا صدمہ تقدیر سے پہونچی مگر بجز رضا کیا ہوسکتا ہے؟ حق تعالےٰ صبر عطا فرماوے، وہ صدمہ یہ ہے کہ

۱۶ر جمادی الاوّل کو میرے فرزند خورد حافظ محمود احمد کا اسہال دموی میں انتقال ہوگیا۔ یہ اس قدر واقعہ جانکاہ ہوا کہ کیا کہوں؟ حق تعالیٰ اس کو بخشے۔ ایک فرزند دو ماہ کا چھوڑا، حق تعالیٰ اس کی عمر کرے کہ اس سے ہی دل بہلاؤں۔"
(مکاتیب رشیدیہ مکتوب نمبر ۸۰ صفحہ ۶۲-۶۳)

ایک دوسرے مکتوب میں بڑے پُر درد انداز میں منشی فتح محمد صاحب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود احمد مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں۔ جب تم ان کو سلام لکھتے ہو، مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔"
(مکاتیب رشیدیہ مکتوب نمبر ۱۲۰ صفحہ ۷۹)

اب میں بھائی جی مرحوم سے متعلق تذکرۃ الرشید اور مکاتیب رشیدیہ کی ہی چند عبارات اور مندرجات پیش کرتا ہوں، جن سے ان کی سوانح پر کچھ روشنی پڑے گی۔

مولانا عاشق الٰہی تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۳۳۸ پر رقم طراز ہیں۔

صاحبزادہ محمود احمد مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادہ یعنی حضرت قدس سرہ کے پوتے سعید احمد اطال اللہ عمرہ ہیں۔ جن کی ولادت ۲۶ر ربیع الاوّل ۱۳۱۱ھ کو ہوئی۔ باپ کا جس دن انتقال ہوا، ان کی عمر ایک ماہ بیس یوم کی تھی۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ کو ان کے ساتھ خاص الفت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ مرحوم کی نشانی تھے اور تیئیس ۲۳ سالہ جوان بیٹے کے بدلے پوتے کی دو ماہ کی جان حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

۵ر ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو جب کہ سعید احمد دس دن کم دو ۲ برس کے

تھے، ان کی والدہ نے بھی رحلت فرمائی۔ حق تعالیٰ عمر و علم میں برکت دے۔ اس وقت سولہ برس کی عمر ہے۔ اور دیوبند میں عربی پڑھتے ہیں۔

نیز تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۱۴۲ پر ہے۔

صغیر السن بچوں کے ساتھ آپ (حضرت گنگوہیؒ) بہت محبت فرماتے تھے کہ ایک دن مولوی محمود احمد کی یادگار سعید احمد سلمہ جن کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی، آپ کے پاس آئے اور گلے میں باہیں ڈال کر کوئی چیز اصرار کے ساتھ مانگنے لگے، اتفاق سے صاحبزادۂ (گرامی قدر) حکیم صاحب مدظلہٗ تشریف لے آئے اور میاں سعید کو تیز نظر کے ساتھ دیکھ کر کہا کہ "حضرت یہ تو بہت گستاخ ہوتا جارہا ہے" حضرت امام ربانی مسکرائے اور یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

برگ گل را شاخ گل بر فرقِ خود جامی دہد

میں نے مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی زید مجدہم کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا جس میں یہ بھی تحریر تھا کہ جی چاہتا ہے میں بھائی جی مرحوم کی یاد میں دو چار صفحات لکھوں اور دارالعلوم میں شائع کرادوں، اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اپنے انداز میں ایک مکتوب گرامی روانہ کیا جو اپنے دامن میں بیش بہا موتی رکھتا ہے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مکتوب گرامی کو اپنے تأثرات کے بعد ناظرین کے سامنے پیش کردوں۔ اس مکتوب گرامی کے بعد ایک دوسرا مکتوب گرامی بھی صادر ہوا جو میرے ایک استفسار کے جواب میں تھا۔ یہ بھی ایک صاحبِ طرز ادیب کے افکار و خیالات کا بہترین مرقع ہے۔ اس کو بھی شائع کرنا ضروری سمجھا۔

مکتوب نمبر ۱۔ از حکیم عبدالرشید محمود عفی عنہ گنگوہ

مکرمی مولانا سلام و تحیات، والا نامہ ملا، جی ہاں۔ بھائی مولوی سعید احمد صاحب بھی رحلت فرماگئے۔ ـــــہ

نزلنا ساعةً ثمّ ارتحلنا　　　كذا الدُّنيا رحالٌ فارتحلنا[1]

آپ نے لکھا کہ دو چار صفحات لکھ کر رسالہ دارالعلوم میں بھیج دوں۔ مگر آپ تو نہ اُن سے قریب تھے نہ وہ ایسے نمایاں کہ ان کے متعلق دو چار صفحات آپ لکھ سکیں۔ دو چار سطور البتہ۔ انہوں نے پون صدی شعور کے ساتھ دیوبند جیسی مرکزی جگہ اور ایک عظیم ادارہ میں گذاری۔ جہاں ہر قسم کی حرکت گرمی، درد و فغاں، قیل و قال، بحث و جدال، نزاع و مرار، شر اور شوریدگی، آہ و واہ ضروری اور مسلسل تھا، مگر وہ کسی تحزّب سے نہ کبھی آشنا ہوئے۔ نہ گروہی، جماعتی جدال و مرار سے۔ تعلقات کی وسعت اور بسط و روابط انہیں پسند تھا۔ نہ وہ کسی اختصاص کے کبھی مدّعی ہوئے۔ حرکت و فعالیّت ان کا مزاج تھا۔ نہ خود بینی و خود نمائی، یک سو کم آمیز مگر متبسم با اخلاق۔ شاید کسی کو ان سے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ ملا ہو۔ وہ باہمہ کم سے کمتر، اور بے ہمہ سب سے زیادہ تھے اُن کا ذوق تھا۔ ؎

جزی اللہ عنا الخیرَ من تعیش بیننا　　ولا بینہ وُدٌّ ولا متعارفُ[2]

کسی کو جانیں، نہ کوئی ان کو پہچانے۔ میل ملاقات اور رسم و ارتباط کے سلسلہ میں گویا دوسروں کی اس قدر رعایت کہ۔ ؎

أُقِلُّ سلامی حیث ماخِفْ عنکم　　واسکت کیما لا یکون جوابُ[3]

سلام سے بھی گریز کہ ناحق جواب کی زحمت سے کوئی دو چار ہو، بعض نے

---

[1] کچھ دیر کے لئے ہم نے پڑاؤ کیا پھر چل پڑے، ایسے ہی پوری دنیا پڑاؤ ہے۔ لہٰذا ہم بھی کوچ کر گئے۔ [2] اللہ تعالیٰ ہماری جانب سے اس شخص کو جزائے خیر عطا فرمائے جس کے اور ہمارے درمیان کوئی تعلق اور شناسائی نہیں ہے۔

[3] میں سلام کم کرتا ہوں تاکہ تمہارے لئے معاملہ ہلکا پھلکا رہے اور خاموش رہتا ہوں تاکہ زحمتِ جواب اٹھانی نہ پڑے۔

تو اس قدر اختصار سے کام لیا کہ ؎

لقاء الناس لیس یفید شیئًا سوی الہذیان من قیل وّقال
فاقلل من لقاء الناس اِلَّا لِاَخذِ العلم او اصلاح حالٍ[1]

کسی کو اگر اس اختصار سے اختلاف ہو تو وہ بھی ماذون ہے کہ اخذ علم اور اصلاح حال کے علاوہ معاشرہ میں تطییب خاطر مسلمین بھی اصلاح حال ہی کا ایک شعبہ ہے۔ پہلی چیز حال ہے۔ دوسری اعتدال ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل وسیع معنیٰ میں فرمایا۔ کن وَسَطًا وَامْشِ جانبًا[2]۔ اس کا ترجمہ اور تعبیر با ہمہ اور بے ہمہ ہی کر لیجئے۔ وہ حضرت گنگوہیؒ کے چھوٹے بیٹے مولوی محمود صاحب کی پہلی اور آخری اولاد تھے۔ وہ پیدا ہوئے، باپ عازم آخرت ہوئے۔ مرنے والوں کا مرثیہ لکھنا ان کے حالات و سوانح پر روشنی ڈالنا سلف سے چلا آ رہا ہے۔ لکھنے والے آج بھی لکھتے ہیں۔ میں نے بھی حضرت شیخ الحدیث اور حضرت مولانا طیب کے متعلق لکھا جو الفرقان میں طبع ہوا۔ مقصد ہوتا ہے اعزہ کی تسکین، صبر کی تلقین، موتیٰ کے محاسن کا اعتراف دعاء مغفرت و نجات، پسماندگان کے غم میں شرکت، معلوم ہو کہ دوسرے بھی ان کے اس المیہ میں شریک ہیں۔ تعزیت سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس دور میں تو اکثر عَظَّمَ اللّٰہُ اَجْرَكَ فِی فلانٍ[3]۔ مجمل اور عام طریقہ تھا پھر خواص کے لئے اس دور صحافت و خطابت میں جرائد کے خصوصی نمبر، تعزیتی اجتماع، یادگاری

---

[1] لوگوں کی ملاقات سے سوائے فضول گوئی اور قیل و قال کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگوں سے ملاقات کم کیا کرو ہاں تحصیل علم یا اصلاح کے لئے ملنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

[2] میانہ رو رہو اور یکسو ہو کر چلو۔

[3] فلاں کے فراق کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

اکاڈمیں۔ ایک بزرگ نے اسی پر اکتفا کیا۔ ؎

انا نعزیك لا انا علی ثقة — من البقاء ولکن سنة الدین

فلا المعزیٰ بباقٍ بعد میته — ولا المعزی وان عاش الی حین[1]

ایک اعرابی نے حضرت عباسؓ عمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہا۔ ؎

خیر من العباس اجرك بعدہٗ — واللہ خیرٌ منك للعباس[2]

فلتصبر و لتحتسب۔ دونوں کو جمع کر دیا۔

کسی نے کہا تھا۔ ؎

ہے موت میں ضرور کوئی راز دل نشیں — سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں یہ کچھ تو نہیں

جلوہ گر نورِ بقا میں صورتِ سیماب ہے — اے تماشا گاہِ عالم بس تجھے آداب ہے

دنیوی حیات کی بے ثباتی مستعار زندگی کی حقیقت حسین توضیح و تعبیر۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اپنے غم و فراقِ بتول میں خوب کہا۔ ؎

اریٰ علل الدنیا علی کثرۃ — وصاحبها حتی الممات علیل

ان افتقادی فاطمة بعد احمد — دلیلٌ علی ان لا یدوم خلیل[3]

---

[1] میں تسلی دیتا ہوں اس وجہ سے نہیں کہ مجھے ہمیشہ رہنے کا یقین ہے بلکہ دین کے حکم کی وجہ سے چنانچہ متوفی کے گذر جانے کے بعد نہ وہ شخص باقی رہے گا جس کو تسلی دی جارہی ہے۔ اور نہ تسلی دینے والا باقی رہے گا۔ اگرچہ کچھ دن دنیا میں اور گذار لے۔ [2] حضرت عباسؓ کے بعد آپ کا اجر و ثواب حضرت عباسؓ سے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ تعالےٰ حضرت عباسؓ کے لئے آپ سے بہتر ہے لہٰذا صبر کرو اور ثواب کی نیت کرو۔ [3] میں اپنے اوپر دنیا کی بے شمار بیماریاں پاتا ہوں، ان بیماریوں میں مبتلا شخص مرتے وقت تک بیمار رہے احمد مجتبیٰ کے بعد فاطمہ زہرا کی جدائی اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی خلیل ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

بقیع سے گذرتے ہوئے فرمایا۔ ؎

مالی مررتُ عَلَی القبُورِ مُسلّما — قبرالحبیب فَلَم یرد جوابی
یا قبر مالك لا تجیب مُنادیًا — املِلتِ بعدی خُلّۃَ الاحبابِ[1]

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھائی کی وفات پر فرمایا۔ ؎

فلیت المنایا کُنّ خلّفن عَاصِمًا — فَعِشنا جمیعًا اوذھبن بنَا معًا[2]

تکلیف ہجر و مہجوری کی ہے نہ موت کی۔ وہ بھی عارضی یہ بھی عارضی خاتمہ بخیر ہو جائے تو سب وہاں مجتمع اِلَّا قِیلاً سلامًا سلامًا کی اصوات، نغمہائے سحاب اندر سحاب اخیر میں وہ بالکل ہی مشغول رہنے لگے تھے۔ فاجعل الٰہی خیر عمری اٰخرہٗ۔[3]

بس دعائے مغفرت کر جائیں۔ انّا انشاء اللہ بہم لاحقون۔ توفنا مُسلمًا والحقنا بالصالحین، وما ذٰلك علی اللہ بعزیز۔[4]

الٰہی لستُ للفردوس اھلاً — ولا اقویٰ عَلیٰ نارِ الجحیم
فہب لی توبۃً واغفرذُنُوبی — فانك غافر الذنبِ العظیم[5]

وَالسّلام

---

[1] مجھے کیا ہوا کہ میں قبروں پر سے گذرا اپنے حبیب کی قبر پر سلام کرتے ہوئے پس اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، اے قبر تجھے کیا ہو گیا تو کسی پکارنے والے کی پکار کا جواب نہیں دیتی۔ کیا تو احباب کی محبت سے دل برداشتہ ہو گئی ہے۔ [2] کیا اچھا ہوتا کہ موتیں کسی محافظ کو میت کا خلیفہ بنا دیتیں، پس ہم ایک ساتھ زندگی گذارتے یا ہم سب کی روحیں ساتھ قبض کر لیتیں۔ [3] الٰہی مری آخری عمر کو بہترین بنا دے۔ آمین۔ [4] ہم انشاء اللہ ان سے ملنے والے ہیں۔ اے اللہ بحالت اسلام ہمیں وفات دے۔ اور نیک لوگوں میں شامل فرما۔ یہ اللہ تعالےٰ کے لئے مشکل کام نہیں ہے۔ [5] اے اللہ میں جنت الفردوس کا اہل نہیں ہوں، اور دوزخ کی آگ کو برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مجھے توبہ کی توفیق عطا فرمائیے۔ اور میرے گناہوں کو بخش دیجئے کیونکہ آپ بڑے بڑے گناہوں کو معاف کرنے والے ہیں۔

مکتوب نمبر ۲

از گنگوہ حکیم عبد الرشید محمود عفی عنہ

مکرمی مولانا زید مجدکم۔ سلام و تحیات

گرامی نامہ سے مشرف ہوا، قابل حذف مضمون و عبارت کی نشاندہی بھی فرماتے تو مجھ کو نفع ہوتا۔ ظاہر ہے کہ آپ سے اہل علم و قلم حضرات کی اہلیت مسلم اور ناقابل انکار ہے۔ میں ہرگز محسوس نہ کرتا۔ بلکہ مشکور ہوتا تشکر سے ابھی فارغ نہیں کہ آپ اس کے لئے اہم کا لفظ استعمال فرما رہے ہیں جو میرے لئے آپ کی جانب سے ایک طرح کی سند ہے۔

میرا خیال اگر صحیح ہے تو شاید میری یہ عبارت لائق حذف خیال فرمائی گئی ہوگی کہ وہ کسی علمی اختصاص سے متصف تھے۔ نہ حرکت وہ فعالیّت ان کا ذوق و مزاج تھا۔ ایسی کھری مبنی بر حقیقت بات ان اذہان پر تو شاید بار ہو سکتی ہے جو کسی شخصی تصویر کشی میں کچھ رنگ آمیزی پسند کرتے۔ یا شاعری ان کا مذاق ہو ہمارے بزرگوں میں بعض حضرات ہیں جو غلبۂ محبت میں اپنے محبوب مشائخ کے لئے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں جس پر اغیار کو نکتہ چینی کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ مگر بات یہی مناسب و متوازن ہے کہ اطرار کی حد تک نہ پہونچیں اور منقبت خوانی کا کیف نہ آئے۔ آگے علمی اختصاص نہ ہونا تو یہ واقعہ ہے۔ عیب یا کوئی ذمیمہ ہرگز نہیں، جتنی بات ہے اسی قدر بیان و اظہار ہے نقص نہ زیادت۔ پھر بھائی کی طرف سے بھائی کے بارے میں ہے۔ اس رشتۂ قریبہ کے پیش نظر نازک بھی ہے اور باریک بھی۔

علمی اختصاص پر عرض کرتا ہوں۔ امام غزالی محقق حکیم ماہر نفسیات عارف باللہ ہیں۔ محدث اور فقیہ نہیں۔ شاہ ولی اللہ حکیم محدث مجدد ہیں، مفتی نہیں، سید احمد بریلوی مجاہد، مجدد ہیں۔ حدیث و فقہ ان کا موضوع نہیں۔ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ

عارف علماگر تھے۔ عالم نہ تھے۔

اوپر چلئے۔ یہ سابقون الاولون، طائران حول العرش ہیں۔ ابن مسعود فقیہ محدث اقربُ واشبہ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دلًّا ہدیًا سمتًا ہیں قائد جیش نہیں۔ معاذ ابن جبل اور ابی ابن کعب امام العلماء اور اقرأ القوم ہیں۔ خالد سیف من سیوف اللہ طلحہ اور زبیر اصحاب تدبر و سیاست، عمرو ابن العاص، سعد ابن ابی وقاص قیادتِ جیوش کی صلاحیت سے مزین، کوئی امین ہذہ الامۃ، کوئی مؤید بروح القدس البتہ خلفاء راشدین المہدیین رضی اللہ عنہم سب منتظر الامارۃ جمعیت جامعیت اجتماعیت میں مکمل۔

ولیس علی اللہ بمُستنکرٍ ان یّجمعَ العَالمَ فی وَاحدٍ[1] کے مصداق۔ اکثر کسی وصف کا انکار نہیں ہوتا۔ اوصاف غالبہ و سمات واضحہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام میں بھی غلبہ کے اعتبار سے آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی خلت وغیرہ شیون مختلفہ ہیں۔ حضرت صدیق رضؓ کا وصف صدیقیت، ابوعبیدہؓ کا وصفِ امانت، عمارؓ کا ملِئَ عمارٌ ایمانًا الی مشاشہٖ[2] انہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ سب صحابہ درجہ بدرجہ صدق و امانت و ایمان سے مزین اور معمور تھے۔ فرق صرف غلبہ کا تھا۔ بڑی کرامت و جلالت جو تمامی مکارم و محاسن اور محامد کا راس المقام ہے وہ ولکنہٗ شیئٌ وُقرَ فی قلوبہم[3] ان سب کا اختصاص ہے یہ صحابہؓ کا وہ نصیب

---

[1] اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ شخص واحد میں ایک عالم کو جمع فرمادے۔
[2] عمار (رضی اللہ عنہ) سر سے پاؤں تک ایمان سے بھرے ہوئے ہیں۔
[3] لیکن وہ ایسی چیز ہے جو اُن کے قلوب میں جاگزیں ہے۔

ہے جوان کے بعد کسی کو میسّر نہ تھا۔ الّا بہ تبعیت۔ یہی ایک برق ہر ایک میں کوند رہی تھی۔ یہی کرنٹ سب میں مشترک آرہا تھا رضی اللہ عنہم۔

اخیر میں عرض ہے کہ یہ سب اس لئے زبانِ قلم پر آیا کہ دو چار صفحات لکھنے کا قصد تحریر فرمایا۔ ان صفحات میں اس نسبت کے اعتبار سے جوان کو ایک امام زمانہ حبرٌ من الاحبار کان عالمًا رفیعًا ثقۃً حجّۃً کانَ۔ [1] عابدًا ناسکًا کثیر العلمِ۔[2] علّامۃٌ من بحور العلم نفیہ النفس۔ کبیر الشان، رأسٌ فی انواع الخیر سے تھی۔ آپ کیا لکھیں گے۔ بے اصل لکھ نہیں سکتے۔ صحیح اور اصل کے حال دسیرت میں اجمال ہے۔ نمائش نہیں اور جو نمایاں ہے اس میں عوام کے لئے کشش نہیں۔ پھر خواص کو بھی التفات کم بہرحال لکھنا دی چاہئے جو مبنی برحقیقت ہو اور وہ دہی بظاہر ہو سکتا ہے جو میں نے عرض کیا۔ یکسوئی عزلت وخلوت بے ضرر ہونا، جدال وخصام سے احتراز واجتناب باہمہ اور بے ہمہ ہونا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کن وسطًا وامشِ جانبًا کا حرز دحرز م یہ اُن کی سیرت کی صحیح ترجمانی ہی نہیں خود بڑی وزنی چیز اور کبریتِ احمر ہے۔ دوسرا جزو حرکت وفعالیت مزاج نہ ہونا بظاہر کوتاہی ہے مگر عواقب احوال ونتائجِ مساعی کے پیش نظر جس کا مشاہدہ آج عام ہے یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ ان کا ہر قسم کے تحزب سے فارغ اور ایک وضع سلیم پر مستقیم رہنا نہ کوئی ادعا نہ علو فی الارض والفساد نہ جذبہ دارانہ غلو جس کا مشاہدہ آج ہم دوائرِ علمیہ دینیہ میں رات دن کر رہے ہیں جس میں اس عصر کے دینی اشخاص کیسے ملوث ہیں اور پھر دارالعلوم جیسی مرکزی بین الاقوامی جگہ میں صحافت وخطابت، خلوت وجلوت

---

[1] ایک محقق عالم، رفیع المرتبت۔ [2] وہ عبادت گذار، کثیر العلم تھے۔

سب غیر متوازن۔ وہ ان سب سے دامن بچائے ہوئے نکل گئے۔ جوار رحمت میں پیوست ہو گئے۔ اس ارشاد نبوی پر چل کر کہ اذا رأیتَ الناس قد مزجت عہود ھم وخفّت اماناتھم وکانوا ھکذا فعلیك بامر نفسك خاصةً دع عنك امر العامة، الزموا اجواف بیوتکم اورکونوا احلاس بیوتکم۔ [1]

ہمارا دین اقویا اور ضعفاء دونوں کے لئے ہے۔ عینٌ بکتْ من خشیة اللہ وعینٌ باتت تحرس فی سبیل اللہ۔[2] اول ضعفاء کے لئے ثانی اقویاء کے لئے۔ روح احسان ہر ایک میں ساری، اخلاص ہر ایک میں پنہاں۔

شاید یہی مضمون لائق حذف خیال فرمایا ہو اور اسی عبارت میں کوئی نکارت محسوس ہوئی ہو، جو میری فہم سقیم میں نہ آسکی۔ نقطۂ نظر کا اختلاف بھی ممکن ہے اور بصیرت وادراک کا ضعف وقوت بھی سبب بن سکتا ہے۔

دوسرا جزو حرکت وفعالیّت نہ ہونا، صحیح ترجمانی ہی نہیں، خود جیسا کہ عرض کیا۔ بڑی گرانقدر وزنی چیز ہے۔ عصری احوال، وقتی تقاضے، کبھی طبعی نزاکت، بعض جگہ طبعی ذکاوت، بلکہ بعض دفعہ طبعی نقاہت۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے خود منصبِ قضا قبول نہیں فرمایا۔ اپنے تلمیذ امام ابو یوسفؒ کو قبول کرنے کی وصیت فرمائی۔ واقعۂ حرہ میں بعض اصحاب سامنے آئے۔ بعض روپوش ہو گئے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ بعض احوال ایسے ہوں گے کہ لیٹا ہوا بہتر ہوگا بیٹھے ہوئے سے۔

---

[1] جب تم لوگوں کو دیکھو کہ باہم معاہدوں کا لحاظ نہیں کرتے اور اماتنوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اور ایسے ہو جائیں تو تم اپنی فکر کرو، عوام کی فکر مت کرو، اپنے گھروں کے اندر رہو، اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جاؤ۔ [2] ایک آنکھ وہ جو اللہ کے خوف کی وجہ سے روئی اور ایک آنکھ وہ جو اللہ کے راستہ میں چوکیداری کرتے ہوتے جاگی۔

اور بیٹھا ہوا بہتر ہوگا کھڑے ہوئے سے اور کھڑا ہوا چلتے ہوئے سے۔

فضول لایعنی، طویل تحریر پر معذرت خواہ ہوں، اور متشکر بھی کہ اس حیلہ سے صحبتِ با اولیاء علماء میسر ہوئی۔ مطابق اس شعر کے کہ ؎

نہ بہ نقش بستہ مشوشم   نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نفسے "بیادِ تو" می زنم   چہ عبارت وچہ معانیم

"بیادِ تو" کے بجائے "بخطاب تو" سمجھ لیجئے۔

عریضہ کی رسید سے مطلع فرمائیں تو اطمینان ہوگا۔

(ماہنامہ دار العلوم اگست ۱۹۸۶ء)

یادِ رفتگاں

قاری احمد میاں صاحب دارِ آخرت کو سدھارے

افسوس کہ ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کو دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تجوید کے قدیم استاذ جناب قاری احمد میاں صاحب طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ قاری صاحب مرحوم حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے صاحبزادے تھے، آپ کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچتی ہے، مرحوم نے فن تجوید کی درسی خدمات کے ساتھ تصنیفی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ مرحوم بڑے سادہ مزاج، متواضع، اور آزاد منش تھے۔ کیا خوب آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

حضرت مولانا سلطان الحق رحمتِ حق سے پیوست

۲۵ فروری ۱۹۸۶ء کو حضرت مولانا سلطان الحق صاحب سابق ناظم کتبخانہ دار العلوم کا وصال ہوگیا، مرحوم ایک عرصہ سے علیل چل رہے تھے وفات سے ایک ہفتہ قبل سے مرض میں اضافہ ہوگیا تھا اور علاج و معالجہ کی ہر دستیاب تدبیر

اختیار کی گئی مگر تقدیر کے آگے تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں، اور مولانا اپنے پیچھے عقیدتمندوں کی ایک بڑی جماعت کو سوگوار چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوگئے مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے جس محفل میں بھی ہوتے اسے اپنی بذلہ سنجیوں سے زعفران زار بنائے رہتے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ سے خصوصی تعلق تھا، عملیات میں مولانا کی ذات آج کل ایک مرجع کی حیثیت رکھتی تھی دارالعلوم اور اس کے اکابر کے سوانح و حالات کے سلسلے میں مولانا ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے، احقر اس سلسلہ میں مولانا مرحوم سے استفادہ کرتا رہتا تھا، مرحوم تقریباً نصف صدی سے زائد تک دارالعلوم سے وابستہ رہے اور مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے اور صاحبزادگان و اہلیہ محترمہ و دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی کی رحلت

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے صاحبزادہ جناب مولانا حفیظ الرحمٰن واصف صاحب کا بھی اسی ماہ میں انتقال ہوگیا، مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب علوم دینیہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، اردو ادب میں مولانا کی ذات ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھی، حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ جو مختلف رسائل و اخبارات اور رجسٹروں میں منتشر تھے، واصف صاحب نے ان تمام فتووں کو نہایت سلیقہ سے مدون و مرتب فرما کر کفایت المفتی کے نام سے عرصہ ہوا شائع کر دیا تھا، مولانا مرحوم کا یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو علمی حلقہ میں ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔ (ماہنامہ دارالعلوم اپریل ۱۹۸۷ء)

یادِ رفتگان

(۱) مولانا محمد حیات سنبھلی

حضرت مولانا محمد حیات سنبھلی نقشبندی ایک جلیل القدر اور صاحب تصانیف عالم دین تھے ۱۳۱۰ھ میں سنبھل ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے، علوم دینیہ کی تکمیل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری سے کی تھی، تکمیل علوم کے بعد لاہور، رنگون، میرٹھ، بریلی، پنجاب وغیرہ کے مدارس میں کامیاب تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۳۹ھ میں اپنے ضلع کے مشہور مدرسہ "جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد" میں استاذ حدیث مقرر ہوئے اور فن حدیث کی اعلیٰ کتابیں آپ کے زیر درس رہیں، اپنے استاذ حضرت مولانا عبد الوحید سنبھلی کی وفات کے بعد مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں ان کے جانشین منتخب ہوئے اور تقریباً بائیس سال کی طویل مدت تک مدرسہ امدادیہ کی علمی خدمت کرتے رہے آپ ہی کی کوششوں سے اس مدرسہ میں دورۂ حدیث کا اجراء ہوا جو بحمد اللہ آج تک قائم ہے۔

۱۳۷۶ھ میں مراد آباد میں ایک درس گاہ حیات العلوم کے نام سے قائم کی اور تاحیات اُس کی نظامت اور صدارت تدریس کی اہم ترین ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے مولانا مرحوم نے تقریباً ۷۰ سال تک حدیث پاک کا درس دیا، مولانا کی یہ ایسی عظیم اور قابل ذکر خصوصیت ہے جس کی مثال ان کے معاصر علماء میں کم ملے گی۔ تدریسی مشغلے کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اور شروح، حواشی، تراجم اور مستقل تالیفات کو ملا کر آپ کی کل تصنیفات تقریباً نصف صد سے زائد ہیں جن میں ۳۷ کتابیں طبع ہو چکی ہیں ان میں تعلیقات

علی سنن ابی داؤد، تجرید بخاری اردو دو جلد، نور القلوب، حواشی ترجمہ قرآن شاہ رفیع الدین دہلوی وحضرت تھانوی، ترجمہ بخاری شریف مکمل، ترجمہ طحاوی شریف حاشیہ جلالین شریف عربی وغیرہ نہایت اہم ہیں، آپ کو سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا عبدالمالک صاحب نقشبندی متوفی ۱۹۷۳ء سے اجازت و خلافت بھی حاصل تھی، افسوس کہ یہ گنجینۂ علم وعمل اب ہمارے درمیان نہیں رہا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی وفات صرف حیات العلوم ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیائے علم کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔

(۲) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قومی آواز دہلی سے یہ خبر معلوم کر کے کہ مشہور مؤرّخ وصحافی جناب سید صباح الدین صاحب ۱۸ر نومبر کو سڑک کے ایک حادثہ میں انتقال کر گئے۔ دل کی جو کیفیت ہوئی اسے تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، موصوف مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید اور شبلی اسکول کے آخری ممتاز فرزند تھے، تاریخ ادب اور صحافت میں اس وقت ہندو پاک میں آپ کا شمار اساتذہ کی فہرست میں ہوتا تھا، موصوف کی تحریریں اعتدال وتوازن، فکری گیرائی، حسن کاری اور نزاکت احساس کا بہترین مجموعہ ہوتی تھیں۔ مجلہ معارف اعظم گڑھ میں آپ نے جو شذرات لکھے ہیں وہ اردو نثر کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

راقم الحروف نے "بابری مسجد حقائق اور افسانے" کے نام سے جب ماہنامہ دارالعلوم میں طویل اداریہ لکھا تو مرحوم نے اسے پڑھ کر ایک محبت آمیز مکتوب تحریر فرمایا اور ہمت افزائی فرماتے ہوئے اداریہ کی دل کھول کر داد دی، بعد میں موصوف نے اسی موضوع سے متعلق ایک وقیع کتاب تصنیف فرمائی

توجا بجا اس میں اس اداریہ کا حوالہ دیا اور پھر یہ کتاب بندہ کے پاس بذریعہ
وی، پی ارسال فرمائی اور ساتھ ہی ایک مکتوب بھی روانہ کیا کہ تمہارے اداریہ
سے کتاب کی ترتیب میں متعدد مقامات میں مدد لی گئی ہے اور بابری مسجد
کے کتبات کا پورا حصہ درج کرلیا گیا ہے اس لئے تمہیں اس کتاب پر تبصرہ
کرنے کا حق سب سے زیادہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ موصوف کی اپنے خردوں کو
آگے بڑھانے کی ایک خاص ادا تھی ورنہ انہیں اس اداریہ کے اقتباسات کی
قطعاً ضرورت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی رحلت سے تنہا دارالمصنفین اعظم گڈھ
کی علمی مجلس سونی نہیں ہوئی ہے بلکہ برصغیر کے علم و ادب کی محفلیں سنسان ہوگئی
ہیں۔ موصوف بیک وقت دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ناظم اور مجلہ معارف
اعظم گڈھ کے مدیر و مرتب تھے۔ موصوف کی رحلت سے یہ دونوں جگہیں
خالی ہوگئی ہیں، خدا کرے دارالمصنفین کو موصوف ہی جیسا کوئی جانباز معتمد
میسّر آجائے تاکہ یہ علم و تاریخ کا مرکز اپنی سابقہ روایات کو قائم رکھ سکے۔

(۳) مولانا ظفرالدین کانپوری

مولانا ظفرالدین کانپوری مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل صاحبِ
نسبت عالم، جامعہ اسلامیہ قلی بازار کانپور کے مہتمم اور انجمن فروغ سنت کے
بانی و صدر تھے، مولانا مرحوم اپنی سادہ مزاجی اور شریف النفسی کی بنا پر مخالفین
کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ مسلک و مشرب کی تفریق کے بغیر ہر ایک
کے کام آنا مولانا کا ایک ایسا امتیاز تھا جس کی نظیر اس دور مصلحت پسند
میں کم ملے گی، شہر کانپور میں علم و دین کے فروغ کے لئے مرحوم کی خدمات ہمیشہ یاد
رکھی جائیں گی۔ علمی و دینی مشاغل کے ساتھ مرحوم سماجی اور معاشرتی امور سے
بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ کانپور کا مولانا کی خدمات سے

محروم ہو جانا اس کے لئے ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی جلد نہ ہوسکے گی۔

(۴) حاجی عبدالمجیب بنارسی

حاجی عبدالمجیب بنارسی محلہ اشفاق نگر شہر بنارس کے مشہور تاجر اہم ترین دینی وسماجی کارکن اور دیوبندی مکتب فکر کے زبردست حامی تھے، بندہ جس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ بنارس میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا اس وقت مرحوم مدرسہ کے ایک فعال ومتحرک رکن و ذمہ دار تھے، مرحوم بندہ کے ساتھ بڑی اپنائیت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے، کارکنان جامعہ نے مرحوم کی صلاحیتوں کے پیش نظر جامعہ اسلامیہ کے شعبہ قدرت اللہ گلزار تعلیم کا نگراں اور خود جامعہ کا خزانچی منتخب کرلیا تھا موصوف ان دونوں ذمہ داریوں کو بڑی خوبی کے ساتھ نباہ رہے تھے، مدرسہ کے معاملات پر جامعہ کے ناظم اعلیٰ جناب حافظ عبدالکبیر صاحب سے ان کے مکان پر مصروف گفتگو تھے کہ وہیں اچانک طبیعت بگڑ گئی وہاں سے بذریعۂ کار اپنے گھر آئے، گھر پہنچ کر طبیعت اور بگڑ گئی۔ فوراً ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا گیا، ڈاکٹروں نے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ انہیں فوراً اسپتال میں داخل کردیا جائے۔

چنانچہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہوگئے اور ڈاکٹروں نے اپنی جیسی ساری تدبیریں کر ڈالیں مگر وقت موعود آپہنچا تھا اس لئے ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور تقریباً اڑتالیس گھنٹے حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۱۸ر نومبر کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مرحوم کو دارالعلوم دیوبند سے خاص قلبی لگاؤ تھا ابھی ایک ماہ قبل اپنے تجارتی کام سے لدھیانہ جاتے ہوئے دیوبند آئے تھے، بندہ ہی کے حجرہ میں کھانا وغیرہ کھایا اور خلاف معمول بہت دیر تک جمعیۃ علماء کی تنظیم وترقی کے سلسلے

میں باتیں کرتے رہے۔ نیز بنارس میں مسلم فنڈ قائم کرنے کے سلسلے میں بھی باتیں کیں اور بندہ سے کہا کہ بنارس آنا ہو تو میرے یہاں آکر قیام کرنا تم سے ابھی مزید باتیں کرنی ہیں، مگر کسے معلوم تھا کہ یہ مرحوم سے آخری ملاقات تھی، چنانچہ بندہ بنارس حاضر ہوا ان کے مکان پر بھی گیا مگر مرحوم تو دوسری دنیا کو آباد کر چکے تھے اس لئے تعزیت کے چند آنسو بہا کر واپس چلا آیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے پسماندگان بالخصوص نابالغ صاحبزادگان کو اپنی حمایت وکفایت میں رکھے۔

(ماہنامہ دارالعلوم دسمبر ۱۹۸۷ء)

یادِ رفتگاں

ادھر تین چار ماہ کے اندر فرزندان دارالعلوم دیوبند میں سے یکے بعد دیگرے پانچ قابل ذکر فضلاء بزم ہستی سے روٹھ کر خلد آشیاں ہو گئے، مگر ہماری محرومیٔ قسمت دیکھئے کہ ہم ان کی تعزیت میں چند سطریں بھی نہ لکھ سکے، اس کوتاہی میں اگرچہ سب سے بڑا دخل اس حقیر کی درسی مصروفیتوں کا ہے لیکن اسی کے ساتھ رسالہ کی تنگ دامانی بھی سدّ راہ بنی، بعض ضروری مضامین عرصہ سے اشاعت کے منتظر تھے جنہیں مزید مؤخر کر دینا مضمون نگار حضرات کے لئے سوہان روح تھا، اس لئے مجبوراً یادِ رفتگاں اور جدید مطبوعات کے تعارف کو روک کر انہیں شائع کرنا پڑا، اب بھی بہت سے مضامین باقی رہ گئے ہیں، لیکن تقاضوں کے دباؤ میں کسی حد تک کمی آگئی ہے۔ اس لئے یادِ رفتگاں کے سلسلے میں یہ چند سطریں تاخیر پر ندامت کے ساتھ قارئین دارالعلوم کی خدمت

میں پیش کی جارہی ہیں اور اس توقع پر کہ ان مرحومین کے لئے ان سطروں کے پڑھنے والے دعائے مغفرت اور ترقیٔ درجات کی دعا فرمائیں گے۔

۱ ۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کے برادر بزرگ جناب مولانا حکیم مطلوب الرحمٰن بن مولانا مشیت اللہ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً طویل علالت کے بعد ۱۰ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ کو اپنے پیچھے سوگواروں کا ایک انبوہ کثیر چھوڑ کر راہیٔ ملک جاودانی ہوگئے، مرحوم حافظ قرآن، مسیحا نفس طبیب اور دارالعلوم دیوبند کے گرامی قدر فرزند تھے، دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ سے کی تھی، اور زندگی بھر اپنے شیخ کے دلدادہ رہے، حضرت مولانا مدنیؒ جب کبھی ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ دن ان کے لئے عید سے کم نہ ہوتا، وفات سے چند دن پہلے خواب دیکھا کہ حضرت مدنیؒ تشریف لائے ہیں اور ان کے ہمراہ دو بزرگ اور ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اور دوسرے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہما ہیں۔ اس خواب سے انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اب زندگی کے ایام ختم ہوچکے ہیں اور جلد ہی ان اکابر کی مجلس میں باریابی ہوگی، مرحوم ایک عرصہ سے صاحبِ فراش تھے مگر اس حالت میں بھی پنج وقتہ نماز وقت پر ادا کرتے رہے، نہایت خوش خلق، ملنسار، متواضع اور مہمان نواز تھے، مہمان نوازی اور تواضع تو اس خاندان کو وراثت میں ملی ہے جس کی زندہ مثال حضرت مہتمم صاحب کی ذات والا صفات ہے۔ متعنا اللہ بطول حیاتہ۔

۲ ۔ ضلع اعظم گڈھ یوپی کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ احیاء العلوم مبارکپور کے ناظم جناب مولانا عبدالباری صاحبؒ ۱۳ ربیع الآخر ۱۴۰۸ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء

کو طویل و جانگسل علالت کے بعد انتقال کر گئے، مرحوم دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے تلمیذ تھے، مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت عالم دین، دینی رہنما اور سیاسی لیڈر رہتے، مرحوم نے ایک طرف احیار العلوم کے ذریعہ اسلامی علوم وفنون اور دینی عقائد و اعمال کی ترویج واشاعت کی خدمت کی تو دوسری طرف جمعیۃ علمار اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے قومی و سیاسی جدوجہد کا فریضہ بھی انجام دیا، ضلع اعظم گڈھ بالخصوص مبارکپور کے مضافات میں مولانا مرحوم ایک بلندپایہ عالم دین اور قومی لیڈر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے علمار دیوبند سے آپ کے خصوصی روابط تھے بالخصوص حضرت مدنی، مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے اور بعض حضرات کی رہنمائی میں مولانا اپنے دیار کے قافلۂ علم وسیاست کی رہنمائی انجام دیتے تھے۔

۳۔ مولانا لقمان الحق صاحب استاذ دار العلوم دیوبند ۸ر جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ کو مختصر سی علالت کے بعد جوار حق سے پیوست ہو گئے۔ مرحوم سابق ناظم کتب خانہ مولانا سلطان الحق رحمۃ اللہ علیہ کے خلف اکبر تھے، ابھی انکی وفات کو پورا سال بھی نہیں گذرا تھا کہ صاحبزادے بھی ان کے ہم آغوش ہو گئے۔ مولانا لقمان الحق مرحوم دار العلوم کے فاضل اور جید استعداد کے مالک تھے، دار العلوم کے استاذ مقرر ہونے سے پہلے دار العلوم میرٹھ کے شیخ الحدیث رہ چکے تھے کچھ دنوں تک مدراس میں بھی تدریسی خدمت انجام دی تھی، درس وتدریس کے ساتھ تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ شروع کیا تھا، جس کے کچھ اجزار شائع بھی ہو گئے تھے، ایضاح البخاری کے ابتدائی اجزار

کی ترتیب و تدوین میں مولانا ریاست علی صاحب کے شریک کار تھے.
افسوس کہ گلشن ہستی کی صرف ۴۹ بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ مالک
دوجہاں کا بلاوا آگیا۔

۴ - مولانا قاری فخرالدین گیاوی ۲۰ر جمادی الآخر ۱۴۰۸ھ مطابق ۹ر فروری ۱۹۸۸ء کو چند دن کی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ مرحوم قاری صاحب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ کے تلمیذ و خلیفہ اور صاحب نسبت بزرگ تھے مرحوم کو اپنے مرشد و شیخ سے عشق کی حد تک محبت تھی، ان کا نام سنتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے، بہار کے مشہور مدرسہ جامعہ قاسمیہ گیا کے بانی و مہتمم تھے اس کے علاوہ مرحوم نے بہار میں پچاسوں مکاتب بھی قائم کئے تھے اور پیرانہ سالی اور ضعف کے باوجود ان تمام مکتبوں کی نگرانی و سرپرستی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، مرحوم کا یہ ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اس کا اجر و ثواب انہیں قیامت تک ملتا رہے گا مرحوم ایک کہنہ مشق قادر الکلام شاعر بھی تھے اور فی البدیہہ اشعار کہتے تھے آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء بہار میں مرحوم ایک امتیازی شان کے مالک تھے، جذب وسلوک، تواضع و مسکنت آپ کے خصوصی اوصاف تھے۔

۵ - پاکستان کے ممتاز دینی ادارہ جامعہ مدنیہ لاہور کے بانی و مہتمم حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رجب کے آخری عشرہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے تلمیذ و خلیفہ تھے، ہندوستان کے مشہور عالم دین اور مصنف و مورخ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند

کے خلف اکبر تھے، تقسیم ملک کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے تھے اور وہیں اپنے
شیخ و مرشد حضرت مدنی قدس سرہٗ کی طرف نسبت کرتے ہوئے جامعہ مدنیہ کی بنیاد
رکھی جو تھوڑے ہی عرصہ میں پاکستان کے اہم اور بڑے مدارس کی فہرست میں
شمار ہونے لگا، مرحوم نہایت جید الاستعداد عالم تھے۔ اردو، فارسی عربی تینوں
زبانوں میں شعر کہہ لیتے تھے، درس و تدریس اور ارشاد و سلوک کے ساتھ
تصنیف و تالیف کا بھی ستھرہ ذوق رکھتے تھے، تسہیل النحو والصرف، ذکر جمیل
متحدہ قومیت وغیرہ آپ کے مشہور و مطبوع رسائل ہیں، مرحوم علوم عصری میں
بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے، پاکستان میں آپ کی رائے اور موقف کو اہمیت
کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مرحوم پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے ایک ثقہ اور
قابل اعتماد ترجمان اور نمائندہ تھے۔

(ماہنامہ دارالعلوم مارچ ۱۹۸۸ء)

ضیاء الحق صدر پاکستان

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

جنرل ضیاء الحق مرحوم ایک پُر امن فوجی انقلاب کے ذریعہ پاکستان کے
سیاسی افق پر نمودار ہوئے اور گیارہ سال تک اپنی ضیا پاشیوں سے ارض پاکستان
کو تابناک بنانے میں مصروف رہے، شہید ضیاء کی نشو و نما اور ساخت و پرداخت
اگرچہ فوجی ماحول میں ہوئی اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ فوجی سرگرمیوں میں ہی
گزرا لیکن اس کے باوجود سیاست کے پیچ و خم اور سیاسی گتھیوں کے سلجھانے

کی صلاحیت ان کے اندر کسی چاک وچوبند کہنہ مشق سیاستداں سے کم نہیں تھی۔
روس نے جس وقت افغانستان میں اپنی فوجیں اتار دیں اس وقت تقریباً ہر
سیاستداں کی زبان پہ یہی جملہ تھا کہ اب پاکستان کی خیر نہیں، لیکن دنیا نے دیکھ
لیا کہ اس فوجی جنرل نے اپنی سیاسی حکمت عملیوں کے ذریعہ اس انتہائی سنگین
صورت حال کو اس طرح اپنے حق میں بنالیا کہ روس جیسی عظیم سیاسی طاقت
بھی متحیر ہوکر رہ گئی اور اس فوجی مہم کے پورے دور میں روس کا رویہ پاکستان
کے ساتھ زبانی حد تک سہی مصالحانہ ہی رہا۔

مرحوم ضیاء الحق نے زمام اقتدار ایسے نازک حالات میں سنبھالی تھی کہ
پاکستان اپنی خارجہ پالیسی میں مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے دنیا کی نگاہوں میں
اپنا اعتبار کھوچکا تھا، لیکن ملک پاکستان کے اس جانبانہ سپوت نے اپنی
خداداد فہم وفراست سے پاکستان کی خارجہ پالیسی اس طرح سے مرتب کی کہ
بین الاقوامی دنیا میں نہ صرف اس کا کھویا ہوا وقار بحال ہوگیا بلکہ پاکستان کو
اس بلند مقام پہ پہنچا دیا جو اسے اپنے ابتدائے قیام سے اب تک نصیب نہیں
ہوا تھا۔

بنگلہ دیش کی جنگ میں تاریخی ناکامی نے پاکستانی فوج کے حوصلے
بالکل پست کر دیئے تھے اور دنیا میں بھی اس کی ساکھ یکسر ختم ہوگئی تھی مگر
اس جواں ہمت سپاہی نے اسے نیا حوصلہ، نئی امنگ عطا کی اور جدید اسلحوں
سے اسے مسلح کر کے دنیا کی بہترین فوجوں کی صف میں لاکھڑا کر دیا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ دنیا کے نقشے میں پاکستان کا اضافہ اسلام
کے نام اور خالص اسلام پہ ہوا تھا، اسی طرح یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ
آج تک پاکستان کے کسی جمہوری سربراہ یا فوجی حکمراں نے اسے اسلامی سٹیٹ

بنانے اور وہاں اسلامی قوانین نافذ کرنے کا نام بھولے سے بھی نہیں لیا، مگر اس مردِ حق کوش نے پاکستانی سیاست والوں کے علی الرغم اور دنیا پرست دین بیزار طاقتوں کی مخالفت کی پروا کئے بغیر نفاذِ شریعت کا اعلان کر دیا، اگرچہ اپنی جگہ یہ بات درست ہے کہ اس سلسلے میں ان کی پیش رفت بہت سست تھی جس کی بنا پر بہت سے لوگ انہیں اس معاملہ میں مخلص نہیں مانتے تھے، اور ان کے اس نعرہ کو ایک سیاسی حربہ سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے، لیکن وہاں کے بگڑے ہوئے ماحول اور مغرب زدہ معاشرے پر صحیح نظر رکھنے والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذِ شریعت کے نازک واہم ترین کام کو مرحلے وار اور تدریجاً ہی آگے بڑھایا جاسکتا تھا، اور حکمت و مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ جوش کے بجائے ہوش کے ساتھ قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جائے، اس نقطۂ نظر کے تحت یہ دعویٰ بیجا نہ ہوگا کہ مرحوم اپنے اس اقدام میں مخلص تھے، مگر پاکستان کے حالات نے انہیں اپنے منصوبے کو پورے طور پر بروئے کار لانے نہیں دیا، اس ظاہری ناکامی کے باوجود ضیاء مرحوم کو اپنے مقصد میں ناکام بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ انہوں نے اسلامی نظام کے نعروں سے پاکستان کو اس طرح پرشور کر دیا ہے کہ اب اس آواز کو کسی طرح بھی دبایا نہیں جاسکتا ہے، اور پاکستان کا کوئی حکمراں بھی اس نعرے کے بغیر اپنی حکومت کو پائیدار اور مستحکم نہیں بنا سکتا، ضیاء مرحوم کا یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے پاکستان کی تاریخ سے مٹایا نہیں جاسکتا۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم اپنی ذاتی و نجی زندگی کے اعتبار سے بھی ایک قابلِ قدر شخصیت کے مالک تھے انہوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو ذاتی

منفعت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، ان کے بڑے سے بڑے سیاسی مخالف بھی اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کر سکے، فوجی ماحول میں تربیت پانے کے باوجود ان کے اندر کبر و نخوت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، نماز اور روزہ کے انتہائی پابند تھے، بلکہ بیان کرنے والے تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ وہ پابند تہجد تھے اور جب کبھی کوئی سیاسی الجھن پیش آجاتی تو پوری پوری رات نماز اور دعا میں گذار دیتے تھے، حج وعمرہ کے موقع پر مسجد نبوی میں جماعت کی پابندی اور پھر ریاض الجنۃ میں گھنٹوں ذکر و تلاوت میں مصروف رہتے ہوئے عام طور پر لوگوں نے انہیں دیکھا ہے، عام خطابات اور تقریروں میں اسلامی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کرتے تھے، پاکستان میں ہی نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی مجلسوں میں بھی تقریر کا آغاز حمد وصلوٰۃ سے کرتے تھے، مرحوم کی انہیں اسلامی اداؤں کی بنا پر بین الاقوامی دنیا میں انہیں لوگ اسلام کا نمائندہ و ترجمان کہتے اور سمجھتے تھے، اور عالم اسلام انہیں بڑی وقعت و محبت کی نگاہوں سے دیکھتا، اسلامی نشأۃ ثانیہ کے داعیوں کی ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے حادثۂ وفات پر عالم اسلام نے جس طرح اظہار غم کیا ہے، شاہ فیصل مرحوم کے بعد اس طرح کا سوگ کسی اور سربراہ کے لئے نہیں منایا گیا، اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی اس مقبولیت میں ایک حد تک اس غیر متوقع اور انتہائی کربناک فضائی حادثہ کا بھی حصہ ہے جس کے وہ شکار ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے عقائد و اعمال، اخلاق اور دیگر بہت سے اوصاف خصائل کے اعتبار سے شہید ضیاء قابل قدر شخصیت کے مالک تھے۔ پاکستان

کے سابق سربراہوں میں کوئی بھی ان محامد و محاسن میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
مالک کائنات سے دعا ہے کہ انہیں تمام مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کے مدارج کو بلند سے بلند تر کرے، نیز پاکستان کو ان کا نعم البدل مرحمت فرمائے تاکہ نفاذ شریعت کا جو اہم ترین اور ضروری کام انہوں نے شروع کیا تھا وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۸۸ء)

مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پاک ارشاد ہے: انّ اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعہ من العباد ولٰکن یقبض العلم بقبض العلماء (متفق علیہ کما فی المشکوٰۃ) اللہ تعالیٰ علم کو واپس نہیں لے گا کہ لوگوں کے ہاتھوں سے قبض کرے بلکہ علماء کو وفات دے کر علم کو واپس لے لیگا۔

اس حدیث کا ظہور آج کل جس کثرت و شدت سے ہو رہا ہے اس کی مثال اگلے زمانے میں نہیں ملتی۔ علمائے حق جس تیزی کے ساتھ اٹھتے جا رہے ہیں اُسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ چل چلاؤ کا یہ سلسلہ اسی رفتار کے ساتھ جاری رہا تو علمی مجلسیں بالکل سونی ہو جائیں گی۔ دور کیوں جائیے اپنے پڑوسی ملک پاکستان پہ ہی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ابھی ماضی قریب میں وہاں کی علمی محفلیں مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا سید محمد یوسف بنوری محدث، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا عبید اللہ انور، مولانا سید حامد میاں وغیرہ جیسے

اساطینِ علم و ماہرینِ فن کی حسنات و برکات سے پُر رونق تھیں، مگر دیکھتے دیکھتے یہ سارے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے ، اور المیہ یہ ہے کہ ان کی خالی جگہیں اب تک پُر نہیں ہو سکیں، اور نہ اس کی کوئی اُمید ہی ہے ۔

اسی قافلۂ فضل و کمال کے ایک فردِ فرید شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب بانی و مہتمم دارالعلوم اکوڑہ خٹک بھی تھے جن کے دم قدم سے وہاں کی مجالسِ علمیہ کا وقار بڑی حد تک قائم تھا ۔ اور ان پیش رو بزرگوں کے بعد طالبانِ علم کے لئے ان کا وجود وجہِ سکون و باعثِ تسلّی تھا، مگر افسوس کہ اکابر و اسلاف کی یہ آخری نشانی بھی ۷ ستمبر کو ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گئی ۔

مولانا مرحوم علم و فضل ، زہد و تقویٰ، اخلاص و استقامت، جرأت و شجاعت اور تواضع و انکسار کے مجسّم نمونہ تھے ۔ ان کی ذات میں علم و عمل کا اس طرح امتزاج تھا کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا اس قحط الرجال کے دور میں مرحوم کی ذات اصلاح وارشاد اور علم و معرفت کا مرکز و محور تھی ۔

۷ محرم سنہ ۱۳۲۷ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو اپنے آبائی وطن اکوڑہ خٹک ضلع پشاور میں آپ کی ولادت ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی ۔ پھر آگے کی تعلیم کے لئے ملتان پہنچے اور وہاں مولانا عنایت اللہ اور مولانا عبدالجلیل وغیرہ سے ملا حسن تک کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کے لئے رختِ سفر باندھا ۔ اور میرٹھ و امروہہ کے مدارس میں تحصیلِ علم کے بعد سنہ ۱۳۴۷ھ میں ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے ۔ اور پانچ سال یہاں رہ کر سنہ ۱۳۵۲ھ میں حضرت شیخ الاسلام

مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغ حاصل کی۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے علاوہ آپ کے اساتذۂ دارالعلوم میں حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی اور حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہما اللہ بھی شامل ہیں۔ ۱۳۶۲ھ میں مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند ہی میں استاذ مقرر ہو گئے جس کا سلسلہ ۱۳۶۶ھ تک قائم رہا۔ چونکہ اسی سال تقسیم ملک کا حادثہ پیش آگیا۔ اس لئے شعبان کی رخصت کے بعد گھر سے دارالعلوم نہ جاسکے اور مجبوراً یہاں کی تدریس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اسی زمانہ میں پشاور ہی کے ایک اور عالم مولانا عبدالحق نافع گل بھی دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اسی لئے دونوں حضرات کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے مولانا مرحوم کو عبدالحق انفع کہا جاتا تھا۔ مولانا کا درس نہایت کامیاب تھا۔ اور تین چار سال کی مختصر سی مدت میں طلبہ آپ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف و معتقد ہو گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے رسمی تعلق منقطع ہو جانے کے بعد دارالعلوم ہی کے طرز پر اپنے آبائی وطن اکوڑہ خٹک میں ایک درسگاہ قائم کی، جو مولانا مرحوم کے جہد و عمل اور ایثار و اخلاص کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں علوم دینیہ کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ اور اس وقت سے ہر سال سیکڑوں تشنگانِ علومِ شریعت اس کے چشمہ صافی سے سیراب ہو کر (فارغ التحصیل) تبلیغِ دین اور اشاعتِ علم میں مصروف ہیں۔

مولانا مرحوم کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے تلامذہ کو ذوقِ جہاد اور دین پر مر مٹنے کے جذبہ سے سرشار کر دیتے تھے۔ چنانچہ جہاد افغانستان میں یہاں کے فضلاء و طلبہ نے جس طرح سے فداکارانہ حصہ لیا ہے اس کی نظیر

پاکستان کے دیگر مدارس کے طلبہ میں نہیں پائی جاتی۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے بلکہ علومِ دین کی اشاعت و تبلیغ کے ساتھ انہوں نے دین کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ کا مقابلہ بھی کیا، اور ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا حتیٰ کہ اسمبلی تک پہنچے اور ایوانِ حکومت میں بھی حق کی آواز بلند کی۔ پاکستان کے خودسر اور دین بیزار حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کر کے افضل الجہاد کا فریضہ ادا کیا۔

۱۹۷۴ء میں جب فتنۂ قادیانیت کے خلاف تحریکِ ختمِ نبوت چلی تو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا مفتی محمود رحمہما اللہ کے شانہ بشانہ مولانا مرحوم نے بھی کام کیا۔

مولانا مرحوم کو دارالعلوم اور اکابرِ دارالعلوم بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ سے غایت درجہ تعلق اور محبت تھی۔ آپ کی مجلسیں دارالعلوم اور اس کے اکابر کے تذکرے سے معمور رہتی تھیں اور اپنے استاذِ حدیث اور پیرومرشد حضرت شیخ الاسلامؒ کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے تھے۔

مولانا مرحوم اگرچہ اصالتاً ایک مدرس تھے، تصنیف و تالیف کے لئے نہ انہیں فرصت تھی اور نہ ہی طبیعت کا اس جانب رُجحان تھا۔ پھر بھی تبلیغِ دین کے لئے بعض رسائل اور کتابیں تحریر کیں۔ علاوہ ازیں اسمبلی میں آپ نے جو تقریریں کی تھیں انہیں ہی ان کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق صاحب نے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ اس طرح سے آپ کے علمی افادات کتابی شکل میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ جن میں تقریرِ ترمذی مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، دعواتِ حق حصہ اول و دوم، مقامِ صحابہ، مسئلہ خلافت و سیادت، ناموسِ رسولؐ نہایت اہم ہیں اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے لگائے ہوئے گلستانِ علم کو سدا بہار رکھے۔
(ماہنامہ دارالعلوم اکتوبر ۱۹۸۸ء)

وفیات

(۱) ۵ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز سہ شنبہ کو ملک کے مشہور صاحبِ قلم، محقق، تذکرہ نگار اور عالم باعمل مولانا مفتی نسیم احمد فریدی چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا فریدی مرحوم کا انتقال علم و تحقیق اور تذکرہ نگاری کی دنیا میں ایک ایسا خلا ہے جس کا مستقبل قریب میں پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے مولانا مرحوم نہایت سادہ مزاج، متواضع، خوش خلق، نرم خو، شب زندہ دار، صوفی المشرب بزرگ تھے، علماء و مشائخ کے تذکرے ملفوظات و مکاتیب سے انہیں خاص شغف تھا اس موضوع پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو علمی حلقوں میں وقعت و اعتبار کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، جن میں تجلیاتِ ربانی، مکتوباتِ خواجہ معصوم، تذکرہ خواجہ باقی باللہ اور تذکرہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مولانا فریدی مرحوم ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کو اپنے آبائی وطن امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں مڈل کلاس تک کی تعلیم اسکول میں حاصل کی بعد ازاں مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں داخل ہو کر اسلامی علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں اور تکمیل کے لئے مرکز علوم دارالعلوم دیوبند آئے اور اسی گہوارۂ علم

وطن میں رہ کر دورۂ حدیث اور افتاء کی تحصیل و تکمیل کی، آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی اور حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی جیسے اساطین علم و نابغۂ عصر شامل ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ اشفاقیہ بریلی سے درس و افادہ کا آغاز کیا بعد ازاں اپنی مادر علمی جامعہ امروہہ چلے آئے جہاں تدریس کے ساتھ افتاء کی اہم ترین خدمت بھی انجام دیتے رہے، جامعہ امروہہ سے یہ تعلق حیات کے آخری لمحہ تک قائم رہا، حتیٰ کے آج سے اٹھارہ انیس سال پہلے جب آپ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے جب بھی کسی نہ کسی حد تک تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا فریدی مرحوم کو قدرت نے گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت کامیاب مدرس، بالغ نظر مفتی، نکتہ سنج شاعر، بہترین مترجم، محقق مصنف اور صاحب نسبت عالم دین تھے۔ ابتداء میں اپنے استاذ حدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کیا، حضرت موصوف کی وفات کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے وابستہ ہو گئے اور انہیں کی زیر تربیت سلوک کے منازل طے کر کے اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، ان تمام محاسن و فضائل سے متصف ہونے کے باوجود تواضع و انکساری، اخفائے حال اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے مرتبہ و مقام سے ناواقف انہیں دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ معمولی پڑھے لکھے کوئی میاں جی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ علماء اور صوفیاء و مصنفین کے طبقے میں مولانا فریدی مرحوم اپنی مثال آپ

تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے فیوض و برکات سے امت کو استفادہ کی توفیق سے نوازے۔

---

(۲) ۹ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء یوم جمعہ کو پاکستان کے مشہور عالم دین اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے، مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی علیہ الرحمہ کے خلف الصدق و صحیح جانشین تھے، درس و تدریس اور وعظ و بیان کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے جس پر ان کی خالص علمی تصنیف "منازل العرفان فی علوم القرآن" شاہد عدل ہے معلوم ہوا کہ مرحوم نے اپنے والد ماجد کی مشہور تفسیر معارف القرآن کے بقیہ حصہ کی تکمیل بھی کی ہے، علم حدیث و تفسیر میں مرحوم کو کامل دستگاہ حاصل تھی، وعظ و تقریر میں اہم علمی مسائل کو اس طرح سلجھا کر بیان کرتے تھے کہ سامعین بغیر کسی دقت کے پورے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے ریڈیو پاکستان سے ان کی تفسیر بھی نشر ہوا کرتی تھی جسے عام و خاص بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے مرحوم کو خصوصی تعلق تھا اور اس کی دعوت پر یہاں حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ابھی چند سال پہلے جب دارالعلوم میں ختم نبوت کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا تو مرحوم۔ نہ صرف یہ کہ اس کے تمام اجلاسوں میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک رہے بلکہ ایک نشست کی صدارت بھی کی تھی، اپنی صدارتی مفصل تقریر میں دارالعلوم دیوبند سے اپنے تعلق کو جس

والہانہ انداز میں بیان کیا تھا اس سے دارالعلوم سے ان کی قلبی وابستگی کا پتہ چلتا ہے، مولانا کی وفات سے دارالعلوم دیوبند پاکستان میں اپنے ایک قابل اعتماد ترجمان سے محروم ہوگیا ہے، دعا ہے اللہ تعالےٰ مرحوم کو درجات عالیہ سے سرفراز فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

(ماہنامہ دارالعلوم نومبر ۱۹۸۸ء)

مولانا ضیاء الحسن

بقلم مولانا شمس تبریز

اس دور قحط الرجال میں جب کسی عالم دین کی خبر وفات ملتی ہے تو دین کا درد رکھنے والے فکر و تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دار فانی کو چھوڑنے والے عالم کا نعم البدل تو کیا بدل بھی ملنا مشکل نظر آنے لگتا ہے، دین و علم دین کی صفوں میں پیدا شدہ خلا کے پُر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور ذہن و دماغ پر نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کی صداقت وحقانیت روشن ہو جاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا:

ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من الناس ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یترك عالما اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔
(صحیح مسلم ۲/۳۴۰ دہلی ۱۳۷۶ھ)

اللہ تعالےٰ علم دین کو اس طرح نہیں اٹھائیگا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے کھینچ لے بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعہ اٹھائے گا یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو نہ چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کے پاس جائیں گے اور وہ سوال کئے جانے پر بغیر علم کے فتویٰ

دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

علم دین خصوصاً حدیث نبوی کے فن شریف کے ساتھ گذشتہ مہینے ایسا ہی حادثہ، فاجعہ پیش آیا، جب ۲۳ر جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ ۱۲ر جنوری ۱۹۸۹ء کو شام پونے سات بجے ہمارے بزرگ دوست، دارالعلوم دیوبند کے فاضل جلیل اور ندوۃ العلماء کے متخصص ادب اور حدیث و رجال حدیث کے ممتاز عالم جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب اعظمی نے طویل اور صبر آزما علالت کے بعد اس دار فانی سے دار باقی و ابدی کی طرف رحلت فرمائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم مئو (اعظم گڈھ) کے مردم خیز اور علم پرور قصبے میں ۲۰ر فروری ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے اور مفتاح العلوم میں متوسط تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور تین سال بعد ۱۳۷۲ھ میں فارغ ہوئے، وہاں دوسرے اساتذہ کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح سے خصوصی درسی استفادہ کیا اور ان کے درس بخاری کو بڑے اہتمام کے ساتھ قلم بند کیا اور اسے حرز جان بنائے رکھا۔

اسی طرح دوسرے اساتذۂ حدیث کی درسی تقریروں کو بالاستیعاب قلم بند کیا۔ جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، دارالعلوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء آکر ادب عربی میں تخصص کیا پھر یہاں سے حدیث میں تبحر حاصل کرنے کے لئے محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ کی خدمت میں عرصے تک رہے اور "مصنف عبدالرزاق" کی تحقیق و تخریج میں ان کے مددگار رہے اور ان کے ایما پر بیروت میں عرصے تک مقیم رہ کر اس کی طباعت کی نگرانی کی، وہاں کے مشہور ناشر اور محقق زہیر شاویش سے ان کے

گہرے علمی روابط ہو گئے اور بعض تحقیقی کاموں میں ان کی مدد بھی کی، قیام لبنان کے دوران حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے اور ترکی کا بھی سفر کیا۔

بیروت سے واپسی پر چند سال معہد ملت (مالیگاؤں) میں اور کچھ عرصے مدرسہ مظہر العلوم (بنارس) میں استاذ رہ کر ندوۃ العلماء تشریف لاکر درس حدیث میں ایسے مشغول ہوئے کہ اسی مبارک شغل میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

حدیث شریف سے ان کا تعلق صرف درسی نہیں تھا بلکہ یہ ان کی علمی تحقیقات کا اہم موضوع، ان کی گفتگوؤں کا محور اور ان کی سیرت وکردار کا دائرہ اور مدار بن گئی تھی۔ وہ صرف علمی ونظری طور پر حدیث نبوی سے متعلق نہ تھے بلکہ سیرت وسنت سے شغف ان کے علم وعمل، عادت وعبادت سب میں روح بن کر رواں دواں تھا اور اس طرح وہ اپنے معاصرین میں اتباعِ سنت حدیث سے ذہنی وقلبی اشتغال، اور ذات نبوی سے زندہ وپائندہ تعلق خاطر کی دلکش تصویر نظر آتے تھے۔

حدیث کے مشہور عالم ومحقق ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی قاسمی (مقیم سعودیہ) کی تحقیقات حدیث میں مولانا ضیاء الحسن صاحب نے بڑا تعاون کیا ہے۔ چنانچہ ان کی مدد سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے حدیث کے متعدد مجموعے بڑی تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع کئے وہ حدیث کا کمپیوٹر تیار کرنے کے سلسلے میں بھی ان کے معاون ومددگار تھے۔

چند سال پہلے ڈاکٹر اعظمی صاحب کو صحیح بخاری شریف کے ایک قدیم راوی کا مراکشی نسخہ ہاتھ آیا جس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی صحیح بخاری کا

مستند ایڈیشن شائع کرنے کے لئے انہوں نے مولانا ضیاء الحسن صاحب کے پاس بھیجی، خوش قسمتی سے مولانا نے اپنے ساتھ مجھے بھی اس کام میں شریک رکھا، تحقیق و تصحیح کے اس مرحلے میں مجھے حدیث شریف پر مولانا کی گہری نظر ان کی تحقیق پسندی، دقتِ نظر اور محنت و محویت کا کچھ اندازہ ہوا، وہ گھنٹوں پورے نشاط اور صبر و انہماک کے ساتھ مخطوطہ کی قرأت و تصحیح کا کام کرتے اور علمی تحقیق کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری اور ایماندارانہ کوشش کرتے تھے۔

کچھ عرصے سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب "ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی" اپنی شرح و تحقیق کے ساتھ مرتب کر رہے تھے اور اسے بڑی حد تک مکمل کر چکے تھے، اس کے لئے فارغ اوقات میں ندوۃ العلماء کے کتب خانے آتے اور ذخائر حدیث سے استفادہ کرتے تھے، خدا کرے کہ کوئی ناشر اسے شائع کر دے۔ اسی طرح اصول الشاشی کا بڑا حصہ ایڈٹ کر چکے تھے۔

درس حدیث کے لئے پوری تیاری کرتے اور درس سے قبل مطالعہ کی پوری پابندی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کا درس دارالعلوم دیوبند کے ممتاز طرزِ تدریس کا نمونہ بن گیا تھا، جس میں مذاہب اربعہ کا بیان، تحقیق لغات اور مسلک حنفی کی تائید و ترجیح نمایاں رہتی ہے، ندوہ سے نکلنے والے رسالوں الرائد اور تعمیر حیات میں ان کے تلامذہ نے مولانا کے درسِ حدیث کے ان پہلوؤں کو خاص طور پر سراہا ہے، ان کی درسی تیاری اور جذبۂ تحقیق کا مجھے اس سے بھی اندازہ ہوا کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے بھی دیوبند کے ایام طالب علمی میں شیخ الحدیث مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادیؒ کے درس بخاری اور حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے درس ترمذی کے خلاصے نوٹ کئے ہیں تو ان کے دیکھنے کی بھی فرمائش کی، وہ ایک محقق کی

شان کے مطابق اپنے موضوع کے جملہ متعلقات سے استفادہ کرنے کی فکر رکھتے تھے، جس کی وجہ سے اللہ تعالٰے نے حدیث شریف میں وہ مقام عطا کیا۔

میں نے ان کے تحقیقی ذوق کا ایک نمونہ یہ بھی دیکھا کہ اپنے زیر مطالعہ کتابوں کی اغلاط کی تصحیح بھی کرتے رہتے تھے اور کتابوں کی جلد بندھواتے وقت دفتری کو ہدایت کرتے تھے کہ کتابوں کے حاشیے اور ان کے فاضل کنارے نہ کاٹے جائیں تاکہ ان پر کچھ لکھا جاسکے۔

حدیث تو ان کے مطالعہ کا مرکزی موضوع تھا، لیکن وہ دیگر علوم وفنون کا بھی مطالعہ رکھتے تھے۔ اخبارو جرائد کا بھی شوق سے مطالعہ کرتے تھے جن میں دیوبند کا عربی پندرہ روزہ "الداعی" بھی تھا۔

ان کے تحقیقی اور تصحیحی ذوق کو دیکھتے ہوئے ندوہ پریس سے شائع ہونے والی کتب ورسائل کی تصحیح اور پروف ریڈنگ کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی اور وہ خاص طور پر "البعث الاسلامی" کی تصحیح کا کام انجام دیتے تھے، غالباً انہوں نے یہاں سے شائع ہونے والی لغت حدیث "مجمع بحار الانوار" کی تصحیح بھی کی تھی۔

جہاں تک ان کے اخلاقی محاسن کا تعلق ہے تو اس کے لئے یہی کافی ہے کہ حدیث کے مبارک اشتغال نے ان کے قول وعمل میں اتباع سنت کا رنگ بھر دیا تھا، ان کی اخلاقی خوبیوں میں ان کے تواضع اور خاکساری اور تقویٰ وطہارت کو اولین حیثیت حاصل تھی، دھیمے اور دلنشیں لہجے میں مخاطب کے اکرام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرنا حتیٰ کہ طلبہ کو برابری کے لہجے میں مخاطب کرنا اور اپنے کو کہیں سے نمایاں کرنے کی کوشش نہ کرنا ان کا شعار تھا جس کی

وجہ سے ایسے بلند علمی وتحقیقی ذوق کے رکھتے ہوئے بھی وہ نہ پبلک اسٹیج پر آئے اور نہ جاہ وشہرت کے طلب گار ہوئے لیکن طلبہ واساتذہ اور ان کے شناسا حلقوں میں ان کا اکرام واحترام دل سے کیا جاتا تھا، من تواضع للہ رفعہ اللہ۔

ان کے تقویٰ وطہارت کے بہت سے واقعات ہیں جن کا احاطہ اس مختصر تعزیتی مضمون میں نہیں ہوسکتا، یہاں توصرف اپنے مشاہدات وتأثرات ہی پر اکتفاکرنا مقصود ہے تاکہ شہادت حق کا کچھ حق ادا ہوجائے۔ ذیابیطس کی وجہ سے پیشاب کی کثرت رہتی تھی اس لئے اذان سنتے ہی نماز کی تیاری شروع کردیتے تھے اور باوجود اعذار اور مختصر جماعت کے امکان کے مسجد کی جماعت میں شرکت کا اہتمام کرتے تھے، اسی کے ساتھ نوافل کی کثرت بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

ہمارے اور مولانا مرحوم کے مشترک دوست مولانا محمد عارف سنبھلی نے ایک واقعہ سنایا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ان کے مکان کے دروازوں کی رنگائی ہورہی تھی، اسی دوران ان کے ایک چھوٹے بچے نے اس سے اپنی سلیٹ بھی رنگ لی، مولانا کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے صاحبزادے کو تنبیہ کی اور دفتر دارالعلوم میں رنگ کی قیمت باصرار جمع کی، اسی طرح میں دیکھتا تھا کہ وہ حتی الامکان طلبہ سے خدمت لینے کے بجائے اپنا سودا سلف اور کام خود کرتے تھے اور ان سے کام لینے کو ناپسند کرتے تھے جس سے شاید ہی چند لوگ احتیاط کرتے ہیں۔

کبھی کبھی ان کے ساتھ امین آباد کی خریداری میں جانا ہوتا تھا، اس میں یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ قیمت کم کرانے کے بجائے منھ مانگی اور چیز کی واقعی قیمت ادا کرکے خوشی محسوس کرتے تھے۔ اور معاملات اور حساب کی صفائی کا پورا اہتمام فرماتے تھے، اور "حساب دوستاں در دل" کا سہارا پسند نہیں

کرتے تھے، تقویٰ واحتیاط کے عادی ہونے کے باوجود مزاج میں خشکی وکرختگی یبوست یا عبوست ذرا بھی نہ تھی بلکہ چہرے بشرے سے ہمیشہ بشاشت اور لطافت ہی کا اظہار ہوتا تھا، کیوں نہ ہو کیوں کہ وہ ان لوگوں میں تھے جن کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے کہ نضراللہ امرأً سمع منا شیئًا فبلّغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی من سامع۔

(جامع ترمذی ص۴۲۳ ۔ دہلی ۱۲۷۶ھ)

تواضع اور کسر نفسی کے ساتھ ضیافت ومہمان نوازی کا وصف خاص بھی ان کو عطا ہوا تھا، ان کے یہاں مہمان بکثرت آتے اور وہ کشادہ روئی اور کشادہ قلبی سے ان کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے لئے ہم چند مقیم احباب بھی ان کے مہمان بن جاتے یا کبھی مشترکہ دعوت کا اہتمام ہوتا تو وہ ہمیشہ ہر خدمت کے لئے اپنے کو پیش کردیتے تھے۔

کھانے پہننے اور نشست وبرخواست میں وہ انتہائی مہذب، باوقار سلیقہ مند اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے اور اسلامی ومشرقی تہذیب وشائستگی کا بھی ایک عمدہ وپاکیزہ نمونہ تھے۔ ہنسنے بولنے اور نشست و برخواست اور چلنے پھرنے سب میں متانت وثقاہت ملحوظ رہتی تھی۔

جیسی پاک وصاف زندگی انہوں نے گذاری اس کا نتیجہ تھا کہ آخری علالت کی مدت اور ان کی وفات بھی قابلِ رشک انداز سے ہوئی، وفات سے چند روز قبل غشی طاری ہوجاتی تھی اس سے جب بھی افاقہ ہوتا تو نماز پڑھنے کی کوشش کرتے اور قلب وزبان سے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے، اور غفلت وبیہوشی میں بھی اللہ اللہ کی آواز جاری رہتی۔

ہم دونوں کے مشترک دوست مولانا عتیق احمد بستوی نے اپنے مضمون

میں ذکر کیا ہے کہ مولانا مرحوم نے اُن سے ایمان مفصل کا مذاکرہ کیا انہیں سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ اور مولانا مرحوم کے درمیان کچھ شکر رنجی تھی جس کے لئے مرنے سے پہلے انہوں نے مولانا مدظلہ سے معافی چاہی اور حضرت مدظلہ نے اپنی بزرگانہ شفقت سے انہیں معاف بھی کر دیا۔

اپنی حد تک مولانا مرحوم نے حقوق العباد کی ادائیگی کی قابل رشک سعی کی، آخری دنوں میں اہلیہ محترمہ کو اپنے بعد صبر اور اللہ پر توکل کی تلقین کی اور دنیا سے اہل دنیا کے حسابات صاف کر کے عازم آخرت ہو گئے اللہ تعالےٰ کی رحیم وکریم ذات عالی سے دعا ہے کہ انہیں حساب یسیر کے ذریعہ بلکہ بے حساب اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور علمی و دینی حلقوں کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ فسیح جنانہ وامطر علیہ شآبیب غفرانہ و رضوانہ۔

(ماہنامہ دارالعلوم مارچ ۱۹۸۹ء)

یاد رفتگاں

مولانا ابوالعرفان ندوی

۱۷ر نومبر ۱۹۸۸ء کی رات میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قدیم استاذ و صدر شعبۂ دینیات مولانا ابوالعرفان ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، مولانا مرحوم کھیتا سرائے ضلع جونپور سے متصل موضع لپسری کے رہنے والے تھے، آپ کے والد ماجد مولانا دین محمد صاحب اس دیار کے نامور علماء میں تھے مدرسہ بدرالعلوم شاہ گنج مولانا دین محمد

ہی کی علمی یادگار ہے جسے ان کے برادرزادہ حضرت مولانا جمیل احمد صاحب نے ترقی دے کر شہرت و مقبولیت کے بام عروج پہ پہنچا دیا۔

مولانا ابوالعرفان مرحوم نے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور ان تینوں اداروں کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک دارالمصنفین اعظم گڈھ سے بحیثیت رفیق کے وابستہ رہے جہاں انہیں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی جیسا نادرۂ روزگار سرپرست مل گیا جس کی وجہ سے انہیں اپنے علمی سفر کو جاری رکھنے میں بڑی مدد ملی، اس کے بعد یہاں سے منتقل ہو کر ندوہ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

مرحوم نے تقریباً ۴۵ سال دارالعلوم ندوہ میں تعلیمی و انتظامی خدمات انجام دیں، اسلام کی علمی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ پر مولانا مرحوم کی نظر بڑی وسیع تھی، علم کلام اور منطق و فلسفہ میں بھی انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی، مرحوم کا میلان طبع تصنیف سے زیادہ تدریس کی جانب تھا، یہی وجہ ہے کہ ہمہ گیر مطالعہ اور علمی شغف کے باوجود آپ کی تصنیفی یادگار دو تین سے زائد نہیں ہے اس کے برعکس تلامذہ اور مستفیضین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔

مطالعہ کی کثرت اور علمی و تحقیقی کاموں میں انہماک کے باوجود مزاج میں بڑی شگفتگی تھی جس مجلس میں ہوتے اسے اپنی بذلہ سنجیوں سے قہقہہ زار بنائے رہتے، مرحوم کی وفات علمی دنیا کے لئے ایک زبردست سانحہ ہے بالخصوص مولانا کی رحلت سے ندوہ ایک ایسے بے لوث، مخلص اور تجربہ کار رفیق سے محروم ہو گیا ہے جس کا بدل اس قحط الرجال میں مشکل ہی سے دستیاب ہو گا۔

⁂ ⁂ ⁂

مولانا ضیاء الحسن اعظمی ابھی اس حادثہ جانکاہ کو گذرے مشکل سے ڈیڑھ ماہ ہوئے تھے کہ دارالعلوم ندوہ کے ایک دوسرے استاذ مولانا ضیاء الحسن اعظمی صدر شعبۂ حدیث بھی ۲۰ر جنوری ۱۹۸۹ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے مولانا موصوف سے متعلق اسی شمارہ میں رفیق محترم مولانا شمس تبریز خاں کا تفصیلی مقالہ موجود ہے ناظرین اسے ملاحظہ فرمالیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی ۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء کو تبلیغی جماعت کے اساسی رکن، عالم ربانی حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی جماعت تبلیغی کے مرکز نظام الدین دہلی میں انتقال کر گئے.

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبید اللہ بن مولانا عبد القدیر علی بن شیخ محمد حبیب شیخ پورہ ضلع بلیا میں ۲۶ر محرم ۱۳۳۹ھ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، انجمن اسلامیہ گورکھپور، چشمۂ رحمت غازی پور اور خانقاہ رشیدیہ جونپور میں ابتدائی تعلیم مکمل کر کے ۱۳۵۶ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور ۱۳۶۰ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، بعد ازاں ایک سال مزید رہ کر فنون کی تحصیل کی، فراغت کے بعد ایک سال تک انجمن اسلامیہ گورکھپور میں مدرس اول کی حیثیت سے درس دیا پھر تدریسی مشغلہ کو موقوف کر کے بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پہنچے اور تبلیغی جماعت سے منسلک ہوگئے پھر یہی تبلیغ دین زندگی کا محبوب مشغلہ بن گیا جو زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہا۔

تبلیغ کے سلسلے میں ہندوستان کے علاوہ سعودیہ عربیہ، مصر، سوڈان، شام

بھوٹن، پاکستان، افریقہ، ماریشس، ری یونین وغیرہ نہ جانے کہاں کہاں پہنچے اور اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچایا، تبلیغ کے ساتھ تعلیمی مشاغل بھی برابر جاری رہے چنانچہ تبلیغی سلسلے میں جب آپ کا قیام چند سالوں حرمین شریفین میں رہا تو وہاں بھی درس کا سلسلہ قائم فرمایا اور ریاض الصالحین، مشکوٰۃ المصابیح، البدایہ والنہایہ اور بخاری شریف آپ کے زیر درس رہیں اور سیکڑوں طلبہ نے اس مدت میں آپ سے اکتساب علم کیا۔

۱۳۷۳ھ میں تبلیغی مرکز کے مدرسہ کاشف العلوم میں دورۂ حدیث جاری ہوا تو بخاری شریف جلد ثانی اور ترمذی شریف مکمل آپ کے سپرد ہوئی بعد ازاں بخاری جلد اول بھی آپ ہی سے متعلق ہو گئی تھی، ان کتابوں کے علاوہ مسلم شریف، طحاوی شریف، نسائی، ابن ماجہ، مؤطا امام محمد اور جلالین شریف بھی آپ نے متعدد بار پڑھائی۔

علم بہت مستحضر تھا اس لیے تبلیغی مشغولیتوں کے باوجود نہایت تفصیل و تحقیق سے پڑھاتے تھے، جماعت تبلیغی کے حلقے میں ان کی علمیت بالخصوص حدیث میں تبحر کے سب ہی علماء قائل تھے۔

ابتداء میں اصلاح وتزکیۂ نفس کا تعلق حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے قائم فرمایا تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ کی جانب رجوع کیا اور حضرت شیخ رحمہ اللہ کی طرف سے خلافت سے نوازے گئے، حضرت شیخ کے خلفاء میں مولانا موصوف کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل تھی کہ خلفاء کی طویل فہرست میں یہ دوسرے یا تیسرے نمبر پر تھے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم جیسا جامع صفات عالم و مبلغ اور مرشد کامل

اس وقت ملنا مشکل ہے۔

تبلیغی و تدریسی مصروفیتوں کے باوجود درج ذیل اہم تصانیف آپ کی علمی یادگار ہیں: (۱) تلخیص الترمذی (۲) تلخیص الطحاوی (۳) الدلائل للمسائل (۴) الدلائل للسنن العادیہ (۵) شجرۃ الانساب (۶) ہل تجوز صلوۃ الجنازۃ فی المسجد ام لا (کیا مسجد میں نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟) (۷) من یکون فی ظل عرش الرحمٰن یوم القیامۃ (قیامت میں اللہ کے عرش کے زیر سایہ کون لوگ ہونگے) وغیرہ۔

(ماہنامہ دارالعلوم مارچ ۱۹۸۹ء)

مولانا ارشاد احمد

بقلم: مولانا قاری ابوالحسن اعظمی

ضلع فیض آباد ضلع فیض آباد پر اللہ تعالےٰ کا ابتدا ہی سے خاص فضل رہا ہے، اس سرزمین سے ہر دور اور زمانے میں عظیم شخصیتیں اٹھتی رہی ہیں، اس شہر کی ابوالمنصور علی خان صفدر جنگ بہادر نے ۱۷۳۹ء میں بنیاد رکھی۔ نواب صفدر جنگ مذکور نے یہ نام اپنے وطن اصلی کی مناسبت سے جو ایران میں ہے فیض آباد رکھا، ورنہ پہلے یہ بنگلہ بستی کے نام سے مشہور تھا۔

مولد و مسکن اس مشہور شہر سے چھبیس کلو میٹر کے فاصلے پر موضع کوڑھا (تحصیل بیکاپور) میں حضرت مولانا کی دسمبر ۱۹۲۱ء میں پیدائش ہوئی، حضرت مولانا کا خاندان ہمیشہ سے عزت و عظمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے، آپ کے والد ماجد جناب محمد ابراہیم صاحبؒ فیض آباد کچہری میں منشی تھے، واضح ہو کہ اس زمانے میں منشی کا منصب بجائے خود ایک اعزازی رتبہ تھا

اسی کے ساتھ مرحوم ایک بڑے زمیندار اور ذاتی عزت و وقار کے مالک بھی تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

چھ سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت مولانا مقامی مکتب کے بعد پرائمری اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ پرائمری تعلیم کے بعد فیض آباد کے ایک جونیر ہائی اسکول کھجر ہٹے میں داخل کئے گئے، جہاں آپ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔

اسلامی تعلیم کی طرف میلان

قسام ازل نے آپ کی تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا، وقت اور ماحول کی وجہ سے آپ دنیاوی تعلیم میں لگے رہے ورنہ آپ کا اصل میلانِ طبع تو علوم اسلامی و قرآنی کی طرف تھا، آپ نے اس زمانہ میں فرمایا تھا کہ "میری طبیعت تو قرآن کریم کی طرف مائل ہے"۔ اللہ اللہ ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ ملاحظہ کیجئے کیسے مبارک و مسعود وقت میں یہ جملہ زبان سے ارشاد ہوا تھا۔

حفظ کی تعلیم

مولانا کے قلبِ مصفا میں اس وقت سے یہ چیز بس گئی تھی اور آپ شریعت اسلامی کے وہ قوانین و اصول جو قرآنِ کریم میں بیان کئے گئے ہوں ان کے علم و حصول کے درپے رہنے لگے تھے، آپ کو ہر وقت اس کا فکر لگا رہتا تھا، مولانا کا رجحان طبع دیکھتے ہوئے اس وقت کے ایک فاضل دیوبند مولانا فصیح الدین صاحب مولانا کو سرائے بخشہ ضلع فیض آباد کے خطیب و امام مولانا احمد میاں سہارنپوری کی خدمت میں لے گئے، آپ نے یہاں حفظ قرآن کا آغاز کیا۔

مولانا ضرغام الدین صاحبؒ کی خدمت میں

اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے چار خلفاء

ہوئے ہیں انہیں میں سے ایک مولانا ضرغام الدین صاحب بھی ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا کو منظفر نگر سے اٹھاکر فیض آباد میں بٹھایا مولانا ضرغام الدین صاحب عجیب صفات و خصوصیات کے حامل تھے، راقم الحروف نے سیکڑوں مرتبہ صاحب سوانح سے عجیب وغریب حالات سنے ہیں۔ کم از کم اس دور میں تو ایسا بزرگ اور ان صفات و کمالات کا مالک عالم ملنا مشکل ہے۔ بہرحال مولانا ضرغام الدین صاحبؒ نے اپنے شیخ کے حکم سے فیض آباد کو اپنی خدمات اور محنتوں کا مرکز و محور بنایا۔ مولانا احمد میاں صاحب چند ماہ کے بعد ہی مولانا کو حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب کی خدمت میں لے گئے اور آپ کی ان صلاحیتوں کا تعارف کرایا۔ جن کا انہیں ادراک ہو گیا تھا۔ صحیح کہا ہے ؎

کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور
مردِ حقانی کی پیشانی کا نور

مولانا ضرغام الدین صاحبؒ نے آپ کو نہایت توجہ اور شفقت سے فارسی و عربی پڑھائی شروع کی، پھر تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر مولانا کو حضرت مولانا علیم اللہ فیض آبادی کی خدمت میں مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ بھیجدیا، مولانا علیم اللہ صاحب خلیفہ تھے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے، یہاں آپ نے فارسی کی تکمیل کے بعد ابتدائی عربی شروع کی۔

ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں آمد

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کے استاذ حضرت مولانا احمد میاں المذکور نے آپ کو اپنے ہمراہ خود دیوبند لاکر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کرایا۔

حضرت مولانا فطری طور پر شریف و نجیب تھے آپ کے اندر بچپن ہی میں ایسے اوصاف پائے جاتے تھے جو آج کل سب کچھ پڑھ لکھ جانے کے بعد بھی لوگوں میں نہیں پائے جاتے (الا ماشاء اللہ)۔

مولانا اپنی خداداد ذہانت و فطانت سے ہر سال امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے تھے، راقم الحروف نے آخری سال کے نمبرات خود دیکھے ہیں متعدد کتابوں میں اکیاون ۵۱ اور باون ۵۲ نمبرات نظر آئے، جبکہ آخری نمبر پچاس ہوتے ہیں۔ تعلیم ہی کے زمانہ سے آپ نے تقریر کی مشق کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور فراغت کے ساتھ ہی آپ نے تقریر و خطابت میں ملکہ پیدا کر لیا تھا اور اطراف واکناف میں تقریری سلسلہ میں اسفار کرنے لگے تھے۔

بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی آپ پر خاص نظر شفقت تھی، تبلیغی سفر بھی آپ کرنے لگے تھے، اسی زمانے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی بھی زیارت کی اور ان کی دعاؤں سے مشرف ہوئے۔

فراغت ازہر ہند دارالعلوم دیوبند جس سے نسبت ایک قابل فخر چیز ہے۔ اس عظیم ادارہ سے اس زمانے کے عظیم اساتذہ کی شفقتوں کے زیر سایہ شعبان ۱۳۶۵ھ میں آپ فارغ ہوئے، اور اس کے بعد ایک سال تک فنون کی تکمیل کی اور ۱۸ر شعبان ۱۳۶۶ھ میں فنون سے فارغ ہوئے۔ حضرت مولانا اس زمانہ کے فضلاء میں سے ہیں جب دارالعلوم دیوبند میں اپنے اپنے فن کے نادرۂ روزگار اساتذہ اکٹھا تھے۔

آپ کے اساتذہ آپ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ گنگوہی

(نبیرۂ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی) وغیرہم تھے۔

۱۹۴۶ء ہنگاموں اور فسادات کا دور

۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۶ء ہندوستان میں ہنگاموں اور فسادات کا دور تھا، اور یہی سال آپ کے تکمیل فنون کا بھی ہے۔ اس زمانۂ فساد میں آپ نے بہار میں مسلسل دو ماہ تک تقریریں کیں، پھر فسادات کے بعد جمعیتہ علماء ہند کے ریلیف ورکر کی حیثیت سے بہار میں دو ماہ تک مسلسل قیام کیا، اور مونگیر، پٹنہ، کھڑک پور، تاراپور وغیرہ مقامات پر زبردست قومی و ملی خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم میں تقرری

جیساکہ ابھی گذرا کہ آپ فطری طور پر نہایت ذکی اور ذہین تھے اسی کے ساتھ آپ کے سرپر اکابر علماء کے سایہ عاطفت کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام حضرت مدنی رح کی خصوصی شفقتیں بھی تھیں چنانچہ اپنی خوبیوں اور فطری صلاحیتوں اور اکابر کی خصوصی توجہات کے باعث اگلے ہی روز یعنی ۱۹ر شعبان ۱۳۶۶ھ بعد نماز ظہر دارالعلوم دیوبند کے اہم ترین اور ذمہ داریوں سے بھرپور شعبہ، شعبۂ تبلیغ میں تقرری عمل میں آگئی، وعظ و تقریر میں آپ کو ملکہ حاصل ہی تھا اس ملکہ کے اظہار کا ذریعہ یہ انتخاب بن گیا۔

تبلیغی دورے

تقرری کے بعد ہی سے آپ کے دورے اور اسفار اس انداز کے ہونے لگے جیسے منجھے ہوئے پرانے مقررین اور واعظین کے ہوتے ہیں، واضح ہو کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایک طرف سلطان الواعظین حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ کا وعظ و تذکیر اور مناظرہ و تقریر میں طوطی بولتا تھا حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رح مہتمم

دارالعلوم دیوبند مرحوم کے حکمت ریز مواعظ کا اطراف ملک میں ڈنکا بجتا تھا۔
اور اسی طرح کے اور بہت سے علاقائی اور ملکی پیمانے کے مشہور مقررین تھے۔ ایسے زمانے میں اپنے وعظ و تذکیر، خطابت و تقریر کا لوہا منوانا اور اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان بنانا ایک عظیم کارنامہ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ ملک کے گوشے گوشے سے تقاضے شروع ہوئے، کئی کئی ماہ کا مسلسل پروگرام بننے لگا، اور اس طرح پورا ملک آپ کی صدائے وعظ وارشاد سے بھر گیا۔ آپ ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچے، کوئی مقام آپ کے وعظ و تقریر سے نہیں چھوٹا حتی کہ بریلی جو خان صاحب بریلوی کا خاص مرکز و مسکن ہے آپ وہاں بھی نہایت کامیاب و کامران رہے۔

فرق باطلہ کا رد

حضرت مولانا چونکہ ایک اہل دل اور صاحب باطن بزرگ تھے اس لئے جہاں کہیں بھی آپ کو کوئی باطل نظر آتا آپ بے چین ہو جاتے اور جب تک احقاق حق اور ابطال باطل نہ کر لیتے آپ کو سکون نہ ہوتا۔

اصلاحی تعلق

حضرت مولانا نے اپنا اصلاحی تعلق عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رکھا تھا، حضرت مولانا کو آپ سے خلافت و اجازت کا شرف بھی حاصل تھا، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ پر بہت اعتماد فرماتے تھے، اکثر اپنی مجلس میں آپ کو اپنی ترجمانی کے لئے کھڑا کر دیتے تھے اور آپ کے دل نشین انداز بیان پر بہت تحسین فرماتے۔

حضرت مولانا کی زندگی سراپا جہد وعمل تھی، عبادت وریاضت تلاوتِ قرآن، مسجد کی نماز باجماعت، یہ آپ کی ایسی خصوصیات ہیں جن کی نظیر آج کے اس دور میں ملنی مشکل ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر کی مجاہدانہ زندگی کی تصدیق، انکی ریاضت وعبادت اور ان کی پابندی جماعت کو دیکھ کر ہو جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ قومی وملی اسفار بیعت وارشاد آپ کی شبانہ روز کی مصروفیتیں تھیں، مہمان نوازی کی عجیب خصوصیت تھی، حالات حاضرہ پر وعظ وتذکیر کا انداز ایسا ہوتا کہ سامعین کو وقت کا اندازہ ہی نہ ہوتا تھا، آج سے ستائیس سال قبل کا وعظ یاد ہے، ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ کوپا گنج میں حضرت مولانا کا وعظ ہوا، راقم بھی بحیثیت نعت خواں کے شریک جلسہ تھا، بعد نماز عشاء حضرت مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہانپوری کے مختصر وعظ کے بعد حضرت مولانا کا وعظ شروع ہوا، راقم نے ایک نعتیہ قطعہ سنایا جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

ہائے اسلام ترے چاہنے والے نہ رہے
جن کا تو چاند تھا افسوس وہ ہالے نہ رہے

نعت کے ختم ہو جانے کے بعد مولانا نے اسی کو وعظ کا موضوع بنایا، بس پھر کیا تھا ایک دریا تھا جو پورے جوش وخروش کے ساتھ بہنا شروع ہو گیا، بارہا مجمع نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ سامعین اپنی چیخوں کو نہ روک سکے، اور پھر آخر میں صبح صادق تک وعظ ہوا، اس مجمع میں جلسہ گاہ کے اندر فجر کی اذان دلوائی اور نماز فجر ادا کی۔

ملت کا درد | ملت کی بے راہ روی سے آپ بہت ملولِ خاطر رہتے

تھے، جہاں کہیں ضرورت ہوتی آپ کسی حال وکیفیت میں ہوتے ضرور جاتے نہایت دشوار گذار راستوں کا سفر فرماتے، ایسی بھی جگہیں ہیں جہاں اچھے اچھے مضبوط قویٰ کے حامل لوگ جانے سے کتراتے لیکن مولانا بے تکلف سفر فرماتے۔

آخر زندگی میں متعدد امراض کے شکار ہوئے، سب سے پرانا اور بڑا مرض ذیابیطس تھا اس کی احتیاط و پرہیز میں آپ نے بیس برس سے ہر قسم کا اناج اور اس سے بنی ہوئی چیزیں قطعی طور پر کھانی چھوڑ دی تھیں، جس سے آپ نہایت کمزور ہوگئے تھے، پھر یہ مرض خود ایسا تھا کہ جس نے مولانا کو کہنا چاہیئے کہ گھلاکر رکھ دیا تھا، اس پر پیرانہ سالی مستزاد لیکن کیا مجال کہ اسفار میں کوئی فرق پڑے۔

راقم کا خود تجربہ ہے کہ کشتواڑ ایک مقام ہے کشمیر کا، نہایت دشوار گذار راستہ، جموں سے بارہ گھنٹے کی مسافت صرف بس سے ہے، خطرناک پہاڑیاں جن کے سفر کے خیال سے اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہوتا ہے بڑے بڑوں کو دیکھا کہ ایک بار جانے کے بعد دوبارہ کانوں پر ہاتھ دھرتے مگر واہ رے ہمت و عزیمت، سینتیس [۳۷] سال سے برابر اس علاقہ کا سفر فرمایا کشتواڑ میں بلاشبہ جو کچھ بھی دینی بیداری اور اصلاحی صورت ہے وہ صرف حضرت کی مسلسل محنتوں کا نتیجہ ہے، راقم الحروف آخر تک تین سالوں میں کشتواڑ میں رفیق سفر رہا اور مولانا کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کا شرف حاصل کیا، کسی بھی حال میں ہوتے مگر معمولات کی پابندی، دور دراز مسجد جاکر نماز باجماعت کی پابندی نہایت اہتمام سے فرماتے۔

ایک ممتاز شخصیت | راقم الحروف کو حضرت کے ساتھ رہنے کا بار بار

موقع ملا، سفر و حضر میں ہر جگہ اور ہر وقت دیکھا بھالا، لیکن اپنے معمولات اور مشاغل کے اس درجہ پابند کہ کہیں بھی ہوں اور کسی بھی حال میں تخلف نہ ہوتا، تقویٰ و طہارت اخلاق اور علم و عمل کا ایسا پیکر مجسم، مسلکِ حق کے اظہار میں ایسے بیباک، نہایت فہیم و ذکی، گفتار و کردار کا ایسا غازی بلاشبہ نہیں دیکھا ــ یہ محض ایک دعویٰ نہیں ہے بلکہ چودہ سال سے قریب رہ کر دیکھنے اور برتنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی ہے راقم کے ساتھ حضرت مولانا کے نہایت مشفقانہ تعلقات تھے، سخت سے سخت مراحل میں مولانا کے مشورے اور تسلّی کے کلمات قلب و دماغ کے لئے سکون کا باعث ہوتے تھے، روزانہ کا یہ معمول تھا کہ مکان سے اپنے دفتر میں آتے اور پھر فوراً راقم الحروف کے پاس تشریف لاتے اور گذشتہ بارہ یا چوبیس گھنٹوں کی مفصل روداد سناتے، اگر کبھی کسی وجہ سے صبح کو نہ آتے تو بعد ظہر اپنے سونے کا معمول ترک کر کے درسگاہ میں آتے، اور کبھی صرف باہر سے کھڑے کھڑے یہ فرماتے کہ میں اس وقت اس لئے آگیا ہوں کہ کبھی تم کچھ اور سوچو!

حضرت مولانا دنیا جہان کی باتیں کرتے، آپ بیتی اور جگ بیتی سبھی کچھ سناتے، خانگی امور سے متعلق یہ کہتے ہوئے باتیں کرتے کہ آپ سے کیا پردہ آپ تو گھر کے ایک آدمی ہیں۔

آخری ایام ادھر چند ماہ سے حضرت مولانا خود کو بیحد کمزور محسوس فرماتے تھے، روزانہ ہی یہ کہتے کہ آج بہت بے چینی ہے رات بڑی تکلیف میں گذری آج دن بھر کچھ کھایا نہیں، اور ویسے بھی غذا دو سال سے نہایت کم رہ گئی تھی، اگر بیٹھ جاتے تو اٹھنے میں دقت ہوتی

سہارا دینا پڑتا تھا، مگر واہ رے مردِ مجاہد! انہیں حالات میں سخت سے سخت اور دور سے دور کے اسفار کا انکار نہ فرماتے۔

آخری سفر اسی ماہ رجب کی تین تاریخ میں میل وشارم مدراس کا سفر درپیش آیا، طبیعت کمزور تھی مگر تیار ہو گئے، مدراس کے ایک صاحب خیر ملک محمد ہاشم صاحب نے مدرسہ مفتاح العلوم کے لئے ایک مسجد بنوائی، اپنے والد جناب خضر صاحب کے نام سے، جس کے افتتاح کی ایک عظیم الشان تقریب منعقد کی جس میں ملک کی نامور شخصیتوں کے ساتھ امام حرم کو بھی دعوت دی، حضرت مولانا کو بھلا اس موقع پر کس طرح فراموش کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یاد کیا گیا، اور آپ تیار بھی ہو گئے، راقم سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم بھی چلو اور جبکہ تمہارے نام بھی دعوت نامہ ہے ضرور چلنا چاہیے، راقم نے کچھ عذر کیا جس پر فرمایا کہ مجھے دیکھئے میں کس قدر کمزور ہوں مگر جا رہا ہوں، بہر حال حضرت مولانا تشریف لے گئے اور بخیریت واپس آ گئے۔

راقم کا گجرات اور مہاراشٹر کا سفر اسی دوران میں ہو گیا۔ ۷ر رجب جمعہ کو واپسی مقرر تھی، مگر یہ پروگرام بڑھ گیا۔ ۸ر رجب سنیچر کو حسب معمول مولانا درسگاہ میں تشریف لائے، مجھے نہ پا کر تعجب کیا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعد نماز ظہر خلافِ معمول ۳ر بار آئے اور تیسری بار بھی نہ پا کر تکلیف کا اظہار فرمایا۔

سفر آخرت درسگاہ سے واپس مکان تشریف لے گئے، عصر کا وقت تھا اذان ہونے والی تھی، نماز کی تیاری میں لگ گئے اور اسی تیاری ہی کی حالت میں طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا، اس طرح نماز کا عاشق نماز ہی کی تیاری میں اپنے مالک سے جا ملا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

راقم الحروف ۲۰ رجب کی شام کو واپس آیا، خبر سنتے ہی سکتہ کا سا عالم ہوگیا، بھاگا ہوا دولت کدہ پر گیا، صاحبزادگان سے ملا، حالات سنے، کیا عرض کروں دل پر کیا گذری ؎

ان کے گئے سے دل کی خرابی نہ پوچھئے
جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا،

جب تک تھے معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ ہے، اب نہیں ہیں تو لگتا ہے کہ کچھ بھی نہ رہا۔ حضرت مولانا صرف وعظ و نصائح ہی نہیں فرماتے تھے بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق اہم مفید اور ضروری تصانیف بھی وقتاً فوقتاً شائع فرماتے، اور آپ کا مکان ایک مکتبہ بن گیا تھا، اہم مطبوعات میں سے نشر الطیب از حضرت تھانوی، مکتوبات نبوی، فرق باطلہ کے رد میں درج ذیل کتابیں شائع کیں:

الکلام المفید فی اثبات التقلید، فتح المبین فی مکائد غیر المقلدین، تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین وغیرہ۔ آخر میں بڑی تمناؤں کے ساتھ رد قادیانیت پر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اہم علماء کرام کے بیانات کو یہ فرماتے ہوئے شائع کیا کہ آخری وقت ہے، شاید یہ ذخیرۂ آخرت بن جائے اور پیغمبر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں یہ کہنے کی ہمت ہو کہ یا رسول اللہ حرم نبوت کی پاسبانی میں یہ کتاب بنام "بیانات علماء ربانی" لے کر حاضر ہوا ہوں، اس کتاب کی اشاعت کا حضرت مولانا کو بہت شوق تھا، بہت فکر تھا، چاہتے تھے کہ جلد از جلد شائع ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور اسے مطبوعہ شکل میں آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا مگر پوری کتاب مکمل حالت میں خوبصورت اور مضبوط جلد کے ساتھ آپ کے انتقال کے صرف چند گھنٹہ بعد پہنچی۔

ملفوظات کا مجموعہ حضرت مولانا کے گرانقدر اور بیش بہا ملفوظات جو روزانہ مجلس میں ارشاد فرماتے تھے۔ اس کا ایک حصہ ''اسلام کے حقائق و معارف'' کے نام سے جناب محترم مولانا سعید الرحمٰن شمس دیناجپوری نے ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند سے شائع کیا ہے ضرورت ہے کہ دوبارہ یہ بیش قیمت نصائح اور علمی حقائق منظر عام پر آئیں اور لوگ اس سے استفادہ کریں، مذکورہ بالا کتابیں مکتبہ رشاد و سعد دیوبند سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

باقیات صالحات پسماندگان میں حضرت کی اہلیہ محترمہ ہیں، پانچ صاحبزادیاں ہیں جو بحمد اللہ سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں، دو صاحبزادے ہیں۔ حافظ احمد رشاد ان کی بھی شادی ہو چکی ہے اور صاحب اولاد ہیں، دوسرے اور سب سے چھوٹے صاحبزادے عزیزم حافظ قاری احمد سعد ہیں جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔

اللّٰہم اغفر لہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ۔

(ماہنامہ دارالعلوم اپریل ۱۹۸۹ء)

مولانا مفتی احمد اشرف راندیری

بقلم: مفتی محمد یعقوب اشرف

آہ حضرت مولانا احمد اشرف راندیری مہتمم دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت (گجرات) نور اللہ مرقدہٗ ۲۷ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ بمطابق ۶ مارچ ۱۹۸۹ء بروز پیر شام ساڑھے چار بجے اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال پر ملال کی جیسے ہی یہ جانکاہ خبر پھیلی

راندیر سورت میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ اور دلوں پر اُداسی چھاگئی۔ اس وحشت ناک خبر کو سنتے ہی دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ اور مولانا مرحوم کے دیگر عقیدت مند جوق در جوق بیتابانہ ان کے گھر آنے شروع ہو گئے۔

مولانا مرحوم کی ذات گرامی اپنی پاکیزہ سیرت، اخلاق و مروت، تواضع وسادگی، خلوص وللّٰہیت، طلبہ پروری، علم دوستی، اور تواضع واعتدال کی بنا پر ہندوستان خاص کر گجرات میں بسنے والے کثیر افراد کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

آپ کی پیدائش مورخہ ۵ / ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ بمطابق ۵ / مارچ ۱۹۰۳ء بروز پیر صبح دس بجے کے قریب ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں حاصل کی، ناظرہ کے استاذ حافظ جمال الدین بانگی رحمہ اللہ تھے۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم جناب مولانا قاضی رحمت اللہ راندیری صاحب رحمہ اللہ، مولانا مطیع اللہ قریشی رحمہ اللہ، اور مولانا عبد اللہ بخاری صاحب رحمہ اللہ سے حاصل کی، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف اس وقت کے شیخ الحدیث قاضی رحمت اللہ اور مہتمم مدرسہ ہٰذا سے اور حدیث کی باقی کتابیں دارالعلوم کے دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔ درس نظامی مکمل کرکے ۱۳۴۳ھ بمطابق ۱۹۲۵ء میں جب کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حافظ احمد بن مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ تھے دارالعلوم دیوبند جاکر دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ اور دوبارہ دورۂ حدیث اور دیگر فنونات کی کتابیں پڑھی بخاری شریف، ترمذی شریف اس وقت کے محدث حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہٗ سے۔ مسلم شریف مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ سے، ابوداؤد شریف حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی، باقی دیگر کتب حدیث اور مختلف فنون کی کتابیں

دارالعلوم دیوبند کے دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔

آپ کے درسی ساتھیوں میں حضرت قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے چھوٹے بھائی مرحوم مولانا محمد طاہرؒ اور مرحوم مولانا احمد میاں صاحبؒ اور مولانا انور شاہ صاحب کے بھائی شاہ سیف اللہؒ، اور مرحوم مولانا محمد تقی دیوبندیؒ اور گودھرا کے مرحوم مولانا عبدالرحمٰن گنیا وغیرہ تھے۔ درجۂ دورہ میں آپ کے کل ساتھی ایک سو بیس ۱۲۰ تھے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ بخاری شریف کی عبارت زیادہ تر حضرت ہی سے پڑھواتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کے گجرات کے شاگردوں میں فقط آپ ہی حیات سے تھے۔

دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد راندیر آنے سے قبل حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن مفتیؒ دارالعلوم دیوبند نے آپ کو خصوصی سند اور حدیث پڑھانے کی اجازت اور اوراد کی اجازت دی اور محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے بھی آپ کو خصوصی سند عطا کی، مکہ شریف کے مشہور عالم شیخ احمد شریف سنوسی رحمہ اللہ نے اوراد کی اجازت دی اور سند بھی ساتھ میں عطا کی غرضیکہ اس وقت کے اکابر کا بھرپور اعتماد آپ کو حاصل تھا۔ گجرات اور اس کے اطراف واکناف میں آپ کی ذات گرامی علوم ومعارف کا ایسا چشمۂ صافی تھا جس سے تشنگان علوم نبوت سیرابی حاصل کیا کرتے تھے۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے اس چشمۂ رواں کو بند کردیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام نصیب فرمائے۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہٗ واجعل قبرہٗ روضۃ من ریاض الجنۃ۔

(ماہنامہ دارالعلوم مئی و جون ۱۹۸۹ء)

ایک شمع رہ گئی تھی ....

اسی مہینہ ۴؍ ربیع الثانی سنہ ۱۴۱۰ھ (۱۵؍ نومبر سنہ ۱۹۸۹ء) کو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی آخری یادگار، تحریک ریشمی رومال کے آخری رکن، اور اسارت مالٹا کی آخری نشانی، حضرت مولانا "عزیر گل" پشاوری طویل عرصہ کی علالت کے بعد بعمر ایک سو دس سال اپنے وطن میں وفات پا گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) مرحوم حضرت شیخ الہند کے تلمیذ رشید اور خادم خاص کی حیثیت سے دائرہ قاسمیہ میں امتیازی شہرت کے مالک تھے، حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ ان کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> مولانا عزیر گل صاحب قصبہ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے خادم خاص ہیں، مشن کے ابتدار سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے، صوبہ سرحد (آزاد یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انہوں نے بہت انجام دی ہیں، عموماً حضرت شیخ الہند ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور رہنما لوگوں کے پاس انہیں کو بھیجا کرتے تھے..... حاجی ترنگ زئی صاحب اور علمائے سرحد و یاغستان اور دیگر فدائین کو مشن کا ممبر بنایا..... باوجودیکہ سی، آئی، ڈی ان کے پیچھے لگی رہی مگر انہوں نے کبھی اس کو پتہ نہیں چلنے دیا..... حضرت شیخ الہند کے نہایت مخلص اور فدائی ہیں، کسی قسم کی طمع اور

غرض نفسانی نہیں رکھی، نہ حضرت سے کبھی جدا ہوئے، لوگوں
نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں مگر انہوں نے گوارا
نہ کیا ہمیشہ عاشقانہ ولولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے
حتیٰ کہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دل جمعی سے شریک
اور رفیق رہے۔ الخ (نقش حیات ج ۲ ص ۱۹۱)

مولانا مرحوم کے متعلق سی، آئی، ڈی اپنی ڈائری میں یہ لکھتا ہے:

عزیز گل پسر شہید گل کا کاخیل پٹھان درگاتی شمالی مغربی
سرحدی صوبہ میں رہتا ہے بڑا آتشیں مزاج ہے جب وہ دیوبند
میں طالب علم تھا اسی وقت سے مولانا محمود حسن کا پکا مرید
ہو گیا تھا، بڑا اہم سازشی ہے، ہجرت کا خواہشمند ہے، ان
لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ہمیشہ مولانا کو اکسایا ہے
کہ وہ جہاد کے لئے ہجرت کر جائیں۔ وہ دیوبند میں خفیہ
جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور ستمبر ۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ)
میں مولانا محمود حسن کے ہمراہ عرب گیا تھا، اس کے سفر حجاز
سے قبل مولانا نے اس کو آزاد علاقہ میں بھیجا تھا تاکہ حاجی
صاحب، سیف الرحمٰن اور دوسرے منحرف لوگوں کو مطلع کر
سکے کہ حضرت مولانا کا ارادہ ہندوستان سے ہجرت کرنے کا
ہے، وہ حضرت مولانا کے ہمراہ اس وقت بھی ٹھہرا رہا جبکہ
ان کے اکثر پیرو اور مریدین ہندوستان کو واپس کردائے
گئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ عزیز گل انور پاشا اور جمال پاشا کے
فرمان لے کر عنقریب ہندوستان آئیگا اور اس فرمان کو

افغانستان لے جانا ہوگا، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوتا
ہے کہ اس کو مکہ میں شریف مکہ کے حکم سے ۲ر دسمبر (۱۹۱۶ء)
کو یا اس کے لگ بھگ گرفتار کرلیا گیا، اور جدہ بھیج دیا گیا
جہاں سے ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء کو اسے مصر روانہ کر دیا گیا،
جنود ربانیہ کی فہرست میں مولوی عزیر گل کا نام لے کر اسے
کرنل دکھایا گیا ہے۔

(ریشمی خطوط سازش کیس کا تعارفی حصہ کون کیا ہے؟ ص ۳۲)

مولانا مرحوم ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت بابرکت میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ ہمہ وقت رہنے کی وجہ سے اکثر واردین و صادرین انہیں حضرت کے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے، حضرت شیخ الہند کے معتمدِ خاص ہونے کے ساتھ ان کے خزانچی بھی تھے، جزیرۂ مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہند کے ہمراہ ہندوستان آئے، اور حضرت کی حیات تک انہیں کی خدمت میں رہے، حضرت کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک انہیں کے مکان پر مقیم رہے، چونکہ اسارت مالٹا کے زمانہ میں اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا اس لئے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت شیخ الہند کی بھانجی کی صاحبزادی سے ان کا عقد بھی ہوگیا تھا، تحریک خلافت کے زمانہ میں دیوبند خلافت کمیٹی کے صدر رہے، مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں ایک عرصہ تک صدارت تدریس کی خدمت بھی انجام دی، رڑکی کے زمانۂ قیام میں ایک نومسلم انگریزہ خاتون سے ان کی شدید خواہش کی بنا پر دوسری اہلیہ کی وفات کے بعد نکاح کرلیا تھا، یہ خاتون یورپ کی تھیں اور یورپین وضع کی عادی، مگر اسلام سے مشرف ہو جانے کے بعد

انہوں نے نہایت سادہ زاہدانہ زندگی اختیار کرلی تھی، پردہ کی شدت سے پابند ہوگئی تھیں، صوم وصلوٰۃ اوراد ووظائف اور تلاوت قرآن حکیم ان کا خاص مشغلہ تھا، مولانا عزیر گل کی رہنمائی میں قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ بھی لکھا تھا مگر اب تک اس کی طباعت نہیں ہوسکی ہے، کاش کہ اس گنج گرانمایہ کو مولانا کے اقارب شائع کردیتے تو ان دونوں مرحومین کے لئے ایک صدقہ جاریہ ہوجاتا اور خلق خدا کو بھی ایک مستند انگریزی ترجمہ سے استفادہ کی سہولت ہوجاتی۔

تقسیم ملک سے قبل مارچ ۱۹۴۶ء (۱۳۶۵ھ) میں مولانا مرحوم اپنی نومسلم اہلیہ اور بچوں کو لے کر اپنے وطن پشاور چلے گئے اور وہیں ایک کچا مکان بناکر سکونت پذیر ہوگئے۔

مولانا مرحوم نہایت متواضع، منکسر المزاج، قناعت پسند اور سادہ زندگی کے دلدادہ تھے، نام ونمود اور شہرت طلبی سے طبعی طور پر نفرت تھی، ہر قسم کے ہنگامہ سے الگ تھلگ رہ کر گوشۂ تنہائی میں ذکر الٰہی میں مصروف رہنا زندگی کا محبوب مشغلہ تھا ضعفِ پیری اور کثرتِ امراض کی وجہ سے ایک عرصہ سے صاحب فراش تھے، بینائی جواب دے چکی تھی اور شنوائی بھی بڑی حد تک متاثر تھی، مگر اس کے باوجود حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا نام سنتے تو جسم میں توانائی کی لہر دوڑ جاتی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے ان کا ذکر خیر شروع کردیتے تھے۔

مولانا مرحوم کی وفات سے تحریک حریت کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا دعا ہے کہ خدائے رحمٰن ورحیم مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم جیسے مجاہدانہ کردار کے لوگ اب تلاش کرنے سے بھی نہیں ملیں گے۔

ڈھونڈوگے ہمیں گلیوں گلیوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

(ماہنامہ دارالعلوم دسمبر ۱۹۸۹ء)

میرواعظ کی شہادت

چمنستانِ کشمیر کی رنگینیاں و دلفریبیاں آج کل قربان گاہِ دہشت کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں، اس وادیٔ حیات افزا کی زعفران زار و عطر بیز فضائیں بارود کی مہلک بدبوؤں سے متعفن ہو گئی ہیں، بلبلوں و قمریوں کی طرب انگیز نواسنجیوں کی بجائے آہ و بکا، نالہ و شیون سے پوری وادی ماتم کدہ بنی ہوئی ہے، صاف و شفاف سرد و شیریں چشموں کے بدلے یہ جنت ارضی آگ و خون کے دریا بہا رہی ہے، محبت و دلنوازی کی اپنی مخصوص روایتی ادا کی جگہ اس نے وحشت و خونخواری کو اپنا شیوہ بنالیا ہے اور آج عالم یہ ہیکہ اس امن و آشتی کے مرکز کا ہر فرد خوف و ہراس سے لرزاں و ترساں نظر آتا ہے، وہاں کی علمی، دینی، سماجی اور سیاسی شخصیتیں چن چن کر موت کے گھاٹ اتاری جا رہی ہیں، ابھی چند دنوں کی بات ہیکہ میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق کو کچھ نامعلوم افراد نے دن دھاڑے گولیوں سے چھلنی کر دیا، کشمیر کی تاریخ میں اتنے بڑے و عظیم مذہبی رہنما کے ساتھ اس بہیمانہ سلوک کی مثال شاید تلاش کرنے سے بھی نہ ملے، کشمیر کے خوشنما چہرے پر ایسا بدنما داغ ہے جس نے اسکی رعنائیوں کو مسخ کر دیا ہے جبکہ مرحوم کی امن پسند، صلح نواز، معتدل پر وقار شخصیت سے یہ امید کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی ہر دلعزیزی و خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر وادیٔ کشمیر کو ان نوپید خار زاروں سے پاک و صاف کر کے اسے پھر سے گلستاں بکنار کر دیں گے، مگر صد حیف کہ بوم صفت نحوست کے پجاریوں نے جو اپنی منحوس فطرت کی بنا پر خرابات اور ویرانوں ہی کو پسند کرتے ہیں، امید کے اس آخری چراغ کو بھی گل کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اک ستارہ جو ضو فشاں تھا حیات کے مغربی افق پر
سیاہیٔ شب کے پاسبانو خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

واقعہ یہ ہے کہ یہ کسی ایک خاندان، ایک جماعت یا ایک قوم کا خسارہ نہیں ہے بلکہ پوری ملت اور سارے ملک کا خسارہ ہے جس کی تلافی کی

مستقبل قریب میں بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اے کاش کہ گلستاں کی اس تباہی و بربادی پر اہل گلستاں اپنی غفلت شعاریوں کے اس نتیجہ سے کچھ تو درس عبرت لیتے، اور اے کاش کہ باغبانوں کو اپنے منصب کے بجائے باغ کی سالمیت کی حفاظت و بقا کا فکر ہوتا تو شاید اس طرح کے ہلاکت خیز حوادثات رونما ہی نہ ہوتے۔ (ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۹۰ء)

مولانا احمد صاحب جونپوری

بقلم: مولانا محمد عثمان جونپوری

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

اخی المعظم حضرت مولانا احمد صاحب لیسردی جونپوری علیہ الرحمہ مہتمم مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج جونپور ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ میں موضع لیسری ضلع جونپور میں پیدا ہوئے، بچپن کے دس سال مولانا شاہ سعید احمد صاحب علیہ الرحمہ کے زیر سایہ گھر پر گذارے۔ قرآن شریف ختم کرکے ۱۹۳۹ء میں مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج آئے۔ یہاں فارسی عربی درجات کی کتابیں اخونا المعظم حضرت مولانا جمیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور انہی کے زیر تربیت رہے، ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند گئے، دیوبند میں تین سال رہے ۱۹۴۹ء میں دورۂ حدیث شریف حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے پڑھا اور حضرت ہی کے دست اقدس پر بیعت ہوئے۔ حضرت مدنی قدس سرہ کی توجہ خصوصی مولانا مرحوم پر رہا کرتی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں مدرسہ بدر الاسلام میں درجۂ عربی کے استاذ مقرر ہوئے، درس و تدریس کے ساتھ طلبہ کی نگرانی اور نمازوں کی

امامت بھی آپ ہی کے ذمہ تھی مولانا مرحوم فطری طور پر بہت منتظم واقع ہوئے تھے آپ کی انتظامی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے مولانا جمیل احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسے کا اکثر و بیشتر کام اور اہم ذمہ داریاں آپ کے سپرد کر دی تھیں آپ کے علم و ہنر، فہم و بصیرت اور دیگر خوبیوں کے پیش نظر مولانا جمیل احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم میں آپ کی تعریف اور توصیف کی ہے جب ۱۹۵۵ء میں آپ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خراجِ تحسین مولانا احمد علیہ الرحمہ کو خردوں کی تعریف و تحسین سے بے نیاز کر دیتا ہے، اس نظم کے تین شعر یہ ہیں:

جب سے ضیا پاش ہے مدرسۂ شاہ گنج — احمد خضر طریق آج حرم کو چلے
پیکر علم و ہنر نکتہ رس و دیدہ ور — کاشفِ سرِ دقیق آج حرم کو چلے
صاحب جود و عطا معدن مہر و وفا — طالب دیں پر شفیق آج حرم کو چلے

اسی بحر پر قافیہ بدل کر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم اور کہی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں:

عارف اسرار دیں احمد شمع یقیں — جن سے تھے سب مستفید آج مدینے چلے
شفقت بے انتہا سارے تلامیذ پر — علم و ہنر کی کلید آج مدینے چلے

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ان اشعار سے بخوبی جانا جاسکتا ہے کہ آپ کتنی خوبیوں اور کیسی کیسی صفات حسنہ کے مجموعہ تھے آپ کی مخلصانہ خدمات اور فہم و بصیرت کا تجربہ کرنے کے بعد ہی مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو یہ سند عطا فرمائی تھی ۱۹۶۳ء میں جب مولانا جمیل احمد رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ ہدایۃ الاسلام کی وفات ہوگئی تو ایک حیرانی اور پریشانی کا عالم تھا دامن صبر قریب تھا کہ لوگوں کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے ہر طرف یاس و حسرت اور غم و حزن کے بادل چھا گئے تھے

ایسے نازک وقت میں جبکہ ارباب مدرسہ بہت غمزدہ اور متفکر تھے حضرت مولانا احمد صاحب علیہ الرحمہ زخمی دلوں کے لئے مرہم بن گئے مدرسہ کے نظم کو اتنی خوبی اور ایسی فراست و دانائی کے ساتھ چلایا کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکی اور حقیقت میں مولانا مرحوم کے عکس جمیل ثابت ہوئے اور اس حسرت و یاس کے عالم میں بہت عزم وارادے سے دین کی کشتی کو آگے بڑھایا اور مدرسے کو ہر گزند سے محفوظ فرمایا۔ آپ کے زمانۂ اہتمام میں طلبہ کی تعداد کے ساتھ مدرسے کی مالیات میں بھی اضافہ ہوا، مدرسہ کی رفتار ترقی تیز ہو گئی، آپ نے درجۂ حفظ کی طرف خصوصی توجہ فرمائی جس کی وجہ سے ہر سال حفظ میں فارغ ہونے والے طلبہ کی ایک جماعت حافظین کر نکلنے لگی، طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر آپ نے خاموشی کے ساتھ بلا تحریک چندہ کے ۹ر جولائی ۱۹۶۸ء میں مدرسہ میں تعمیری کام شروع کرایا مسجد کے مشرق میں تالاب کے حاشیہ پر ستونوں کے ذریعہ ایک عظیم الشان عمارت بنوائی جس سے جامع مسجد کا صحن وسیع ہو گیا اور طلبہ کے رہنے کے لئے دس کمرے نکل آئے، مسجد کے شمال و جنوب میں دو دو درسگاہیں بنوائیں اور مسجد سے متصل ایک مہمان خانہ تعمیر کرایا اس عمارت کے بن جانے سے مسجد اور مدرسے کی شان و شوکت اور اس کے حسن و جمال میں نمایاں اضافہ ہو گیا اور مسجد ہر طرف سے محفوظ ہو گئی، ۱۹۸۱ء میں مدرسہ کی قدیم عمارت کا ہال جو بچوں کے لئے تنگ پڑنے لگا تھا مسجد کا راستہ مسقف کرا کے اس کو بہت زیادہ کشادہ کرا دیا اور قدیم مہمان خانہ کے اوپر ایک مہمان خانہ تعمیر کرایا جو مدنی مہمان خانہ کے ساتھ موسوم ہے، ۱۹۸۳ء میں جامع مسجد شاہ گنج کو جس کے در و دیوار پر کہنگی کا اثر ظاہر ہو رہا تھا

نیا جامہ پہنا کر بالکل نیا بنا دیا جس کی وجہ سے مسجد کی خستگی اور کہنگی ختم ہو گئی اور اس کا حسن و جمال آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا، مسجد میں ایک خوبصورت طویل و عریض سائبان بنوایا جس سے نمازیوں کو بارش اور دھوپ سے نجات ملی، جب مسجد نے نیا جامہ زیب تن کیا تو راقم نے ایک قطعہ مولانا علیہ الرحمہ کی خدمت میں نذر کیا تھا جو حسب ذیل ہے :

مسجد خستہ حال کو رشک چمن بنا دیا حسن و جمال میں اسے پھر سے دلہن بنا دیا
نور ہی نور ہر طرف پھیلی ہو جیسے چاندنی نکہت گل سے صحن کو مشک ختن بنا دیا

انہیں تعمیرات کے ساتھ مدرسے کا نہایت دل کش اور جاذب نظر گیٹ بنوایا جس کے دو خوبصورت منارے اپنے بنوانے والے کی طبع لطیف اور مزاج نفیس کا رات دن اعلان کرتے رہتے ہیں، مولانا علیہ الرحمہ کا یہ وہ عظیم کارنامہ ہے جو تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا، وقت کا مؤرخ آپ کی ان خدمات جلیلہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، آپ کو فیاض ازل نے تعلیم و تربیت کا بہترین انداز عطا فرمایا تھا، آپ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ طالب علم جہاں زیور علم سے آراستہ ہو وہیں اس کو ادب واخلاق اور دوسری اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل بنایا جائے تاکہ وہ قوم کے لئے نمونہ بن سکے، اہتمام کی ذمہ داریوں کے ساتھ بہت سی چھوٹی بڑی کتاب بھی آپ پڑھایا کرتے تھے، تفسیر کی مشہور کتاب جلالین شریف کا درس تقریباً تیس سال سے آپ ہی کے یہاں تھا، آخری بار ۱۹۸۹ء میں آپ نے جلالین شریف مولوی مصعب عالم جونپوری اور آزاد عالم اعظمی کی جماعت کو پڑھائی، مولانا علیہ الرحمہ کی صحت دو سال سے خراب رہنے لگی تھی، ذیابیطس کا عارضہ ہو گیا جو رفتہ رفتہ غالب آ گیا، گردے متأثر ہو گئے پھر کوئی علاج کارگر نہیں ہوا، آخر چودہ ماہ کی طویل علالت کے بعد ۶۳/سال کی عمر میں ۲۴/جنوری

۱۹۹۰ء چہارشنبہ ۵ بجے صبح روح عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف پرواز کر گئی، طلباء و حفاظ کی ایک جماعت نے غسل دیا، ایک نماز جنازہ مدرسے میں استاذ مدرسہ مولانا شبیر احمد صاحب نے اور دوسری مرحوم کے صاحبزادے مولانا حافظ حمزہ قاسمی نے وطن مالوف موضع بسری میں پڑھائی اور وہیں مقبرہ صالحین میں مدفون ہوئے، جنازے میں بہت ازدحام تھا جو عند اللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے، مولانا مرحوم نے ۴۲ سال مدرسہ بدر الاسلام کی خدمت کی جس میں آخر کے ۲۷ سال اہتمام کی ذمہ داریوں کے ساتھ گذارے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں، بڑے صاحبزادے مولانا حافظ محمد حمزہ قاسمی ہیں جو بروقت دوحہ قطر کی جامع مسجد میں خطیب ہیں چھوٹے صاحبزادے مولوی غازی شکیل ہیں جو آج کل گھر پر ہیں، مولانا کے داماد مولوی حافظ شاہد رضوان قاسمی بدر الاسلام میں استاد اور کارگذار مہتمم بھی ہیں ؎

یا الٰہی ہو دعا میری قبول　　قبر پہ برسا کریں جنت کے پھول

(ماہنامہ دار العلوم مئی ۱۹۹۰ء)

مولانا ضمیر احمد اعظمی

دیارِ شرق کے مشہور عالمِ دین، بلند پایہ مدرس اور نامور خطیب حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب ۱۸ ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵ ر اپریل ۱۹۹۰ء یوم اتوار کو دیپک میموریل اسپتال دہلی میں فوت ہو گئے، جہاں تقریباً ایک ماہ سے وہ زیر علاج تھے۔

مولانا ضمیر احمد صاحب مرحوم ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳ ر ربیع الاول

۱۳۴۳ھ کو دوشنبہ کے دن بعد الفجر آبائی وطن حاجی پور ضلع اعظم گڑھ میں
پیدا ہوئے تھے۔ ابھی عمر کی صرف پانچ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والدہ ماجدہ
کے آغوشِ عاطفت سے محروم ہوگئے، آپ کے والد مولوی حافظ محمد اسمٰعیلؒ
مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تلمیذ اور مرید و خلیفہ تھے، اور اس دیار
میں ان کے مسلک کے زبردست منّاد و مبلغ تھے اور اہل حق بالخصوص
علمائے دیوبند کے شدید مخالف تھے۔ سنسکرت پر انہیں کافی عبور تھا،
گھنٹوں سنسکرت اور ہندی زبان میں تقریریں کرتے تھے۔ تحریکِ
خلافت میں حصہ لیا تو برما میں آپ کے دم سے ہلچل مچ گئی، آخر کار انگریزی
گورنمنٹ نے ایک گھنٹہ کے اندر برما اسٹیٹ کو خالی کرنے کا آرڈر دیدیا۔
اسے کرشمۂ خداوندی ہی کہئے کہ وہ شخص جس کی زندگی علمارحق کی
مخالفت میں گذر رہی تھی اس نے اپنے فرزند ارجمند یعنی مولانا ضمیر احمد
صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی معنوی شاخ مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج میں
حصول تعلیم کے لئے داخل کر دیا، جہاں علمائے دیوبند کے خاص معتمد ماہر نحو
و معقولات مولانا دین محمدؒ اور قطب مشرق مولانا جمیل احمد صاحب جونپوریؒ
کا چشمۂ علم اپنی فیض رسانیوں میں مصروف تھا، مولانا ضمیر احمد صاحب پر ان
ہر دو بزرگوں کی خصوصی توجہ رہی، چنانچہ یہ نہال تازہ انہیں کی تربیت میں
پروان چڑھا، مدرسہ بدرالاسلام میں تعلیم مکمل کر لینے کے بعد حضرت مولانا
جمیل احمد صاحب کے مشورے پر بڑے غور و فکر اور تشویش کے ساتھ مولوی
اسمٰعیل صاحب انہیں دارالعلوم دیوبند حصول علم کی خاطر بھیجنے پر آمادہ ہوگئے
اس وقت دارالعلوم دیوبند۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی
نور اللہ مرقدہٗ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب

بلیاویؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے اساطین علم و معرفت کی علمی و روحانی سرگرمیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے دوران قیام ہی آپؒ کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، آخر کار حضرت شیخ الاسلامؒ کے حکم پر حضرت شیخ مدنی کے معالج خصوصی ڈاکٹر سندھی نے اپنے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرلیا، مگر ساتھ ہی مایوسی اور فکر چھائی ہوئی تھی کیونکہ مرض اپنے آخری اسٹیج پر تھا، مرض کی شدت اور حالت کی نزاکت کی بذریعہ تار ان کے والد کو اطلاع دی گئی، صاحبزادے کو دیوبند بھیجے جانے کی بدشگونی تصور کرتے ہوئے بعجلت دیوبند پہونچے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ مولانا ضمیر احمد صاحب مرض کی شدت کی بنا پر زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے دعائے مغفرت کی درخواست اور خواہش ظاہر کی تھی کہ نماز جنازہ آپ پڑھائینگے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ خود ہاسپیٹل تشریف لائے اور ان کے بستر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی، اور فرمایا کہ آپ کیوں دل چھوٹا کر رہے ہیں ان شاء اللہ اچھے ہو جائیں گے۔ اس وقت سے طبیعت جو سنبھلی تو بغیر کسی آپریشن کے مرض بالکل ختم ہو گیا، جب روبصحت ہوئے تو آپ نے ایک روز اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ والد صاحب کو مزار قاسمی پر لے جاؤ، چونکہ اب تک کی زندگی میں انہیں بزرگوں کو برا بھلا کہتے رہے تھے اس لئے بڑی ردّ و قدح اور اصرار کے بعد ان کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لئے تیار ہوئے، وہاں پہونچنا تھا کہ عجیب وارفتگی کا حال ہوا، مراقب ہوئے اور دیر تک بیٹھے رہے، عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں مزار سے متصل مسجد میں ادا کیں، مغرب کے بعد واپس آئے تو عجیب حال ہو رہا تھا، آنسوؤں کا سیلاب امڈا چلا آرہا تھا، استغفار کے کلمات ورد زبان تھے،

توبہ توبہ کی رٹ لگی کہ ہائے ہم نے ان علمائے حق وبزرگان دین کو بہت برا بھلا کہا تھا مگر یہاں تو ان کی قبریں اس قدر منور ہیں اور اس قدر کشش والے یہ انسان ہیں کہ اپنے علماء حتی کہ احمد رضا خاں وغیرہ میں یہ بات بالکل نہیں، پھر کیا تھا، یہاں سے جب لوٹے تو مسلک حق پر گامزن ہوئے، حتیٰ کہ انتقال سے کچھ قبل روحانی طور پر حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ سے بیعت ہوئے اور تمام کلمات بیعت ادا کئے۔

مولانا ضمیر احمد صاحب نے پانچ برس دارالعلوم میں رہ کر اکتساب فیض کیا، اور دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد اپنے استاذ مولانا فخر الحسنؒ کے حکم پر ۱۹۴۵ء میں سیوڑھی بیر بھوم (بنگال) تشریف لے گئے اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہ کر صحاح ستہ کا درس دیا، آپ جب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر سیوڑھی تشریف لے گئے تو عمر اس قدر کم تھی کہ سارے تلامذہ اور اساتذہ میں سب سے کم عمر آپ ہی تھے، اسی دوران ۱۹۴۷ء میں آزادی ہند کے بعد تبدیلی وطن کا سلسلہ شروع ہوا تو حالات انتہائی ابتر ہوگئے، جس کی وجہ سے سیوڑھی جانے کی پھر نوبت نہ آئی، اور آپ اپنے ساتھی قاضی امتیاز احمد مرحوم کی جگہ پر مدرسہ دعوۃ الحق سلطانپور میں تدریسی اور اہتمام کی خدمت انجام دینے لگے، چھ ماہ بعد حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حکم پر دیارِ مشرق کی ایک بہت ظلمت آشنا بستی جلال پور تشریف لائے۔ جلال پور ایک طرف کچھوچھہ سے بالکل قریب ہے تو دوسری طرف نور پور، متو پور وغیرہ مشہور بستیاں تھیں جو اگرچہ ختم ہوچکی تھیں۔ مگر شیعیت لوگوں کے دل و دماغ میں اب بھی رچی بسی تھی، کچھوچھہ دسویں صدی ہجری کے مشہور صاحب فیض بزرگ حضرت جہانگیر اشرف سمنانیؒ کی آخری آرام گاہ ہے اور اس وقت مبتدعین کی خرافات و بدعات کا گہوارہ بنا ہوا تھا،

اسی قربت مکانی کا اثر تھا کہ جلالپور میں ایک گھرانے کے علاوہ کوئی بھی صحیح المسلک نہ تھا، اس وجہ سے ابتدا میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بسا اوقات تین تین روز کے فاقے کی بھی نوبت آئی، ایک مرتبہ سارا سامان حتیٰ کہ بستر تک دریا برد کر دیا گیا، گالیوں اور معمولی ایذا رسانیوں کا سلسلہ تو روزمرہ کا دستور بن گیا تھا۔

سلسلۂ شطاریہ کے مشہور بزرگ شیخ علی عاشقانؒ کی جانب منسوب یہ مقولہ کہ یہاں نہ عالم ہوں گے نہ جاہل، جلال پور میں زبان زد خاص وعام تھا اور لوگ اس کو بطور سند استعمال کرتے تھے جس کی بنا پر آپؒ کی جلال پور میں کسی بھی تعلیمی کاوش کو ایک مجرمانہ فعل کی حیثیت سے دیکھا گیا، اور ہر وہ نازیبا سلوک کیا گیا جو علماء و اولیاء، و انبیاء کے ساتھ برتا گیا، مگر ان مشکلات ومصائب کے مقابلہ میں آپ کوہِ استقامت بن کر ڈٹے رہے اور آپ کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی، اور جرأت وہمت کے ساتھ شرک وبدعات کے مقابلے میں توحید وسنت کی آواز بلند کرتے رہے اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ مولانا شاہ کرامت علی جونپوریؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالاوّل صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ کو جو مکتب کی شکل میں تھا اس کو ترقی دینے میں مصروف رہے، چنانچہ آپ کی مخلصانہ جدوجہد رنگ لائی اور کل کا مکتب ایک اچھے خاصے مدرسے کی حیثیت سے مرجع طلبہ وعلماء بن گیا، اسی کے ساتھ اس دیار میں دیگر مقامات پر بھی مدارس ومکاتب قائم کئے جن میں جامعہ شرقیہ اسلامیہ شرقی نگر لونیہ ڈیہہ پھول پور اعظم گڈھ خاص اہمیت کا حامل ہے، جامعہ شرقیہ میں خود اپنا مرتب کردہ نصاب جاری کیا، اس طرح عصر جدید سے ہم آہنگ نصاب کے

تجربہ کی بنیاد ڈالی، مستقبل میں اس کے اچھے نتائج کی توقع ہے۔

ترویج توحید و سنت کی پاداش میں اگر آپ ایک طرف اہل ہوس کی ایذا رسانیوں کے آخر دم تک ہدف رہے تو دوسری طرف بفضل رب العزت اہل حق کی جانب سے اکرام و عزت افزائی کا سلسلہ بھی جاری تھا چنانچہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند سے حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی قدس سرہٗ نے اپنے زمانۂ صدارت میں درس و تدریس کے لئے متعدد بار طلب کیا، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ نے بھی دعوت دی، پھر آخر میں دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی نے مجلس شوریٰ کے ایما پر آپ سے دارالعلوم میں آنے کی پیش کش کی اور مجلس شوریٰ دارالعلوم کے مؤقر رکن حضرت مولانا منظور احمد صاحب نعمانی مدظلہٗ کے ذریعہ نیابت اہتمام کی پیش کش کی گئی، مگر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے زندگی کے ابتدائی دور میں جس خطۂ ارض کی خدمت سپرد کر دی تھی زندگی کے آخری عہد تک اسی کی علمی و دینی اصلاح میں ہزار ہمت شکنیوں کے باوجود منہمک رہے، اور جب تک مرض نے بے دم نہیں کر دیا وہاں سے نہیں ہٹے۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ سے مرض تنفس کے شکار تھے، آخر میں چند مہینوں سے جگر کے فعل میں بھی فتور آ گیا تھا، اس لئے انتقال سے ایک ماہ قبل علاج کے لئے دہلی لائے گئے۔ دیپک میموریل ہاسپٹل میں ڈاکٹر ملہوترا اور بہت سے ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، حکیم عبدالحمید صاحب کو بھی دکھلایا گیا، مرض خطرناک تھا پھر بھی افاقہ معلوم ہوا، اسی دوران مرحوم کے چچا خسر (اہلیہ محترمہ کے چچا) ڈاکٹر منشیر الحق صاحب وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی

کے شہید کئے جانے کی خبر ملی جس سے کافی متأثر ہوئے اس دوہرے غم کو برداشت نہ کر سکے اور بیہوش ہو گئے، دو روز تک بے ہوشی قائم رہی، تیسرے روز افاقہ ہوا تو طبیعت بہت ہشاش بشاش معلوم ہوئی، کھانا بھی کھایا، مولانا کو روبصحت دیکھ کر متعلقین کو بڑی مسرت ہوئی مگر کسے معلوم تھا کہ آخری سنبھالا تھا، عصر کی نماز کے لئے تیمم کا اشارہ کیا اور پھر طبیعت بگڑ گئی اور بگڑتی ہی گئی حتی کہ اسی دن ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ء مطابق ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ بروز اتوار ۸ بجکر تیس منٹ پر مولائے حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جسد خاکی کو دیوبند لایا گیا، احاطۂ مولسری میں جم غفیر نے حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، صدر جمعیۃ علماء ہند کی اقتدا میں نماز جنازہ پڑھی اور علماء و طلبہ کے دوش پر مزار قاسمی پہونچ کر حضرت شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے پائتیں مدفون ہوئے، پسماندگان میں پانچ بیٹیاں اور دو لڑکے چھوڑے، بڑے لڑکے مولانا قاری ازہر جمال صاحب ہیں اور چھوٹے اظفر جمال ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔

مرحوم اعلیٰ درجہ کے مدرس، محدث، مفسر تھے تو خطیب و متکلم اور مناظر بھی تھے، سیاسیات حاضرہ سے بھی غافل نہ تھے، شعر کہنے پہ آتے تو برجستہ عمدہ اشعار کہتے تھے، بڑے بڑے شعراء اپنے کلام کی اصلاح کراتے تھے، آخر زندگی تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، علم حدیث کی منتہی کتابیں بنگال اور مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں پڑھائیں، نحو و منطق، فلسفہ اور تفسیر کے درس میں آپ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا، ہندوستان کے ساتھ ملیشیا اور سنگاپور میں سیکڑوں تقریریں ہوئیں، تبلیغی سلسلہ سے بھی ان ملکوں میں خدمت انجام

دی، ہزارہا لوگوں نے آپ کی تقریریں سن کر ہدایت پائی، بدعات سے توبہ کی، دین حنیف کے علمبردار بنے، شیعیت، بریلویت مودودیت کا آپ نے خاص طور پر تعاقب کیا، سیرت نبوی علیہ السلام آپ کا خاص موضوع تھا۔

ملیشیا میں ہندوستانی و پاکستانی مسلمانوں کو منضبط کرنے اور ان کی آواز کو باوزن بنانے کے لیے مسلم ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی، اس طرح آپ کی فیض رسانی محض جلال پور یا ہندوستان تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

زبان و بیان کے ساتھ اللہ تعالے نے آپ میں قلمی صلاحیت بھی بھرپور ودیعت فرمائی تھی، "عاشورۂ محرم اور تعزیہ داری"، "ظہور قدسی" "مسلمان کیا کریں" "دین رحمت" آپ کی مطبوعہ تالیفات ہیں جو ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، ان کے علاوہ "مودودی صاحب کی تضاد بیانیاں"، "دینی تعلیم اور ہندوستان" مسلم پرسنل لار سے متعلق سوالات کے جوابات، بڑی دقیع اور اہم تالیفات ہیں۔

ہمیشہ جمعیۃ العلمار ہند سے وابستہ رہے اور سیاسی طور پر کانگریس کے مؤید رہے۔ حضرت شیخ الاسلام سے اصلاح وسلوک کا تعلق قائم تھا، بعد میں حضرت مولانا عبدالحی چشتی اور پھر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے یہ تعلق قائم کیا۔

کیا کیا خوبیاں گنائی جائیں، مختصر یہ کہ۔ ع

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(ماہنامہ دارالعلوم اگست ۱۹۹۰ء)

مولانا محمد سعید بزرگ

بقلم: عمر فاروق لوہاروی

ماضی قریب میں جن روشن ضمیر علماء نے جاہلانہ رسوم و بدعات کے خلاف جد و جہد اور ہدایت نبوی کی نشر و اشاعت کو اپنا مشن اور زندگی کا نصب العین بنا کر رنگون اور گجرات کے ظلمت زار میں روشنی کے بلند میناروں کی حیثیت اختیار کی تھی اور جن کی جلوہ گستریوں اور ضیا باریوں کی بدولت آج رنگون اور گجرات کے مسلمانوں میں علم و آگاہی کے انوار کا مشاہدہ ہو رہا ہے ان نفوسِ قدسیہ میں سملک، ڈابھیل (صوبہ گجرات) کے عالم باعمل حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ) کا نام نامی بھی سرفہرست ہے۔

اس عالم باعمل ذات گرامی کے گھر میں ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ کو جمعہ کے دن محمد سعید نامی اسم بامسمّٰی آفتاب علم نے طلوع کیا۔

مولانا (محمد سعید بزرگ صاحبؒ) چونکہ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے اس علمی فضا و ماحول میں پروان چڑھتے رہے اور اپنے والد بزرگوار کے بہترین مکارم و فضائل کی درخشانیاں اپنے اندر جذب کرتے رہے، اسی قابلِ رشک ماحول نے آپ کے اندر بے پناہ صفاتِ حمیدہ و اخلاق جمیلہ کے نقوش کالنقش فی الحجر کر دیئے اور آپ کی فطری و جبلی صلاحیتوں اور استعدادوں کو ابھار کر اس طرح بام عروج پہ پہنچا دیا کہ "بزرگی از ناصیتش ہویدا" کے زریں مرقع بن گئے۔

مولانا کی تعلیم کے مراحل ابتدا سے انتہا تک اپنے پدر بزرگوار کی زیر نگرانی

(مولانا احمد حسن بھام سملکی ؒ کے لگائے ہوئے گلستانِ علم جامعہ اسلامیہ لتعلیم الدین ڈابھیل سملک میں) طے پائے، جامعہ کے اس دور کے نامور اور مایۂ ناز اساتذہ مولانا محمد ناظم ندوی ؒ، مولانا عبدالقدیر کیمل پوری، مولانا بدر عالم میرٹھی ؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوری ؒ سے اکتسابِ فیض کیا، بخاری شریف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہی اور علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ سے پڑھ کر ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں فراغت پائی۔

شعبان ۱۳۵۷ھ میں جب کہ آپ ہدایہ کے طالب علم تھے اپنے والد ماجد کے ہمراہ تھانہ بھون حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے، اگرچہ حضرت تھانوی ؒ طلبہ کو بیعت نہیں کرتے تھے لیکن آپ کے والدِ محترم مولانا احمد بزرگ صاحب کی سفارش پر خلافِ معمول آپ کو بیعت سے مشرف فرمایا، حضرت تھانوی ؒ کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمل پوری سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اس کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے متعلق ہوگئے، حضرت مدنی ؒ سے آپ کا بہت گہرا اور خصوصی تعلق تھا، آپ کو اپنی زندگی کے چھ حج میں سے ایک حج کے سفر میں شیخ الاسلام کی معیت کا شرف بھی حاصل رہا ہے، حضرت مدنی ؒ کی طرف سے آپ کو بعض تعویذات کی اجازت بھی حاصل تھی۔

نصاب جامعہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا محمد سعید بزرگ صاحب مختلف دینی و ملی خدمات انجام دیتے رہے، سملک مسجد کی تولیت سنبھالی، مجلسِ خدام الدین سملک کی تاسیس میں بھی اہم رول ادا کیا، ۱۹۵۳ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ کے ایماء پر ایشیا کی عظیم درسگاہ اور ازہر الہند یعنی دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور وفات تک

اس کی رکنیت کا شرف حاصل رہا، دارالعلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ ہونے
کے ساتھ جمعیۃ علمائے صوبہ گجرات کے نائب صدر انجمن اصلاح المسلمین
صوبہ گجرات کے صدر، دینی تعلیم بورڈ ضلع سورت و بلساڑ کے صدر اور
مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، نیز دیگر بہت سے
ملّی و قومی مؤقر اداروں سے بھی آپ بحیثیتِ رکن متعلق رہے۔

۱۴ر رجب ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۳ر جنوری ۱۹۶۰ء کو جامعہ اسلامیہ
ڈابھیل سملک کے اہتمام کی ذمہ داری مولانا کو سپرد کی گئی۔ مولانا نے لوگوں
کے بہت زیادہ اصرار و دباؤ کے بعد یہ ذمہ داری قبول فرمائی، اور اخیر دم
تک اہتمام کی جملہ ذمہ داریوں کو اخلاص کے ساتھ نہایت خاموشی سے باحسن
وجوہ انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ اپنی اطمینان بخش کارگذاریوں، بہترین
معیاری خدمات، اور مثالی اندازِ تربیت کی وجہ سے جامعہ کو ملک اور بیرونِ
ملک میں ملّتِ اسلامیہ کا دھڑکتا ہوا دل بنا دیا۔ آپ کے دورِ اہتمام میں
جامعہ ڈابھیل نے روحانی اور مادّی ہر اعتبار سے ترقی کے اعلیٰ مدارج
طے کئے، غرض آپ کا دورِ اہتمام نہایت تابناک، شاندار اور جاندار رہا ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا کی کاوشوں اور کوششوں سے متعدد دینی و علمی کتابیں زیورِ طباعت
سے آراستہ ہوئیں جو آج بھی افادیت کے گوہر لٹا کر آپ کی یاد کے انمٹ
نقوش کا کام دے رہی ہیں۔ ؎

تلک آثارنا تدل علینا
فانظروا بعدنا الی الآثار

مولانا محمد سعید بزرگ صاحب صوبہ گجرات کے مشہور، با اثر اور با رسوخ عالم باعمل تھے، آپ کی شخصیت بے شمار خوبیوں کے بیش بہا خزینوں اور گراں مایہ گنجینوں سے مرصّع تھی۔ ؎

ولیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

مولانا کو اللہ تعالےٰ نے غیر معمولی ذکاوت و ذہانت اور فراست و فطانت عطا فرمائی تھی، آپ روشن دماغ، بلند ارادہ اور اعلیٰ تدبر کے مالک تھے جود و کرم، صبر و تحمل اور استقلال و استقامت میں اپنی نظیر آپ تھے، غرباء کی نصرت و حمایت اور ان سے ہمدردی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی، آپ صحابہ کرام رضی کی صفت "لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم" کا صحیح عکس تھے، جب کبھی خلاف حق بات سنتے تو صفتِ فاروقی "واشدھم فی امر اللہ عمر" کا مکمل نمونہ ہوتے تھے۔

مولانا کئی برسوں سے بیمار تھے، اس کے باوجود پابندی سے روزانہ مدرسہ میں حاضری دیتے تھے، کچھ وقت سے گردہ کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا، طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ۱۷ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۹۰ء کو سورت ڈومسیا ہوسپیٹل میں لے جایا گیا۔ ؎

میں ہوں مریض عشق نہ ہو گی مجھے شفا
لے جا کے کیا کرو گے مسیحا کے سامنے

۲ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۹۰ء کو اسپتال سے گھر لایا گیا، اور ۶ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۹۰ء اتوار کے دن دوپہر کو ایک بجے یہ پچھتر سالہ خادم دین اس دار فانی کو خیرباد کہتے ہوئے عالم باقی

کو کوچ کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل کو سکوں، روح کو آرام آگیا

موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

نماز جنازہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے فیض یافتہ فضلاء اور عوام کے علاوہ سملک ڈابھیل، راندیر، تراج، ترکیسر اور بھروچ کے علماء بھی کثیر تعداد میں شریک ہوئے، نماز جنازہ سملک اسکول کے باہر وسیع میدان میں ادا کی گئی، برکۃ العصر حضرت مولانا احمد رضا اجمیری صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث مدرسہ اشرفیہ راندیر، سورت) نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ہزاروں جگر فگار سینوں نے پُرنم آنکھوں سے رات کو دس بجے کتاب وسنت کی اس امانت کو سملک کے قبرستان میں ان کے والد مولانا احمد بزرگ سملکیؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیا۔

مولانا مرحوم اپنے پیچھے اہلیہ، دو فرزند، اور چھ صاحبزادیاں چھوڑ گئے ہیں۔ دونوں فرزند (مولانا احمد بزرگ صاحب اور قاری عبدالرحمٰن بزرگ صاحب) جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

(ماہنامہ دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۰ء)

قاری انیس صاحبؒ

یوپی کے ضلع فیض آباد کے ایک چھوٹے سے قریہ جگن پور میں تین سو سال پہلے راجپوت خاندان کے ایک شخص رائے بسائے سنگھ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام

کی دولت سے مشرف فرمایا اس شخص نے اپنا اسلامی نام بھیکن خاں رکھا، اسی کی نسل میں ایک ایسا صالح فرزند پیدا ہوا جس نے انتہائی غربت اور پریشانیوں کے باوجود تحصیل علم کیا، دیوبند سے فراغت حاصل کی اور فن قرارت و تجوید میں کمال پیدا کیا، ابتدا میں اپنے وطن جگن پور میں گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر قریہ کے بچوں کو برسوں قرآن پاک کی تعلیم دی، پھر برما کا سفر مقدر ہوا، وہاں کے قیام کے دوران علوم دینیہ کی ترویج کی، بدعات کے خلاف ہزاروں فتاوے مرتب کر کے شائع کئے، کئی کتابیں لکھیں، یہ مرد درویش حضرت شیخ الہند سے بیعت تھا، اور مسلک دیوبند کا عاشق، ورع و تقویٰ میں منفرد، اخلاص و للّٰہیت کا پتلا، خوش اوقات، اتباع سنت میں بے مثال۔

اسی مرد خدا کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا جس کو خود اس نے پالا، پڑھایا اور تربیت کی، تربیت کا اس پر کچھ ایسا رنگ چڑھا کہ وہ اپنے والد کا نمونہ بن گیا، بچپن ہی میں شفیق ماں کے سایہ سے محروم ہو گیا، ابھی بالغ بھی نہیں ہوا تھا کہ مربی باپ بھی رخصت ہو گیا جو اس کے لئے سب کچھ تھا، اس بے سروسامانی کے عالم میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے، کسی کی ترغیب پر تحصیل علم کے لئے سفر کیا، چند سال اس طرح گذرے کہ دوستوں اور اپنوں نے اس غربت کے مارے اور پرانی وضع قطع کے طالب علم کو اتنا ستایا کہ اس دور کے حالات سنکر کلیجہ منھ کو آتا ہے، طلبہ مدارس کی مردم آزاری پر قلق ہوتا تھا، بالآخر کسی طرح دیوبند پہونچنے میں کامیابی ہوئی اور وہاں تعلیم مکمل کی، باپ کی وراثت فن قرارت تھی لہٰذا اس میں جان توڑ کر محنت کی، مرحوم قاری حفظ الرحمٰن صاحب سے حفص کے علاوہ سبعہ کی بھی تکمیل کی مگر اس فن کی پیاس باقی تھی، دیوبند سے لکھنؤ آیا، یہاں مدرسہ فرقانیہ جو اس وقت

ملک میں فن قرارت کا مشہور مدرسہ تھا، وہاں ماہر اساتذۂ کرام سے سبعہ عشرہ کی اہم کتابیں پڑھیں، پورے قرآن کا اجرار کیا اور طویل مدت اس کی تحصیل میں خرچ کی، اور بعد میں اسی ادارے ہی میں مجوّد کی حیثیت سے خدمت شروع کی، دس سال تک اس ادارے میں خدمت انجام دی۔

ادھر گجرات میں فلاح دارین ترکیسر کے مہتمم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کو اپنے ادارے میں قرارت سبعہ کے لئے ایک ماہر استاذ کی ضرورت تھی، موصوف اس کے لئے ملک گیر دورہ کر رہے تھے اسی سلسلہ میں فرقانیہ جانا ہوا، دیکھا تو ایک قدیم وضع کا کرتا پہنے دوپلی ٹوپی لگائے مغلئی پاجامے میں ملبوس ایک نوجوان دنیا سے بے رغبت کم گو ایک چھوٹے سے حجرے کی چٹائی پر بیٹھا ہوا فن کی باریکیوں سے طلبہ کو آگاہ کر رہا ہے، گجرات تشریف لانے کو کہا گیا تو فرمایا اگر آپ کے یہاں اس فن سے طلبہ دلچسپی لیں تو خدمت سے انکار نہیں، بہرحال ترکیسر کا آب ودانہ لکھنو سے اٹھا لایا، ترکیسر آکر موصوف کے جوہر کھلے، پوری قوت کے ساتھ اس فن کو طلبہ میں مقبول بنانے کی کوشش کی، سبعہ کے اسباق جاری کیے، رائیہ، درّہ، تیسیر کے اسباق بھی بعض طلبہ کو پڑھاتے، قرار کی ایک بڑی تعداد پیدا فرمائی جو بالفعل تدریس کی اہلیت رکھتی تھی، ان میں سے بعض فی الحال بعض بڑے مدارس میں اس فن کے کامیاب اساتذہ ہیں۔

اسباق کی خصوصیات: مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ طالبین وصادقین اور متواضع طلبہ ہی کو پڑھانے کے قائل تھے، ان کو اپنے فن سے اتنی محبت تھی کہ وہ ہر ایک کو آسانی سے یہ فن دینے کے قائل نہ تھے، وہ فرماتے تھے کہ یہ شریف علم شریف طلبہ ہی کو دیا جائے، اگر کوئی طالب صادق نظر آتا تو پھر خارج

میں پڑھانے کے لئے تیار ہوجاتے، اور اس سے بے حد تعلق رکھتے، اور
اس کی عزت کرتے، اس کی مالی مدد کرتے، وہ پرانی وضع کے آدمی تھے، شاگرد
جب تک استاذ سے ایسا تعلق نہ رکھے جو ایک اطاعت شعار بیٹے کو باپ سے
ہوتا ہے تب تک اس کو طالب علم ہی نہیں سمجھتے تھے، ان کا ماننا تھا کہ استاذ
سے محبت ہی فیض کا ذریعہ ہوتی ہے، ان کو خود بھی اپنے اساتذہ کے ساتھ
بے پناہ محبت تھی، نام آتے ہی رونا شروع کر دیتے، اور ان کے کمالات ذکر
فرماتے، دوسری بات یہ تھی کہ وہ پورے قرآن مجید کا اجراء کرانے کے عادی
تھے، تکمیل کے بعد ہی سند دینے کے قائل تھے چنانچہ اس پر انہوں
نے شدت سے عمل کیا، ان کے یہاں ریا رنمود، جلسے جلوس اور اسٹیج پر قرارت
سے مکمل اجتناب تھا، اس کو پسند نہیں کرتے تھے، البتہ قرآن پاک کا اجراء
مکمل ہوجانے پر بے حد خوش ہوتے اس موقع پر دعاء کا اہتمام کرتے سب
کو اجتماعی دعاء میں شریک کرتے اور اس مجلس میں حضورؐ کی نعت پڑھوانے
کے شوقین تھے، مٹھائی سے بے حد رغبت تھی جب کہ وہ ان کے مرض میں
شدید مضر تھی۔

حضورؐ کی محبت مرحوم کے ریشہ ریشہ میں سمائی ہوئی تھی، سرکارؐ کا نام
سنتے ہی زار و قطار رونے لگتے، اگر نام آئے اور کوئی درود نہ پڑھے تو
آگ بگولہ ہوجاتے۔

مرحوم نے بڑی مفید کتابیں حفص، سبعہ اور عشرہ کے طلبۂ کرام کیلئے
تصنیف فرمائیں اور آخری تصنیف "شانِ مصطفیٰ" دو جلدوں میں تقریباً
ایک ہزار صفحات پر مشتمل بیماری کے ایام میں رات رات بھر جاگ کر تحریر کی
جس کی ہر سطر عشقِ مصطفیٰ میں ڈوبے ہوئے دل کی عکاسی کرتی ہے۔

مرحوم انتہائی گوشہ نشین، کم آمیز اور تنہائی کے خوگر تھے، پوری زندگی تجرد میں گذاری، اس معاملہ میں وہ اپنے کو معذور سمجھتے تھے، شاید رات جو انہوں نے خدا کی عبادت کے لئے وقف کر رکھی تھی اس میں دوئی گوارا نہیں تھی۔

مرحوم نے بہت کم عمری میں انتقال فرمایا، شکر کے مہلک مرض نے بہت جلد ان کو نڈھال کر دیا تھا، علاج کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، البتہ پرہیز کے قائل نہیں تھے، گذشتہ سال سے فلاح دارین سے گھر تشریف لے گئے وہیں صاحب فراش رہے۔ ۱۶ر نومبر بروز جمعہ وقت موعود آپہونچا اور جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدرسہ میں اطلاع آتے ہی صفِ ماتم بچھ گئی، ہر شخص اشک بار ہوگیا، ایصال ثواب و دعائے مغفرت کی مجلس ہوئی، تعزیتی تجویز پڑھی گئی، مسلم عوام سے اس مرد خدا کے لئے دعا ر مغفرت کی درخواست ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم جنوری ۱۹۹۱ء)

دو حادثے

یعنی مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا قاضی زین العابدین

ارکان شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی رحلت

(۱) یہ خبر ملتے ہی دارالعلوم دیوبند کی فضا یک لخت سوگوار ہو گئی کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین، امارت شرعیہ بہار کے امیر، خانقاہ رحمانیہ کے سجادہ نشین اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے روح رواں حضرت مولانا

منت اللہ رحمانی ۳ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ، ۱۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو کارگاہِ حیات سے رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا رحمانی کو قدرت نے گوناگوں صفات وخصوصیات سے نوازا تھا، وہ ایک وسیع النظر عالم، صاحب نسبت شیخ، فعال ومتحرک رہنما اور بلند پایہ مصنف تھے، پیرانہ سالی اور ذیابیطس جیسے جاں گسل مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود ملی وسماجی کاموں میں بڑے چاق وچوبند رہتے تھے، ایسی جامع صفات اور نوع بنوع خصوصیتوں کی حامل شخصیت سے اس قحط الرجال میں ملتِ اسلامیہ کا محروم ہو جانا ایک زبردست خسارہ ہے جس کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مولانا مرحوم تیرہویں صدی کے مشہور عالم دین وشیخ طریقت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ خلیفۂ اجل حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی متوفی ۱۳۱۳ھ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ۹ رجمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں آپ کی ولادت ہوئی اور علم وعرفان کے پاکیزہ ماحول میں پروان چڑھے، والد گرامی کی وفات کے بعد ۱۱ سال کی عمر میں بغرض تحصیل علم حیدرآباد گئے، اور وہاں مولانا مفتی عبداللطیف صاحب متوفی ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء سے عربی صرف ونحو اور منطق وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں اپنے برادر کبیر مولانا نور اللہ کے ہمراہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اور مولانا حفیظ اللہ اعظمیؒ، مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ، مولانا شبلی فقیہ اعظمیؒ، مولانا عبدالرحمٰن نگرامیؒ وغیرہ قابل فخر اساتذہ سے علم وفن کی تحصیل کی، آخر میں بغرض تکمیل ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا سید اصغر حسین

محدث دیوبندی، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی جیسے یگانہ روزگار علماء سے حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں سندِ فراغت حاصل کی، دارالعلوم دیوبند کے رفقاء درس میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جن سے آپ کے تعلقات آخر دم تک دوستانہ و بے تکلفانہ رہے۔

والد ماجد کا انتقال چونکہ آپ کی نوعمری ہی میں ہو گیا تھا اس لئے ان سے بیعت و ارشاد کا تعلق رکھنے کے باوجود استفادہ نہ کر سکے، بعد میں حضرت حاجی محمد شفیع بجنوری خلیفہ حضرت گنج مراد آبادی کی خدمت میں پانچ برس رہ کر سلوک کی راہیں طے کیں اور اپنے والد محترم کے خلیفہ مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری سے مجازِ خلافت ہوئے، اپنے برادرِ اکبر مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں خانقاہ رحمانی کی مسندِ ارشاد پر فائز ہوئے، اور خلقِ خدا کی اصلاحِ باطن کی بنیادی خدمت کی جانب متوجہ ہو گئے، بہار، اڑیسہ اور بنگال میں آپ کے مریدین و مسترشدین کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ افادۂ باطنی کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری تھا، جامعہ رحمانی کا از سرِ نو قیام اور اس کی غیر معمولی ترقی مولانا مرحوم ہی کی قوتِ عمل کی مرہونِ منت ہے، جامعہ رحمانی کا شمار آج بہار کے مرکزی دینی مدارس میں ہوتا ہے۔

۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی بااختیار باڈی "مجلس شوریٰ" کے رکن منتخب ہوئے اور تا دمِ واپسیں اس سعادت سے ہمکنار رہے، مجلس میں آپ کی اصابتِ رائے کو اہم مقام حاصل تھا حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کی وفات کے بعد سے مجلس کی قرار دادوں کی ترتیب و تحریر کی خدمت بالعموم آپ ہی انجام دیتے تھے، اپنی مادرِ علمی سے مرحوم کو خاص

وابستگی تھی اور اس کی تعمیر و ترقی کے لئے دل سے کوشاں رہتے تھے ۔

۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء میں امارت شرعیہ بہار کے امیر رابع کے منصب جلیل کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے اکابر کی زیر نگرانی ان کا انتخاب عمل میں آیا، اسے ان کا کارنامہ ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اکابر کی اس میراث اور یادگار کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنے علم و فضل، فہم و فراست، اعتدال و توازن اور حرکت و عمل سے اسے مزید ترقی و وسعت بھی دی اور آج اس کی شاخیں بہار کے حدود سے نکل کر ملک کے دیگر حصوں تک پہنچ گئی ہیں ۔

ملک میں جب متعصب صحافیوں اور تنگ نظر سیاسی بازی گروں کی طرف سے یکساں سول کوڈ کا مطالبہ زور پکڑنے لگا تو قانون شریعت کے تحفظ کے لئے ایک مستقل ادارہ کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ مولانا مرحوم کی تحریک پر اس سلسلے کا ایک مخصوص و اولین اجتماع دارالعلوم دیوبند میں ہوا جس میں ملک کے اصحاب فکر علماء نے فیصلہ کیا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے جس میں ہر مکتبۂ فکر کے صاحب نظر علماء اور دانشوروں کو نمائندگی دی جائے، اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے مولانا رحمانی مرحوم کی تگ و دو سے دسمبر ۱۹۷۲ء / ۱۳۹۲ھ کو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت ایک عظیم تاریخی کنونشن بمبئی میں منعقد ہوا جس میں حضرت حکیم الاسلام کی صدارت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس کے جنرل سکریٹری کے لئے اس عظیم اجتماع کی نظر مولانا رحمانی ہی پر پڑی، چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے حسن انتظام، قوت عمل اور متوازن رویہ سے اسے ملک گیر تحریک بنا دیا جس نے شاہ بانو کیس میں بڑا قابل قدر اور تاریخی کردار ادا کیا۔

مولانا مرحوم کی زندگی اپنے محاسن و برکات سے اگر قابل رشک ہے

توان کی موت بھی حسن قبول کی بشارت بن کر آئی کہ رمضان المبارک کو عشاء اور تراویح کی چند رکعات کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے پسماندگان خصوصاً ان کے صاحبزادہ مولانا محمد ولی رحمانی کو صبر و تسلیم کی توفیق ارزانی فرمائے اور قوم و ملت، امارت شرعیہ بہار اور دار العلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ اللّٰہم آمین۔

(۲) حضرت مولانا رحمانی مرحوم کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ۳۱ر مارچ ۱۹۹۱ء کو دار العلوم دیوبند کے ابن قدیم اور رکن شوریٰ حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے سانحۂ ارتحال کی غمناک اطلاع ملی، اس اندوہناک خبر کے ملتے ہی حضرت مہتمم صاحب تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے بذریعہ کار میرٹھ روانہ ہوگئے، تقریباً دس بجے دن کو حضرت مہتمم صاحب نے نماز جنازہ ادا کرائی۔

حضرت قاضی صاحب میرٹھ کے اس علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے جو محمد تغلق شاہ ۷۲۵ھ کے عہد سے میرٹھ کے منصب قضاء پر فائز چلا آرہا ہے قاضی صاحب تقریباً ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم دار العلوم میرٹھ اور مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ میں پائی، حضرت شیخ الہند کے تلمیذ مولانا عبد المؤمن دیوبندی سے مشکوٰۃ اور بیضاوی تک پڑھا، عربی ادب کا ذوق مولانا اختر شاہ خاں صاحب استاذ مدرسہ امداد الاسلام کی صحبت میں پیدا ہوا، اسی زمانہ میں فاضل ادب عربی کا امتحان الہ آباد بورڈ سے پاس کیا اور ہائی اسکول تک انگریزی پڑھی، حدیث کی تحصیل و تکمیل کے لئے ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اسرارہما سے حدیث

کا فیض حاصل کیا اور ۱۳۴۶ھ میں امتیاز کے ساتھ دورۂ حدیث سے فراغت پائی، زمانۂ طالب علمی میں ان کے مضامین و مقالات اردو کے معیاری جرائد میں شائع ہونے لگے تھے۔ چنانچہ فراغت کے بعد مولانا تاجور نجیب آبادی ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور نے انہیں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے لاہور بلالیا ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو اس کے رفقار تحریر میں حضرت قاضی صاحب شریک تھے، اسی زمانہ میں انہوں نے تاریخ ملت کے تین حصے، نبی عربی، خلافت راشدہ، اور خلافت بنو امیہ تالیف کئے، ان کے علاوہ قاضی صاحب کی تصانیف میں بیان اللسان (عربی اردو لغت) قاموس القرآن (الفاظِ قرآنی کی لغت) انتخاب صحاح ستہ، سیرت طیبہ، شہید کربلا، کلام عربی، اخلاق نبوی وغیرہ بہت اہم اور مقبول ہیں، ایک عرصہ تک میرٹھ سے "الحرم" کے نام سے ایک مؤقر ماہنامہ بھی نکالتے رہے ۱۹۵۷ء/۱۳۷۷ھ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کی دعوت پر جامعہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ و تفسیر کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اس منصب پر ایک عرصہ تک فائز رہے ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور آخر تک اس شرف و مجد پر قائم رہے، جب تک صحت و طاقت نے ساتھ دیا بلا ناغہ مجلس کے ہر اجلاس میں شرکت فرماتے رہے اور اپنے مفید مشوروں سے دارالعلوم کی تعمیر و ترقی میں مخلصانہ حصہ لیتے رہے حضرت قاضی صاحب کو دارالعلوم سے قلبی لگاؤ تھا، مجلس کے علاوہ عام اوقات میں بھی اپنے نیک مشوروں سے ارباب انتظام کی رہنمائی کرتے رہتے تھے اور ہر وارد و صادر سے دارالعلوم کے احوال و کوائف معلوم کرتے رہتے تھے، دعا ہے اللہ تعالےٰ حضرت قاضی صاحب کو دارالعلوم اور پوری ملت کی جانب سے جزائے خیر دے اور انکے مدارج کو بلند فرمائے۔

(ماہنامہ دارالعلوم جون ۱۹۹۱ء)

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم

وقعت الواقعہ

آہ کہ! استاذ الاساتذہ حضرت مولانا معراج الحق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، ۷ر صفر ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸ر اگست ۱۹۹۱ء یکشنبہ کو سوا دس بجے دن میں رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے اور اپنے پیچھے ہزاروں شاگردوں اور بے شمار عقیدت مندوں کو چھوڑ گئے جو ان کی یاد میں مدتوں اشکش بار و دل فگار رہیں گے۔

ادھر چند مہینوں سے آپ کی صحت بتدریج گرتی جارہی تھی، عمر طبعی کا ضعف، بیماری کی گرفت اور دماغی محنت نے موصوف کو اس قدر واماندہ اور نڈھال کر دیا تھا کہ علاج و معالجے سب بے اثر ہوکر رہ گئے تھے، اور آپ کی زندگی کے یہ آخری ایام بس مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی یاد ماضی اور فکر مستقبل کے سہارے گذر رہے تھے کہ وہ وقت موعود آگیا جس سے کسی کو بھی کسی صورت میں مفر نہیں ہے۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

ابھی چند مہینے کی بات ہے کہ ماہ رمضان میں پہلے دارالعلوم کے قابل فخر فرزند اور ملک کے نامور عالم دین امیر شریعت بہار مولانا منت اللہ رحمانی رخصت ہوگئے، ان کے بعد دارالعلوم کے ایک دوسرے لائق ترسپوت اور مشہور صاحب تصنیف فاضل مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی داغ مفارقت دے گئے، اور اب برصغیر ہند و پاک کی مجلس علمی کے صدر نشین حضرت مولانا معراج الحق صاحب بھی چلے گئے، دینی و علمی محفلیں اجڑتی جارہی ہیں اور اس وقت ملت اسلامیہ ایک زبردست خلا کا شکار ہے، علمی و عملی انحطاط کے

اس دور میں جب کہ جانے والا اپنا کوئی بدل چھوڑ کر نہیں جاتا حضرت مولانا کی وفات ایسا عظیم حادثہ ہے جس پر اظہار کرب والم سارے الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ حادثہ صرف مولانا مرحوم کے اعزہ کا نہیں، محض ان کے تلامذہ کا نہیں، تنہا دارالعلوم کا نہیں بلکہ پوری دنیائے علم وفن کا حادثہ ہے مشہور مقولہ موت العالِم موت العالَم کی صداقت کا صحیح اور مکمل ادراک اسی جیسے حادثوں کے وقت ہوتا ہے۔

ولادت اور علمی نشوونما

حضرت مرحوم ماہ رجب ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں دیوبند کے ایک محلہ کوٹلہ میں پیدا ہوئے، پرائمری درجات کی تعلیم قصبہ "برنالہ" صوبہ پنجاب میں حاصل کی جہاں آپ کے والد بزرگوار منشی نورالحق بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ آگے مڈل تک کی تعلیم دیوبند میں مکمل کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ دینیات میں داخل ہوئے اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین دیوبندی سے اردو فارسی، ابتدائی عربی وغیرہ کی تحصیل کی۔ ۱۳۴۵ھ میں یہاں کی تعلیم موقوف کرکے مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لے لیا کیونکہ آپ کے والد محترم کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا تھا اور وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ سہارنپور ہی میں قیام پذیر تھے، مظاہر علوم میں تقریباً پانچ سال زیر تعلیم رہ کر حسب ذیل کتابیں پڑھیں۔

تہذیب، نورالایضاح، کافیہ، قطبی، تصدیقات، شرح تہذیب، اصول الشاشی شرح جامی بحث فعل، قدوری، نفحۃ الیمن، نورالانوار، میر قطبی، سلم العلوم، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مقامات حریری، ملاحسن، مختصر المعانی، سبعہ معلقہ، مناظرہ رشیدیہ، حسامی، ہدایہ اولین، ہدیہ سعیدیہ۔

۱۳۴۹ھ ماہ ربیع الثانی میں دوبارہ پھر دارالعلوم میں داخل ہو گئے اور اس سال دارالعلوم میں مختصر المعانی، حسامی، ہدایہ اولین، ملا حسن اور میبذی پڑھیں۔ سنہ ۱۳۵۰ھ میں دیوان متنبی، ہدایہ اخیرین، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف نخبۃ الفکر، سراجی اور میبذی (مکرر) کی تحصیل کی، سنہ ۱۳۵۱ھ میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، اور سنہ ۱۳۵۲ھ میں فنون کی حسب ذیل کتابیں پڑھ کر دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو گئے۔

صدرا، شمس بازغہ، دیوان حماسہ، شرح عقائد، سبعہ معلقہ، بیضاوی، خیالی، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، شرح چغمینی، تصریح۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ نے جن اساتذہ سے اکتساب فیض کیا، ان میں مجاہد عصر، شیخ وقت، عارف باللہ، محدث کبیر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امام معقولات حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندی، حضرت مولانا نبیہ حسن دیوبندی، حضرت مولانا رسول خاں صاحب سرحدی، حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندی، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند قدس اسرارہم جیسے اساطین علم و فن اور یگانہ روزگار علماء و مشائخ شامل ہیں، اگر یہ بات درست ہے اور یقیناً درست ہے کہ کامل اساتذہ کے تلامذہ بھی کامل ہوتے ہیں تو حضرت صدر صاحب مغفور کے کمال علمی کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو گی۔

یوں تو حضرت مولانا مرحوم کو اپنے سب ہی اساتذہ سے تعلق خاطر تھا، لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی، حضرت علامہ بلیاوی اور حضرت

شیخ الادب قدس اسرارہم سے والہانہ عقیدت تھی، بالخصوص حضرت
شیخ الادب سے تو آپ بیحد متاثر تھے، اور حضرت موصوف کی بھی آپ پر خصوصی
عنایت تھی، اسی لئے حلقۂ دارالعلوم میں آپ ان کے مخصوص و منتخب
شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے "مولوی فاضل" کا
امتحان دیا اور اعلیٰ نمبرات (فرسٹ ڈویژن) سے کامیاب ہوئے۔

درس وافادہ

تعلیمی مرحلوں کی تکمیل کے بعد اپنے اساتذہ واکابر کے منشاء و منہاج
کے مطابق مسند درس وافادہ کو زینت بخشی اور سب سے پہلے مدرسہ ہاشمیہ
جامع مسجد زکریا اسٹریٹ بمبئی کو اپنی علمی و دینی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء
سے ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء تک یہاں رہ کر علوم نبوت کے جواہر پاروں سے عروس البلاد کو
آراستہ و پیراستہ کرتے رہے۔ آپ کے درس وافادہ کا یہ اولین تجربہ
تھا جس سے بڑی خوش اسلوبی اور نیک نامی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے
بعد ازاں اپنے اساتذہ کے مشورہ اور اہل گلبرگہ کی طلب پر جنوبی ہند کی
مشہور دینی درسگاہ مدرسہ دینیہ روضتین گلبرگہ سے وابستہ ہوگئے،
یہاں صدارت تدریس کے ساتھ اہتمام کا اہم ترین منصب بھی آپ کے
سپرد کر دیا گیا۔ ان مختلف النوع دونوں اہم ترین و نازک ترین ذمہ داریوں
کو تقریباً چار سال تک اس حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا کہ آپ کی علمی و انتظامی
صلاحیتوں کے معترف و معتقد خود آپ کے اساتذہ بھی ہوگئے چنانچہ ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء
میں آپ کو مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں بلالیا گیا، اس وقت سے حیات کے آخری

لمحے تک دارالعلوم ہی سے وابستہ و پیوستہ رہے جو آپ کا گھر بھی تھا اور درسگاہ بھی، دنیا کے تمام علائق سے یکسو ہو کر بس دارالعلوم کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا لیا تھا، اس طرح نصف صدی کی طویل مدت دارالعلوم کی خدمت اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گذار دی ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام ہے تیرے ہی کام سے
ترے ذکر سے، ترے فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں تدریس کے ساتھ نیابت اہتمام کی ذمہ داری بھی مولانا مرحوم سے متعلق ہو گئی، جسے ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء تک بالغ نظری و تندہی کے ساتھ انجام دیتے رہے، پھر ۱۴۰۲ھ میں دارالعلوم کی ہیئت حاکمہ مجلس شوریٰ نے صدارت تدریس کے عظیم ترین منصب کے لئے آپ کا انتخاب کیا جس پر تا دمِ واپسیں فائز رہے۔

علمی کمال

دارالعلوم کی پچاس سالہ تدریسی زندگی میں حضرت مولانا نے نحو، بلاغت، ادب، منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ ہر فن کا کامیاب درس دیا، جو علومِ متداولہ میں آپ کی دستگاہ اور جامعیت کی ایک زندہ شہادت ہے لیکن اپنے خصوصی استاد و مربی حضرت شیخ الادب کی طرح آپ کا پسندیدہ موضوع فقہِ اسلامی اور قدیم عربی ادب تھا، فقہ حنفی کی بلند پایہ دادق ترین کتاب ہدایہ اخیرین کا درس بے تکان دیتے تھے، اور اہم سے اہم پیچیدہ مباحث کی ایسی دل نشین اور سلجھی تشریح کرتے تھے کہ طلبہ کو احساس تک نہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی اہم اور سخت بحث تھی، اسی طرح متنبی، حماسہ اور سبعہ معلقہ کے

درس میں تحقیق لغات، حل ترکیب، اشعار کے معیار بلاغت، متعلق شعراء کے ادبی مقام اور ان کے کلام کے معانی ومفہوم پر ایسی جامع اور فاضلانہ تقریر کرتے تھے کہ باصلاحیت طلبہ جھوم جھوم اٹھتے تھے، ان دونوں فن میں مولانا مرحوم کی انفرادیت پورے حلقۂ دارالعلوم میں معروف ومسلم تھی جس میں کوئی دوسرا ان کا ہم پایہ وہم پلّہ نہیں تھا۔

حضرت صدر صاحب مغفور علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو تصنیف وتالیف کے بالمقابل افراد سازی اور مردان کار کی ساخت و پرداخت کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے بھرپور تصنیفی صلاحیت رکھنے کے باوجود جس کا اندازہ زمانۂ تعلیم کی نوشتہ تقریر ترمذی وغیرہ سے ہوتا ہے، کتابوں کی تالیف اور شروح وحواشی کی تحریر کے بجائے اپنے شاگردوں کی علمی تہذیب وتربیت اور ان کے اخلاق وکردار کو آراستہ وپیراستہ کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، آپ کی اسی جہد مسلسل کا نتیجہ ہے کہ آپ کے چراغ علم وحکمت سے علم وآگہی کی ہزاروں شمعیں روشن ہوگئیں جن کی ضیاء پاش کرنوں سے آج دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے۔

عادات وخصائل

حق گوئی اور طریق حق پر استقامت میں مولانا مرحوم پختہ کردار کے مالک تھے، نفع ونمود کے جذبہ سے بلند ہوکر ہمیشہ سچی بات کہنے کے عادی تھے، آپ کا دینی مزاج بزرگان سلف کی طرح "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کا حامل تھا، رائے میں پختہ تھے کسی شخصیت سے کم ہی مرعوب ہوتے تھے، مزاج اصول پسند تھا، اس لئے بے اصولی بے حد ناگوار تھی، اپنے کام میں بڑے

چست اور چاق و چوبند رہتے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے سخت گیر تھے مگر سخت دل نہیں تھے، چھوٹے بچوں کے ساتھ بڑی شفقت و محبت اور پیار و دلار کا معاملہ کرتے، وقار اور سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، شدید غصہ اور ناراضگی کے وقت بھی سخیف وا رکیک الفاظ زبان پر نہیں لاتے تھے، قہقہہ مار کر ہنسنے کے بجائے زیر لب مسکرا دینے کی عادت تھی، طبیعت میں نفاست اور پاکیزگی تھی، کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے اور عمدہ استعمال کرتے تھے، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے، اور ان کے تلقین کردہ اوراد و وظائف کے بڑے پابند تھے، آخر شب میں اٹھ جانے کا معمول تھا جس میں تخلف نہیں ہوتا تھا، رمضان المبارک میں ساری رات جاگنے کا اہتمام کرتے تھے۔

خدا بخشے بڑی خوبیاں تھیں جانے والے میں

یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم اپنے فضل و کمال اور وسیع تر علمی و دینی خدمات کے پیش نظر جس قدر دانی اور جس شہرت کے مستحق تھے وہ نہ ہو سکی۔ دعا ہے کہ خدائے رحیم و کریم اپنے رحم و کرم سے انہیں درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ اپنی خصوصی رضوان و رحمت سے ہم کنار کرے، اور زلات و تقصیرات کو حسنات میں تبدیل فرماوے دارالعلوم اور تمام مسلمانوں کی طرف سے انہیں جزائے خیر عطا کرے۔ ؎

سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

ایک ضروری نوٹ ان سطور کے لکھنے اور کاتب کے حوالہ کر دینے

کے بعد ایک گرامی قدر اور ہر اعتبار سے اپنے ایک بزرگ معاصر کا تاثراتی مضمون کل کے قومی آواز میں نظر آیا، جسے پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ موصوف کی یہ تحریر ان کی حیثیتِ عرفی کے معیار سے (گستاخی معاف) گری ہوئی ہے، موصوف نے حضرت استاذالاساتذہ مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے حادثۂ وفات پر بطور اظہار تعزیت کے یہ تاثراتی تحریر شائع کرائی ہے جس میں انہوں نے حضرت صدر صاحب مرحوم کی حیات پر بھی قدرے روشنی ڈالی ہے، چنانچہ موصوف نے دارالعلوم کی مسند صدارت کی رفعت وعظمت کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

> "مولانا معراج الحق مرحوم تقریباً دس سال سے اسی مسند پہ فائز تھے، مولانا مرحوم کا بڑے سے بڑا مداح بھی غالباً یہ یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ موصوف اس سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہونے کے باوجود علم وشہرت کے اعتبار سے انہی کے ہم پایہ تھے۔"

(قومی آواز مورخہ ۲؍ستمبر ۱۹۹۱ء)

مولانا کی یہ بات اگرچہ اپنی جگہ پر درست ہے اور صد فی صد درست ہے، لیکن کہی گئی ہے بے موقع، کیونکہ تعزیت کا موقع جانے والے کے حسنات وبرکات کے بیان کا ہوتا ہے اس کے اکابر کے ساتھ تقابل وموازنہ کا نہیں، "اذکروا محاسن موتاکم" کے ذریعہ ہمیں یہی تعلیم دی گئی ہے اس لئے یہ بات قطعی طور پہ بے موقع ہے اور حضرت مرحوم کے تلامذہ اور عقیدت مندوں کو اس سے ناگواری خلاف توقع نہیں ہے، پھر آگے چل کر معاصر موصوف نے حضرت مولانا مرحوم سے اپنے رشتۂ تلمذ، اپنے اوپر ان کی خصوصی عنایات اور اپنی

نیازمندی وحق شناسی پرجس تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس میں خودنمائی کا پہلو نمایاں ہوگیا ہے، یہ چیز بھی بے موقع ہے اور ان کی شایان شان نہیں ہے، آخر میں موصوف نے "دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ" کے سلسلے میں بھی اظہار رائے کیا ہے اور حضرت مولانا کی جانب منسوب کر کے ایسی بات کہی ہے جو سراسر خلاف واقعہ ہے، انھوں نے یہ بات ایسے وقت کہی ہے جب کہ وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں، کاش کہ معاصر موصوف ان کی حیات میں اس کا اظہار کر دیتے تو مولانا مرحوم کی طرف سے تائید یا تردید سے حقیقت کا انکشاف ہو جاتا لیکن جب وہ دنیا میں نہیں رہے تو اس کا دو ٹوک فیصلہ ممکن نہیں ہے، لیکن مولانا مرحوم کے ساتھ اپنی دس سالہ خادمانہ رفاقت کی بنیاد پر پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہنے میں مجھے قطعًا باک نہیں ہے کہ مولانا اس تبدیلی کو آخر وقت تک حق اور درست سمجھتے رہے، اگر انہیں کچھ شکایت تھی تو اس کا تعلق اس تبدیلی سے قطعًا نہیں تھا۔

موصوف نے اس مسئلے کو ایسے وقت میں چھیڑا ہے جب کہ دارالعلوم اپنے غم میں مبتلا ہے، ایسے وقت میں موصوف کا یہ طرز عمل دارالعلوم کے ساتھ نسبت تلمذ اور حق خیرخواہی کے بالکل خلاف ہے جو ان کی شایان شان نہیں ہے اور نہ ان سے اس کی توقع تھی، اس قصۂ پارینہ کو پھر سے زندہ کرنا اور ایسے وقت میں کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۹۱ء)

استاذ الاساتذہ مولانا بہاری صاحبؒ

دنیا ایک سرائے ہے جس میں مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری

ہے روزانہ لاکھوں آتے اور جاتے ہیں، اس لئے کسی کی یہاں سے رحلت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بعض بندگان خدا کچھ ایسی افادی شان اور امتیازی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کا اس سرائے فانی سے کوچ کر جانا قوم یا جماعت کے لئے واقعتاً ایک حادثہ ہے اور اس پر جس قدر بھی رنج ومحن اور کرب والم محسوس کیا جائے کم ہے، حضرت مولانا محمد حسین بہاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک ایسے ہی با فیض صاحب علم وکمال تھے جن کے فیوض وبرکات سے علمی حلقہ ۵ رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ارجنوری ۱۹۹۲ء کو ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا، مولانا مرحوم ۱۳۶۷ھ میں بحیثیت استاذ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور زندگی نے جب تک ساتھ دیا درس وافادہ میں مشغول رہے اس طرح ۴۵ سال کی طویل مدت میں ہزاروں طلبۂ علوم نے ان سے اکتساب فیض کیا۔

مولانا مرحوم تقریباً ۱۳۲۱ھ میں ضلع سیتامڑھی بہار کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے، مکتبی تعلیم کی تکمیل اپنے وطن ہی میں کی، فارسی وعربی کی تحصیل کے لئے مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ مشرقی چمپارن بہار میں داخلہ لیا، پھر یہاں سے ضلع اعظم گڈھ یوپی کی مشہور درسگاہ دارالعلوم مئو پہنچے، یہاں حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی، محدث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا کریم بخش سنبھلی جیسے ماہر ویگانۂ روزگار اساتذہ کے زیر تدریس مختصر المعانی تک پڑھا، اس کے بعد اپنے استاذ مولانا سنبھلی کی معیت میں سنبھل چلے آئے یہاں ایک سال تک پڑھ کر مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، بعد ازاں تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند آگئے، اور یہیں سے ۱۳۴۵ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ سے بخاری شریف

و ترمذی شریف اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے بقیہ کتب صحاح ستہ پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، فراغت تعلیم کے بعد مدرسہ شاہ بہلول سہارنپور سے درس و تدریس کا آغاز کیا، یہاں ایک سال تدریسی خدمت انجام دے کر مدرسہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت چلے گئے، تقریباً دو سال مدرسہ اشرفیہ میں بھی قیام رہا، اس کے بعد مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خاں دہلی کی مسندِ درس کو زینت بخشی اور مسلسل ۱۴ برس جم کر جملہ علوم و فنون کا نہایت کامیاب درس دیا، یہیں سے آپ کے اساتذہ و اکابر نے آپ کو دارالعلوم دیوبند بلالیا پھر تو آپ دارالعلوم دیوبند ہی کے ہو کر رہ گئے اور مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

یوں تو مرحوم نے ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھائیں اور نیک نامی کے ساتھ پڑھائیں، لیکن آپ کا خاص فن معقولات تھا، اس فن کی بڑی سے بڑی کتاب بے تکان پڑھاتے تھے اور حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی نوراللہ مرقدہٗ جیسے امام المعقولات کی موجودگی میں شیخ المعقولات اور علامہ بہاری جیسے توصیفی القاب سے مشہور ہو گئے تھے۔

ادھر بیس بائیس سال سے حدیث پاک کے اسباق بھی آپ سے متعلق رہے اور اس اہم ترین ذمہ داری کو بھی بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا، درس میں لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بجائے حل کتاب پر زور دیتے تھے، اور دقیق سے دقیق مسائل کو نہایت آسان پیرائے میں سمجھا دیا کرتے تھے، دوران درس طلبہ کی تنشیط اذہان کی غرض سے موقع و محل کے مناسب بعض چٹکلے بھی بیان کر دیا کرتے تھے، حضرت مولانا کی حیثیت اس وقت دارالعلوم میں استاذ الاساتذہ کی تھی، موجودہ اساتذۂ دارالعلوم میں

چند حضرات کے علاوہ تقریباً سبھی کے استاذ تھے اور طلبہ کے علاوہ حضرات اساتذہ بھی آپ سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ تواضع و انکساری کا یہ عالم تھا کہ اپنے لئے کسی امتیاز کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ طلبہ و اساتذہ کے ساتھ اس طرح گھلے ملے رہتے تھے جیسے ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے ساتھ خلاملا رکھتا ہے، تصنع اور بناوٹ کا ان کے یہاں قطعی گذر نہیں تھا، بات چیت، وضع قطع، رہن سہن ہر ایک چیز میں سادگی و بے تکلفی پسندیدہ تھی، چھوٹے بڑے ہر ایک ساتھ شفقت و محبت اور حسن اخلاق سے پیش آتے تھے، اگر کسی عقیدت مند نے کھانے پینے کی کوئی چیز بطور ہدیہ کے کمرے میں بھیجدی تو بہت خوش ہوتے تھے اور جی بھر کے دعائیں دیتے تھے، پھر ملاقات پر شکریہ بھی ادا کرتے تھے اور دیگر احباب سے اس کا ذکر خیر بھی کرتے تھے، مولانا مرحوم کی یہی بے لوث و مخلصانہ ادائیں تھیں جن سے ان کی شخصیت بڑی پرکشش، دلکش اور محبوب عام و خاص ہو گئی تھی اور جس محفل میں ہوتے جان محفل بنے رہتے تھے۔

نماز باجماعت کی پابندی اور وہ بھی صف اولیٰ کی رعایت کے ساتھ مولانا مرحوم کی عادت ثانیہ بن گئی تھی جس میں اس وقت اپنی نظیر آپ تھے، جب تک پیروں میں اتنی سکت رہی کہ سہارے کے ساتھ مسجد پہنچ جائیں جماعت کو چھوڑنا گوارا نہیں ہوا کسی نہ کسی طرح ایک دو کے سہارے مسجد میں پہنچتے رہے، لیکن جب مرض لقوہ کی وجہ سے بالکل صاحب فراش ہو گئے تو مجبوراً کمرے ہی میں جماعت کر لیا کرتے تھے، ۴م رجمادی الثانی کو نماز مغرب کے لئے کھڑے ہونا چاہتے تھے کہ کمزوری کی وجہ سے گر گئے جس کے صدمے سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔

اللّٰھم ارحمہ وادخلہ فی عبادک الصالحین۔

حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز رائے پوری

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے مفتی و ناظم اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز رائے پوری ایک طویل علالت کے بعد ۱۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ ۲۰؍ دسمبر ۱۹۹۱ء یوم جمعہ کو اپنے سیکڑوں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم مغربی یوپی کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے، فقہ حنفی پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے، فتویٰ نویسی میں خاص مہارت رکھتے تھے، آپ کے فتاوے بڑے معتدل و متوازن اور عام فہم ہوتے تھے۔ واقعات حاضرہ اور مسائل جدیدہ سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے، صبر و تحمل، ضبط نفس، اعتدال پسندی اور خوش اخلاقی میں اپنے معاصر علماء میں امتیازی شان کے مالک تھے، دارالعلوم دیوبند کی تعمیر و ترقی میں بڑی فراخ حوصلگی اور تندہی کے ساتھ کوشاں رہتے تھے، جب تک صحت نے ساتھ دیا التزام کے ساتھ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے، مفتی صاحب مرحوم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے خاص متوسلین میں تھے اور حضرت رائے پوری کی طرح قیام مکاتب اور تعمیر مساجد سے خصوصی شغف رکھتے تھے، علاوہ ازیں دیگر دینی و سماجی کاموں میں بھی پوری دلچسپی لیتے تھے، مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لئے بھی بڑی تگ و دو فرماتے تھے آپ کی دینی و سماجی خدمات کے اصل مرکز ہریانہ و ہماچل پردیش کی مسلم نو آبادیات تھیں، جہاں آپ کے قائم کردہ بہت سے مکاتب مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف کار ہیں۔

حضرت مفتی صاحب بڑے وجیہ شکیل اور صحت مند قوی الجثہ تھے لیکن ادھر چند سالوں سے مسلسل مختلف انواع امراض کے شکار رہے اور جسم گھل کر بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا، علاج و معالجہ کی ساری تدبیروں پر فیصلہ خداوندی غالب آیا اور آپ اپنے حقیقی مالک سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ

۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ ۳ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو آٹھ بجے شب میں پاکستان میں بزم اشرف کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا یعنی شیخ طریقت، مرجع علماء حضرت فقیر محمد صاحب خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہما اپنے ہزاروں مریدین و عقیدت مندوں کو روتا چھوڑ کر اپنی اصلی منزل کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں مہمند میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم چارسدہ میں حاصل کی پھر مدرسہ نعمانیہ امرتسر میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن علیہ الرحمہ کی خصوصی توجہات کے زیر سایہ علوم و فنون متداولہ کی تکمیل کی اور حضرت مفتی صاحب ہی کے ایماء پر اور مشورے سے حضرت تھانوی قدس سرہ سے بیعت کی اور اپنے اخلاص و حسن نیت کی بدولت جلد ہی سلوک کی راہیں طے کر کے خلافت سے سرفراز ہوگئے، حضرت تھانویؒ کو مولانا مرحوم پر بڑا اعتماد تھا جس وقت یہ مجلس میں حاضر ہوتے تو حضرت تھانویؒ فرماتے کہ ہماری مجلس کی رونق آگئے۔ کثرت گریہ کی وجہ سے حضرت تھانویؒ نے بکّار کے لقب سے انہیں ممتاز فرمایا تھا، پاکستان کے بڑے بڑے علماء مثلاً مولانا ایوب جان

بنوری ، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا سلیم اللہ خان، مولانا قاری سعید الرحمٰن وغیرہ آپ سے منسلک تھے۔

(ماہنامہ دارالعلوم فروری ۱۹۹۲ء)

حادثۂ جانکاہ

اخلائی وان شط الحبیب وداره وعزتلاقیه و ناءت منازله
وان فاتکم ان تبصروه بعینکم فما فاتکم منه فهذا شمائله

پچھلے مہینے رأس المحدثین، مرجع العلماء حضرت امیر الہند مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن اعظمی کی خبر وفات تمام علمی و دینی حلقوں پر ایک صاعقہ بن کر گری حضرت موصوف ایک عرصہ سے مختلف عوارض میں مبتلا تھے اور مورخہ ۱۱؍ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ م ۱۷؍ مارچ ۱۹۹۲ء سہ شنبہ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت محدث اعظمی نہ صرف علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، عقائد، احسان و سلوک کے بحر ذخار تھے، بلکہ علوم آلیہ، صرف و نحو، ادب و بلاغت، سیر و تاریخ منطق و فلسفہ اور علم الاسرار میں بھی نابغۂ روزگار تھے، اور زہد و ورع، قناعت و استغناء، صبر و استقلال، اناۃ و وقار میں سلف صالحین کی یادگار تھے، فطری ذہانت و ذکاوت، اخاذ طبیعت، دقیقہ شناسی، نکتہ رسی، سرعت فہم، حیرت افزا استحضار اور غیر معمولی قوت حافظہ نے آپ کے وجود کو مجسمہ علم اور ذہن کو ایک کتب خانہ بنا دیا تھا، کتابیں ہی آپ کی جلیس و رفیق اور زندگی کی ساتھی تھیں، دنیا کے سارے جھمیلوں سے دست کش ہوکر ہمہ وقت علمی تحقیقات و اکتشافات میں مستغرق رہتے، کتابوں کا ایسا شیدائی اس زمانہ

میں تلاش وجستجو کے باوجود بھی نہیں مل سکتا، ایسے جلیل القدر اور علوم کتاب وسنت کے عاشق کی وفات بلا ریب ایک ایسا علمی سانحہ وملی حادثہ ہے جس پر اظہار کرب والم کے لئے الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں، یہ صرف حضرت موصوف کے ابناء واعزہ کا نہیں، تنہا مئو اور اعظم گڈھ کا نہیں، جماعت دیوبند اور برصغیر کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے جس سے "موت العالِم موت العالَم"، جیسے مقولہ کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سوانحی نقوش

ولادت اور تعلیم وتربیت

۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور علمی وصنعتی قصبہ مئو ناتھ بھنجن میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام "اختر حسن" ہے والد ماجد کا اسم گرامی مولوی محمد صابر بن عنایت اللہ ہے، مولوی محمد صابر صاحب مرحوم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے اور نہایت عابد وزاہد اور خوش اخلاق و زندہ اوقات انسان تھے، کثرت تلاوت قرآن اور سلام میں پہل کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، تقریباً ۳۶ سال تک محض رضائے الٰہی کے لئے محلہ کی مسجد میں بچوں کو قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے۔

علم دین کے اس سعادت خیز ماحول میں آپ کی نشوونما اور ساخت و پرداخت ہوئی قرآن عظیم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں والد بزرگوار ہی سے پڑھیں، اس کے بعد اپنے خسر مولانا عبدالرحمٰن مئوی کے پاس فارسی کی دیگر بڑی کتابوں کی تعلیم حاصل کی، عربی تعلیم کی ابتدا مولوی عبدالعزیز مئوی سے کی اور اسی کے ساتھ تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پیلی بھیتی سے پڑھا اور

زبانی یاد کر کے سنایا، صرف و نحو کی اکثر کتابیں ضلع کے مشہور عالم دین اور با فیض استاذ مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں رہ کر پڑھیں اور ادب کی دو ایک کتابوں کے بعض حصے مولانا محمد صابر صاحب ساکن محلہ بلاتی پور مئو سے پڑھا۔ ادب، بلاغۃ، فقہ، اصول فقہ اور حدیث میں مشکوۃ شریف اور ترمذی نصف اول کی تحصیل استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالغفار تلمیذ رشید حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی سے کی اور انہیں کی زیر تربیت مظہر العلوم بنارس سے ۱۳۳۶ھ م ۱۹۱۸ء میں "ملّا" الٰہ آباد بورڈ اور دوسرے سال "فاضل" کا امتحان اعلیٰ کامیابی سے پاس کیا، اس زمانہ میں ان امتحانات کی بڑی اہمیت تھی اور ہر کس و ناکس ان میں بیٹھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

حضرت مولانا اعظمیؒ کی دینی نشو و نما اور علمی ساخت و پرداخت میں علی الترتیب ان کے دلی صفت والد مولوی محمد صابر صاحب اور یگانۂ عصر استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ مرکزی حیثیت رکھتے تھے اول الذکر پاک نفس بزرگ نے آپ کے مزاج میں دین کی عظمت و محبت اور حمیت و صلابت پیدا کی، بچپن کا یہ دینی انصباغ زندگی بھر آپ کی ذات میں نمایاں رہا، اور ثانی الذکر علمی مربی نے آپ کے اندر تحصیل علم کی ایسی چاہت و محبت بھر دی کہ آپ کی شخصیت زندگی برائے علم کا نمونہ کامل بن گئی۔

علم و فن کی تحصیل و تکمیل کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۷ء میں آپ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور داخلہ کا امتحان دیا تو اس میں امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، حضرت مہتمم صاحب کو اس غیر معمولی کامیابی پر استعجاب ہوا اور اطمینان خاطر کے لئے دوبارہ حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی کے پاس امتحان بھیج دیا مولانا موصوف امتحان میں بہت سخت گیر تھے طلبہ عام طور پر ان کے پاس امتحان

سے گھبراتے تھے حضرت شیخ الادب نے دیوان متنبی اور حماسہ کا دوبارہ امتحان لیا جس میں آپ کو پہلی بار سے بھی زیادہ نمبرات ملے، امتحان داخلہ اور دیگر ضروری کارروائیوں سے گذر کر مولانا نبیہ حسن صاحب سے ہیئت، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سے جلالین اور حضرت مولانا رسول خاں سرحدی سے بیضاوی سورۂ بقرہ کے اسباق شروع کر دیئے کہ اوائل ماہِ صفر میں دارالعلوم کے اندر فصلی بخار پھیل گیا جس میں مولانا موصوف بھی مبتلا ہو گئے اور مرض نے اس درجہ شدت اختیار کر لی کہ وہاں قیام مشکل ہو گیا ناچار آخر صفر میں گھر واپس لوٹ آئے، پھر دوسرے سال دوبارہ دیوبند کا قصد کیا اور دورۂ حدیث میں داخل ہو کر محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری سے ترمذی جلد اول، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے مسلم شریف حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی سے ابو داؤد اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے بقیہ کتب صحاح ستہ کی تعلیم و تحصیل میں منہمک ہو گئے، مگر اس دفعہ بھی سال پورا ہونے سے پہلے ہی ماہ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں بیمار پڑ گئے اور رخصت لے کر وطن واپس آگئے۔ صحت یابی کے بعد دارالعلوم مئو میں حضرت شیخ الہند کے مشہور تلمیذ اور نامور صاحب درس عالم حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے (جو اس وقت وہاں کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے) صحاح ستہ کی تکمیل کر کے سند فراغت و اجازت لی۔

حضرت مولانا سنبھلی اور حضرت علامہ کشمیری کے علاوہ آپ کو حضرت مولانا عبدالغفار مئوی اور مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی سے بھی احادیث وغیرہ کی سند و اجازت حاصل تھی۔

مولانا سنبھلی ہی سے معقولات کی باقی ماندہ کتابیں صدرا، شمس بازغہ، حمد اللہ، قاضی مبارک، توضیح تلویح اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں، دوران تعلیم

ہی طلبہ کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔

درس و افادہ

فراغت کے بعد دارالعلوم مئو ہی میں باقاعدہ درجہ علیا کے استاذ مقرر ہو گئے، تقریباً دو برس یہاں تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۳۴۳ھ میں بحیثیت صدر المدرسین مظہر العلوم بنارس چلے گئے مظہر العلوم ہی کے زمانۂ تدریس میں آپ کے استاذ مولانا ابو الحسن مئوی نے اپنے مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں خدمت تدریس کی پیش کش کی استاذ محترم کی اس خواہش کو آپ رد نہیں کر سکے اور مظہر العلوم بنارس سے منتقل ہو کر ۱۳۴۹ھ میں مفتاح العلوم مئو آ گئے اور اپنی علمی سرگرمیوں کے ذریعہ اس کے اندر ایک نئی جان ڈال دی، بالفاظ دگر مدرسہ مفتاح العلوم کی از سر نو نشأۃ ثانیہ فرمائی اور اسے ایک قصباتی مدرسہ سے بلند کر کے بین الملکی جامعہ بنا دیا۔ ۱۳۶۹ھ تک مسلسل جامعہ مفتاح العلوم میں بحیثیت شیخ الجامعہ صدر المدرسین یا مہتمم کے حدیث و تفسیر اور فقہ و ادب کا درس دیتے رہے اس مدت میں سیکڑوں تشنہ کام علم و فن آپ کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہوئے اور بخاری و ترمذی وغیرہ پڑھ کر سند اجازت و فراغت حاصل کی۔

تعلیم و تدریس کا یہ زریں سلسلہ مزید آگے نہ بڑھ سکا، ۱۳۶۹ھ میں اپنے تصنیفی و تحقیقی کاموں بالخصوص مصنف عبد الرزاق کی تصحیح و تعلیق میں مصروفیت کی بنا پر مفتاح العلوم کی خدمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

حرمین شریفین اور دیگر بلاد اسلامیہ کا علمی سفر

۱۳۶۹ھ ہی میں پہلی بار حج و زیارت کی دولت بے پایاں سے مالا مال ہوئے پھر دو سال بعد دوبارہ اس سعادت عظمیٰ سے ہم کنار ہوئے، اس طرح تقریباً چھ سات بار حرمین شریفین

کی حاضری سے بہرہ مند ہوئے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ زادہما اللہ شرفا وتعظیما کے علاوہ آپ نے بیروت، حلب، دمشق، صیدا، بعلبک، لاذقیہ، جبلہ، بحرین، مصر وغیرہ بلاد اسلامیہ کے خالص علمی اسفار بھی کئے جن میں آپ نے جی بھر کے استفادہ وافادہ کیا۔

ان رحلات میں بلاد عرب وشام کی بہت سی مشہور علمی شخصیتوں سے تعارف اور علمی روابط قائم ہوئے اور ایک کثیر جماعت نے آپ سے حدیث پاک کی سند واجازت حاصل کی، ان میں سے چند مشاہیر علماء کے اسماء یہ ہیں۔ (۱) الامام الشیخ عبدالحلیم محمود شیخ الازہر (۲) الشیخ بہجۃ البیطار (۳) الشیخ عبداللہ سراج الحلبی (۴) الشیخ نورالدین عتر (۵) الشیخ المحقق عبدالفتاح ابوغدہ (۶) الشیخ عبدالعزیز ابن باز (۷) الشیخ محمد امین الکتبی شیخ الحرم المکی (۸) الشیخ محمد المغربی المکی (۹) الشیخ علوی المالکی (۱۰) الشیخ حسن مشاط (۱۱) الشیخ حسنین مخلوف (۱۲) الشیخ عبدالرحمٰن الیمانی مدیر مکتبۃ الحرم (۱۳) العلامہ خیرالدین الزرکلی (۱۴) الاستاذ سعید الافغانی (۱۵) الشیخ ناصرالدین البانی (۱۶) الشیخ محمد علی الحرکان (۱۷) الشیخ سلیمان الضیبع (۱۸) الشیخ ابوالیسر عابدین (۱۹) الشیخ عبدالعزیز ابوعیون السود (۲۰) الشیخ مصطفیٰ الزرقار (۲۱) المفتی الاکبر الشیخ محمد امین الحسینی (۲۲) مفتی الجمہوریۃ اللبنانیۃ الشیخ حسن خالد (۲۳) الشیخ اسماعیل الانصاری (۲۴) الدکتور صلاح الدین المنجد (۲۵) الشیخ حمد الجاسر (۲۶) الشیخ عبداللہ العقیل (۲۷) الشیخ عبدالبدیع صقر (۲۸) الاستاذ زہیر الشاویش (۲۹) الشیخ محمد عوامہ (۳۰) الدکتور بشار عواد وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند سے صدارت افتاء اور صدارت تدریس کی دعوت

۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی

وتعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مئو آکر بیک زبان صدارت افتار کا اہم ترین منصب پیش کیا، مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے، پھر چند برسوں کے بعد اصحاب شوریٰ کی جانب سے صدارت تدریس کی عظیم پیش کش کی گئی مگر اپنے تصنیفی مشاغل کی بنار پر آپ نے عذر معقول فرمادیا۔

یوپی اسمبلی کی رکنیت اور ندوہ میں درس بخاری

۱۳۷۱ھ م ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے آپ کو اسمبلی کے لئے اپنا امیدوار بنایا جسے اپنے مزاج وافتاد طبع کے خلاف احباب واکابر کی خواہش کے احترام میں قبول کرلیا مگر اپنے حلقہ انتخاب میں ایک دن کے لئے بھی نہیں گئے، اس کے باوجود بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور پانچ سال تک اسمبلی کے رکن رہے، اس زمانہ میں اگرچہ اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی اور ملک کا اعلیٰ وسنجیدہ طبقہ ہی اس تک رسائی کا حوصلہ کرتا تھا بایں ہمہ حضرت محدث عصر کے علمی مزاج کو اس سے کوئی مناسبت اور ہم آہنگی نہیں تھی اس لئے لکھنؤ میں آپ کا اکثر وقت سیاسی سرگرمیوں کے بجائے ندوہ کے کتب خانہ میں مطالعۂ کتب میں گذرتا، اسی زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ناظم اعلیٰ ندوۃ العلمار کی شدید خواہش اور پیہم اصرار پر ندوہ میں بخاری شریف کا درس شروع کردیا جس کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا، اسی کے ساتھ دارالمبلغین لکھنؤ میں بھی درس وافادہ کی مجلس قائم کررکھی تھی، اسمبلی کی پانچ سالہ مدت پوری ہوتے ہی گھر پر اپنے اصلی مشغلہ تصنیف وتحقیق میں مشغول ہوگئے اور دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا۔

دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت

۱۳۷۳ھ م ۱۹۵۳ء میں مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن منتخب ہوئے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس وقیع منصب پر فائز رہے، مجلس میں آپ کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور لمبا اوقات آپ ہی کی زیر صدارت مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوتا، حضرت مولانا عبدالحی چشتی خلیفہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی تجویز پر مجلس شوریٰ میں یہ طے ہو گیا تھا، ہر وہ تجویز جس کا تعلق انتظام وانصرام کے بجائے دین وشریعت اور فقہی احکام سے ہو، اس کی تصدیق وتصویب جب تک محدث اعظمی نہ فرمادیں نافذ العمل نہیں ہوگی، اسی سال مذکور ہی میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے اور تاحیات اس پر قائم رہے اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسوں اور کانفرنسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور اپنے مفید مشوروں سے ملک وملت کی خدمت انجام دیتے رہے۔

دوبارہ جامعہ مفتاح العلوم کی مسند اہتمام وصدارت تدریس پر

ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ جنوری ۱۹۷۳ء میں جب آپ کے رفیق خاص اور دیرینہ ساتھی مولانا عبداللطیف نعمانی مہتمم وشیخ الجامعہ مفتاح العلوم مئو کا انتقال ہو گیا اور جامعہ مفتاح العلوم میں کوئی ایسی بھاری بھرکم شخصیت موجود نہیں تھی جو اس کی نیک نامی اور شہرت ومقبولیت کو برقرار رکھتے ہوئے کار اہتمام وصدارت تدریس کی خدمات انجام دے سکے، تو جامعہ کے اصحاب حل وعقد نے طے کیا کہ حضرت محدث اعظمی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کی علمی وانتظامی ذمہ داریوں کو قبول فرمالیں چونکہ اس گلشن علم وآگہی کی آبیاری اور اسے پروان چڑھانے میں موصوف نے

اپنی جوانی کے قیمتی شب وروز اور زریں اوقات نذر کئے تھے، بھلا اسے بے یار ومددگار کس طرح چھوڑ سکتے تھے، اس لئے پیرانہ سالی اور اپنی دیگر علمی ودینی مصروفیات کے باوجود جامعہ کے ارباب بست وکشاد کی اس درخواست کو رد نہ کر سکے، اور دوبارہ مفتاح العلوم کے اہتمام اور صدارت تدریس کی خدمت قبول کر لی اور کئی سال تک جامعہ کی تعلیمی وانتظامی خدمت انجام دی مگر بچند وجوہ یہ سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا اور آپ جامعہ مفتاح العلوم کی خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

المعہد العالی اور مرقاۃ العلوم کی تاسیس

حضرت محدث اعظمی کو عرصہ سے اس کا شدت سے احساس تھا کہ دن بہ دن طلبہ کی استعداد کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی ہے مدارس اسلامیہ کے فضلاء میں بالعموم مطلوبہ صلاحیتیں ناپید ہوتی جارہی ہیں اور اگر بعض میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے تو علمی تربیت نہ ہونے کی بنا پر وہ صحیح طریقہ سے اس صلاحیت سے کام نہیں لے پاتے، جامعہ مفتاح العلوم کی دوبارہ خدمات نے حضرت موصوف کے اس احساس کو مزید پختہ بنادیا، اس لئے آپ نے فیصلہ کیا کہ مدارس کے فضلاء کی تربیت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے چنانچہ ۱۴۰۰ھ م ۱۹۸۰ء میں مئو میں المعہد العالی کے نام سے ایک تربیتی ادارہ کی بنیاد رکھی، پھر چند سالوں کے بعد ٹھوس ابتدائی تعلیم کے لئے مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک اور مدرسہ قائم فرمایا، ان دونوں اداروں کی تعمیر وترقی سے آپ کو اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کے سارے انتظامی اور تعلیمی کاموں کی خود نگرانی فرماتے تھے، اور پیرانہ سالی وکثرت عوارض کے باوجود منتہی طلبہ کو متعدد کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، مدارس کے بارے میں آپ کا ہمیشہ سے یہ

نظریہ رہا ہے کہ وہ محض رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کے لئے ہونے چاہئیں ان میں دنیوی اغراض وخواہشات کی آمیزش تک نہ ہو، موصوف اس ادارہ کو اسی نہج پہ چلا رہے تھے۔

صدارتی ایوارڈ

حضرت محدث عصر کی طویل علمی وتحقیقی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ۱۴۰۵ھ م ۱۹۸۴ء میں انہیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ اور اعزازی انعام عطا کیا تھا جس کے واقعی طور پہ وہ مستحق تھے۔

امارت شرعیہ ہند کا قیام اور امیر الہند کا انتخاب

دین اسلام کیا ہے؟ یہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور مسلمانوں کی اجتماعی مرکزیت پہ مشتمل ایک مکمل نظام حیات ہے، اس میں انتشار، فضویت اور پراگندگی کی کوئی گنجائش نہیں، اسی بنا پر جمعیۃ علماء ہند ۱۳۳۹ھ م ۱۹۲۰ء سے مسلسل اسلامی شرعی امارت کی ضرورت پر زور دے کر اس کے لئے راستہ ہموار کرتی رہی تا کہ اس ملک میں غیر مسلم اقتدار کے ماتحت رہتے ہوئے بھی منظم طور پر اسلامی احکام پہ پورا پورا عمل کیا جاسکے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے جمعیۃ علماء کی یہ ۶۶ سالہ جدوجہد بارآور ہوئی اور اس کی دعوت پہ ۲۸ر صفر ۱۴۰۷ھ م ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو مدنی ہال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں ملک کے چودہ صوبوں دلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، کیرالہ گجرات، اڑیسہ، مہاراشٹر، راجستھان، ہریانہ، کرناٹک، آسام، مغربی بنگال، آندھرا کے تین ہزار سے زائد نمائندے اور ارباب حل وعقد جمع ہوئے جن میں علماء دین، مفتیان عظام، مصنفین، محققین، عصری اداروں کے لکچرر اور پروفیسر، اسمبلی وپارلیمنٹ کے ممبران، وکلاء، تجار، ڈاکٹر غرضیکہ ہر طبقہ کے اصحاب رائے

شامل تھے، ارباب حل وعقد کے اس عظیم اجتماع نے حضرت مولانا سید اسعد مدنی کی تجویز پر لبیک کہتے ہوئے امیر الہند کے منصب عظیم کے لیے باتفاق حضرت محدث کبیر صاحب کا انتخاب کیا، چونکہ اپنی علالت کی وجہ سے حضرت موصوف اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس لیے ان کی جانب سے حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے شرکائے اجلاس سے سمع و طاعت کی بیعت لی اس طرح شرعی معیار کے مطابق کل ہند سطح پر امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے اولین امیر شریعت حضرت موصوف قرار پائے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علمی کمالات اور خدمات

علمی مقام و مرتبہ حضرت محدث عصر اس برصغیر ہی میں نہیں پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی و تحقیقی کارناموں کی وجہ سے مشہور و مقبول تھے، وہ اعلیٰ درجہ کے مدرس، بلند پایہ مصنف متبحر عالم اور نادرۂ روزگار محدث تھے، تفقہ فی الحدیث اور فقہ حنفی کی تائید و نصرت جو علمائے دیوبند کے درس کی امتیازی خصوصیت تھی، اسی کے ساتھ رجال طبقات رواۃ، علل حدیث، اور طرق حدیث کی تحقیق میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، وہ اپنے اس کمال میں ہندوستان ہی نہیں عرب ملکوں میں بھی بے نظیر تھے، عصر حاضر کے کبار علمائے حدیث آپ کی معلومات اور تحقیقات پر مکمل اعتماد کرتے تھے، چنانچہ مصر کے محقق عالم حدیث علامہ احمد محمد شاکر کی مسند امام احمد بن حنبل کی تحقیق و تعلیق پر آپ کے استدراکات و تعقیبات کو نہ صرف دوسرے محققین نے

بنظر استحسان دیکھا بلکہ خود علامہ احمد محمد شاکر نے پورے تشکر و امتنان کے ساتھ انہیں قبول کیا اور مسند کی پندرہویں جلد میں ان کو بعینہ نقل بھی کر دیا۔ اس سلسلے میں علامہ احمد محمد شاکر نے حضرت محدث اعظمی کو جو مکتوب لکھا تھا اس کے اقتباسات یہاں نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

حضرة الاخ العلامة الکبیر المحقق الاستاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی..... جاء فی کتابکم الاول النفیس...... اما استدراکاتکم فکلها نفیسة عالیة ولا اقول هذا مجاملة......
واشکرکم خالص الشکر علی هذه العنایة الجیدة وارجو ان تزیدو من اشاراتکم وارشاداتکم خدمة للسنة النبویة المطهرة وانتم کما رأیت من عملکم من اعظم العلماء بها فی هذا العصر فالحمد للّٰه علی توفیقکم۔

کتبه المخلص: احمد محمد شاکر

اس مکتوب کے لفظ لفظ سے حضرت محدث اعظمی کی علم حدیث میں عظمت شان اور جلالت قدر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عصر حاضر کے جید عالم اور محقق فقیہ علامہ ابوالوفا افغانی کے تأثرات بھی ملاحظہ کرتے چلئے جسے انہوں نے "کتاب الزہد والرقائق" کی تقریظ میں قلم بند کیا ہے، علامہ افغانی لکھتے ہیں:

فقد اطلعت علی کتاب الزهد للامام ابن المبارک رحمه اللّٰه الذی رتب اصوله وصححها وعلق علیه العلامة اللبیب الحبیب مولانا الشیخ حبیب الرحمٰن

الاعظمی لازال ناصرالسنة ...... فوجدته ماهرا للعلوم حاویا بها امینا لروایاته حل فی تعلیقه مشکلات الکتاب واخرج احادیثه وآثاره وقدمه بمقدمة ثمینة مفیدة تدل علیٰ سعة اطلاعه و طول باعه قل له نظیر فی علماء زماننا.

(کتاب الزہد والرقاق ص...)

اس تحریر میں بھی اس بات کا اعتراف ملتا ہے کہ حضرت محدث اعظمی علوم حدیث میں ماہر اور وسعتِ معلومات میں اپنی نظیر آپ تھے۔

تعلیقات وتصنیفات

حضرت محدث اعظمی کو خدائے علیم وخبیر نے تحریر و تصنیف کا نہایت عمدہ ذوق وسلیقہ عطا فرمایا تھا جس سے وہ زندگی بھر کام بھی لیتے رہے اور اس صدی میں آپ نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں جو مہتم بالشان اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں بلاریب وہ آپ کا ایک تجدیدی کارنامہ ہے جس میں ان کا کوئی سہیم ونظیر نہیں ہے، حضرت محدث اعظمی نے جن کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے ان پر عالمانہ مقدمے بھی تحریر کئے ہیں جن میں مصنف کے حالات وکمالات، ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ، زیر اشاعت کتاب کی افادیت واہمیت اور ان کے مخطوطات کی نشاندہی فرمائی ہے، حواشی اور تعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق واختلاف، متن میں درج آیات واحادیث کی تخریج، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ کی تشریح، دیگر مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کرکے ان کی خطا وصحت کا فیصلہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ امور ایسے ہیں جنہیں وہی انجام دے سکتا ہے جس کی متون

وشروح حدیث پر پوری نظر ہو، علوم روایت کے تمام انواع اور علم درایت کے تمام مقاصد و مدارک سے کامل واقفیت رکھتا ہو اور طبقات رواۃ و طرق حدیث کی تحقیق میں اسے مہارت حاصل ہو۔

ذیل میں ان نادر کتابوں کی فہرست ملاحظہ کیجئے جنہیں موصوف نے تصحیح و تعلیق اور مفید حواشی سے آراستہ کر کے شائع کرایا جس سے اس فن میں ان کی عبقریت اور مجتہدانہ مہارت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) انتقاء الترغیب والترھیب للحافظ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ ناشر ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۰ء۔

(۲) مسند الحمیدی (دو جلدوں میں) یہ امام بخاری کے استاذ امام ابو بکر عبد اللہ بن الزبیر قریشی اسدی، حمیدی، المتوفی ۲۱۹ھ کی تالیف ہے اب تک غیر مطبوعہ تھی، حیدر آباد سے ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

(۳) کتاب الزھد والرقائق للامام عبد اللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ یہ کتاب بھی مخطوطہ ہونے کی وجہ سے علماء کی دسترس سے باہر تھی حتی کہ علامہ سید سلیمان ندوی جیسے کثیر المطالعہ اور محقق عالم کو بھی اس کتاب تک اپنی نارسائی کا اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "قدماء میں صرف ایک بزرگ امام عبد اللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے جنہوں نے کتاب الزہد والرقائق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے مگر یہ ہیچمداں اس کی زیارت سے محروم رہا ہے اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا۔"
>
> (معارف ۱۹۴۴ء)

محدث اعظمی کے غواصی کی داد دیجئے کہ علوم حدیث کے بحر بیکراں سے اس موتی کو برآمد کرلیا اور اسے اپنے تعلیقات وحواشی سے مزید آبدار کرکے اہل علم وتحقیق تک پہونچا دیا جو آج ان کے کتب خانوں کے لئے باعث زینت ہے، یہ نادر مخطوطہ ادارہ احیار المعارف مالیگاؤں سے ۱۳۸۵ھ م ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔

(۴) سنن سعید بن منصور (دو جلدوں میں) یہ شیخ ابوعثمان سعید بن منصور مروزی متوفی ۲۲۹ھ کی تصنیف ہے جس میں ثلاثیات بہت ہیں، یہ بھی مالیگاؤں سے ۱۳۸۹ھ میں شائع ہوئی ہے۔

(۵) المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ للحافظ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ (چار جلدوں میں) وزارۃ الاوقاف کویت نے ۱۳۹۰ھ میں شائع کی۔

(۶) المصنف لعبد الرزاق۔ امام عبدالرزاق بن ہمام بن نافع (استاذ امام احمد بن حنبل) المتوفی ۲۱۱ھ کی تصنیف ہے جس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں یہ کتاب احادیث وآثار کا ایک دائرۃ المعارف ہے، ۱۱ر جلدوں میں دارالقلم بیروت سے ۱۳۹۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

(۷) تلخیص خواتم جامع الاصول للمحدث محمد بن طاہر پٹنی المتوفی ۹۸۶ھ احیار المعارف مالیگاؤں سے ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی۔

(۸) کشف الاستار عن زوائد مسند بزار للہیثمی کو چار جلدوں میں ۱۳۹۹ھ میں دمشق کے ایک ادارہ نے شائع کیا۔

(۹) المصنف لابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ اس کی تین جلدیں مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوچکی ہیں بقیہ زیر طبع ہیں۔

(۱۰) تحقیق حیاۃ الصحابۃ للشیخ محمد یوسف الکاندھلوی۔

(۱۱) تصحیح وتعلیق تکمیل الاذھان للشیخ المحدث الشاہ رفیع الدین الدہلوی المتوفی ۱۲۳۳ھ غیر مطبوعہ جس کا ایک نسخہ مجلس علمی کراچی میں ہے

(۱۲) کتاب الثقات لابن شاھین غیر مطبوعہ۔

مؤلفات کی فہرست

(۱) الحاوی لرجال الطحاوی عربی غیر مطبوعہ جس میں معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں کتابوں کے رجال پر بحث کی گئی ہے، یہ ایک عمل مبتکر اور نیا کام ہے کیونکہ اب تک کسی محدث نے مشکل الآثار کے رجال پہ کام نہیں کیا ہے، حضرت محدث کشمیری نے اس کتاب کے مسودہ کو دیکھ کر مولانا اعظمی کی کثرت معلومات کی تعریف فرمائی تھی۔

(۲) الاتحاف السنیۃ بذکر محدثی الحنفیۃ، عربی غیر مطبوعہ۔

(۳) استدراکات علی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی للشیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری۔

(۴) نصرت الحدیث اردو منکرین حدیث کی تردید میں بے نظیر کتاب ہے، حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کتاب پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

(۵) اعیان الحجاج دو جلدیں، موضوع نام سے ظاہر ہے، مولانا ابوالحسن علی میاں نے اس تالیف کو علمی و دینی قرار دیا ہے۔

(۶) رکعات تراویح۔

(۷) رکعات التراویح برد انوار المصابیح } یہ دونوں کتابیں ہندوستانی غیر مقلدین کے جواب میں تراویح کی رکعتوں سے متعلق ہیں اور اپنے باب میں بہت خوب ہیں۔

(۸) اعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعه۔

(۹) ازھار المرفوعه فی رد الآثار المتبوعه۔ دو جلدوں میں، یہ دونوں کتابیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مجلس کی تین طلاقوں سے متعلق ہیں اور ہندوستانی غیر مقلدین کے رد میں ہیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو اجماع امت کے برخلاف ایک مانتے ہیں۔

(۱۰) شارع حقیقی۔ یہ فرقہ بریلوی کی تردید میں ہے اور اپنے موضوع پر نہایت گراں قدر ہے۔

(۱۱) تحقیق اهل حدیث۔ یہ کتاب بھی غیر مقلدین کے رد میں ہے جو اپنے کو اہل حدیث کہلاتے ہیں۔

(۱۲) النذر لاولیاء اللّٰه۔ اہل بدعت کی رد میں ہے۔

(۱۳) ارشاد الثقلین۔ فرقہ رافضیہ کی تردید میں ہے۔

(۱۴) ابطال عزاداری۔ یہ بھی فرقہ رافضیہ کی تردید میں ہے۔

(۱۵) تعزیہ داری سنی نقطۂ نظر سے۔

(۱۶) رفع المجادله فی آیات المباهله۔

(۱۷) التنقید علی التفسیر الجدید۔ خواجہ عبدالحی مرحوم کی تفسیر پر علمی پیرایہ میں گرفت کی گئی ہے۔

(۱۸) اہل دل کی دل آویز باتیں۔

(۱۹) رہبر حجاج۔

(۲۰) رد تحقیق الکلام، غیر مطبوعہ۔

آپ کی علمی خدمات میں ایک خدمت یہ بھی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ پر حافظ قاسم بن قطلوبغا نے جو استدراک تحریر

کیا ہے اس کا نصف آخر جو آپ کو دستیاب ہو گیا تھا علامہ زاہد کوثری کے
پاس مصر بھیج کر منیۃ الالمعی کے ساتھ شائع کرایا جس کے لئے علامہ
زاہد کوثری نے منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں بہت زیادہ اظہار تشکر و امتنان
کیا ہے اور آپ کو " العلامۃ النحریر والجہبذ الخبیر" کے توصیفی
کلمات سے یاد کیا ہے۔

علم فقہ میں مقام و مرتبہ

بالعموم سبھی اہل علم جانتے ہیں حضرت مولانا
الاعظمی ایک بلند پایہ محدث اور علوم حدیث
کے زبر دست ناقد و محقق تھے مگر یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ ایک فقید المثال
فقیہ بھی تھے، ان کی شان محدثیت، دیگر کمالات علمیہ پر اس طرح چھا گئی تھی کہ
ان کی فقہی بصیرت و مہارت پس منظر سے اوجھل ہو گئی آپ کی فقاہت کی اس
سے بڑی سند اور کیا ہو گی کہ برصغیر کے سب سے بڑے فقہ و افتاء کے مرکز
دار العلوم دیوبند کی صدارت افتاء کی مسند آپ کو پیش کی گئی اور وہ بھی
حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسے جلیل القدر اور صاحب بصیرت عالم
و محدث کی جانب سے۔

محدث اعظمی بحیثیت ایک مناظر کے

دیگر علمی کمالات کے ساتھ آپ
ایک زبر دست اور حاضر جواب
مناظر بھی تھے، بریلوی فرقہ اور جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) کے علماء سے
تحریری مناظرہ کے علاوہ آپ نے تقریری مناظرے بھی کئے اور انہیں لاجواب
کر کے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، ۲۴/۲۵/۲۶ رجمادی الاخری ۱۳۵۲ھ
م ۱۵/۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو موضع ادری ضلع اعظم گڈھ میں بریلوی فرقہ کے
صف اول کے عالم و مناظر مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی سے آپ کا

مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا منظور نعمانی کی رفاقت میں مناظرہ ہوا، نتیجہ میں بریلوی مناظرین شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب ہوگئے اس مناظرہ کی مکمل روداد ماہنامہ الفرقان میں دیکھی جاسکتی ہے۔

احسان سلوک

احسان و سلوک میں بھی حضرت محدث اعظمی بلند مقام پر فائز تھے، علم کا غلبہ اور اخفائے حال کی بے پناہ کوشش کی بنا پر آپ کی احسانی کیفیت کا عام طور پر لوگوں کو ادراک نہیں ہوسکا، آپ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے، اپنی بیعت کا ذکر خود انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۳۷ھ غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی مگر خوش قسمتی کی وجہ سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہوگیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا فتحپوری صاحب سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے، مولانا فتحپوری صاحب سوانح حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ کے سامنے ذرا داہنے ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے۔

مولانا فتحپوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی اپنی

قیام گاہ پہ آنے جانے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا، عصر کے
بعد خانقاہ کے دروازے پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے
اور گفتگو کی نوبت بھی آئی جس شب میں بعد مغرب میں شرفِ
بیعت سے مشرف ہوا تھا اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد
نمازِ عصر حضرت مولانا فتحپوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا تھا
کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی
وصول کرنی چاہئے ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت
کر لیا حالانکہ حضرت ایسا نہیں کرتے یہ ان کی خصوصیت ہے۔"
(مقدمہ تذکرہ مصلح الامت ص۵۰)

اجازت و خلافت آپ کو حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلیفۂ اجل حضرت مصلح الامت مولانا وصی اللہ فتحپوری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت مولانا منیر الدین صاحب مہاجر مکہ رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) سے بواسطہ حاجی عبد الحمید صاحب اورنگ آبادی بھی حاصل تھی لیکن اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے ارادت مندوں کے اصرار کے باوجود بیعت نہیں کرتے تھے البتہ کچھ مخصوص عقیدت مند آپ سے متوسل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اس موقع پر اس بات کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ آپ احسان و سلوک میں حضرت اقدس مولانا تھانویؒ سے منسلک ہونے کے باوجود ملکی سیاست میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ و اعلی اللہ مراتبہ کے نظریہ کے حامی و مؤید تھے اسی وجہ سے تاحیات جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، آپ کے اعتدال، توسط اور میانہ روی کا یہ کمال ہے کہ ان دونوں حضرات اکابر رحمہما اللہ کا اعتماد ہمیشہ آپ کو حاصل رہا بلکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے بعد ان کے صاحبزادۂ اجل

حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند و نائب امیر الہند سے بھی آپ کا عزیزانہ تعلق تھا، چنانچہ بیماری کے آخر زمانہ میں جب کہ آپ پر ایک استغراقی کیفیت طاری تھی، گفتگو اور بات چیت بالکل موقوف ہوگئی تھی آنکھیں ہمہ وقت بند رہتی تھی، علالت کی اسی کیفیت میں حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہٗ عیادت کے لئے خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی آہٹ محسوس ہوتے ہی آنکھیں کھول دیں، گویا ان کے انتظار میں تھے اور اشارے سے اپنے قریب بلا کر کچھ دیر نہایت دھیمی آواز میں باتیں بھی کیں اور صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد کو بلا کر فرمایا کہ مولانا کو گھر لے جاکر ناشتہ کرا دیں، حضرت مولانا کی یہی آخری گفتگو تھی، اس کے بعد آپ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

تلامذہ اور اولاد

مولانا نے کم و بیش تیس چالیس سال تک مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس مدت میں کتنے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا ان کی مکمل تعداد سے واقفیت نہیں، البتہ چند مشاہیر علماء جن کو حضرت محدث عصر سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے اسماء یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ (۲) مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ (۳) مولانا محمد حسین بہاری مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند (۴) مولانا عبدالستار معروفی سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۵) مولانا عبدالجبار اعظمی مدظلہ شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس (۶) مولانا ضیاء الدین مئوی سابق شیخ الحدیث ندوہ (۷) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی استاذ ادب ندوہ لکھنؤ (۸) مولانا ظفیر الدین مفتاحی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند (۹) صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد مفتاحی (۱۰) مولانا عبدالرشید مئوی مرحوم سابق صدر مدرس مفتاح العلوم۔

علمائے بلاد عربیہ جنہوں نے آپ سے سند حدیث اور اجازت روایت

حاصل کی ان کی فہرست پہلے آچکی ہے۔

حضرت محدث اعظمی کے سوانح اور ان کے علوم و معارف اور علمی کمالات وخدمات کا یہ ایک مختصر اور ہلکا سا تعارف ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بحر بیکراں کے علمی و دینی جواہر پاروں کو سمیٹنے کے لئے ایک نہیں بہت سارے دفاتر درکار ہیں، لاریب کہ وہ برصغیر میں علم کا ایک بیش بہا خزانہ تھے، واحسرتاہ کہ ہم اس خزانہ خوبی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
غنچۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ماہنامہ دارالعلوم اپریل و مئی ۱۹۹۲ء)

حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری

بقلم: عبدالخالق آزاد پاکستان

کیسے بیان کیا جائے؟ اور کیونکر تحریر کیا جائے؟! خانقاہ رحیمیہ رائے پور سے تعلق رکھنے والے لاکھوں مریدین و منتسبین اور بے شمار متعلقین اس وقت انتہائی غم واندوہ میں ڈوب گئے جب انہیں یہ اندوہناک خبر ملی کہ حضرت اقدس قطب الارشاد شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفۂ اجل اور جانشین حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری ۳ر جون ۱۹۹۲ء مطابق ۲ر ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ سوا نو بجے شب جمعرات لاہور میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے وصال کی خبر تمام متعلقین پر بجلی بن کر گری اور جو سنتا تھا سکتے کے عالم میں آجاتا تھا، ہر ایک نے یوں محسوس کیا کہ میرا گھر ویران و برباد ہو گیا ہے، اور میں ہی سب سے زیادہ

متأثر ہوا ہوں، گویا ہر ایک نے اس غم کو کچھ اس طرح محسوس کیا کہ جسے معرض تحریر میں لانا ممکن نہیں ۔

آپ شیخ المشائخ قطب العالم حضرت اقدس مولانا المحترم شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری اول نور اللہ مرقدہ (بانی خانقاہ رحیمیہ رائے پور) کے حقیقی نواسے اور حضرت قطب الارشاد مولانا المحترم شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری ثانی نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفۂ اجل اور جانشین تھے آپ پاکستان وہندوستان کے اکثر مدارس علمیہ اور دینی سیاسی وتبلیغی جماعتوں کے سر پرست تھے اور دین کے تمام شعبوں میں لوگ آپ سے راہنمائی حاصل کرتے تھے، غرض کہ آپ کا وجود تمام دینی سیاسی اور تبلیغی حلقوں میں بالعموم اور خانقاہ رحیمیہ رائے پور کے مریدین اور بے شمار متعلقین ومنتسبین کے لیۓ بالخصوص اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت تھا، ہزاروں لاکھوں افراد آپ کے حلقۂ صحبت میں رہ کر سیراب ہو رہے تھے علماء واساتذہ کے علاوہ ہر طرح کے لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق آپ کی ذات والاصفات سے مستفید ہو رہے تھے، آپ کے انتقال پر ملال سے پاکستان وہندوستان کے دینی حلقوں میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا بظاہر بہت مشکل ہے ،یقیناً امت مسلمہ کے لئے یہ ایک بہت بڑا اور عظیم سانحہ ہے جس نے تمام لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے ،اللہ تعالےٰ حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے تمام افراد اور پسماندگان ومتعلقین کو صبر جمیل نصیب فرمائے اور جنت الفردوس کے اعلیٰ علیین میں مقام نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین ۔

حالات زندگی

ذیل میں حضرت اقدس رائے پوری ثالث رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی

مختصراً تحریر کیے جاتے ہیں، تفصیلی حالات اور مفصل سوانحی تذکرہ بعد میں لکھا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

خاندان اور نسب

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوریؒ کا خاندان تقسیم ہند سے قبل قصبہ "گمتھلہ راؤ" تحصیل تھانیسر ضلع کرنال میں قدیم عرصے آباد تھا، آپ نسلاً چوہان راجپوت ہیں، آپ کے والد محترم چودھری تصدق حسین خاں صاحب اس قصبہ کے رئیس اور علاقے کے بااثر افراد میں سے تھے، اگرچہ آپ کے خاندان کی ملکیتی زمین اور جائیداد خاصی تھی، لیکن انگریز دشمنی کی وجہ سے یہ خاندان انگریز حکومت کا ہمیشہ معتوب رہا چنانچہ اکثر زمین اور جائیداد قرق کرلی گئی اور جمنا کے مغربی کنارے پر کھادر کے علاقے کی زمین جو پیداوار کے تناسب سے ناقص تھی آپ کے خاندان کے پاس رہنے دی گئی، بایں ہمہ آپ کے والد محترم عام لوگوں کی خدمت اور بھلائی کے کاموں کی وجہ سے ہر دل عزیز شخصیت تھے جس کی وجہ سے اس پورے علاقے پر ان کا اثر تھا۔

آپ کے والد محترم کو جہاں اس علاقے میں یہ دنیاوی وجاہت اور دینی شرافت وعزت حاصل تھی وہاں انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ حضرت قطب العالم شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ اول نور اللہ مرقدہٗ کی اکلوتی صاحبزادی محترمہ ان کے نکاح میں تھیں، آپ کے والد صاحب کی تین شادیاں ہوئیں، پہلی شادی پانی پت میں ہوئی تھی جس سے دو صاحبزادے تجمل حسین اور عبدالمجید اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، دوسری شادی اعلیٰ حضرت رائے پوری اولؒ کی صاحبزادی محترمہ سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے عبدالحمید خاں صاحب اور حضرت اقدس

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، اور تیسری شادی سے دو لڑکے خلیل الرحمٰن اور عبدالرحمٰن اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

آپ کے والد محترم نیک صالح آدمی تھے اور والدۂ معظمہ بھی انتہائی عابدہ وصالحہ خاتون تھیں اور چونکہ اعلیٰ حضرت رائے پوری اول کا سلسلۂ نسب چند پشت اوپر جاکر آپ کے خاندان سے ہی مل جاتا تھا اس طرح والدین کی شرافت و نجابت کی وجہ سے آپ کا نسبی تعلق بزرگوں کے ایسے خاندان سے تھا جو اپنے وقت میں مرجع خلائق اور دینی حلقوں میں بڑا مقام رکھتا تھا۔

ولادت اور بچپن

آپ کی پیدائش ۱۴ر جولائی ۱۹۰۵ء مطابق ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ میں اپنے آبائی وطن قصبہ گمتھلہ میں ہوئی، بچپن قصبہ گمتھلہ اور ننھالی وطن رائے پور میں گذرا، اگرچہ آپ کے بچپن کے حالات تفصیل کہیں سے نہیں ملتے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتدائی ۱۰ر ۱۱ر سال کی عمر کا اکثر حصہ گمتھلہ میں ہی گذرا اور اس کے بعد آپ مستقل طور پر تعلیم و تربیت کے لئے رائے پور اپنے نانا حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری اول کی خدمت میں آگئے تھے، اس کے بعد آپ نے رائے پور کو اعلیٰ حضرت رائے پوری اول کے حکم پر اپنا وطن بنالیا تھا، اگرچہ زمینوں کی دیکھ بھال اور ضروری خاندانی امور نمٹانے کے لئے آپ گمتھلہ بھی تشریف لے جایا کرتے تھے، لیکن زیادہ تر قیام رائے پور میں ہی رہا کرتا تھا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز آبائی وطن گمتھلہ

میں ہی ہوگیا تھا، اس وقت وہاں اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ اول کی زیر سرپرستی اور آپ کے والد ماجد صاحب کے زیر انتظام تعلیم القرآن کا ایک مدرسہ قائم تھا، اس مدرسہ میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ بھی اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ اول کے حکم پر کچھ عرصہ پڑھاتے رہے، چنانچہ سوانح قادری میں حضرت رائے پوری ثانی کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

> ”حضرت نے ..... مجھے مدرس بنا کر گمتھلہ بھیجا مجھے حضرت کی جُدائی شاق تھی...... میری درخواست کے باوجود حضرت نے حکماً اصرار سے بھیجا...... کچھ عرصہ بعد واپس بلالیا۔“
>
> (سوانح قادری ص۶۹)

اور یہ وہی زمانہ ہے جو حضرت رائے پوری ثالث کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے چنانچہ غالب گمان ہے کہ آپ کی ابتدائی تعلیم حفظ القرآن وغیرہ میں ہوئی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ ہی آپ کے استاذ تھے، بعد میں جب آپ گمتھلہ سے رائے پور منتقل ہوئے تو حافظ محمد یوسف صاحب وغیرہ اساتذہ سے بھی آپ نے تعلیم حاصل کی، قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد آپ نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کے آخری زمانۂ حیات میں ان کی زیر نگرانی قرآن پاک کا دور اور تلاوت کا معمول جاری رکھا حتیٰ کہ روزانہ دس پارے تقریباً حضرت عالیؒ کو سناتے تھے، اس وقت حضرت عالی رائے پوری اول کی پوری توجہ آپ کی جانب ہوتی تھی حفظ القرآن کے علاوہ ابتدائی دینی مسائل، اردو نوشت و خواند کے ساتھ تجوید و قرأت میں بھی آپ نے اسی زمانہ میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی، لیکن بچپن کے زمانہ میں قرآن پاک سے آپ کا شغف و تعلق اس قدر بڑھا کہ آپ نے زندگی بھر

سفر وحضر میں تلاوت قرآن کو اپنی زندگی کا لازمہ بنالیا تھا اور شاید قرآن پاک سے اسی محبت وشیفتگی کی وجہ سے رائے پوری حلقہ میں آپ کو "حضرت حافظ صاحب" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مزید تعلیم کیلئے مظاہر علوم میں داخلہ

ابتدائی تعلیم رائے پور میں حاصل کر کے آپ نے مزید علوم دینیہ کے حصول کے لئے پاک وہند کی عظیم دینی درسگاہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا، اس وقت وہاں پر محدث العصر حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ تشریف فرما تھے چنانچہ مدرسہ میں آپ کو حضرت سہارنپوریؒ کی شفقتوں اور نوازشوں کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا سعید احمد صاحب کا ارشاد ہے کہ ایک بار حضرت والد صاحب موصوف نے فرمایا کہ جب میں مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم کی غرض سے داخل ہوا تو حضرت سہارنپوریؒ نے میری تعلیم کے لئے چند اساتذۂ کرام کو مخصوص کر دیا کہ صرف وہی حضرات مجھے تعلیم دیں گے جن حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ خاص طور پر شامل ہیں، اور آخری سال میں احادیث کی کتب خود حضرت سہارنپوریؒ نے پڑھائیں جبکہ چار پانچ سال سے حضرت سہارنپوریؒ نے ضعف اور کمزوری کے سبب پڑھانا ترک کیا ہوا تھا لیکن حضرت موصوف کو خاص طور پر خود احادیث پڑھانے کے لئے اس سال اسباق رکھے۔ غرضیکہ ایسے عظیم اساتذۂ کرام کی زیر نگرانی خالص علمی و دینی ماحول میں رہ کر آپ نے

۱۳۴۲ھ بمطابق ۱۹۲۳ء میں تمام ظاہری علوم سے فراغت حاصل کرلی، اس طرح گویا انیس۱۹ برس کی عمر میں آپ کو تمام ظاہری دینی علوم پہ دسترس حاصل ہوگئی تھی۔

آپ کی شادیاں اور اولاد و احفاد

آپ کی یکے بعد دیگرے چار شادیاں ہوئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے
پہلا نکاح حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے بھائی عبدالغفور خاں کی صاحبزادی سے ہوا جو خود اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ نے طے کیا تھا، لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان کا انتقال ہوگیا۔

دوسری شادی قصبہ سکروڈہ تحصیل رڑکی کے ایک معزز خاندان میں حضرت حکیم رشید احمد صاحب کی صاحبزادی "خاتون" سے ہوئی جن سے آپ کے بڑے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی اور ایک صاحبزادی "سعیدہ خاتون" پیدا ہوئی۔ صاحبزادی کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔

دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد تیسری شادی بھی قصبہ سکروڈہ ہی کے راؤ غلام محمد خان کی نواسی اور رائے پور میں چودھری فیروز خان کی صاحبزادی "حسینہ خاتون" سے ہوئی جن سے رشید احمد، عتیق احمد اور خلیل احمد تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، عتیق احمد کا چھوٹی عمر میں ہی انتقال ہوگیا، اور بھائی رشید احمد صاحب اپنے والد کے انتقال کے ۱۱ دن بعد چار صاحبزادے اور ایک لڑکی چھوڑ کر ۱۵ جون ۱۹۹۲ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چوتھی شادی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوری کی بیوہ صاحبزادی محترمہ زبیدہ خاتون سے ہوئی جن سے حبیب احمد، ظفر اقبال اور بھائی عبدالقادر صاحب تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئی جو اللہ کے فضل کرم سے بقید حیات ہیں۔

آخر زمانہ حیات میں جس طرح روحانی نسبتوں اور خانقاہی نظام کو آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی نے سنبھالا ہوا تھا اور انتہائی توجہ اور لگن کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو پورا کیا، اسی طرح آپ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے بھائی عبدالقادر صاحب نے معذوری کے اخیر زمانہ میں مسلسل سات سال تک بڑی جانفشانی اور محنت سے خدمت کی اور آپ کی جسمانی صحت وصفائی اور علاج ومعالجہ کا دلی لگن کے ساتھ خیال رکھا اور آپ کو ہر طرح کی سہولت بہم پہونچائی۔

روحانی تربیت وتکمیل

ابھی آپ مدرسہ مظاہر علوم میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ بمطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء میں آپ کے نانا اور مربی اول خانقاہ رحیمی کے سرتاج اول شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کا وصال ہوگیا، لیکن حضرت رائے پوری اول نے اپنے وصال سے قبل ابتدا ہی سے آپ پر خصوصی توجہ دینی شروع کردی تھی، اور آخری زمانہ حیات میں تو آپ کی پوری توجہ کا مرکز حضرت موصوف ہی تھے، چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ نے بارہا اپنے احباب ومتعلقین کے درمیان حضرت منشی رحمت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا کہ "اعلیٰ حضرت رائے پوری اولؒ تو اس وقت (یعنی جب شاہ عبدالعزیز صاحب

اپنے نانا حضرت رائے پوری اول کو قرآن کی منزل سناتے تھے) میں صاحبزادہ محترم کی طرف پوری طرح متوجہ رہتے ہیں"، اور یوں شروع سے ہی حضرت عالی رائے پوری اول کو آپ کی تربیت کا خصوصی اہتمام رہا، اس طرح آپ کی روحانی تربیت بنیادی طور پر اعلیٰ حضرت رائے پوری اول کے ہاتھوں سے ہوئی۔

چنانچہ ایک بار حضرت موصوف نے اپنے صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی سے ارشاد فرمایا کہ "بیٹا! تمہارے ابا کی تربیت تو خود حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ فرما گئے تھے" حضرت عالی رائے پوری اول کے وصال کے بعد تربیت کے تکمیلی مراحل آپ نے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمتِ عالیہ میں رہ کر طے فرمائے اور بڑی ہمت اور جفاکشی کے ساتھ منازل سلوک طے کیں، تربیت کے تمام عرصہ میں آپ اپنے معمولاتِ ذکر اور دیگر اشغال کو اتنی ہمت اور پابندی کے ساتھ ادا فرماتے تھے کہ شاید و باید پھر یہ ساری زندگی کا ایسا لازمی جزو بن گیا کہ آپ نے ہر حالت میں اپنے معمولات پورے فرمائے، خاص طور پر قرآن پاک سے تو آپ کا شغف اتنا گہرا اور اس کی محبت اتنی زیادہ تھی کہ روزانہ کے معمولات میں زیادہ حصہ نوافل وغیرہ میں تلاوتِ قرآنِ پاک میں مشغولیت کا ہوتا تھا حتیٰ کہ زندگی کی دیگر مصروفیات خواہ کتنی بھی کیوں نہ ہوں لیکن آپ کے معمولات میں آخر تک کوئی فرق نہیں آیا۔

اور یوں علوم ظاہری میں درجۂ کمال حاصل کر لینے کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی طور پر آپ کی تربیت ایسے عالی شیوخ کے زیر نگرانی، ایک ایسے ماحول میں ہوئی کہ جہاں سے آپ کامل ہو کر نکلے، اور ایسے نکھرے کہ جیسے خوبصورت ہیرا تراش خراش کے بعد پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے۔

آپ کا سفرِ حج

آپ نے اپنے حجِ فرض کے لئے اپنے شیخ محترم حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے ہمراہ ۱۳۴۵ھ بمطابق ۱۹۲۷ء میں سفرِ حج فرمایا، اس سفر میں آپ دونوں حضرات کے علاوہ حضرت رائے پوری ثانی کے چھوٹے بھائی حافظ مولانا محمد خلیل صاحب، حاجی ظفرالدین صاحب اور رائے پور کے دیگر راؤ صاحبان شامل تھے، مدینہ منورہ میں حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الحدیث صاحب سے بھی ملاقات رہی، بلکہ رمضان انہی حضرات کے پاس ہی گذارا، اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں ملاقات کی چند خاص مجلسیں تحریک آزادی ہند کے عظیم مجاہد امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہوئی جو اصل میں تو حضرت رائے پوری ثانیؒ اور حضرت سندھیؒ کی ملاقات تھی، جبکہ آپ حضرت رائے پوری ثانیؒ کے خادم کی حیثیت سے شریک مجلس تھے اور ان مجلسوں کی تمام گفتگو کے راز دار تھے۔ یکم محرم ۱۳۴۶ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۲۷ء کو واپسی ہوئی، اس تاریخ کو واپس کراچی تشریف لائے اور ۶ محرم کو سہارنپور آمد ہوئی۔

مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی کی ذمہ داریاں

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری ثالث رحمۃ اللہ علیہ جس طرح علوم ظاہری اور باطنی میں اونچے کمالات سے بہرور تھے، اس طرح حسن تدبیر وانتظام، مشاورت، اور صائب رائے دینے کی صلاحیت واستعداد بھی آپ میں بدرجہ اتم موجود تھی جس کی توثیق حضرت تھانویؒ، حضرت دہلویؒ، اور حضرت

رائے پوری ثانیؒ ایسے اکابر نے اس طرح فرمائی کہ ۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ بمطابق ۲۷ر جولائی ۱۹۴۰ء کے اجتماعِ سرپرستانِ مدرسہ مظاہر علوم میں آپ کو مدرسہ مظاہر علوم کا سرپرست مقرر کیا گیا اور جن الفاظ کے ساتھ یہ قرار داد منظور کی گئی وہ حضرت شیخ الحدیثؒ کی ڈائری میں یوں نقل کئے گئے ہیں:

"چونکہ مولانا رحیم بخش صاحبؒ کی وفات کے بعد سے ایک جگہ سرپرستی کی خالی ہے اس لئے قرار پایا کہ مولانا مرحوم کی جگہ حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز گمتھلوی (ثم رائے پوری) جو مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں اور نیز صاحب دیانت و امانت داہل الرائے میں سے ہیں سرپرست مدرسہ مقرر کیا جائے، اور حضرت مولانا کو اس کی اطلاع کر دی جائے۔"

(دستخط سرپرستان)

اشرف علی تھانوی، محمد الیاس، عاشق الٰہی، عبدالقادر رائے پوری

رشید احمد دہلوی (تاریخ مظاہر ص ۱۳۴ ج ۲)

یہ الفاظ نقل کر کے تاریخ مظاہر کے مصنف لکھتے ہیں:

"مجلس شوریٰ کی تجویز کے مطابق حضرت حافظ عبدالعزیز صاحب کو تحریری اطلاع دی گئی کہ تشریف لا کر کاغذاتِ اوقاف کا معائنہ فرمائیں، چنانچہ مولانا نے ۱۲ر رجب کو آ کر ۱۷ر رجب ۱۳۵۹ھ تک معائنہ فرمایا۔" (ص ۱۳۵ ج ۲)

مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی محض خانہ پُری یا اعزازی عہدہ نہ ہوتی تھی بلکہ مدرسہ کے حسابات آمد و خرچ اور دیگر امور کی نگرانی ایسی ذمہ داریاں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی تھیں نیز مدرسہ کے لئے پالیسی ساز ادارہ بھی یہ مجلس

سرپرستان ہی ہوتی تھی اور حضرات سرپرستان اس عہدہ کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے ہی اس کو قبول کرتے، اور دوسرے کو نامزد کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہمہ جہتی صلاحیت رکھنے والے افراد کو ہی اس اہم عہدہ پر فائز کیا جاتا تھا۔

چنانچہ آپ نے مدرسہ کی سرپرستی کا عہدہ قبول کرنے کے بعد پاکستان بننے تک مسلسل سات سال مدرسہ کے حسابات کی نگرانی پوری توجہ اور ذمہ داری کے ساتھ فرمائی اور مدرسہ کے تمام سالانہ اجلاسوں اور اجتماع سرپرستان میں بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے اس طرح آپ کو بڑے بڑے اکابرین حضرت تھانویؒ، حضرت دہلوی، حضرت رائے پوری ثانی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اور ان حضرات کی تربیت میں رہ کر اس جہت سے بھی آپ درجۂ کمال پر فائز ہوئے، پاکستان بنجانے کے بعد آپ اپنے خاندان کے ہمراہ سرگودھا شہر میں قیام پذیر ہوئے اور ویزا وغیرہ کی دقتوں اور مشکلات کے سبب ہر سال انڈیا آنا ممکن نہ رہا اور عملی طور پر اس ذمہ داری کو نبھانے سے قاصر رہے، لیکن پھر بھی آپ کی توجہات اور مفید مشورے ارباب مدرسہ کے لئے بدستور جاری رہے، اس طرح آخر وقت تک آپ نے مدرسہ کی سرپرستی فرمائی۔

حضرت موصوف کی جانشینی کا اعلان

حضرت قطب العالم شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی نوازشات اور توجہات کے زیر سایہ رہ کر جب آپ نے تربیتِ ظاہری اور باطنی کے تمام مراحل بحسن وخوبی طے کر لئے

تو آپ کی ذات والاصفات ہر طرح سے نکھر کر سامنے آگئی اور ادھر حضرت رائے پوری ثانیؒ کا آخری زمانہ حیات آپہنچا، اور آپ نے اپنی زندگی کا آخری رمضان ۱۳۸۱ھ رائے پور میں گذارا تو حضرت موصوف نے آپ کو سرگودھا سے خاص طور پر بلوایا اور رمضان کے بعد آپ کی جانشینی کا اعلان فرمایا، گویا خانقاہ رحیمی کے اس سلسلہ کی ساری ذمہ داری آپ پر ڈال دی گئی چنانچہ مولانا علی میاں صاحب اس کی تفصیل ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

> "آخری رمضان سے پہلے مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب کو پاکستان سے بلایا گیا، مولانا اوپر کی منزل میں تشریف رکھتے تھے اور حسب معمول رمضان کے اشغال میں عالی ہمتی سے مشغول تھے رائے پور کی اس خانقاہ کو آباد رکھنے کے لئے کسی موزوں شخصیت کے انتخاب وتعین کی ضرورت تھی، مولانا عبدالعزیز صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ کے حقیقی نواسہ اور اسی خاندان والاشان کے چشم وچراغ ہیں، عالم صالح متشرع اور ذاکر وشاکر ہیں، حضرت سے ہی بیعت و اجازت ہے اور حضرت ہی کے دامن عاطفت میں تربیت پائی ہے، اہل رائے پور اور قرب وجوار کے مسلمان ان سے خوب واقف و مانوس بھی ہیں اور وہ اپنے خاندانی تعلق قرابت قریبہ اور وجاہت سے اس شیرازہ کو مجتمع و مربوط رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، حضرت (شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری) نے ان کو رائے پور میں قیام کے لئے تجویز فرمایا اور رمضان کے بعد شوال (۱۳۸۱ھ) کا پہلا ہفتہ تھا، غالباً وہ ۵ یا ۶ شوال

کی تاریخ تھی حضرت کے ارشاد سے حضرت شیخ الحدیث نے جو
تشریف رکھتے تھے متعلقین خانقاہ کے ایک مجمع میں (جانشینی کا)
اعلان فرمایا"۔ (سوانح قادری ص۲۰۵)

اس طرح خانقاہ رحیمیہ کی تمام ذمہ داریاں آپ کی ذات سے متعلق ہو گئیں۔ اور حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے وصال (۱۶ اگست ۱۹۶۲ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ) کے بعد باقاعدہ طور پر اس سلسلہ کا سارا بوجھ آپ کے کندھوں پر آپڑا، جسے تادم حیات آپ نے بڑی خوبی اور حسن تدبیر سے پورا فرمایا، چنانچہ خانقاہ رحیمیہ سے منسلک لاکھوں متعلقین جو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں موجود تھے، کی تربیت فرمائی، اور خانقاہ کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے، سرگودھا (پاکستان) میں وہاں کے متوسلین و متعلقین کی تربیت کا اہتمام فرماتے رہے اور ٹوٹے دلوں، غموں اور مصیبتوں سے چور انسان کے سروں پر ہمیشہ دست شفقت رکھے رہے، اور اسی طرح جب بھی حالات نے اجازت دی اور ویزہ کی مشکلات راہ میں رکاوٹ نہ بنیں تو آپ رائے پور (سہارنپور، انڈیا) میں تشریف لاکر ہندوستان میں اس خانقاہ سے متعلق افراد کی تربیت فرماتے رہے، اور مصیبت زدہ انسانیت کو خصوصی دعاؤں اور توجہات سے نوازتے رہے۔

پاکستان سے رائے پور کیلئے آپ کے مختلف اسفار

مختلف وجوہات و حوادث کی وجہ سے حضرت رائے پوری ثانیؒ کے وصال کے بعد مجبوراً آپ کو سرگودھا (پاکستان) قیام کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود آپ کے دل میں رائے پور قیام کی خواہش اور تڑپ اتنی زیادہ تھی کہ

جس کا کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، چنانچہ حضرت رائے پوری ثانیؒ کے
وصال کے بعد جلد ہی آپ نے رائے پور حاضری دی اور یہاں قیام فرمایا، اس
کے بعد ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں آپ کے اسفار ہوئے، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ
کے بعد ۱۴ رسال تک دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوجانے کے سبب سفر
نہ ہوسکا، پھر ۱۹۷۸ء میں آپ نے چھ ماہ کے قریب قیام فرمایا، ان تمام سفروں
میں جہاں اپنے شیخ محترم و مربی ثانی شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے
تابوت کو رائے پور منتقل کرنے کے سلسلے میں علما و مفتیان کرام سے گفتگو فرمائی
اور اس سلسلے میں دوڑ دھوپ کی وہاں سالکین طریقت کی رہنمائی اور تربیت
کا اہتمام بھی فرمایا اور بہت سے لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا، اور اللہ تعالیٰ
سے قرب کے حصول کی جدوجہد کی، ۱۹۷۸ء کے بعد ویزہ وغیرہ کی مشکلات اور
مختلف طرح کی رکاوٹوں کی وجہ سے کافی عرصہ آپ یہاں تشریف نہ لاسکے بالآخر
۱۴ر نومبر ۱۹۸۷ء کو آپ کو ہندوستان سفر کرنے کی اجازت ملی اور آپ دہلی
تشریف لائے، ایک ہفتہ دہلی میں قیام رہا اور دہلی کے لوگ بڑی محبت وشوق
کے ساتھ آپ کی صحبت میں رہے اور آپ کے فیوضات و برکات سے مستفید ہوئے
بعدۂ ایک ہفتہ بہٹ ہاؤس سہارنپور میں قیام رہا اور وہاں بھی آپ سے بیعت
ہونے والوں کا تانتا بندھا رہا، اور مدرسہ مظاہر علوم کے اساتذہ و طلبا بھی
آپ کی زیارت اور صحبت سے مستفید ہوتے رہے، اسی طرح دارالعلوم دیوبند
اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم، اساتذۂ کرام اور طلبا بھی آپ کی زیارت
اور ملاقات کے لئے تشریف لائے، اور وقفہ کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہا، ایک
ہفتہ سہارنپور قیام کے بعد نومبر کے آخر میں رائے پور ”خانقاہ رحیمیہ“ میں تشریف
لائے اور مسلسل تین ماہ خانقاہ میں قیام فرمایا، لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو آپ

کی زیارت اور بیعت کے لئے امڈا چلا آرہا تھا، لوگوں کا شوق و ذوق دیدنی تھا، ہر وقت ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا، چونکہ آپ کمزوری اور ضعف کے سبب چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور تھے چنانچہ بیعت ہونے والے احباب کو حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی (جو شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کے خلیفہ اور آپ کے بڑے صاحبزادے اور پھر جانشین بھی ہیں) کلمات بیعت ادا کرواتے تھے، اور آپ کی طرف سے ترجمانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے، جمعہ کے موقعہ پہ ۲۵، ۳۰ ہزار کا مجمع آپ کی زیارت و ملاقات کے لئے جمع ہو جاتا تھا، جو بسا اوقات کنٹرول سے باہر ہوتا تھا۔

حضرت موصوف کی طرف سے اپنے جانشین کا اعلان

اسی سفر میں جنوری کے وسط میں ایک بار ایک بڑے مجمع کے سامنے حضرت موصوف رحمہ اللہ نے بنفس نفیس لوگوں کو نصیحتیں ارشاد فرمائیں اور پھر بعد میں اپنی جانب سے اس سلسلہ کی ذمہ داری حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائپوری مدظلہ العالی پہ ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا "میں اب معذور ہوگیا ہوں اور تمہاری دعاؤں کا محتاج ہوں، سب لوگ میری طرف سے مولوی سعید احمد صاحب کو قبول کریں اور ذکر و اذکار و معمولات ان سے ہی پوچھ کر کیا کریں، اب وہ تمہاری راہنمائی کریں گے۔" اس طرح آپ نے زندگی میں ہی حضرت مولانا مدظلہ العالی کو اپنا جانشین اور خلیفہ بنا دیا تھا، آپ کے اس سفر سے ہزاروں لاکھوں لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا، اس کے بعد اپریل ۱۹۹۱ء میں آپ نے ہندوستان کا سفر فرمایا اور رائے پور میں قیام کیا، اور بدستور سابق دور دراز سے لوگوں نے آکر

شرف زیارت و ملاقات حاصل کیا اور طالبین نے اپنی اصلاح کی، اور آپ کی توجہ سے مستفید ہوئے۔

آخری سفرِ ہندوستان اور رائے پور کا رمضان

آخری بار آپ کا رائے پور کا سفر ۲۵ر فروری ۱۹۹۲ء کو (رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ سے ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل) ہوا، اپنے شیخ حضرت رائے پوری ثانی کی سنت میں زندگی کا آخری رمضان المبارک آپ نے بھی رائے پور خانقاہ رحیمیہ میں ہی فرمایا اور ہندوستان کے متوسلین و مریدین کی یہ دیرینہ خواہش کہ حضرت کا رمضان رائے پور میں ہو، بڑے دنوں کے بعد اس طرح پوری ہوئی، چنانچہ اس رمضان میں طالبین و سالکین نے پورے ماہ قیام کر کے منازل سلوک طے کیں اور عوام شرف زیارت و ملاقات سے باریاب ہو کر اپنی تشنگی بجھاتے رہے، چونکہ خود حضرتؒ تو کثرت امراض کے سبب معذور ہو گئے تھے لہٰذا اس سارے نظام کو آپ کے جانشین اور خلیفہ حضرت رائے پوری ثانیؒ حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائپوری نے کنٹرول فرمایا اور چلایا، چنانچہ حضرتؒ کی توجہات و برکات کے سبب رائپور میں ایک بار پھر اکابر حضرات رائے پوری کے رمضان کی یاد تازہ ہو گئی، لیکن اثنائے رمضان میں حضرت موصوف کے خاندان میں ایک حادثہ پیش آگیا کہ ۲۷ر مارچ ۱۹۹۲ء بمطابق ۲۲ر رمضان ۱۴۱۲ھ کو حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی کے چھوٹے صاحبزادے محبوب احمد سلمہٗ ۱۲ر سال کی عمر میں ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے، اس حادثہ کے سبب رمضان المبارک کے فوراً بعد حضرت اقدسؒ کو اپنے صاحبزادگان کے ہمراہ واپس پاکستان جانا پڑا، چنانچہ ۱۲ر اپریل ۱۹۹۲ء کو رائے پور سے دہلی تشریف آوری ہوئی اور جہاز کی

ٹکٹوں وغیرہ میں تاخیر کی وجہ سے ۲۲ر اپریل کو پاکستان واپسی ہوئی، اس طرح تقریباً دو ماہ یہاں پر قیام رہا۔

پاکستان میں زندگی کے آخری ایام اور شدت مرض

ہندوستان سے واپس پاکستان تشریف لانے کے بعد کل ۴۱ر دن آپ کا زمانہ حیات رہا، اگرچہ اعلیٰ حضرت رائے پوری اول اور حضرت رائے پوری ثانی کی طرح آپ بھی ۶ر ۷ر سال تک مختلف امراض میں مبتلا رہے، اور علاج معالجہ جاری رہا لیکن رائے پور میں آخری رمضان المبارک کے قیام کے دوران آپ پر مرض کا شدید حملہ ہوا اور ڈاکٹروں نے تشویش کا اظہار کیا، اس کے بعد طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی اسی وجہ سے پاکستان کا سفر ممکن ہوا، پھر سرگودھا آنے کے بعد طبیعت میں خاصی بے چینی اور تکلیف شروع ہوگئی اور مرض میں شدت آتی چلی گئی اور اتوار کے روز ۳۱ر مئی کو طبیعت خاصی خراب ہوگئی، ڈاکٹروں نے بڑی ہمت سے علاج شروع کیا، لیکن طبیعت دن بدن گرتی چلی گئی، جب مرض نے شدت اختیار کی تو آپ کو لاہور میو ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔

زندگی کا آخری دن اور وصال مبارک

شدتِ مرض کے سبب ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق منگل اور بدھ کی درمیانی شب میں آپ کو سرگودھا سے لاہور میو ہسپتال میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں ماہر ڈاکٹروں کے ایک پینل نے آپ کا علاج شروع کیا، لیکن طبیعت سنبھل نہ پائی اور بالآخر جمعرات کی شب سوا نو بجے مورخہ ۴ر جون ۱۹۹۲ء بمطابق ۲ر ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ اپنے خالق حقیقی کے حضور جا پہونچے۔
اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃً واسعۃً۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

رائے پور میں دفن ہونے کی خواہش

حضرت رائے پوری ثالث رحمہ اللہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بارہا فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ میں رائے پور میں دفن ہوں، مجھے یہاں کی مٹی نصیب ہو، نومبر ۸۸ء میں جب آپ کا قیام شاہ محمود صاحب کے بہٹ ہاؤس میں تھا حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی ملاقات کے لئے تشریف لائے جب واپسی کی اجازت لینے لگے تو حضرت رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا کہ" میں یہاں اس لئے آیا ہوا ہوں کہ مجھے یہاں کی مٹی نصیب ہو جائے"۔ اسی طرح ۱۵؍ جنوری ۸۸ء کو جب بنفس نفیس آپ نے حضرت مولانا سعید احمد صاحب کو اپنا جانشین بنایا تو فرمایا کہ" میرے شیخ نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارا وطن رائے پور ہے میں چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی مجھے ان بزرگوں کے قدموں میں رائے پور میں دفن کیا جائے"۔ اور پھر جب پاکستان تشریف لے جاتے تو ہر دم رائے پور جانے کی خواہش رہتی تھی۔

حضرت موصوف رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس دیرینہ خواہش ووصیت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے صاحبزادگان نے حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی کی سربراہی میں یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ اگر دونوں حکومتیں اجازت دیدیں تو حضرت رحمہ اللہ کو رائے پور لاکر وہاں دفن کیا جائے، انتقال کے فوری بعد بظاہر رائے پور لانا ممکن نظر نہیں آرہا تھا اس لئے آپ کو سرگودھا لے جایا گیا اور دوسرے دن ۲۸؍ جون کو شام ۵ بجے نماز جنازہ کا اعلان کر دیا گیا اور اس دوران پاکستان و ہندوستان کی دونوں حکومتوں سے رابطہ کیا گیا جس کے حوصلہ افزا نتائج نکلے اور شام ۳ بجے تک دونوں حکومتوں نے حضرت رحمہ اللہ کی میت کو رائے پور منتقل کرنے کی اجازت دیدی، اس پر سرگودھا میں تدفین ملتوی کر کے اور ۵ بجے شام نماز جنازہ پڑھا کر

حضرت رحمہ اللہ کو لاہور اور پھر وہاں سے رائے پور لے جانا طے ہو گیا۔

سرگودھا میں نماز جنازہ

آپ کے انتقال کی خبر پورے پاکستان و ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، ریڈیو، اخبارات کے علاوہ ٹیلی فون کے ذریعہ تمام منتسبین و متعلقین تک یہ اندوہناک اطلاع پہنچ گئی اور لوگ دور دراز سے اپنے شیخ محترم کا آخری دیدار کرنے اور نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے سرگودھا میں جمع ہونے لگے، پاکستان کا قریب قریب کوئی علاقہ اور شہر ایسا نہ ہوگا کہ جہاں سے لوگ شریک نہ ہوئے ہوں، سخت گرمی کے باوجود علماء و طلباء اور عام لوگوں کا اتنا بڑا مجمع جمع ہو گیا کہ تاحد نظر لوگوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے، اس دوران آپ کے جسد مبارک کو غسل دیا گیا، صاحبزادۂ محترم اور جانشین حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائپوری مدظلہ العالی آپ سے بیعت اور تربیت یافتہ حضرت مولانا محمد حبیب اللہ مختار صاحب مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی، اور چھوٹے صاحبزادۂ محترم بھائی عبدالقادر صاحب نے غسل دیا، تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ گھر سے باہر لایا گیا اور چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس کندھا دینے کے لئے باندھے گئے، عصر کی نماز کے بعد جنازہ سرگودھا کی مرکزی عیدگاہ میں لایا گیا اور وہاں آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد گاڑی میں رکھ کر جنازہ لاہور لایا گیا۔

لاہور میں نماز جنازہ

رائے پور لے جانے کے لئے کاغذات کی تکمیل میں دو ایک روز لگ گئے،

اس کے بعد، رجون بروز اتوار کو لاہور سے ۲ ½ بجے کی پی آئی اے کی فلائٹ سے آپ کا تابوت دہلی آنا تھا اس لئے اس روز زوال کے بعد ½ ۱۲ بجے کے قریب لاہور میں نماز جنازہ ہوئی، جو احباب سرگودھا میں شامل نہ ہوسکے تھے وہ یہاں پر آکر شامل ہو گئے، یہاں پر نماز جنازہ حضرت مولانا سید نفیس شاہ صاحب خلیفہ حضرت رائے پوری ثانی نے پڑھائی پھر فوری طور پر ایرپورٹ لایا گیا اور وہاں سے پی آئی اے کی فلائٹ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔

دہلی میں نماز جنازہ

شام ۶ بجے کے قریب اندرا گاندھی ایرپورٹ دہلی سے آپ کا تابوت باہر آیا چونکہ تبلیغی مرکز نظام الدین سے اور دوسرے علاقوں سے وہاں خاصے احباب جمع ہوگئے تھے ان کے اصرار پر ایرپورٹ پر ہی تیسری مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد خصوصی ایمبولینس کے ذریعہ آپ کے تابوت کو رائے پور لے جایا گیا، حفاظت کے لئے ایمبولینس کے ساتھ پولس کی گاڑیاں موجود تھیں جو راستہ صاف بھی کرتی جارہی تھیں، اس طرح شام ۸ بجے دہلی سے روانہ ہوکر قریباً ۱۲ بجے رات جنازہ رائے پور پہنچ گیا۔

رائے پور میں نماز جنازہ اور تدفین

رائے پور میں جب سے حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پُر ملال کی خبر آئی تھی اس وقت سے سیکڑوں آدمیوں کا مجمع رہنے لگا، اور آخری روز جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تابوت کی آمد کی اطلاع ملی، اور یہ خبر انڈیا ریڈیو

اور اخبارات کے ذریعے پورے ہندوستان میں پھیل گئی تو لوگ جوق در جوق دیوانہ وار رائے پور کی جانب آنے لگے، لوگوں کا ایک سمندر تھا جو رائے پور میں اپنے شیخ محترم کی آخری زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت کے لئے بیتاب تھا جب کہ بعض لوگ تو مسلسل تین روز سے یہاں پر قیام پذیر تھے، بہرحال ایک عام اندازے کے مطابق ۵۰ر ۶۰ ہزار کا مجمع تھا، اب ہر شخص زیارت کی خواہش دل میں دبائے ہوئے تھا، لیکن ایک تو رات کا وقت، بجلی بھی غائب اور پھر یہ کہ تدفین میں خاصی دیر ہو چکی تھی، اس لئے صاحبزادۂ محترم اور جانشین حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی نے مائک پر آکر صبر و تحمل کے ساتھ رہنے اور سکون کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنے کی تلقین کی، اور زیارت کرانے سے معذرت کی۔

اس کے بعد رات تقریباً ۱½ بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم و مہتمم حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور پھر ۲½ بجے کے قریب آپ کے نانا شیخ المشائخ قطب العالم شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے پہلو میں آپ کی تدفین عمل میں آئی اور یوں آپ کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی، کہ رائے پور کی سرزمین میں بزرگوں کے پہلو میں آپ کو جگہ ملی، اور ایسے وقت میں آپ کے جسد مبارک کو سپرد خاک کیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ مقرب بندہ تہجد کی نماز کے لئے کھڑا ہو کر اس ذات قدوس کے سامنے جبین نیاز جھکاتا تھا، اور اپنی پیشانی کو زمین کی اس مٹی پر رگڑ رگڑ کر خدا کے حضور گڑگڑاتا تھا۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ رحمۃً واسعۃ وارفع درجاتہ العالیۃ الی یوم القیمۃ۔ اللّٰھم نور قبرہ وبرد مضجعہٗ۔

آخر زمانہ حیات میں رجوع الی اللہ اور کثرت استغفار کی تلقین

اکثر اہل اللہ کی طرح آخری زمانہ حیات میں آپ پر رجوع الی اللہ کا غلبہ ہو گیا تھا، چنانچہ ہر دم آپ کی توجہ اُدھر ہی لگی رہتی تھی یہاں تک کہ آنے والے تمام احباب کو اس بات کی بڑی تاکید فرماتے تھے کہ ہمارے انفرادی اور اجتماعی گناہوں کے سبب سے ہم طرح طرح کی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اس لئے گناہوں کی معافی کے لئے توبہ واستغفار کی کثرت کرنی چاہئے اور خوب گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنی چاہئے، اور خوب تواضع وانکساری سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں اور غیر اللہ کا خیال کبھی دل میں نہ لائیں، خاص طور پر فرض نمازوں کے بعد دعاء کا خاص اہتمام خود بھی فرماتے اور دوسروں کو تلقین فرماتے تھے، رمضان المبارک میں ختم قرآن پاک کی رات کو آپ کی دعاء وگریہ زاری اتنی طویل اور پُر اثر ہو جاتی تھی کہ حاضرین کے قلوب انتہائی نرم ہو جاتے تھے، اور بے اختیار خدا سے مانگنے کو جی چاہتا تھا۔

اپنے تمام متعلقین اور منتسبین کو ارشاد فرماتے تھے کہ تیسرے کلمے استغفار اور درود شریف ابراہیمی (جو نماز میں پڑھا جاتا ہے) کی کم از کم ایک ایک تسبیح روزانہ کا معمول بنائیں، اور کوشش کریں کہ مغرب کی نماز کے بعد استغفار کی ایک تسبیح عشاء کی نماز کے بعد درود شریف کی ایک تسبیح خوب دل لگا کر پڑھیں، استغفار کرتے وقت اپنے گناہوں پر انتہائی ندامت اور شرمندگی کا احساس اپنے اندر پیدا کریں، اور درود شریف کی تسبیح کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت دل میں بٹھائیں، اور فجر کی نماز کے بعد تیسرے کلمے کی ایک تسبیح پڑھا کریں، اگر کسی دن ان اوقات میں نہ پڑھی جاسکیں تو پھر ۲۴ گھنٹے میں

وہ کسی وقت بھی انہیں پڑھ لیا جائے، اسی طرح تلاوت قرآن پاک کو بھی روزانہ وظیفہ سمجھتے ہوئے اپنا معمول بنائیں اگر حافظ ہے تو روزانہ تین پارے تلاوت کرے، اور اگر حافظ نہیں ہے تو ایک پارہ روزانہ کا معمول بنائے، عام لوگ جتنا آسانی سے قرآن پاک پڑھ سکتے ہوں روزانہ پڑھا کریں، اور اسے اپنا معمول بنا لیں۔

آپ کے جانشین حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی

یوں تو حضرت رائے پوری ثالث شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دامن عاطفت سے فیض حاصل کرنے والے علماء اور دیگر حضرات بہت ہیں، لیکن آپ کی روحانی توجہات کا مرکز آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلہ العالی تھے، ۱۹۹۳ء کے سفر رائے پور میں آپ نے حضرت مولانا مدظلہ العالی کو خلافت اور جانشینی سے مشرف فرمایا جس کا تذکرہ گذشتہ سطور میں آچکا ہے۔

حضرت مولانا مدظلہ العالی ۱۹۵۷ء میں اپنے آبائی وطن گمتھلہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہاں ہی حاصل کی اس زمانہ میں وہاں حافظ مقصود احمد رائے پوری پڑھایا کرتے تھے، یہ آپ کے اساتذہ میں سے ہیں، پھر کچھ عرصہ اپنے ننھیالی گاؤں قصبہ سکروڈہ میں بھی ابتدائی اردو نوشت وخواند کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کچھ عرصہ رائپور کے مدرسہ میں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب کے زیر نگرانی رہے اور پھر مزید علوم دینیہ کے حصول کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، تمام کتابیں آپ نے یہاں رہ کر ہی پڑھیں، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی شفقتوں کے زیر سایہ تعلیم کے تمام مراحل

طے کیے اور ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں تکمیل علوم دینیہ سے فراغت حاصل کی.

علوم دینیہ کی تعلیم کے دوران بھی اور فراغت کے بعد آپ نے حضرت رائپوری ثانی رح کی خدمت میں رہ کر منازل سلوک طے کیں اور خانقاہ رحیمیہ میں ذکر و اشغال و مراقبہ میں مشغول رہا کرتے تھے، تکمیل سلوک کے بعد حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہی اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔

اس کے بعد حضرت رائے پوری ثانی کی اجازت سے سرگودھا پاکستان تشریف لے گئے، لیکن محترم راؤ عطاء الرحمٰن خاں صاحب وغیرہ خدام کے بقول حضرت رائے پوری ثانی فرمایا کرتے تھے "ہم نے مولوی سعید کو پاکستان بھیج کر بڑی غلطی کی ہے اسے یہاں اپنے پاس رکھتے تو اچھا تھا" نہ معلوم حضرت اقدس آپ سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔

پاکستان جانے کے بعد آپ نے اپنے والد محترم حضرت رائے پوری ثالث کی خدمت میں زیادہ وقت گزارا، اور اس خانقاہ میں اتباع سنت و اتباع شریعت کے ساتھ دین کی جامعیت کا جو رنگ غالب ہے اس کی بنیاد پہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور مدارس دینیہ کے طلبا میں جامع دین کے غلبے کی شعوری محنت و جدوجہد کی بنیاد رکھی اور پاکستان کے مختلف شہروں میں بڑی محنت اور جانفشانی سے باشعور اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دین کی اس محنت کے کام کو آگے بڑھایا جس میں اکابرین سلسلۂ ولی اللہی کے طرز پر طریقت شریعت اور سیاست کا گہرا امتزاج تھا، اور جس میں خدا پرستی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے، انسان دوستی اور خدمتِ خلق اور دینی صالح نظام کی اہمیت کو بھی خوب اجاگر کیا گیا، اس سلسلہ میں آپ کو اپنے والد محترم حضرت رائے پوری

ثالث رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی اور ہدایات بھی حاصل رہیں یہ کام بحمد اللہ اب بھی جاری ہے ۔

اس کے علاوہ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی معذوری کے زمانہ میں خانقاہی نظام کے اس پورے سلسلہ کو آپ نے بڑی توجہ اور لگن کے ساتھ کنٹرول کیا چنانچہ طالبین و سالکین کو ذکر و اذکار کی تلقین اور ان کے حالات کی نگرانی آپ ہی فرماتے تھے اور نئے بیعت ہونے والوں کو آپ ہی کلمات بیعت کہلواتے تھے ، یہاں تک کہ ۱۹۸۸ء میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور مختلف بزرگوں کے سامنے کئی بار اس کا اظہار فرمایا ، چنانچہ نومبر ۱۹۹۱ء میں کلور کوٹ (پاکستان) میں حضرت اقدس رائے پوری ثالث رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا کی معیت میں ایک شادی کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ العالی بھی دیوبند سے وہاں تشریف لے آئے ، ملاقات کے وقت حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا سعید احمد صاحب مدظلہ العالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت مدنی سے ارشاد فرمایا " یہ میرے بڑے لڑکے مولوی سعید صاحب ہیں ، ماشاء اللہ انہوں نے ہمارے بزرگوں کی روحانی امانتوں اور ذمہ داریوں کو سنبھال رکھا ہے ، دعا کریں کہ اللہ ان کی عمر دراز فرمائے " ، اس پر مولانا مدنی مدظلہ العالی نے دعا فرمائی ۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خانقاہ رحیمیہ رائے پور کو حضرت مولانا مدظلہ العالی کے دم سے آباد رکھے اور تمام متوسلین و متعلقین کو آپ کی زیر سرپرستی اپنی رضا و محبت کی دولت سے مالا مال کر دے اور اس خانقاہ کے عظیم مشن کو باحسن و خوبی پورا کرنے کیلئے آپ کو ہمت و طاقت نصیب فرمائے ۔ آمین یا رب العالمین ۔

(ماہنامہ دار العلوم جولائی و اگست ۱۹۹۲ء)

دوحادثے

قارئین "دارالعلوم" کو اخبارات کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ ملک کے مشہور سیاسی رہنما جناب ضیاء الرحمٰن انصاری ۶/۷ اکتوبر کی درمیانی شب میں، اور نامور عالم دین و صحافی مولانا حامد الانصاری غازی ۱۶ اکتوبر بروز جمعہ کو انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سرائے فانی کی خاصیت ہی فنا ہے، یہاں جو بھی آتا ہے جانے ہی کے لئے آتا ہے "کل من علیہا فان" خالق دوجہاں کا ایسا ہمہ گیر قانون ہے جس سے کوئی بڑا چھوٹا، نیک و بد مستثنیٰ نہیں ہے، اس لئے اس بزم فنا سے کسی کا اٹھ جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، پھر بھی بعض شخصیتیں کچھ ایسی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کی رحلت ملک و قوم اور جماعت و افراد کے لئے ایک حادثہ/فاجعہ شمار کی جاتی ہے، بلاشبہ سابق مرکزی وزیر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری اور ملک کے مشہور عالم و صحافی مولانا حامد الانصاری غازی کا حادثہ/وفات بھی ایسا ہی سانحہ ہے جس کا غم عرصہ تک بھلایا نہیں جاسکے گا۔

(۱)

مرحوم ضیاء الرحمٰن انصاری پچھلی چار دہائیوں سے سیاست میں سرگرم رہے اترپردیش اسمبلی کے علاوہ تین بار پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئے، مرکز میں کئی اہم وزارتوں میں وزیر رہے ۱۹۸۹ء میں وزارت ماحولیات و جنگلات میں کابینی درجہ کے وزیر بنائے گئے، ایم، ایل، اے ہوں۔ ایم، پی ہوں یا وزیر انہوں نے کسی حال میں بھی عوام کے کسی طبقہ سے ناطہ توڑا نہ ان سے دوری اختیار کی، زمانۂ وزارت میں اکبر روڈ پر ان کی رہائش گاہ عوام و خواص کا مرکز توجہ بنی ہوئی تھی جہاں ضرورتمندوں

کی ایک بھیڑ لگی رہتی اور وہ بلا تفریق ہر ایک کی جائز ضرورت پورا کرنے کی مخلصانہ کوشش کرتے، بسا اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ لوگ ان پر ناراض ہو رہے ہیں اور وہ مسکرا رہے ہیں۔

مرحوم انصاری صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، مولانا روم، حافظ شیرازی، غالب، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ابو الکلام آزاد کے شیدائیوں میں تھے، بالخصوص مولانا آزاد کو انھوں نے پڑھا ہی نہیں بلکہ انہیں اپنی زندگی کا آئیڈیل اور نمونہ بنا لیا تھا، ان کی تقریر کی خوبصورت اور پرجوش زبان میں مولانا آزاد کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔

سیاسی زندگی میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنا قد اونچا کرنے کے لئے دوسروں کے کندھے پر سوار ہو جاتے ہیں اور مقابلہ میں آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو کہنی مارنا آج کل کا مقبول عام فن ہے، لیکن مرحوم اس طرح کی اوچھی حرکتوں سے ہمیشہ بیزار رہے، ان کی زندگی نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی، خدمت خلق ہمدردی و غمگساری اور اصول و اقدار کی پاس داری میں وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے میں راحت پاتے تھے، "شاہ بانو کیس" سے کون ناواقف ہوگا، اس موقع پر انصاری صاحب نے اسلام اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو پارلیمنٹ میں جس طرح واضح کیا، اور پارٹی سے بلند ہو کر جس طرح اس معاملہ میں حق کی وکالت کی، کیا ان کی اس عظیم خدمت کو بھلایا جا سکتا ہے، جبکہ بعض سیاست گزیدہ مسلم لیڈروں نے محض نام آوری اور اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کی غرض سے نہ صرف مرحوم انصاری کے نقطۂ نظر بلکہ ان کی ذات کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔

مرحوم انصاری صاحب سماجی وسیاسی میدان میں جمعیۃ علمائے ہند
کی راہ سے داخل ہوئے تھے، اس رشتہ اور تعلق کا انہوں نے زندگی بھر
پاس وخیال رکھا، اور جمعیۃ علماء کی ہر دعوت پر ہمیشہ لبیک کہنے کے لئے تیار
رہتے تھے، دارالعلوم دیوبند سے بھی مرحوم کو بڑا لگاؤ تھا، یہاں کے علماء وطلبہ
کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور ان کی خدمت کو اپنے لئے
سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"۔

(۲)

مولانا حامد الانصاری غازی نہ صرف ایک مولوی اور عالم دین تھے بلکہ
وہ ایک بلند پایہ صحافی اور مجاہد آزادی تھے، ان کی زندگی جہد وعمل سے تعبیر
تھی اس بڑھاپے میں بھی وہ اس طرح متحرک اور فعال تھے کہ ہم جیسے جوانوں
کو ان کے بڑھاپے پر رشک آتا تھا، وطن سے محبت اور اس کے لئے کچھ کر جانے
کا جذبہ انہیں پیدائشی طور پر ملا تھا، ان کے والد گرامی مرتبت حضرت مولانا محمد میاں
منصور انصاری حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی انقلابی تحریک "ریشمی رومال" کے عظیم
رکن اور صفِ اول کے کارکن تھے، مرحوم مولانا حامد الانصاری غازی ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں
اپنے آبائی وطن انبیٹھہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وقت کے
بلند پایہ استاذ اور اپنے نانا مولانا صدیق احمد انبیٹھوی سے مالیرکوٹلہ میں حاصل
کی، جہاں وہ بسلسلہ ملازمت رہتے تھے، ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۶ھ تک پانچ سال
دارالعلوم دیوبند میں پڑھا، اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت مولانا محمد انور شاہ
محدث کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی
وغیرہ اساتذہ دارالعلوم کا انتظامیہ سے اختلاف ہو گیا جس نے آگے چل کر ایک
سنگین صورت اختیار کر لی، اور جس کے نتیجہ میں دارالعلوم کے علماء وطلبہ دو گروہوں

میں بٹ گئے، محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد ادریس سکروڈوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا حامد الانصاری غازی اور مولانا عبدالوحید صدیقی اور کئی سو طلبہ ایک طرف ہو گئے، دوسری طرف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم، مولانا مولانا اعزاز علی شیخ الادب، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا عبدالسمیع دیوبندی مولانا نبیہ حسن، مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندی، مولانا سید ممتاز علی وغیرہ تھے، طلبہ کی کافی تعداد اس طرف بھی تھی، دونوں جانب سے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت واشاعت کے لئے مہاجر اور انصار کے نام سے پرچے بھی شائع ہوتے تھے، جریدہ مہاجر جو انتظامیہ مخالف گروہ کی ترجمانی کرتا تھا، مولانا حامد الانصاری غازی مرحوم ہی کی ادارت میں نکلتا تھا، آخر کار حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اپنے رفقاء کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو کر ڈابھیل (گجرات) کے مدرسہ میں چلے گئے، اسی قافلہ کے ساتھ مولانا حامد الانصاری مرحوم بھی دارالعلوم سے ترک تعلیم کر کے ڈابھیل کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔

محمد رفعت سروش بجنوری نے اپنے مضمون "علم وصحافت کا ستارہ جو غروب ہو گیا" مطبوعہ قومی آواز ۲۱ اکتوبر میں اس اختلاف کے تعلق سے لکھا ہے کہ "ایک گروہ تھا جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پیروکاروں کا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ہم نوا تھا" پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس کش مکش کا انجام یہ ہوا کہ مولانا حسین احمد مدنی دیوبند ہی میں رہے اور ان کے حریفوں نے ڈابھیل گجرات میں ایک نئے دارالعلوم کی بنا ڈالی"

موصوف کا یہ بیان واقعہ کے یکسر خلاف ہے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی

قدس سرہٗ اس وقت تک دارالعلوم نہیں آئے تھے، بلکہ اس زمانہ میں وہ سلہٹ
کے مدرسہ میں شیخ الحدیث تھے اور ان کا قیام سلہٹ ہی میں تھا، حضرت محدث
کشمیری کے دارالعلوم سے مستعفی ہو جانے کے بعد حضرت مولانا محمد احمد صاحب
مہتمم اور حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی نائب مہتمم کے طلب و اصرار پر شوال ۱۳۴۶ھ
میں دارالعلوم آکر مسند صدارت کو سنبھالا، اس لئے اس اختلاف کو حضرت مدنی سے
جوڑنا تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔

چنانچہ سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم میں لکھتے ہیں "۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں
جب حضرت شاہ صاحب دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت
دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو
اس کے شایان شان پُر کر سکے اس لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی"
(ج ۲ ص ۲۰۹)

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں:
"مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ہی جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں
شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا، سلہٹ میں آپ ۱۳۴۵ھ تک رہے
حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے پر آپ شوال
۱۳۴۵ھ (صحیح ۱۳۴۶ھ ہے) میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔"
(دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند ص ۶۷)

ذکر تو مرحوم غازی صاحب کا چل رہا تھا، درمیان میں بطور جملہ معترضہ
کے یہ بات آگئی غالباً مولانا حامد الانصاری صاحب نے ڈابھیل ہی سے فراغت
حاصل کی تھی اس مذکورہ اختلاف کی بنا پر دارالعلوم میں تکمیل تعلیم کا موقع
انہیں نہ مل سکا، سلسلۂ تعلیم کے ختم ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ تک لاہور کے ایک

اخبار سے وابستہ رہے، اس کے بعد ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۲ء تک مدینہ بجنور کے مدیر اعلیٰ رہے، غازی صاحب کے مضمون افزا قلم کی بنا پر مدینہ اخبار نے خوب ترقی کی اور اس کا شمار ملک کے اہم ترین اخباروں میں ہوگیا، کچھ دنوں تک دلی کے مشہور علمی تحقیقی اور اشاعتی ادارہ ندوۃ المصنفین سے بھی وابستہ رہے، اسی زمانے میں اپنی مشہور کتاب "اسلام کا نظام حکومت" تصنیف کی جو علمی دنیا میں اپنے موضوع پر بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے، سیرت کے عنوان پر "خلق عظیم" کے نام سے بھی آپ کی ایک قابل قدر کتاب ہے، جمعیۃ علماء کی تاریخ پر بھی ایک مختصر رسالہ ان کی یادگار ہے، شعروادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے۔

مدینہ بجنور سے علیحدہ ہوجانے کے بعد غازی صاحب نے اپنی صحافتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے بمبئی کو منتخب کیا، اور چند لوگوں کی شرکت میں "جمہوریت" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا، جو تقریباً تین سال تک نکلتا رہا، مگر شرکاء میں اختلاف رونما ہوجانے کی وجہ سے بند ہوگیا،

غازی صاحب مرحوم ابتدا ہی سے جمعیۃ علماء سے وابستہ رہے اور ایک طویل زمانے تک صوبہ مہاراشٹر کی جمعیۃ کے صدر بھی رہے ۱۳۸۲ھ سے ۱۴۰۵ھ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے، دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صدسالہ کے موقع پر مجلس شوریٰ نے اس کی انتظامی مجلس کا آپ کو سربراہ مقرر کیا تھا اور مرحوم نے اس سلسلہ میں اہم خدمات انجام دیں، وقار کے ساتھ تواضع نے مرحوم کی شخصیت کو بہت پرکشش بنادیا تھا، جس مجلس میں ہوتے مرکز توجہ بن جاتے تھے، بڑوں کی خدمات کا اعتراف اور چھوٹوں کی ہمت افزائی دل کھول کر کرتے تھے غرضیکہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔

جناب مولانا حامد الانصاری غازی اور جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کی وفات پر مہتمم دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا تعزیتی بیان

دیوبند، جناب مولانا حامد الانصاری غازی، سابق رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند کی خبر وفات کو دار العلوم کے حلقہ میں انتہائی رنج وغم کے ساتھ سُنا گیا، موصوف مرحوم حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری کے صاحبزادے، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے داماد تھے اور اپنی ذات میں مرحوم بلند پایہ عالم، دار العلوم کے فیض یافتہ، مشہور ادیب اور صحافی تھے، ان کے قلم سے متعدد کامیاب تصانیف سامنے آئیں، اور وہ ایک عرصہ تک بجنور سے نکلنے والے مشہور اخبار "مدینہ" کے کامیاب مدیر رہے، دار العلوم سے تعلق کی بنیاد پر عرصۂ دراز تک مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

مرحوم کی خبر وفات کے بعد دار العلوم دیوبند میں ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی گئی، حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند نے ان کی وفات کو بڑا حادثہ قرار دیتے ہوئے پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا ہے، خدائے عزوجل ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین۔

دیوبند۔ سابق مرکزی وزیر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کی وفات پر مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے ایک تعزیتی پیغام

ارسال کیا ہے، اس پیغام میں اس حادثۂ فاجعہ پر اپنی طرف سے نیز ارکین دارالعلوم کی طرف سے انتہائی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے دعا فرمائی کہ پروردگار عالم مرحوم کو آخرت کے بلند درجات اور آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے.

اس موقع پر دارالعلوم دیوبند میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا. حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آپ ملک اور ملّی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، آپ کی وطنی خدمات اور حق گوئی و بیباکی عرصۂ دراز تک یاد رہے گی، آپ نے انصاری صاحب کی وفات کو ایک عظیم ملی نقصان بتایا، انصاری صاحب سیکولر ذہن رکھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو ملّی مسائل سے زبردست دلچسپی تھی، دارالعلوم دیوبند سے بھی آپ کا قریبی تعلق تھا، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ ایسا نقصان ہے کہ جس کی کسک عرصۂ دراز تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

(ماہنامہ دارالعلوم نومبر ۱۹۹۲ء)

حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب جلال آبادی

بقلم: پروفیسر ماجد علی خاں صاحب

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

وطن عزیز ہندوستان کے علاوہ دنیا کے اٹھارہ ممالک میں سفر اور اکثر میں قیام کے دوران راقم السطور کی سیکڑوں جید علماء اور بیسیوں کبار مشائخ سے ملاقات ہوئی ہے اور بہت سے مشاہیر صوفیا کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے لیکن اتباع سنت، پابندیٔ شریعت، تاثیر صحبت اور حسن اخلاق ظاہرہ و باطنہ کے اعتبار سے کسی کو حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب شروانی جلال آبادی

قدس سرہ سے بڑھا ہوا نہیں پایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں تصوف کے امام تھے، اگر وہ تصوف جو در اصل تزکیۂ نفس ہے اور حدیث میں جس کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو شریعت سے جداگانہ کوئی الگ شئ نہیں ہے اس کو اس دور میں عملی شکل میں دیکھنا ہو تو خانقاہ جلال آباد میں اس کے مناظر مل سکتے ہیں۔

حضرت مولانا مسیح اللہ جلال آبادیؒ نے تصوف کو شریعت سے جدا کر کے کبھی نہیں دیکھا بلکہ اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے خیالات اور تعلیمات کے عین مطابق تصوف کو شریعت کا ہی ایک شعبہ تسلیم کیا، اس موضوع سے حضرتؒ کی مجالس اور نجی گفتگو پُر رہتی تھیں، یہی نہیں بلکہ اس موضوع پر ایک اہم تصنیف "شریعت و تصوف" کے نام سے بھی تحریر کی حضرت مولاناؒ کی جو "مجالس" زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں بھی یہ موضوع بکثرت ملے گا۔

حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب نور اللہ مرقدہ کی ولادت شریفہ ۱۳۲۹ھ یا ۱۳۳۰ھ کو آپ کے وطن سرائے برلہ تحصیل اترولی ضلع علی گڑھ میں شروانی خاندان میں ہوئی، چونکہ بالتعین تاریخِ پیدائش معلوم نہیں ہے اس وجہ سے دو سال لکھے گئے ہیں، آپ کا تعلق شروانی خاندان سے تھا جو ہمیشہ سے ہی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے پٹھانوں کا ایک ممتاز خاندان رہا ہے جس میں نہ صرف بڑے بڑے رؤسا، اُمراء اور اہل ریاست پیدا ہوئے بلکہ اہل کمال صوفیاء اور اہل اللہ علماء بھی ہوئے۔

ضلع علی گڑھ کا موضع برلہ ایک پرانا موضع تھا جو کہ باقاعدہ طور پر مسلم عہد حکومت میں بسایا گیا تھا، اس موضع میں شروانی خاندان کے ایک مقتدر

صاحب حیثیت شخص صفات خاں صاحب تھے وہی حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ تھے، آپ کے والد ماجد احمد سعید خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت ذکی قابل اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں ہوئی اور بعد کو فارسی و عربی کی تعلیم بھی آپ نے اپنے وطن میں ہی حاصل کی، مشکوۃ سے نیچے درجہ تک کی علومِ دینیہ کی کتابیں آپ نے اپنے وطن میں ہی حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، بعد میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور مشکوٰۃ ہدایہ وغیرہ اور دورۂ حدیث کی کتب دارالعلوم میں پڑھ کر علوم دینیہ کی فراغت حاصل کی اور فضیلت سے سرفراز ہوئے۔

جس سال آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اسی سال آپ نے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور باقاعدہ اصلاحی خط و کتابت کا سلسلہ شروع فرمایا، کچھ عرصہ کے بعد اسی سال یا اگلے سال آپ حضرت تھانوی رح سے باقاعدہ بیعت ہوئے جس سال آپ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوتے اسی سال یعنی ۱۳۵۱ھ میں ۲۵ شوال کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خلافت مرحمت فرمائی، آپ کی فطری صلاحیتوں اور اکتساب فیوض کی خصوصیت کی وجہ سے کم عمری میں ہی آپ کا شمار حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مخصوص خلفاء میں ہونے لگا، جن گیارہ مجازین پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو خصوصی اعتماد تھا ان میں آپ کا شمار بھی ہوتا تھا۔

اس وقت جلال آباد (ضلع مظفر نگر، یوپی) میں ایک معمولی سا مدرسہ تھا، جلال آباد تھانہ بھون سے تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر سہارنپور کی جانب

واقع ہے، آپ ۱۳۵۷ھ میں اپنے پیرومرشد حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ارشاد سے جلال آباد تشریف لائے اس وقت مدرسہ کے کل دو کمرے تھے، ایک حافظ صاحب تھے اور دوسرے مدرس، حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب مقرر ہوئے، آپ اس مدرسہ کی خدمت میں مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے بموجب تن و جان سے لگ گئے، یہاں تک کہ جب آپ اس دنیا سے عالم آخرت منتقل ہوئے تو وہ معمولی سا دو کمروں والا مدرسہ ایک بڑے دارالعلوم، جامعہ مفتاح العلوم میں تبدیل ہوچکا تھا جس میں اس وقت تقریباً پانچ سو طلبار مختلف مراحل میں علوم دینیہ کی تکمیل کر رہے ہیں، منتہی طلبہ دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کر کے درس نظامی کی فضیلت سے سرفراز ہوتے ہیں، مدرسہ میں افتار کا بھی نظم ہے اور فراغت کے بعد باصلاحیت خواہش مند طلبہ کو افتار کی بھی تربیت دیجاتی ہے۔

اس وقت مدرسہ کی عالیشان بلڈنگ ہے، اس سے ملحق ایک بہت خوبصورت اور وسیع مسجد ہے، کئی دارالاقامہ ہیں، اور مدرسہ کی اپنی جائداد بھی موجود ہے، اس مدرسہ میں باہر ممالک خصوصاً ساؤتھ افریقہ، انگلینڈ، اور فرانس کے طلبار بھی بڑی تعداد میں علم حاصل کرتے ہیں، مسجد سے ملحق برآمدوں میں خانقاہ ہے جس میں بالائی اور تحتی منزلوں میں سترہ کمرے ہیں، خانقاہ میں طالبین قیام کرتے ہیں، یہ حضرات حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیر نگرانی سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے اپنے مولیٰ سے لو لگاتے تھے، اور اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صاجزادے و جانشین حضرت مولانا محمد صفی اللہ خاں صاحب شروانی جلال آبادی دامت برکاتہم کی نگرانی میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں، وفات سے کافی عرصہ قبل

حضرت رحمہ اللہ نے اپنی جگہ اپنے صاحبزادے حضرت مولانا صفی اللہ خانصاحب دامت برکاتہم عرف بھائی جان کو ہی جامعہ مفتاح العلوم کا مہتمم مقرر فرما دیا تھا۔

مدرسہ میں دورۂ حدیث شروع ہونے کے بعد سے وفات سے تقریباً پندرہ سولہ سال قبل تک بخاری شریف کا درس حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود ہی دیتے تھے بعد کو پیرانہ سالی کی وجہ سے درس بخاری تو بند کر دیا تھا لیکن ختم بخاری شریف خود ہی کرتے تھے ختم بخاری شریف کے دن مدرسہ میں ایک میلہ سا لگا ہوتا تھا اور ہزاروں لوگ دعا میں شرکت کرنے آتے تھے، ایک سال قبل جبکہ راقم السطور بھی ختم بخاری میں آخری بار شریک ہوا تھا، ایک تخمینہ کے مطابق پچاس ہزار سے زیادہ افراد نے ختم بخاری میں شرکت کی تھی، آس پاس کے اضلاع اور دور دراز کے علاقوں سے لوگ اس متبرک جلسہ میں شریک ہونے آئے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ختم بخاری کی تقریر تین ساڑھے تین گھنٹہ کی ہوتی تھی اور بعض مرتبہ اس سے بھی زیادہ، یعنی تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹہ میں بخاری شریف کی آخری حدیث کی تشریح فرماتے تھے جو ایک زبردست عالمانہ لکچر ہوتا تھا، یہ تقریر طبع بھی ہو چکی ہے جس سے آپ کی وسعت علم اور دقیق النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خاں صاحب شروانی جلال آبادی قدس سرہٗ ایک زبردست اور جید عالم دین تھے، اب تک مطبوعہ مجالس کے پندرہ حصوں کو اگر شامل کر لیا جائے تو آپ کی ۲۵ سے زیادہ تصنیفات ہیں، اس میں شرح بخاری "فضل الباری" (اردو) کے چار حصے شامل ہیں، افسوس کہ یہ شرح مکمل طور پر طبع نہ ہو سکی ہے۔

تصوف میں آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "شریعت و تصوف" ہے جس میں

آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ تصوف دراصل شریعت ہی کا ایک جزو ہے، کتاب کے شروع میں ہی آپ تحریر فرماتے ہیں "شریعت کا وہ جز جو اعمال باطنی سے متعلق ہے تصوف وسلوک، اور وہ جز جو اعمال ظاہری سے متعلق ہے فقہ کہلاتا ہے" یہ کتاب دو حصوں میں ہے پہلے حصہ میں حقیقت تصوف، ضرورت تصوف اور قرآن کے تحت عنوانات ہیں جس میں مدلل طریقہ سے تصوف اور شریعت کے ربط پر گفتگو کی گئی ہے، بعد میں اس میں شیخ کامل کی پہچان، مرشد کے حقوق، مجاہدہ، اخلاق رذیلہ، اخلاق حمیدہ، اخلاص، توبہ، محبت، شوق، خوف، رجاء، زہد، توکل، صدق، تفویض، رضا وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، کتاب کے دوسرے حصے میں اصطلاحات تصوف سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ مزاجاً بہت نرم، خوش خلق، مہمان نواز، مستجاب الدعوات اور متبع سنت تھے، آپ تقویٰ، حلم، تواضع اور مروّت کے اعلیٰ درجات پر فائز تھے، اس مختصر مضمون میں آپ کی صفات عالیہ پر گفتگو کرنا مشکل ہے، مختصر یہ کہ آپ قول وعمل میں پوری طرح سنت نبوی کے پابند تھے، اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے، سونے اور جاگنے میں شدت سے سنت پر عمل فرماتے تھے، یہاں تک کہ جوتا تک پہننے میں اور اتارنے میں بھی راقم السطور نے کبھی بھی آپ کو خلاف سنت کوئی عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

حضرت کی توجہ باطنی کا ایک معمولی سا واقعہ تحریر کیا جاتا ہے، ایک مرتبہ شاید بارہ تیرہ سال قبل حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے حکم دیا کہ میں حضرتؒ کے نعلین مبارک پہنوں، میں نے حکم کی تعمیل کی، چند منٹ کے بعد جب میں نے نعلین مبارک اتاریں تو اپنے آپ کو "سلطان الاذکار" میں مشغول پایا، یعنی میرے جسم کے روئیں روئیں سے اللہ کا ذکر نکل رہا تھا حضرت والا کے قالین، پلنگ، بستر اور

ان دیواروں کو جہاں آپ تشریف فرما ہوتے تھے، خود راقم السطور نے ذکرِ الٰہی میں مشغول محسوس کیا، لیکن ہمارے نزدیک تصوف میں ان چیزوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، کیونکہ ان کا تعلق کشف وکرامت سے ہے نہ کہ اعمال اختیاری سے، غیر اختیاری اعمال کا درجہ تصوف میں سمندر کے جھاگوں جیسا ہے، دراصل ولایت اور تصوف کی انتہا مکمل اور کامل اتباع سنت اور پابندی شریعت بمع ملکۂ یادداشت اور تعلق باللہ ہے۔ ہمارے نزدیک شیخ کامل کی پہچان بھی پابندی شریعت واتباع سنت بمع ملکۂ یادداشت و تعلق باللہ ہے نہ کہ کشف وکرامات۔

حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خاں صاحب شروانی رح کی وفات ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء مطابق ۷ ارجمادی الاول ۱۴۱۳ھ کو شب جمعہ میں سوا بارہ بجے ہوئی جنازہ میں تخمینہ کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد تھے، بعد نماز جمعہ آپ کی تدفین جلال آباد (ضلع مظفر نگر، یوپی) میں ہوئی۔

(ماہنامہ دارالعلوم دسمبر ۱۹۹۲ء)

مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری

از: پروفیسر سید محمود اللہ بختیاری

ہمارے والد محترم حضرت مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری حسینی ۱۱ر مئی کی صبح اس دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ درخواست کی

جاتی ہے کہ حسنات قبولیت ، درجات کی بلندی اور مغفرت کی دعا کی جائے۔

رحلت سے ایک ہفتہ قبل ذکر الٰہی جاری ہوگیا تھا، کلمہ طیبہ کا ورد زور زور سے کرنے لگے اور یہ آیت وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ۔ زبان پر جاری رہی اور اسی حالت میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

والدِ محترم اپنے آبائی وطن رائے چوٹی ضلع کرپہ آندھراپردیش میں قیام پذیر ہوکر دعوت واصلاح کی عظیم ترین خدمت میں مصروف رہتے تھے، علماء کی تربیت کا ایک خصوصی پروگرام رکھتے تھے اور اس کا کورس بھی بنایا تھا، خطاب عام اور خصوصی ملاقاتیں بھی رہتی تھیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں رائے چوٹی میں بعارضۂ قلب بیمار ہوئے تو اطلاع پاکر میں اور میرے فرزند مولوی سید کمال اللہ بختیاری ندوی رائے چوٹی سے مدراس لے آئے ان کے خصوصی ڈاکٹر کے مشورہ سے جنرل ہسپتال مدراس میں داخل کیا گیا اللہ نے فضل فرمادیا اور طبیعت سنبھل گئی، تقریباً پچاس دن ہسپتال میں رہے، مولوی سید حماد اللہ بختیاری اور مولوی سید محمد اللہ ضیاء بختیاری بھی خدمت میں لگے رہے اور ہمیشہ آتے رہے،

عارضۂ قلب اور پیرانہ سالی اور دن بدن بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر والدِ محترم کو ہسپتال میں شدید احساس ہوگیا تھا کہ وہ اپنے قائم کردہ اصلاحی ادارہ معہدِ احسانی کے مقاصد کو بروئے کار نہ لاسکیں گے، اور مزید اس بات کا بھی اظہار فرمایا کہ آئندہ اکیڈمک قسم کا کام نہیں کریں گے، اور وصیت فرمادی کہ

معہدِ احسانی کے نام سے جو زمین رائے چوٹی میں خریدی گئی ہے اور زمین خریدنے کے بعد جو بھی رقم موجود ہے صرف اسی رقم سے اس وقف شدہ زمین پر ایک لائبریری کی شکل دی جائے اور ان کی جملہ کتابیں جو وقف ہیں ترتیب دیجائیں تاکہ اہلِ علم مستفید ہوں۔ تحریرًا مجھے حکم دیا گیا کہ ان کتابوں کی ترتیب اور حفاظت کروں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کی سہولت جلد عطا فرمادے اور والدِ محترم کی یہ آخری خواہش پوری ہوجائے۔

صحت یابی کے بعد ڈاکٹروں نے مدراس میں گھر پر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ گھر پر ذیابیطس اور السر کا بھی علاج ہوتا رہا، گفتگو اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہا، شگفتگی متانت اور گفتگو کا وہی علمی اور خصوصی رنگ رہتا، بیماری کے باوجود قوتِ حفظ اور یادداشت غیر معمولی تھی مخلصین اور معتقدین ملنے آتے تو یہ شعر پڑھتے ؎

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے گفتگو کرتے اور ہر ایک کی صلاحیت کے مطابق اصلاحِ باطن کی تلقین فرماتے اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہا، علماء تشریف لاتے تو علمی باتیں ہوتیں، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی طرف توجہ دلاتے اور گھر والوں پر خصوصی توجہ فرماتے اور سب کو ہدایات و مشورے دیتے رہتے اور سب کے حق میں دعا فرماتے۔ سید محمد اللہ ضیا بختیاری اکثر والدِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے، حضرت مولانا سید شاہ مرشد پیراں، قادری قاضی رائے چوٹی، مولوی سید حمید اللہ بختیاری شاطر، مولوی سید احمد اللہ بختیاری، مولوی سید مخدوم محی الدین قادری اور

دوسرے بھائی بھی آتے رہتے ، والد محترم کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ املا کرواتے کوئی علمی اور احسانیات سے متعلق بات سمجھاتے، مختلف کتابوں کو پڑھواتے اور تبصرہ فرماتے گراں قدر مشورے دیتے کہ کس طرح جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں دینی بیداری پیدا کی جائے۔

اپنے اکابر اور اساتذہ کا بڑا احترام سے نام لیتے اور اپنی ملاقاتوں کا ذکر فرماتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کل کی بات ہے، خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح اور اپنے نانا حضرت مولانا سید شاہ قادر باشا حسینی قادری رح اور دادا حضرت مولانا سید شاہ علیم اللہ بختیاری حسینی رح جنھوں نے اس شہر (رائے چوٹی) میں شرک وبدعات کیخلاف دعوتی واصلاحی کام انجام دیا تھا کا ذکر کثرت سے فرماتے، اپنے ساتھیوں کا تذکرہ ہمیشہ کرتے اور واقعات سناتے، خصوصاً اپنے ساتھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا ذکر خیر بڑی مسرّت سے فرماتے اور کہتے کہ اللہ نے انھیں خدماتِ دینیہ وملیہ کے لیے منتخب فرمایا ہے اور دعائے صحت کرتے رہتے۔

حضرت مولانا سید اسعد حسینی مدنی مدظلہ العالی جب بھی مدراس آتے مزاج پرسی کے لیے گھر پر تشریف لاتے، حضرت مولانا کی تشریف آوری سے والدِ محترم بہت خوش ہوتے اور اپنے والہانہ تعلق کا اظہار فرماتے اور بار بار حضرت مولانا کی دینی وملی خدمات کا ذکر کرتے اور آپ کے حق میں بھی دعا فرماتے رہتے۔ اپنے شاگردوں کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے خصوصاً حضرت مولانا ابوالبیان حماد عمری کا ذکر کرتے۔

گھر پر ہی ڈاکٹر آتے، معائنہ جات ہوتے اس طرح علاج کا سلسلہ اور تیمارداری چلتی رہی، کبھی کمزوری بڑھ جاتی اور پھر طبیعت سنبھل جاتی تقریباً چودہ ماہ گھر پر علاج اور نگرانی ہوتی رہی۔

اپریل ۱۹۹۳ء کے پہلے ہفتہ میں یکایک طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر گھر پر علاج کرتا رہا جب طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو ڈاکٹر کے مشورہ سے ۲۴/ اپریل ۱۹۹۳ء کو عائشہ ہوسپٹل پرائیویٹ مدراس میں داخل کیا گیا، معقول علاج رہا، ہر ممکنہ تدبیر کی گئی لیکن مشیت الٰہی کو یہی منظور تھا کہ ۱۷ دن کی علالت کے بعد ۱۱/ مئی ۱۹۹۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ اس قدر جلد والد محترم سے ہم جدا ہو جائیں گے۔

ان کی وصیت کے مطابق آبائی وطن رائے چوٹی لے جایا گیا اور ۱۲/ مئی ۱۹۹۳ء کی صبح تجہیز و تکفین کے بعد مدرسہ امدادیہ رائے چوٹی کے وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی، قاضی سید شاہ مرشد پیراں قادری نے نماز پڑھائی اور دعائے مغفرت کی جس میں تمام عزیز واقارب، فرزندان، مشائخ عظام اور علماء کرام تلامذہ، مریدین، خلفاء، اور معتقدین بڑی تعداد میں شریک ہوئے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے اور درجات بلند فرما کر جنت الفردوس عطا کرے ان کے اعمال حسنہ اور خدمات دینیہ دعوت کی تڑپ اور ملت کی خیر خواہی کو اپنے فضل ورحمت سے قبول فرما کر مراتب عالیہ سے نوازے آمین۔

حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب شیرکوٹیؒ

بقلم:۔ مولانا بلال احمد شیرکوٹی۔

۱۲/ جون ۱۹۹۳ء بروز پیر عالم ربانی استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن

صاحب شیر کوٹی اپنے ہزاروں عقیدتمندوں کو سوگوار چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ کے آخری عشرے میں اپنے ایک سعید شاگرد رشید مولانا نور محمد صاحب مدظلہ' گجراتی (جو اس وقت مکۃ المکرمہ میں مقیم ہیں) کی درخواست پر حضرت مولانا محمد محفوظ الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ بنیت عمرہ حجاز مقدس تشریف لے گئے، جانے کے فوراً بعد عمرہ ادا کیا، وہاں پر اور بہت سے تلامذہ کی کوششوں سے ویزا میں اضافہ ہوگیا اور حج بیت اللہ تک رہنے کی اجازت مل گئی، عزیز واقربا کو بھی علم ہوگیا کہ اب حضرت مولانا حج بیت اللہ کے بعد ہی تشریف لائیں گے۔ سبھی متعلقین خاص طور پر آپ کے برادر کبیر حضرت مولانا محمد شریف الحسن صاحب مدظلہ' نہایت مسرور تھے اور بار بار شکر رب العٰلمین میں رطب اللسان تھے۔ دوران قیام مکۃ المکرمہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ، طواف، درس و تدریس جیسے مبارک اعمال صالحہ میں ہمہ تن مشغول ومصروف رہے۔ اپنے اساتذہ سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ سب کے نام سے طواف کیے، اور تلامذہ سے غایت درجہ کی شفقت ومحبت دیکھیے کہ ہر ایک کے نام سے بھی ایک ایک طواف کیا، جن کی تعداد تقریباً ایک سو ساٹھ ہے۔ مناسک حج کی تکمیل کے بعد مراجعت وطن کا ارادہ فرمایا، اور ۱۰؍جون ۱۹۹۳ء بروز جمعرات تقریباً ۲ بجے صبح بمبئی پہونچ گئے، متعلقین نے حج بیت اللہ سے واپسی پر مرحبا کہا، بمبئی میں مقیم شاگردوں سے ملاقات ہوئی، دو دن بمبئی قیام کرکے شیر کوٹ کے لیے روانہ ہونے کا پروگرام تھا، راجدھانی ایکسپریس کا ٹکٹ تھا، مولانا کے ایک شاگرد رشید برادرم مولوی محمد عرفان نجم شیر کوٹی آپ کو گاڑی میں سوار کرانے کی غرض سے اسٹیشن تک آئے ہوئے تھے، حضرت نے ان کو ٹکٹ دیا کہ گاڑی

میں سیٹ نمبر وغیرہ دیکھ کر آؤ، طبیعت بالکل ٹھیک تھی، مولانا محمد عرفان صاحب حضرت کو پلیٹ فارم پر سامان کے پاس کھڑا ہوا چھوڑ کر سیٹ تلاش کرنے کی غرض سے گاڑی میں داخل ہوئے، ادھر فرشتۂ اجل نے حضرت مولانا سے ملاقات کی۔

واپسی پر مولوی عرفان دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا اپنی جگہ پر نہیں ہیں، فکر لاحق ہوئی کہ آخر اتنی جلدی کہاں چلے گئے۔ ادھر اُدھر پاس میں کھڑے ہوئے مسافروں سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ ان کو پولیس والے اسٹریچر پر لٹا کر ایک کمرے میں لے گئے ہیں۔ جا کر دیکھا تو مولانا زمین پر دراز ہیں اور منھ سے لعاب نکل رہا ہے، تنفس پر اتنا اثر کہ سانس بہت آہستہ آہستہ آرہا ہے یہ گھبرائے اور ذرا قریبی ہسپتال میں لے جا کر چیک کرایا، تو یہ سنکر کہ حضرت تو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں، حواس باختہ ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ فوراً دہلی اسٹیشن پر منتظرین آمد کو اس حادثۂ فاجعہ کی بذریعۂ فون اطلاع دی گئی بس پھر کیا تھا قیامتِ صغریٰ برپا ہو گئی، حضرت کے بڑے بھائی حضرت مولانا شریف الحسن صاحب مدظلہٗ، تو غم کی تاب نہ لا کر فوراً ہی بے ہوش ہو گئے، ہر شخص اپنا سر گریبان میں ڈالے اشک بار نظر آرہا تھا۔ جو گھر اس آنے والے مقدس مہمان کے خیر مقدم میں خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا چشم زدن میں ماتم کدہ بن گیا۔ یہ اندوہناک خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور قصبے کے اطراف و اکناف، نیز ضلع کے مختلف مقامات کے علاوہ دور دراز سے آپ کے متعلقین احباب و معاصرین اور تلامذہ کی آمد شروع ہو گئی ۱۴ر جون ۹۳ء بروز پیر علی الصبح مولانا مرحوم کا جسد خاکی اپنے چند غم زدہ شاگردوں اور اقرباء کے ساتھ شیر کوٹ پہنچ گیا۔

احقر آج صبح ہی سے منتظر تھا کہ حضرت مولانا کی آمد کا علم ہو تو شیر کوٹ جاؤں دوسرا گھنٹہ جلالین شریف (جلد ثانی) کا شروع ہی ہوا تھا اور چند آیات ہی پڑھا سکا تھا کہ بھائی شبیر احمد صاحب شیشگر کے صاحب زادۂ محترم میرے پاس پہنچے، میں نے ان سے معلوم کیا کہ مولانا تشریف لے آئے؟ تو انھوں نے نہایت درد بھرے لہجے میں بتایا کہ "تشریف تو لے آئے مگر جسم و روح کے افتراق کے ساتھ بس میرے دل پر بجلی سی گر پڑی، میں ہکا بکا سا رہ گیا، خود کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو گیا مگر صبر و ضبط کا دامن تھامے ہوئے مدرسہ کی تعلیمی چھٹی کر کے انکے ہمراہ شیر کوٹ پہنچ گیا۔

تقریباً ½ ۱ بجے میت کو غسل دلایا گیا، غسلِ میت حضرت کے ماموں زاد بھائی صلاح الدین صاحب نے دیا۔ ان کے معاونین میں مولوی عبید الرحمن صاحب مولوی بدر الدین مولوی ڈاکٹر علاء الدین مولوی ڈاکٹر رئیس احمد صاحب، مولانا عبد الغفار صاحب، مولوی محمد عرفان صاحب، مولوی ڈاکٹر محمد صدیق صاحب کر تپوری کے ساتھ احقر بھی شامل تھا، غسل اور تجہیز و تکفین کے بعد، بعد از ظہر آپ کا جنازہ نہایت مختصر راستے سے مدرسہ رحمانیہ تک لے جایا گیا۔ نمازِ جنازہ آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا شریف الحسن صاحب مدظلہ نے پڑھائی، جملہ عمائدین شہر اور علماء ضلع بھر کے تلامذہ و متعلقین نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی اور اپنے والدِ بزرگوار قطب الاقطاب حضرت مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب نور اللہ مرقدہ کی آغوش میں ہمیشہ ہمیش کے لیے محوِ خواب ہو گئے۔ موصوف مرحوم تقریباً ۴۹ برس کے تھے اپنی مختصر سی زندگی میں بے شمار قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی امور انجام دیے۔ جن میں مدرسہ رحمانیہ کا قیام، مسلم فنڈ کا قیام اور اس کے تحت ایک زنانہ ہسپتال، قبرستان کی حد بندی کرنا وغیرہ بطورِ خاص ذکر ہیں۔

قارئین سے درخواست ہے کہ مرحوم ومغفور کے لیے دعاءِ مغفرت و رفع درجات فرمائیں خداوند کریم پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین!!

حضرت الحاج مولانا نیاز محمد صاحبؒ

• ازجناب عبدالرحیم ہڈیڈلوی

انتہائی افسوس اور رنج والم کے ساتھ خدمتِ عالیہ میں یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ میوات کی عظیم شخصیت متبحر عالم، فقیہ ومحدّث ومرشدِ کامل حضرت الحاج مولانا نیاز محمد صاحب (مجاز شیخ الاسلام مدنیؒ) صدر جمعیۃ علماء صوبہ وامیر شریعت ہریانہ وہماچل ۱۶ر جون ۹۲ءکو صبح نو بجے اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولانا مرحوم کو خداوند قدوس نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا آپ زبردست عالم ہونے کے ساتھ مرشد کامل بھی تھے، دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد ۵ سال مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب (بانی تبلیغ) قدس سرہٗ کے پاس رہ کر تدریسی وتبلیغی خدمات انجام دیں، اس کے بعد ۴۰ءمیں میوات کے علمی مرکز مدرسہ معین الاسلام نوح میں تشریف لائے اور مسندِ صدارت پر فائز رہ کر ۱۸ر سال تک درسِ حدیث دیتے رہے، بعدازاں اپنے ہی قائم کردہ مدرسہ قاسم العلوم واقع درگاہ حضرت موسیٰ بلّہ نوح کے اہتمام وصدارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اسے ترقی دے کر دورۂ حدیث کی تکمیل تک پہنچایا جو بحمدللہ آج بھی عروج پر ہے اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھ کر عربی واردو میں تقریباً ڈھائی درجن اہم کتابیں تصنیف فرمائیں جنہیں

الدّر المنضد، عمدۃ اللبیب، فتوحات الباری، النجاۃ الکاملہ ۲ حصص طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ارشاد و سلوک کے سلسلے میں آپ کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا، بڑے بڑے علماء آپ سے وابستہ رہ کر اصلاحِ باطن میں مصروف ہیں اور کئی حضرات کو آپ سے اجازت و خلافت بھی مل چکی ہے۔ بڑی عمر میں آپ کو قرآن کریم حفظ کرنے کا شوق ہوا اور صرف ۳ ماہ کی مدت میں مکمل قرآن شریف حفظ کرلیا.......... آخری عمر تک تلاوت کا بہت شغل رہا، مطالعۂ کتب آپ کا محبوب مشغلہ تھا بہت ہی بلند اخلاق اور باوضع تھے، مجلس میں اکثر علمی مذاکرے اور مسائل پر گفتگو ہوتی تھی آخری وقت تک ذکر اللہ جاری رہا اور نہایت سکون کے ساتھ جانِ جاں آفریں کے سپرد کردی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔ پسماندگان میں ایک بیوہ دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں پورے گھر میں علمی و دینی ماحول ہے، آپ سے درخواست ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کے لیے ایصال ثواب و دعائے مغفرت فرمائیں۔

(رسالہ دارالعلوم اگست ۹۳ء ص۵۱)

مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری

از:۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پورا اعظم گڑھ

ایک حادثہ جو ہر اس شخص کے لیے یقینی ہے جس نے اس دنیائے ناپائدار میں قدم رکھا ہے اور جس نے زندگی کی آنکھ کھولی ہے، بہر حال اسے اس حادثہ سے دوچار ہونا ہے، ہر شخص اللہ کے پاس سے ایک لکھی لکھائی عمر لے کر آیا ہے لیکن نہ اسے خبر کہ وہ کتنی ہے؟ اور نہ دوسروں کو پتا کہ وہ ہمارے درمیان کتنے دن رہے گا؟ لیکن اس کے باوجود آدمی صحت و تندرستی دیکھ کر، جوانی

نوعمری دیکھ کر، قوت وطاقت دیکھ کرایک اندازہ کرتا ہے کہ ابھی حیات دراز ہے، ابھی اور جینا ہے، ابھی مرنے والی نہ عمر ہے نہ صحت، اور اسی اندازہ سے وہ مطمئن رہتا ہے، اور ایسا مطمئن رہتا ہے جیسے وہ اس "حادثۂ ناگزیر" کو ٹالنے میں کامیاب ہو چکا ہو۔ مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی عمر کی گنتی پوری کر کے چل دیتا ہے تو وہ تو اپنا اعمالنامہ لے کر خدا کے حضور پہنچ جاتا ہے لیکن اسے دیکھنے والے، اس سے تعلق رکھنے والے اور اس کی محبت میں جینے والے ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ کیا ہوا؟۔ ابھی تو بالکل صحت مند تھے، ابھی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی تو جوان تھے، ابھی تو جوانی ڈھلی ہی تھی، بڑھاپا کہاں آیا تھا؟ ارے اس کا تو وہم بھی نہ تھا، لیکن اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔

آج قلم ایسا ہی ایک حادثہ لکھنے پر مجبور ہو رہا ہے، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارے محبوب استاذ، بہترین مشیر، ہمہ تن شفقت ومحبت، رہبر ورہنما حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمھوری اس طرح اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چل دیں گے، کتنے صحت مند تھے؟ کیسے توانا تھے؟ صرف بال ہی تو سفید ہوئے تھے، بڑھاپے کا اور تو کوئی نام ونشان بھی نہ تھا، کیا بیماری تھی انھیں؟ بیماری تو انھیں محض چھو کر گزر جاتی تھی، ابھی کئی دن ہوئے مدرسہ شیخ الاسلام کی شوریٰ کی میٹنگ میں آئے تھے، کتنے ہشاش بشاش تھے رات میں دیر تک مجلس شوریٰ کا اجلاس چلتا رہا۔ انھیں کی صدارت میں اجلاس ہو رہا تھا، ان کی رائے سب کے لیے قابل تسلیم ہوتی تھی، صبح انھیں واپسی کی جلدی تھی لیکن مدرسہ کا ایک ضروری کام انھیں پر موقوف تھا، نماز فجر پڑھ کر اس طرح یکسو ہو کر اس کے لیے بیٹھے، جیسے انہیں اور کوئی کام ہی نہیں، پورے انشراح

وانبساط کے ساتھ اس معاملے کو طے کیا اور پھر یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے جانے کے لیے دیر سے تیار رہے ہوں، کون جانتا تھا کہ حالتِ صحت کا یہ آخری دیدار ہے۔

۲۳ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو اچانک اطلاع ملی کہ کل مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، غسل کرنے کے لیے حمام میں تشریف لے گئے تھے، وہیں یہ حملہ ہوا، کسی کو خبر نہ تھی، کئی گھنٹے کے بعد لوگوں کو احساس ہوا تو دروازہ توڑ کر اندر گئے، تو گرے ہوئے تھے، ہوش قائم تھا، پوچھنے پر جواب بھی دیا۔ مگر آہستہ آہستہ ہوش کم ہوتا گیا۔ معلوم ہوا کہ اعظم گڑھ کے ایک شفاخانہ میں داخل ہیں، دل دھک سے ہو کر رہ گیا، بھاگم بھاگ اعظم گڈھ پہنچا، آہ کہ وہ شفقت و کرم کا پیکر مجسم، جس کے چہرے پر اپنے عزیزوں کو دیکھتے ہی خوشی و مسرت کا نور دمک اٹھتا تھا آج اس طرح بے سدھ پڑا ہے کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہیں، بایاں حصہ بالکل مفلوج ہے، آنکھیں بند ہیں، دایاں ہاتھ اور دایاں ہاتھ پاؤں حرکت کر رہا ہے، میرا مولانا سے شاگردانہ تعلق اٹھائیس انتیس سال سے ہے، لیکن میں نے کبھی انھیں ننگے بدن نہیں دیکھا تھا، آج صرف ایک لنگی بندھی ہوئی جو نظر آئی تو طبیعت بے قابو ہوگئی، قریب جا کر دھڑکتے دل سے سلام کیا، تو سلام کا جواب دیا، نام بتایا تو اچھا کہا مگر آنکھیں نہیں کھول سکے، چند گھنٹے ان کی خدمت میں رہا، پھر واپس چلا آیا کہ کل پھر آؤں گا کل پہنچا تو معلوم ہوا کہ حالت نازک ہوتی جا رہی تھی اس لیے ڈاکٹروں کے مشورے سے لوگ رات ہی میں لکھنؤ لے گئے۔ پھر لکھنؤ سے کبھی امید کی خبر آتی اور کبھی یاس کی بات ہوتی۔

آخر ۲۹ محرم ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۹۳ء کو بعد نمازِ مغرب

اطلاع آئی کہ مولانا کا وصال ہوگیا، سنتے ہی سر چکرا گیا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، دل صدمے سے چور چور ہوگیا، رات کس طرح گزری بس کچھ نہ پوچھیے، نیند آتی تھی اور مولانا کا شاداب چہرہ سامنے آجاتا تھا، بس آنکھ کھل جاتی تھی، صبح سویرے بمہور پہنچا، سوگواروں کا ہجوم تھا، اکثر آنکھیں سرخ تھیں، صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا محمد راشد صاحب سلمہ کو دیکھا تو آنکھیں برس پڑیں، ایک جملہ بھی تو تسلی کا ادا نہ ہوسکا سب صورتِ سوال بنے ہوئے تھے، کہ یہ اچانک کیا ہوگیا؟ ہر ایک چہرہ اداس تھا، عوام بھی تھے، خواص بھی تھے، طلبہ بھی تھے، لیکن سب کے چہروں پر رنج واندوہ کی گہری پرچھائیاں تھیں مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور جس کے وہ عملاً سرپرست تھے، کے اساتذہ وطلبہ آگئے تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے طلبہ واساتذہ بھی تھے، ان کے علاوہ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد، جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج، مدرسہ عین الاسلام نوادہ کے اساتذہ ومنتظمین پہونچ گئے، جامعہ رشیدیہ بمہور کے تو سبھی حضرات تصویرِ غم بنے ہوئے تھے۔

مولانا کو غسل دیا گیا، کفن پہنایا گیا، کتنا نرم اور گداز بدن تھا، موت نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی تھی، بدن جیسا زندگی میں تھا پس مرگ بھی ویسا ہی رہا، کیا مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ایسا ہی ہوتا ہے؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرام کی نیند سو رہے ہوں، چہرے پر تازگی وشادابی تھی، نماز جنازہ انکے استاذ مکرم حضرت مولانا عبد المنان صاحب مدظلہ نے پڑھائی اور ساڑھے دس بجے دن میں یہ گنجِ گراں مایہ تہِ خاک چھپا دیا گیا، ان سارے مراحل میں یہ خادم وشاگرد شریک رہا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کی روح کو سکون واطمینان بخشے اور انھیں جنت میں جگہ دے۔

دفن کرکے آئے تو ذہن میں ماضی کے دریچے کھل گئے، پچھلی یادیں ایک ایک کرکے آنے لگیں، دل شکستہ اور زخم خوردہ ہے، قلم تھر تھرا رہا ہے، لیکن اسکے باوجود تقاضا ہے کہ ان یادوں کو کاغذ کے حوالے کردوں، شاید دلِ محزوں کو کچھ تسلی ہو۔

شوال کے مہینے سے عربی مدارس اپنا نیا تعلیمی سال شروع کرتے ہیں داخلہ کے خواہش مند طلبہ ابتداءِ ماہِ شوال میں ان مدارس کا رخ کرتے ہیں۔ ہجری سن غالباً ۱۳۸۴ھ تھا اور عیسوی سنہ ۱۹۶۴ء رہا ہوگا۔ ایک ڈرا سہما طالب علم اپنے ایک رفیق اور رہنما کو لے کر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ کے لیے پہنچا، ناظم مدرسہ نے حکم دیا کہ مولانا محمد مسلم صاحب کو جاکر امتحانِ داخلہ دو، وہ مولانا کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحب ہینڈ پائپ سے پانی نکال رہے ہیں کسی نے بتایا کہ یہی مولانا محمد مسلم صاحب ہیں، متوسط قد، تندرست گٹھا ہوا جسم، گہرا سانولا رنگ پورے چہرے پر خوب صورت بھری سیاہ داڑھی، آنکھیں مخمور سی، چہرہ بارُعب، لمبا کرتا، تنگ مہری کا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا سر پر دوپلی خوب صوت ٹوپی، کندھے پر بڑا سا رومال، بہت ہی جامہ زیب نظر آئے۔ انہوں نے کھڑے ہی کھڑے امتحان لیا، صرف تین سوال کیے۔ پہلے دو سوال کا جواب دے دیا مگر تیسرے کا جواب نہ بن پڑا۔ کیونکہ جس کتاب کا سوال انھوں نے کیا تھا وہ اس کی پڑھی ہوئی نہ تھی۔ اسے عربی دوم میں داخلہ لینا تھا لیکن تعلیمی لحاظ سے اس لائق نہ تھا مولانا نے فرمایا کہ رعایتاً عربی دوم میں تمھارا داخلہ کرلیا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ فلاں کتاب پڑھ ڈالو۔

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی، ایک ہفتہ کے بعد تعلیم شروع ہوئی تو

میرے درجے کی ایک کتاب علم الصیغہ کا سبق ان کے پاس تھا، مولانا نہایت اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، بڑے بارعب وباوقار! پڑھاتے ایسا تھے کہ جیسے گھول کر پلا دینا چاہتے ہوں، ان کا انداز تدریس نمونہ کا انداز تھا، مشکل سے مشکل بات کو اس طرح سمجھاتے تھے کہ اس کے مشکل ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا، طالب علم کے ذہن میں وہ بات اس طرح بیٹھ جاتی جیسے اسے پہلے سے معلوم رہی ہو۔ میں نے مولانا سے چار سال تعلیم حاصل کی ہے، پڑھانے کا انداز انھیں سے سیکھا۔ خود مقرر و خطیب نہ تھے، لیکن بہتوں کو خطیب بنا دیا جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا کا تدریسی اور تربیتی کمال ظاہر ہوا۔ باوقار و بارعب بھی بہت تھے، مہربان وبا اخلاق بھی بہت تھے، ہر طالب علم ان سے ڈرتا بھی تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا۔ طلبہ فجر سے پہلے سوتے ہوتے ان کی ایک آواز مردوں میں جان ڈال دیتی اور ہر طرف بیداری کی ہلچل پیدا کر دیتی پڑھنے کے لیے طالب علموں کی ہمت افزائی ایسے ایسے طریقوں سے کرتے کہ وہ دیوانہ وار تعلیمی محنت میں مشغول ہو جاتے، طلبہ سے رات رات پڑھوا دینا انکے لیے معمولی بات تھی۔

مولانا مدرسہ کی مدرسی کے ساتھ ملی مسائل کا بھی پورا شعور رکھتے تھے، اور ابتدا ہی سے مسلمانوں کے ملکی اور بین الاقوامی احوال و معاملات میں دلچسپی لیتے تھے اور اس باب میں انھیں جمعیۃ علمائے ہند کی رہنمائی پر یقین کامل تھا، انہوں نے ہمیشہ جمعیۃ علمائے ہند کے جھنڈے کے نیچے کام کیا اور پورے شرح صدر کے ساتھ کیا، انہوں نے یہی روح مدرسہ کے تمام طلبہ میں بھی پھونک رکھی تھی۔

جن دنوں صدر ناصر نے اسرائیل سے شکست کھائی تھی اور قبلۂ اول ... (حفظہا اللہ واعادہا الی المسلمین) پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا تھا، تو ساری دنیا

مسلمان بلبلا اٹھے تھے، ہر مسلمان غمزدہ تھا، ہندوستان میں جمعیۃ العلماء نے اس صدمے کی چوٹ کو سب سے زیادہ محسوس کیا، اسرائیل نے فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے گھروں سے نکال کر بے گھر کر دیا تھا، یہ خانماں برباد لوگ کیمپوں میں آسمان کے نیچے دھوپ میں بے سایہ کے پڑے ہوئے تھے، قبلۂ اول کی بازیافت کا مسئلہ تو تھا ہی فوری طور پر ان پناہ گزین بے پناہوں کی امداد و اعانت کا مسئلہ سب سے اہم تھا، دنیا کے تمام مسلم ممالک اس کارِ خیر میں لگے ہوئے تھے، ہندوستان کا مسلمان گو کہ مفلوک الحال ہے مگر بہت حوصلہ مند ہے اس نے اس امداد و تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس وقت کے ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند اور اب کے صدر گرامی قدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب کی اپیل پر مسلمانوں نے اپنی بساط بھر بلکہ کچھ زیادہ ہی تعاون کیا۔

حضرت استاذِ محترم نے مظلومین کی اعانت کے لیے طالب علموں میں وہ ولولہ پیدا کیا کہ بیشتر طلبہ اس کے لیے مستعد و سرگرم کار ہو گئے، مولانا نے ایک مختصر سی مگر نہایت پرجوش تقریر لکھ کر طلبہ کو دے دی، انہوں نے اس کی روشنی میں آس پاس کے قریہ جات اور گاؤں میں ایک آگ سی لگا دی۔ طلبہ کی کوششوں سے کافی سرمایہ جمع ہو گیا، جو دفتر جمعیۃ علماء میں بھیج دیا گیا اور وہاں سے مستحقین کو پہنچا دیا گیا۔

مولانا کو جمعیۃ علماء ہند سے، جمعیۃ کے اکابر سے، بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے اور ان کے خانوادہ سے جو خلوص اور قلبی لگاؤ تھا، اور جیسی فدائیت تھی اس کو عشق کے علاوہ اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، میں نے اٹھائیس انتیس سال کے اس عرصے میں کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا کا یہ جذبۂ عقیدت و محبت کسی سرد و گرم سے متاثر ہوا ہو یا اس میں کبھی

کسی طرح کا تغیر ہوا ہو، مولانا طبیعت کے اور قلب کے نہایت پختہ اور مضبوط انسان تھے، فیصلہ کرتے تو بہت سوچ کر اطمینان کے بعد کرتے، اور جو فیصلہ کر لیتے اس سے پیچھے ہٹنے کا تصور تک نہ کرتے، قلبی لگاؤ سبھی بزرگوں سے تھا، عقیدت کیش سبھی کے تھے مگر جب حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا نام آتا سر سے پاؤں تک ان پر ایک کیف اور سرور چھا جاتا اور ایسا کیف اور ایسا سرور جو دوسروں کو بھی متاثر کر دیتا، خاکسار جب مولانا کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوا تو حضرت کا نام ان کی زبان سے بکثرت سنا، میں اس وقت تک حضرت مدنی پر جو کچھ لکھا گیا تھا تقریباً سب پڑھ چکا تھا۔ لیکن مولانا کی زبان سے جب حضرت مدنی کا نام اور تذکرہ سنتا تو کچھ اور ہی لطف آتا، ایک دن فرمانے لگے کہ تم لوگوں نے حضرت مدنی کو دیکھا نہیں، انھیں دیکھ کر صحابۂ کرام یاد آتے تھے، ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت مدنی صحابہ کی مثال ہوں۔

اسی طرح حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے بھی والہانہ شیفتگی کا معاملہ تھا، ایک دن بہت دیر تک ان کا ذکر عقیدت و محبت سے کرتے رہے۔ یاد رہے کہ یہ میری طالب علمی کے دور کی بات ہے۔ تو میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ مولانا کے شاگرد ہیں؟ فرمایا کہ میں نے ان سے کچھ پڑھا نہیں ہے لیکن میرا تعلق شاگردانہ ہی ہے، پھر میں نے پوچھا کہ آپ ان سے بیعت ہیں؟ فرمایا کہ میں بیعت نہیں ہوں، لیکن عقیدت مریدوں سے بڑھ کر رکھتا ہوں۔ بعد میں حضرت مولانا سے بیعت ہو گئے تھے۔

مدرسہ میں جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، یہ بات زیر بحث تھی کہ جلسہ کی صدارت کے لیے کس کو دعوت دی جائے، حضرت مولانا اسعد مدنی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی کا نام منتخب ہوا، مولانا قاسمی اس وقت تک

جمعیۃ سے الگ نہیں ہوئے تھے، غالباً یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے، جلسہ دو دن کا تھا، پہلے دن استاذِ محترم کے خلوص اور ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے تینوں صاحبزادگان تشریف لائے، مولانا ارشد مدنی اس وقت جامعہ قاسمیہ گیا میں مدرس تھے ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی اسجد میاں بھی آئے، مولانا ارشد مدنی جوانِ رعنا تھے اور اسجد میاں بچے تھے۔ اس دن مولانا محمد مسلم صاحب کی مسرت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا، انھیں گویا زندگی کی عظیم ترین مسرت حاصل ہو گئی تھی۔

پھر حضرت مولانا اسعد مدنی کی جانب سے انگریزی پریس فنڈ کی تحریک چلی، مولانا محمد مسلم صاحب حسبِ معمول اس تحریک کی کامیابی کے لیے پورے انہماک کے ساتھ لگ گئے، پھر دیہاتوں اور گاؤں میں طلبہ کے وفود بھیجنے لگے، اس موقع پر استاذِ محترم نے حضرت مولانا اسعد مدنی کا کئی روز کا پروگرام لیا، مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں شاندار جلسہ ہوا،...... اور ایک بڑے معرکہ کا جلسہ بلریا گنج میں جماعتِ اسلامی کے عین مرکز کے سامنے ہوا، اس وقت جماعتِ اسلامی کے حلقے سے مولانا اسعد مدنی صاحب کی مخالفت خوب جم کر ہو رہی تھی، اندیشہ تھا کہ یہاں بھی کچھ ناخوش گواری پیش آئے مگر استاذ محترم کا حسنِ انتظام حضرت مولانا اسعد صاحب کی فطری شجاعت و بسالت اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب چشتی علیہ الرحمہ کی روحانیت! کہ جلسہ ہوا اور بہت ہی کامیاب ہوا، اور کسی طرح کی کوئی آواز نہیں آئی، جس وقت جلسہ گاہ میں مولانا اسعد صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب ایک کار سے تشریف لائے، اور دونوں بزرگ گاڑی سے نکلے تو ایسا لگا جیسے دو نور کے پیکر بشکلِ بشر زمین پر اُتر آئے ہوں مولانا اسعد صاحب تو سیدھے اسٹیج پر چلے گئے اور جا کر تقریر شروع کر دی

اور مولانا عبدالحی صاحبؒ اسٹیج کے پیچھے سر جھکائے مسلسل ٹہلتے رہے، مولانا نے بہت موثر تقریر کی اور جلسہ نہایت امن وسکون کے ساتھ ختم ہوا۔

حضرت الاستاذ کو جمعیۃ العلماء کے ساتھ والہانہ وابستگی تھی، اس کے ہر پروگرام میں نہایت انشراح کے ساتھ شریک ہوتے، ان کا یہ تعلق نہایت مخلصانہ تھا، انہوں نے نہ کبھی عہدے کی خواہش کی اور نہ خود کو کبھی نمایاں کرنیکا قصد کیا، وہ ہمیشہ خادمانہ کام کرتے رہے، اور اسے اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے رہے، ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ جب جمعیۃ کے کسی پروگرام میں شریک ہوتے تو ان کے چہرے پر وہی مسرت اور طمانینت جھلکتی، جو کوئی عبادت گزار اپنی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے، جمعیۃ سے وابستگی میں ان کی کوئی ذاتی غرض کبھی نہیں رہی وہ واقعی ان کی عبادت تھی، جسے وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے، جمعیۃ کے سلسلے میں جتنے اسفار انھیں کرنے پڑتے، سب اپنے ذاتی مصارف سے کرتے تھے، جمعیۃ پر ان کا بار نہ ڈالتے۔

جمعیۃ علماء کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جس سے انھیں گہری وابستگی تھی بلکہ وہ ان کے لیے بمنزلۂ روح اور جان کے تھی۔ وہ مدارسِ عربیہ ہیں، انہوں نے اپنی پوری زندگی مدارس میں ہی گزاری۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد وہ دارالعلوم مؤ میں چند سال مدرس رہے وہاں سے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مدرس ہوئے، ان کی مدرسی کا سب سے تابناک دور تھا، وہ بالکل یکسو ہو کر پڑھاتے تھے، اور طلبہ کی تربیت کرتے تھے، اس وقت تک فراہمی مالیات اور تعمیرات سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، مبارک پور میں انھوں نے کم وبیش دس سال تک پڑھایا ہے وہاں سے ان کی مدرسی مشہور ہوئی۔ پھر بعض ناموافق حالات کی وجہ سے مبارکپور

سے جون پور وہاں کے ایک قدیم ادارہ میں جو نیم مردہ ہوچکا تھا، یعنی مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد جون پور تشریف لے گئے، مولانا تشریف لے گئے تو یہ نیم مردہ اچانک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا، طلبہ کی آمد دور دور سے شروع ہوگئی اور چند دنوں میں طلبہ کا ہجوم ہوگیا، مگر مدرسہ اور جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی کی کشمکش سے اندازہ ہوا کہ اس سے یکسو ہوکر کام کا کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا چاہیے جو پہلے سے کسی کے تسلط میں نہ ہو، چنانچہ راجے بی بی کی بنوائی ہوئی نامکمل مسجد جو محلہ لال دروازہ میں صدیوں سے ویران پڑی ہوئی اپنی خاموش نگاہوں سے کسی مردِ غیب کی منتظر تھی کہ آئے اور کارے بکند۔ آخر وہ مردِ غیب مولانا محمد مسلم صاحب کی شکل میں اسے مل گیا، وہ مسجد جو صدیوں سے نمازیوں کو ترس رہی تھی، اور گھاس پھوس اور خود رو پودوں کی وجہ سے جنگل بنی ہوئی تھی، خدا کی قدرت دیکھیے کہ بہت قلیل عرصہ میں وہ علم دین کا لہلہاتا ہوا چمن زار بن گئی، اس کی گھاس صاف کی گئی اس کے جنوبی و شمالی اور مشرقی برآمدوں میں دیواریں کھڑی کرکے حجرے بنا دیے گئے اور تعلیم شروع ہوگئی قال اللہ وقال الرسول کی مسامعہ نواز صدائیں گونجنے لگیں، مسجد کی روح زندہ ہوگئی، پانچوں وقت اذان ہونے لگی۔۔۔ ، نمازیں پڑھی جانے لگیں، حضرت مولانا جان کی بازی لگاکر اس کی آباد کاری میں لگ گئے، اس سلسلے میں بڑے بڑے خطرات آئے مگر ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے، خود بھی لگے رہے، اپنے رفقاء کو بھی لگائے رکھا، دن رات ایک تڑپ تھی جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی، مدرسہ کے اوقات میں سبق پڑھاتے، دوسرے اوقات میں اہلِ خیر کے دروازوں کو کھٹکھٹاتے اور اس کارِ اہم کی جانب متوجہ کرتے۔
مولانا احیاء العلوم مبارک پور میں جب تھے تو بہت خوش لباس تھے، کرتے

پاجامے اور ٹوپی کی ایک خاص تراش اور وضع تھی، جس کے نوک پلک وہ خود درست کرتے تھے، کپڑوں میں نہ کبھی شکن نظر آتی اور نہ میل کچیل، جوتا تو اتنا خوبصورت اور سبک پہننے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل، اور پھر پالش ایسی چمکدار اور تازہ کہ کبھی اس میں فرق نہیں آسکتا تھا، مگر لال دروازہ میں جامعہ حسینیہ قائم کرنے کے بعد ان کا حال یہ ہوا کہ کپڑے میلے ہو رہے ہیں کچھ التفات نہیں، بدن دھول اور غبار سے اٹ رہا ہے، نہانے کی فرصت نہیں، ایک ہی کپڑا کئی دن سے بدن پر ہے، پورا لباس شکن آلود ہے، لیکن تبدیل کرنے کا خیال نہیں، جوتوں پر ہفتوں سے پالش نہیں ہوئی ہے بدرنگ ہوئے جا رہے ہیں مگر پروا نہیں، دل میں ایک جوش تھا جو انھیں مسلسل حرکت میں رکھتا تھا، کئی بار ایسا ہوا کہ وہ مدرسہ دینیہ میں۔ جہاں میں پڑھتا تھا، غبار آلود پراگندہ بال گرد سے اٹے ہوئے اور بدرنگ جوتے پہنے ہوئے تشریف لائے معلوم ہوا کہ چند گھنٹے ٹھہریں گے پھر واپسی ہے، میں نے عرض کیا کہ کپڑے دیجیے دھلوا دوں، آپ خود بھی غسل کر لیجیے، جوتوں پر پالش کرا دوں، فرصت نہ ہونیکا عذر کیا، مگر میں نے گستاخی کر کے انھیں روکا، کپڑے دھلوائے، غسل کرایا، غسل کے بعد تازہ دم ہوئے تو فرمایا کہ تم نے اچھا کیا ورنہ ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک مجھے موقع نہ ملتا۔

مسجد کے شمالی حصہ میں زمین خریدی، اس پر مدرسہ کی عمارت بنوائی اس کی تعمیر میں لگے تو اس سے اتنا انہماک اور شغف ہوا کہ خود ایک بہترین مہندس اور انجینیر بن گئے، تعمیر کے ایسے ایسے نقشے نکالتے کہ تجربہ کار ماہرین فن حیران رہ جاتے، وہ اپنے ذہنی نقشہ کے مطابق عمارت بنواتے اور ہر وقت کاریگروں پر سوار رہتے۔ تھوڑے وقت اور تھوڑے

خرچ میں انھیں بہترین عمارت بنوانے کا سلیقہ آگیا تھا۔

لیکن ہم لوگوں کے لیے مولانا کی یہ دل چسپی سوہانِ روح تھی، اس کا اثر تعلیم وتدریس پر پڑ رہا تھا، مجھے تعمیرات کے کاموں سے بغایت وحشت ہے اسی وحشت کے باعث میں نے بار بار ان سے حد درجہ مرعوب ہونے کے باوجود کہا کہ یہ دل چسپی کم کر دیجیے، اور تعلیمی مشغلہ برقرار رکھیے، اس پر وہ مسکراتے اور فرماتے بہت سے پڑھانے والے تیار کر چکا ہوں، اب دوسرا کام کر رہا ہوں، فرماتے تھے کہ تعمیر سے مجھے عشق ہوگیا ہے۔ ان کی یہ دل چسپی آخر تک برقرار رہی۔

جامعہ حسینیہ کی تعمیر کے ایک کافی حد تک مکمل ہو چکنے کے بعد بعض حالات کی وجہ سے حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی نے مولانا کو دفتر جمعیۃ علماء میں بلالیا وہاں کچھ دنوں کام کیا مگر انھیں اس کی فکر تھی کہ اپنے آبائی وطن بھور ضلع اعظم گڈھ میں ایک دینی درس گاہ قائم کریں، مکتب تو پہلے سے چل رہا تھا مگر باقاعدہ عربی درس گاہ نہ تھی، حضرت مولانا مدنی سے اجازت لے کر وہ بھور آگئے اور ستمبر ۱۹۸۶ء کی کسی تاریخ میں ایک عظیم الشان جلسہ کرا کے محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور دوسرے اکابر کے ہاتھوں جامعہ رشیدیہ بھور کا سنگِ بنیاد رکھوایا اور اسی تاریخ میں شیخو پور میں انہی اکابر کے ہاتھوں مولانا ہی کے اہتمام میں مدرسہ شیخ الاسلام کی عمارتِ نو کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا نے بھور میں مدرسہ کی نہایت نفیس اور دیدہ زیب عمارت بنوائی اور ابھی دو سال قبل گاؤں کی پرانی مسجد کی تعمیر جدید کا منصوبہ بنا تو اس میں بھی دن رات ایک کرکے لگے رہے اور ایک حد تک اس کی تکمیل کرادی۔

اور یہ سب اس طور پر کرتے کہ خود کسی جگہ کوئی عہدہ قبول نہیں کرتے تھے، جامعہ حسینیہ میں سب کچھ انھیں کا کیا ہوا ہے لیکن وہ نہ مہتمم تھے، نہ صدر مدرس، جامعہ رشیدیہ بہور میں بھی سب کچھ وہی کرتے تھے مگر کسی عہدہ کا نام یہاں بھی نہ تھا، مسجد کا کام کرتے رہے مگر اصل ذمہ دار دوسرے لوگ تھے، درحقیقت یہ سارے کام وہ اپنے دلی تقاضے اور اللہ کے واسطے کرتے تھے اس سے ان کا دل اور ضمیر مطمئن ہوتا تھا۔

مولانا کو جیسی دلچسپی جامعہ رشیدیہ سے تھی ویسا ہی تعلق مدرسہ شیخ الاسلام سے بھی تھا، وہ دونوں جگہوں کی نگرانی کرتے تھے، مدرسہ شیخ الاسلام میں مجھے لانے والے وہی تھے، انھیں کے حکم سے اس دیہات میں بیٹھا ہوا ہوں۔ مدرسہ میں جب ضرورت ہوتی وہ تشریف لاتے مفید مشورے دیتے اور مدرسہ سے کرایہ کبھی نہ لیتے۔

مولانا کو جس طرح اپنے بڑوں سے عقیدت و گرویدگی تھی اسی طرح اپنے چھوٹوں سے بھی بہت محبت فرماتے تھے، مولانا کے سب شاگرد میری اس بات کی تائید کریں گے، میں ان کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں، لیکن ہمیشہ ان کے الطاف وعنایات کا مورد بنا رہا، مدرسہ دینیہ میں مولانا تشریف لاتے اور کتنی مرتبہ صرف میری دل جوئی کے لیے تشریف لاتے، ان کی آمد پر اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں ان سے درخواست کرتا کہ تبرکاً ایک دو سبق پڑھا دیجیے۔ کبھی گزارش کرتا کہ طلبہ کو کچھ نصیحتیں کر دیجیے، مولانا اسے خوشی سے قبول فرماتے سبق پڑھاتے، طلبہ کو نصیحتیں فرماتے۔ کبھی میں جامعہ حسینیہ پہونچتا، تو اس وقت چونکہ مولانا کا مدرسہ کی مالیات یا تعمیرات سے شغف بہت عروج پر تھا میں آتا تو اپنے اسباق میرے حوالے کر دیتے اور مطمئن ہو کر چندے کی مہم پر

نکل جاتے، میرا قیام ان کے حکم سے کئی کئی دن رہتا، اور ان کے اسباق پڑھاتا رہتا، طلبہ کے درمیان مجھ سے تقریریں کراتے، خود بھی سنتے اور خوش ہوتے مدرسہ کا کوئی جلسہ، کوئی پروگرام ہوتا تو ضرور بلاتے اور حاضر ہوتا تو گہری سنجیدگی کے باوجود خوشی کے آثار چہرے پر دمکنے لگتے۔

جامعہ حسینیہ کو انہوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا، اسے پروان چڑھایا تھا مگر ایک وقت ایسا آیا کہ انھیں اپنے بڑوں کے حکم سے اسے چھوڑ دینا پڑا، آدمی اپنی اولاد سے جدا کر دیا جائے، اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے محروم کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی، .... مگر مولانا نے غایت خلوص کی بنا پر یہ تکلیف دہ فیصلہ قبول کر لیا۔ اس وقت وہ بہت محزون خاطر اور دل شکستہ تھے، باوجود اپنی قلبی قوت کے، جو کسی وقت اضمحلال کو قبول نہیں کرتی تھی، ان پر افسردگی کا ایک عالم طاری تھا، اس وقت مدرسہ دینیہ تشریف لائے، اور تین دن تک آپ نے اسی خادم کے پاس قیام فرمایا، اس وقت خلوت وجلوت کا ساتھی تنہا میں تھا، خوب کھل کر باتیں ہوئیں میں ان کے کرم وشفقت کی بنا پر باوجود مرعوبیت کے کچھ گستاخ ہو گیا تھا، میں انھیں کی غلطیاں گنواتا اور وہ کشادہ پیشانی سے سنتے، قبول کرتے اور اصلاح کا وعدہ کرتے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا کو اپنے اکابر سے بےحد لگاؤ تھا، ان کا تذکرہ چھڑ جاتا تو کسی طرح انھیں سیری نہ ہوتی، میرا طبعی ذوق بھی یہی ہے، کبھی مجلس میں بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا۔ اور بے تکان ان کے احوال وواقعات واقوال بیان کرتا، کبھی گھنٹوں یہ سلسلۂ بیان جاری رہتا۔ مگر مولانا پہلو نہ بدلتے، بلکہ یکساں دلچسپی اور انشراح کے ساتھ سنتے، میں

رکتا تو مزید کوئی بات چھیڑ کر سلسلہ کو دراز کر دیتے، کبھی کبھی مزاحاً فرمائش کرتے کہ بزرگوں کے احوال وواقعات سناؤ، اور میرا یہ حال ہوتا کہ دیوانہ را ہوے بس است، میں شروع ہو جاتا۔

ایک مرتبہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں، وہیں کے ایک استاذ میرے محب ومحبوب دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب جو ازراہِ ظرافت کبھی کبھی مجھے "تذکرۃ الاولیا" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ کے کمرے میں ہم لوگ موجود تھے، حضرت مولانا صدر مجلس تھے، کسی تقریب سے بزرگوں کا تذکرہ چھڑ گیا، اور میں دیر تک اسی مبارک ذکر میں محو ومنہمک رہا مولانا بھی اسی انہماک سے سنتے رہے، مولانا پان کے عادی تھے مگر اس وقت گفتگو کی محویت میں کسی کو پان کا خیال نہ رہا، خود مولانا بھی بھولے ہی رہے، بہت دیر کے بعد میں خاموش ہوا تو فرمایا!

قاری صاحب! اتنی دیر تک اتنی اچھی باتیں سنی ہیں، اب تو پان کا استحقاق ہو گیا ہے، سب لوگ ہنس پڑے اور پان کا دور چل پڑا۔

جامعہ رشیدیہ میں دار القرآن کا افتتاح ہوا تو اپنے شاگرد کو اس کیلیے بلوایا، وعظ کہلوایا مسجد کے سنگِ بنیاد کی تقریب تھی تو سواری بھیج کر بلوایا، افتتاحی وعظ کہلوایا، سنگِ بنیاد رکھوایا، غرض اپنے اس حقیر شاگرد پر نوازش وکرم کی بارش برساتے رہے، اب مولانا اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چل دیے تو تنہائی محسوس ہونے لگی اور جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔

مولانا کا آبائی وطن مبارک پور سے چار یا پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں بمہور ہے۔ بمہور اہلِ علم کی بستی ہے؛ مولانا کے والد مولوی محمد الیاس صاحب اصلاحی مرحوم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے تعلیم یافتہ تھے، نہایت خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے، حضرت مولانا ان کے تیسرے صاحبزادے تھے،

دو بھائی مولانا سے پہلے تھے، جناب محمد شمیم صاحب جن کی وفات ابھی عید کے بعد ہوئی، دوسرے محمد محسن صاحب جو ماشاء اللہ بقید حیات ہیں، تیسرے مولانا تھے، مولانا سے چھوٹے حافظ محمد عرفان صاحب ان کے بعد جناب محمد احسان صاحب اور سب سے چھوٹے بھائی میرے رفیقِ درس جناب مولانا محمد رضوان صاحب ہیں، اور ایک بہن ہیں۔

مولانا کی پیدائش غالباً ۱۹۳۶ء یا اس سے کچھ آگے پیچھے ہوئی ہے، ابتداءً اپنے نانیہال بلریا گنج میں مڈل تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد عربی کی طرف متوجہ ہوئے، ذکاوت وذہانت سے خوب بہرہ ور تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، دورۂ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کی نوبت نہ آسکی کیونکہ ایک سال قبل حضرت کا وصال ہوگیا تھا، اور انھوں نے اپنی جگہ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمۃ کو مقرر فرمادیا تھا۔ چنانچہ دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت شیخ فخر الدین صاحبؒ سے کی۔

مولانا کا نکاح ان کے ماموں کی صاحبزادی سے ہوا تھا تین اولادیں ہوئیں، جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب جو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عرصہ تک جامعہ حسینیہ میں بحیثیت مدرس ومفتی کام کرتے رہے، اور اب دارالعلوم دیوبند میں عربی کے استاذ ہیں، ذہانت وذکاوت میں اپنے والد کی یادگار ہیں، ردِّ شیعت کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء، اور خانوادہ مدنی کے ساتھ عشق وشیفتگی میں اپنے والدِ محترم کے صحیح جانشین ووارث ہیں۔ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں ترقی بخشیں۔ دوسرے فرزند محمد زاہد سلمہٗ، بلریا گنج میں

دکان کرتے ہیں اور تیسرے فرزند محمد مجاہد سلمہٗ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔
اہلیہ کا انتقال کئی سال قبل ہوگیا، دوسرے عقد کے لیے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے بہت زور دیا مگر قبول نہیں کیا۔
والد کے انتقال کے بعد بھائیوں میں جائیداد اور مکان کا بٹوارہ ہوا، تو مولانا نے مکان میں حصہ نہیں لیا بلکہ خالی زمین لی اور اپنے حصے کا کھیت فروخت کیا اور مکان اچھا سا بنوالیا۔ چھوٹے بھائی مولانا محمد رضوان نے بھی یہی کیا، مولانا نے اپنے مکان کے ساتھ ان کا مکان بھی بنوایا۔ دونوں بھائی اور بوڑھی والدہ ساتھ رہتی تھیں، والدہ بہت عمر رسیدہ تھیں، دونوں بھائیوں کو خدمت کا خوب موقع ملا، وہ ہر تھوڑی دیر پر مولانا کو پکارتیں اور مولانا دوڑے ہوئے ان کی خدمت میں جاتے، کام کچھ نہ ہوتا مگر مولانا اُف نہ کرتے اسی سال بقرعید کے بعد ان کا وصال ہوا اور ڈیڑھ ہونے دو ماہ کے بعد مولانا بھی انھیں کی آغوش میں پہونچ گئے، شاید انھوں نے پکارا ہو، جیسے زندگی میں برابر پکارا کرتی تھیں۔
مولانا کی ساری زندگی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا، خود اپنے لیے، اپنی دنیا کے لیے کچھ نہیں کیا، وہ دنیا سے اس طرح اٹھے ہیں جس طرح بط پانی سے پر جھاڑ کر نکل آتی ہے، ان کا ترکہ بھی بہت مختصر ہے، ان کے وارث بھی بہت کم ہیں، صرف تین بیٹے، جنس و نقد کی قبیل سے شاید ان کے پاس کچھ نہ رہا ہو۔
جس دن ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے غالباً اسی روز مدرسہ کے ایک استاذ کو جنھیں مدرسہ کے حسابات لکھنے پر لگا رکھا تھا مدرسہ کا پورا حساب سمجھایا

اور ارشاد فرمایا کہ سب کچھ آپ سمجھ گئے۔ انھوں نے ہاں کہا، تو فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں بیمار پڑجاؤں تو آپ لوگوں کو حساب سمجھالیں گے، انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا، مجھے سمجھائیے انھوں نے حسبِ منشا سمجھا دیا' تو مطمئن ہوئے اور غالباً اس سے ایک روز پہلے مسجد جو زیرِ تعمیر ہے اس کے تمام حسابات مسجد کے ایک ذمہ دار کو بتاکر ان کے حوالے کر دیے تھے

فالج کے حملے کے بعد دیکھا گیا تو ان کی جیب میں کل چودہ سو روپے تھے معلوم ہوا کہ اس میں مدرسے کے سات سو روپے ہیں، اور مسجد کے دو سو اور باقی پانچسو غالباً ترکہ ہے۔ اس مردِ خدا کی غالباً کل یہی کائنات تھی، مولانا کا شمار زمرۂ صوفیا میں نہیں ہوتا لیکن جس شان سے انہوں نے دنیا کو برتا ہے، اسے ترک کیا ہے وہ زاہدانِ باصفا کی یادگار ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت کرے، ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے عمل میں غلطی بہت ممکن ہے ہوئی ہو، لیکن نیت اُن کی ہمیشہ دین اور علم دین کے فروغ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی رہی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے یہاں نیتوں پر ہی مدار ہے، اللہ تعالیٰ ان کی نیت کو قبول فرمائے اور روح و رضوان سے نوازے۔ آمین!

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۹۳ء)

مولانا مشتاق احمد غازی پوری

غازی پور، ۶ راکتوبر، حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوری صدر مدرس مدرسہ دینیہ کا ۴ر اکتوبر کی شام میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا، انتقال سے قبل مولانا بالکل صحت مند تھے، معمولات میں کوئی فرق آیا نہ بیماری کی کوئی علامت ظاہر ہوئی، معمول کے مطابق صبح میں مدرسہ آئے، ضروری کاموں کو انجام دیا پھر ظہر کی نماز پڑھائی، معمول کے مطابق عصر کی نماز مدرسہ میں ادا کرنے کے لئے باوضو گھر سے روانہ ہوئے، گھر سے تھوڑی دور پر مدرسہ عظیمیہ کے پاس اچانک چکر آیا اور وہیں بیٹھ گئے، بہت سے جاننے پہچاننے والے آس پاس موجود تھے، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہیں لٹایا اور پانی پلایا اور منٹوں میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دوسرے دن مقامی ایم، اے، اچ انٹر کالج کے میدان میں ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی، مولانا محی الدین صاحب مظاہری نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں مدرسہ دینیہ کے اساتذہ و طلبہ اور ضلع کے بہت سے مدارس کے علماء و طلبہ شریک ہوئے۔

شرکاء جنازہ کی کثیر تعداد مولانا مرحوم کی عنداللہ وعندالناس مقبولیت کی ایسی کھلی ہوئی نشانی تھی جس کو دیکھ کر ہر شخص متاثر ہوا، ایم، اے، اچ کالج کے پاس آبائی قبرستان میں ہزاروں سوگواروں نے دکھی دل کے ساتھ مولانا مرحوم کو سپرد خاک کیا، بیک وقت مٹی دینے والوں کی کئی قطاریں بنائی گئی تھیں۔ اس وقائع نگار نے کتنی ہی لوگوں کو سسکیاں لیتے اور آہیں بھرتے دیکھا، ایک ضعیف نے رو رو کر مولانا کی کریم النفسی اور

خلق کی تعریف کی۔

مولانا مرحوم حد درجہ منکسر المزاج، متحمل، بردبار اور صحیح معنوں میں نمونۂ اسلاف تھے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ شروانی رح سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور اپنے شیخ کے اخلاق کا پرتو اور نمونہ تھے۔ طلبہ پر حد درجہ شفیق تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دینیہ ہی میں اپنے مربی مولانا عمر فاروقی اور مولانا ابوالحسن صدیقی سے حاصل کی اور پھر دیوبند سے فراغت پائی۔

حضرت شیخ الاسلام رح سے بے حد محبت کرتے تھے، قرآن کی تفسیر کا درس لاہور جا کر مولانا احمد علی لاہوری سے حاصل کیا، تدریسی زندگی کا آغاز قصبہ بارا سے کیا، جہاں ان کے استاذ و مربی مولانا ابوالحسن صدیقی نے ۱۹۴۲ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا تھا۔

یہ وہی قصبہ ہے جہاں حضرت سید احمد شہید رح نے اپنے قافلہ کے ساتھ قیام کیا تھا اور پچھم محلہ کی جامع مسجد میں کئی دن تک وعظ فرمایا تھا۔

مولانا نے دیوریا میں کئی برسوں تک جمعیۃ علماء کے مبلغ کی حیثیت سے کام کیا، پھر چالیس سال تک مدرسہ دینیہ کی مسندِ صدارت کو رونق بخشی۔

(ماہنامہ دارالعلوم دسمبر ۱۹۹۳ء)

مولانا احرار الحق فیض آبادیؒ

بقلم مولوی محمد ارشد قاسمی

نام | محمد احرار الحق ابن فخر الدین صاحب۔

ولادت باسعادت | ۸ر مارچ ۱۹۴۲ء بروز منگل مقام بکری رسول پور پوسٹ التفات گنج ضلع فیض آباد، یوپی۔

آغاز تعلیم | ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم علن پور میں حاصل کی اس کے بعد والد محترم کے اشارہ پر تلاش معاش کی غرض سے بمبئی چلے گئے وہاں مختلف کام کئے، ایک مرتبہ بمبئی شہر میں حضرت مولانا محمد یونس صاحب گمبروی (مظفر نگر) مدظلہ العالی کی تقریر تھی، مولانا بھی ان کی تقریر سننے چلے گئے، وہاں مولانا کی تقریر سے بہت متأثر ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ انشاء اللہ تعلیم ضرور حاصل کروں گا، چنانچہ دن میں مدرسہ امدادیہ دونٹاکی میں تعلیم حاصل کرتے (مدرسہ امدادیہ اب چونابھٹی میں چلتا ہے) اور رات میں کافی چائے بیچتے جس سے اپنا خرچ چلاتے، اس طرح کچھ مختصری تعلیم بمبئی میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے آئے اور ۱۳۸۳ھ میں یہاں داخلہ لیا، لیکن مولانا فرماتے تھے کہ مجھے کتابیں کم سمجھ میں آتی تھیں، تو میں نے یہ سوچا کر طلبہ کو تکرار کراؤں، شاید اس سے کتاب آسانی سے سمجھ میں آنے لگے، چنانچہ طبیعت پر جبر کر کے بنام خدا طلبہ کو صرف ونحو کی تکرار کرانے لگا۔ الحمد للہ کچھ ہی دنوں میں کتابیں سمجھ میں آنے لگیں، یہ زمانہ نہایت تنگی اور پریشانی کا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ میں نے بہت ہی تنگدستی کی حالت میں تعلیم حاصل کی ہے، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کی زندگی میں تقریباً سات سال تک ناشتہ کرنے کی نوبت تک نہیں آئی اور صرف مطبخ کی خوراک پر ہی زندگی گذارتا اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔

مولانا مرحوم کے دارالعلوم کے ساتھیوں میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند اور مولانا نعمان الحق مرحوم سابق مدرس دارالعلوم اور مولانا رشید الدین صاحب مہتمم مدرسہ

شاہی اور مولانا رشید الوحیدی و مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ دارالرشاد بارہ بنکی وغیرہم ہیں۔

حضرت شیخ الحدیثؒ سے اصلاحی تعلق

۱۳۷۷ھ میں مولانا کا پہلا عقد ہوا، اور اسی سال غالباً جمادی الثانی کے مہینہ میں بروز جمعہ قبل نماز جمعہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ میں انتقال کرگئیں تو دوسرا عقد ۱۳۸۸ھ ماہ رمضان المبارک میں کیا یہ دوسری اہلیہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء یعنی جس سال حضرت اقدس مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، اس سال مولانا مرحوم موقوف علیہ میں زیر تعلیم تھے، پھر ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری پڑھی اور اس کے اگلے سال دارالعلوم ہی سے افتاء کیا اور مختلف فنون میں دو سال وقت لگایا۔

تدریس کی ابتداء

۱۳۸۱ھ میں سب سے پہلے مدرس کی حیثیت سے مدرسہ حسینیہ تاؤلی میں تقرر ہوا، یہ تقرر ایک مدرس کی خالی جگہ پر ہوا تھا جو اس سال حج بیت اللہ کے لئے جارہے تھے، اسی وجہ سے مولانا مرحوم صرف ایک سال تاؤلی میں رہے، اسی سال مولانا مرحوم نے ایک مسجد کی سنگ بنیاد بھی رکھی جو تاؤلی میں موجود ہے اور مسجد احراری کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے بعد کولھاپور مہاراشٹر تشریف لے گئے اور ایک مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اتفاق سے اچانک مولانا کی اہلیہ سخت بیمار ہوگئیں اور وہ بغرض علاج بمبئی لائی گئیں چنانچہ مولانا مرحوم اپنی اہلیہ کی دیکھ بھال کی غرض سے کولھاپور سے بمبئی آگئے، اسی دوران کچھ مخلصین نے مشورہ دیا کہ آپ عارضی طور سے مدرسہ امدادیہ جوناگھٹی میں درس کا سلسلہ شروع کردیں اور ساتھ ہی اہلیہ کا علاج بھی کراتے رہیں، تاکہ مصارف نکلتے رہیں، اسی وجہ سے مولانا مرحوم نے تقریباً ۶ ماہ مدرسہ امدادیہ بمبئی

میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر باضابطہ مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم بانسکنڈی آسام تشریف لے گئے وہاں مسلسل تین سال تک تدریسی امور انجام دیئے، لیکن سفر کی طوالت اور وطن سے دوری کی وجہ سے مولانا کی یہ خواہش تھی کہ اگر وطن کے قریب کہیں کوئی جگہ مل جائے تو بہتر ہو۔

نورالعلوم بہرائچ میں تدریسی خدمات

ادھر بشکل امداد غیبی مدرسہ نورالعلوم بہرائچ والوں نے آمادگی ظاہر کی کہ آپ بہرائچ تشریف لے آئیں، چنانچہ وہاں کے لوگوں کی خواہش پر حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کرنے کے بعد نورالعلوم بہرائچ تشریف لے آئے اور تدریسی خدمات میں مشغول ہو گئے۔

مدرسہ کنزالعلوم ٹانڈہ میں بحیثیت مدرس تقرر

کچھ دنوں کے بعد مولانا مرحوم کے خسر حضرت مولانا مفتی وکیل الدین صاحب نے مولانا کو مدرسہ کنزالعلوم ٹانڈہ میں بلالیا تاکہ گھر سے بالکل قریب ہو جائیں اور بال بچوں کی دیکھ بھال و تربیت کر سکیں۔

مولانا کے خسر حضرت مولانا مفتی وکیل الدین صاحب ضلع فیض آباد کے ایک جید الاستعداد عالم تھے، اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے، حضرت مفتی صاحب نے اپنے زمانہ میں کنزالعلوم کو اتنا عروج دیا کہ عربی سال ہفتم تک تعلیم ہونے لگی تھی اور پورے دیار میں اس وقت اتنا بڑا اور اچھا مدرسہ کوئی نہیں تھا، حضرت مفتی صاحب کا انتقال حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کے انتقال کے ٹھیک بارہ دن کے بعد بروز عید ۱۴۲۶ھ کو ہوا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

مولانا مرحوم مفتی صاحب کی دعوت پر مدرسہ کنزالعلوم تشریف لے آئے اور درس وافادہ میں مشغول ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ کنزالعلوم والوں نے مولانا کو دارالاقامہ

کا نگراں نامزد کر دیا تھا جس کی وجہ سے مولانا مرحوم طلبہ پر خصوصی نگاہ رکھتے تھے اور ہر طالب علم کی وضع قطع داڑھی پر خصوصی توجہ کے ساتھ ساتھ نماز با جماعت کی تاکید کرتے تھے یہ سختی وہاں کے مقیم طلبہ کو کچھ ناگوار گذری، انھوں نے دیگر اساتذہ سے مولانا کی شکایت شروع کر دی حتیٰ کہ مدرسین بھی مولانا سے کہنے لگے کہ مولانا آپ طلبہ پر اس قدر شدت نہ کریں جس کی وجہ سے مولانا کی طبیعت وہاں سے مکدر ہوگئی اور مولانا نے کچھ مخلصوں اور خیرخواہوں سے مشورہ کیا، چنانچہ سب نے یہی رائے دی کہ مولانا جب آپکی نگرانی و تربیت سے طلبہ و انتظامیہ وغیرہ نالاں رہتے ہیں تو آپ یا تو نرمی برتیں یا اللہ کا نام لے کر کسی دوسری جگہ کا انتخاب فرمائیں۔

دوبارہ نور العلوم بہرائچ میں تدریسی خدمات

یہ بات کسی طرح سے مولانا کلیم اللہ مہتمم مدرسہ نورالعلوم بہرائچ کو معلوم ہوگئی کہ مولانا کنز العلوم ٹانڈہ سے بددل ہیں اور کسی دوسری درسگاہ کا انتخاب کرنا چاہ رہے ہیں تو فوراً مولانا کلیم اللہ صاحب نے اپنے صاحبزادہ محترم جناب مولانا حیات اللہ صاحب قاسمی کو بھیج کر دوبارہ نورالعلوم بہرائچ کے لئے مولانا کو آمادہ کرلیا۔ اور پھر دوبارہ مدرسہ نورالعلوم بہرائچ بحیثیت مدرس کے تشریف لے گئے اور وہاں مولانا نے بڑی محنت ولگن سے تقریباً پانچ سال دینی خدمات انجام دیں اور حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے فیض کو لوگوں میں پہونچا کر شہر بہرائچ میں بہت سے لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح کی، چنانچہ ہر سال مولانا مرحوم رمضان المبارک میں بہرائچ شہر کی جامع مسجد میں اپنے مریدین کے ساتھ اعتکاف فرماتے رہے اور بہت سے لوگوں کو اپنے سلسلۃ الذہب میں جوڑ کر ان کی آخرت سنوارتے رہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کے مریدین کی ایک بڑی تعداد بہرائچ میں موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے تدریسی تعلق اور طلبہ پر شفقت

اسی زمانے میں حضرت

مولانا محمد طلحہ صاحب ابن شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو سہارنپور بلوایا کہ آپ حضرت شیخ کے زمانہ میں رمضان المبارک شیخ کے ساتھ ہی سہارنپور میں گذارتے تھے، اس لئے آپ اس سال تشریف لے آئیں اور رمضان یہیں گذاریں، مولانا مرحوم نے پیرزادۂ محترم کی دعوت پر لبیک کہا اور رمضان المبارک میں سہارنپور تشریف لے آئے، اسی ماہ میں مولانا نے سہارنپور سے دیوبند کا سفر فرمایا، یہاں پہونچ کر حضرت مہتمم صاحب و مولانا معراج الحق صاحب وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے آپ کا دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے لئے انتخاب کیا ہے، نیز حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آپ شوال میں تشریف لے آئیں، چنانچہ شوال ۱۴۰۵ھ سے آپ کا دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے لئے تقرر ہوگیا۔

حضرت مولانا مرحوم زمانۂ تدریس میں طلبہ کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے بعض دفعہ اگر کسی طالب علم کو ڈانٹ دیا تو اس کو تنہائی میں بلاکر معذرت کرتے اور فرماتے کہ بھائی آپ کو ڈانٹنے کا مقصد اصلاح ہے، آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے طلبہ مولانا مرحوم کے گرویدہ تھے۔

مولانا بہت منکسر المزاج، سادہ لوح، سنجیدہ طبیعت اور نہایت متین تھے اسی وجہ سے ہر چھوٹا اور بڑا ان سے براہ راست گفتگو کرلیتا اور ملاقات میں جھجک محسوس نہ کرتا۔

حضرت شیخ سے اجازتِ خلافت

مولانا مرحوم کا اصلاحی تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۳۷۰ھ میں قائم ہوگیا تھا، وہ حضرت شیخ کے اتنے گرویدہ اور عاشق تھے کہ ہر سال رمضان المبارک شیخ کے پاس سہارنپور ہی میں گذارتے تھے چنانچہ حضرت شیخ نے رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ میں ستائیسویں شب میں اجازت مرحمت فرمائی، جس شب کو عوام شب قدر کہتے ہیں، ایک مصلّٰی بھی عطا فرمایا، اور حضرت

شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ:

مولوی احرار پیارے! جس نسبت کو حاصل کرنے کے لئے تم نے اس ناکارہ سے حسنِ ظن رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں مرحمت فرمائی ہے، میں تم کو حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی طرف سے بیعت کی اجازت دیتا ہوں، اس کے بعد فرمایا: میں تم کو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو، اور اہل سنت والجماعت سے وابستہ رہو اور بدعت و معاصی سے بچو اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ:

اس کی بہت حفاظت کیجیو (حضرت شیخ الحدیث اور ان کے خلفاء ج ۲ ص ۴۱)

مولانا محمد طلحہ صاحب و مولانا محمد یونس صاحب سے قلبی تعلق

مولانا مرحوم دیوبند میں

قیام تدریس کے زمانہ میں بھی صاحبزادہ محترم بھائی محمد طلحہ صاحب و حضرت مولانا محمد یونس صاحب وغیرہ سے بغرض ملاقات کثرت سے سہارنپور جایا کرتے تھے اور ان کو ان دونوں بزرگوں سے بہت گہرا تعلق اور قلبی لگاؤ تھا، میں نے اکثر دیکھا کہ جب مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم، دیوبند تشریف لاتے تو ان کا قیام دیوبند میں فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب زید مجدہم کے پاس رہتا اور جب تک دیوبند میں ٹھہرتے مولانا مرحوم ضرور مولانا یونس صاحب کے پاس رہتے، دونوں میں غایت درجہ بے تکلفی تھی، اسی وجہ سے بعض دفعہ تو مولانا مرحوم انھیں سہارنپور تک پہونچانے کے لئے چلے جاتے اس طرح کی محبت لوگوں میں میں نے عموماً کم دیکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کے انتقال پر حضرت مولانا محمد یونس صاحب کو بھی کافی صدمہ ہوا اور اس جدائی کا بہت گہرا اثر رہا۔

مرض الموت اور ابتدار سفر آخرت

مولانا مرحوم نے ۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ تعطیل کلاں میں سیتاپور کا سفر کیا،
وہیں مولانا مرحوم کو دل میں ہلکا سا درد محسوس ہوا، معمولی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لی اور بہرائچ چلے گئے، وہاں بھی دل میں درد محسوس ہوا اس مرتبہ تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی، وہاں کے ڈاکٹروں نے چیک اپ کرکے بتایا کہ یہ ہارٹ کا درد ہے آپ آرام فرمائیں، پھر کچھ لوگوں کے مشورہ سے بہرائچ اسپتال میں داخل کر دیا گیا، مگر کچھ آرام نہ ہوا تو لوگوں نے لکھنؤ لے جانے کی رائے دی، چنانچہ ۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ کو لکھنؤ لے جایا گیا وہاں لاری کارڈیالوجی سینٹر میں زیر علاج رہے، پھر چھبیس گھنٹے کے درمیان دو جھٹکے لگے، پھر کچھ طبیعت سنبھلی۔ احقر ۷؍رمضان المبارک کو حضرت سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ گیا، دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ تمہارے آجانے سے مجھے کافی سکون محسوس ہوا، یہ تمہارے تعلق کی بات ہے، میں آج تم کو تین دن سے مسلسل یاد کر رہا ہوں، پھر فرمایا کہ مجھ سے معانقہ کرو، چنانچہ مولانا بستر ہی پر لیٹے تھے میں نے معانقہ کیا اور تھوڑی سی گفتگو کی، اس وقت آواز میں کافی نقاہت تھی اور آواز بالکل آہستہ نکل رہی تھی، پھر میں نے مولانا کے صاحبزادے مفتی مولوی محبوب الرحمٰن وعزیزم مخلص الرحمٰن سے پوچھا، ان لوگوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مولانا کا دل ستر فیصد کام نہیں کر رہا ہے، صرف تیس فی صد کام کر رہا ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر قریشی صاحب (سحر نرسنگ ہوم) تشریف لے آئے، ان کے ہمراہ مولانا محمد زکریا صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی تھے، انہوں نے بھی یہی بات بتائی، ان کے علاوہ مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی و مولانا عتیق الرحمٰن صاحب بستوی وحافظ عبد التواب صاحب اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ودیگر بہت سے لوگ عیادت کے لئے تشریف لاتے رہے، آخر الذکر دونوں اساتذہ مولانا مرحوم کے شاگرد بھی ہیں۔

احقر سے دو چار روز قبل حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی بھی لکھنؤ تشریف لاکر حضرت مولانا کی عیادت کر چکے تھے۔ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب مدظلہ کے ہمراہ اور لوگ بھی تھے، ان میں بھائی محمد طلحہ صاحب ابن حاجی فقیر محمد تماکو والے بھی تھے، چنانچہ بھائی طلحہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ میرا مکان آپ کے اسپتال سے قریب ہی ہے آپ میرے مکان پر آرام فرمائیں وہاں ہر طرح کی سہولت ہے اور ہم لوگوں کو زیادہ خدمت کا موقع بھی، چنانچہ ۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کو دوپہر کے وقت حضرت مولانا کو اسپتال سے بھائی محمد طلحہ صاحب کے مکان پر منتقل کر دیا گیا، یہاں پر مولانا پورے دن بخیر و عافیت رہے پھر اچانک رات ساڑھے دس بجے کے قریب ایک جھٹکا لگا، یہ پانچواں اٹیک تھا جو بہت سخت تھا، حضرت مولانا اس کی شدت برداشت نہ کر سکے، اور بہت زور سے یا اللہ کہا پھر چہرہ قبلہ رو کر کے اپنے تمام اعزاء و اقارب اور اہل دنیا کو خیر باد کہہ کر راہی ملکِ بقا ہو گئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

آخری آرام گاہ

جنازہ وطن لے جانے کی تیاری شروع ہو گئی اور فوراً فیض آباد، بہرائچ، بمبئی، دیو بند سب جگہوں پر فون سے اطلاع دی گئی اور بذریعہ ایمبولینس مولانا مرحوم کا جنازہ وطن لایا گیا، راستہ میں شہر فیض آباد میں تھوڑی دیر سحری کے وقت روکا گیا، وہیں سے ہم لوگ مولانا مرحوم کے جنازہ کے ہمراہ ان کے آبائی گاؤں پکری رسولپور گئے، ۱۹ر رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر آبائی قبرستان کے میدان میں صاحبزادۂ محترم مولانا مفتی محبوب الرحمٰن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس خزانۂ خوبی کو ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دیا گیا۔ ع

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پسماندگان

حضرت مولانا مرحوم کے پسماندگان میں پانچ بھائی ہیں جن میں ایک مولانا مرحوم سے بڑے اور چار چھوٹے ہیں، اور الحمد للہ سب بقید حیات ہیں۔ مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ مرحومہ سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں، جس میں سے ایک لڑکا دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر مفتی کا کورس کرکے اب تدریسی خدمات میں مصروف ہے اور مولانا مفتی محبوب الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا مرحوم کی دوسری اہلیہ صاحبہ موجود ہیں ان سے دو لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک لڑکا عزیزم مخلص الرحمٰن دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہے۔

دعاء واختتام

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائیں اور ہر طرح کی آخرت کی نعمتوں اور راحتوں سے نوازیں، اور جمیع پسماندگان و متعلقین و منتسبین کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور ان کے گھر والوں کو ہر طرح کے شر ور و آفات سے بچائیں اور خصوصی مدد فرمائیں۔ ؎

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۹۴ء)

وفیات

(۱) دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل، نامور طبیب اور عالم باعمل مولانا حکیم محمد احسن صاحب سنبھلی ۵ رمئی ۱۹۹۴ء مطابق ۲۳ رذی قعدہ ۱۴۱۴ھ کو تقریباً ۸۲ رسال کی عمر میں اپنے آقائے رحیم وکریم کی آغوشِ رحمت میں پہونچ گئے۔ مرحوم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے حقیقی بھائی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے تلمیذ رشید تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد تکمیل الطب لکھنؤ میں فن طبابت کی

تکمیل کی، اور پھر طبابت زندگی کا مشغلہ بن گیا، جس کا سلسلہ وفات سے چند دن پہلے تک جاری رہا، مرحوم کو فن طب میں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور پر نبض شناسی میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دستِ شفا کی فیض بخش نعمت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اس لئے مطب خوب چلتا تھا مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن آپ نے اُسے حصولِ زر کے بجائے خدمتِ خلق اور زادِ آخرت کا ذریعہ بنا لیا تھا، روزانہ بہت سے مریض ایسے ہوتے تھے جن کے نسخوں پر "ف" کی علامت بنی ہوتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس مریض کو دوا مفت دیدی جائے، مزید برآں بہت سے مریضوں کے پرہیز کے لئے بھی اپنے جیب خاص سے انتظام کر دیا کرتے تھے، مریض کے گھر جانے کی بھی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔

مطب کی مشغولیت کے ساتھ جمعیۃ علماء کے اصلاحی و سماجی پروگراموں میں نہایت مستعدی و دلچسپی کے ساتھ شرکت کرتے تھے، اپنے محلّہ کی مسجد میں تقریباً ۴۰ ۵۰ رسال تک لوجہ اللہ امامت کے فرائض انجام دیئے اور ایک طویل مدت تک درس قرآن و درسِ حدیث دیتے رہے، حکیم صاحب کو قرآن سے خصوصی شغف تھا، اسی کا ثمرہ تھا کہ حافظ نہ ہونے کے باوجود قرآن اس قدر یاد تھا کہ گویا حافظ قرآن ہی تھے سحر خیزی و تہجد گذاری زندگی کا محبوب مشغلہ تھا حتی کہ آخر میں جب مرض نے بالکل نڈھال کر دیا تھا اور ضعف اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ خود سے تیمم بھی نہیں کر سکتے تھے ضعف و نقاہت کی اس حالت میں بھی نماز تہجد میں ناغہ نہیں ہونے دیا۔

مزاج میں قدرے ظرافت و لطافت تھی اس لئے گھر کے چھوٹے بڑے سب آپ سے انتہائی درجہ مانوس تھے، شکار کے بھی شوقین تھے، اور اس سلسلے کے بڑے دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے۔

تبلیغ دین اور احقاق حق و ابطال باطل میں بھی بڑے مستعد تھے اور اس

راستے میں بڑی بڑی قربانیاں دیں، انجمن معاون الاسلام جو سنبھل کا ایک مشہور عظیم دینی ادارہ ہے طویل عرصہ تک مرحوم اس کے ناظم اعلیٰ اور متولی رہے، اسی انجمن کی اراضی پر "مدینہ مسجد" کے نام سے ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی اور ایک مدرسہ مدینۃ العلوم کے نام سے قائم فرمایا، غرضیکہ مرحوم اپنی نیک نفسی اور گوناگوں دینی و سماجی خدمات کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔

دعا ہے کہ خدائے غفور و شکور مرحوم کی سیئات کو مبدل بحسنات فرمائے، ان کی علمی و دینی خدمات کو شرف قبولیت سے ہم کنار کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل و ثواب جزیل ارزانی فرمائے۔

دارالعلوم دیوبند کے نامور فاضل، تحریک مدح صحابہ کے فعال و متحرک قائد اور کاکوری ضلع لکھنؤ کے مشہور علمی و روحانی خانوادہ کے سپوت حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی ۲۳ر ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۳ / ۴ر جون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ؎ ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

مرحوم حضرت مولانا عبدالرحیم فاروقی کے فرزند اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور قدس اسرارہما کے برادر زادہ تھے، ۲۴ر شوال ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء کو اپنے آبائی وطن کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم علی الترتیب لکھنؤ اور مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ ضلع مرادآباد میں حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی وغیرہ اساتذۂ دارالعلوم سے دورۂ حدیث وغیرہ

پڑھ کر ۱۹۳۶ء میں سند فراغت حاصل کی، تعلیم و تحصیل سے فارغ ہو جانے کے بعد حضرت امام اہل سنت کے قائم کردہ ادارہ دار المبلغین سے وابستہ ہو گئے اور حضرت امام اہل سنت کی معیت میں اس علمی و تربیتی ادارہ کو بام عروج تک پہونچانے میں بے لوث خدمات انجام دیں اور بانیٔ ادارہ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک بحیثیت مہتمم کے اس کی خدمت کرتے رہے، دار المبلغین کی زیر سرپرستی چلنے والا مدرسہ عربیہ خزینۃ العلوم آپ ہی کی سعی مشکور کا مظہر ہے۔

۱۹۷۲ء میں دار المبلغین سے الگ ہو کر اپنی تمام تر توجہات کا مرکز دار العلوم فاروقیہ کاکوری کو بنا لیا تھا جسے انہوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک مکتب کی شکل میں قائم کیا تھا، مرحوم کے حسن اخلاق اور جہد مسلسل سے آج یہ مکتب ضلع لکھنؤ میں درس نظامی کا اہم ترین مرکز اور تعلیمی ادارہ شمار ہوتا ہے۔

خطۂ اودھ جو شیعی نوابان اودھ کی بدولت رافضیت کا ایک گڑھ باور کیا جاتا تھا جہاں شیعوں کے علاوہ سنی مکتب فکر سے وابستہ عوام بھی تشیع کی بدعات و خرافات سے ملوث تھے، مولانا مرحوم نے شیعوں کے اس مضبوط قلعہ میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے دراڑ پیدا کر دی اور نواب محمود آباد جیسے با اقتدار غالی شیعہ کے حوصلے پست کر دیئے۔

فضائل صحابہ پر آپ کی تقریر بڑی دلنشین اور اثر انگیز ہوتی تھی، اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، اپنی بے لوث علمی و دینی خدمات کی بنا پر ملک کے علمی و دینی حلقوں میں وقار و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

افسوس کہ فروتنی و انکساری، سادگی اور وضعداری کا یہ پیکر جمیل اور جہد و عمل کا شیدائی اور امام اہل سنت ــــ حضرت مولانا عبد الشکور رحمۃ اللہ علیہ کا ساختہ و پرداختہ اور ان کی اولاد کا امین اور ناموس صحابہ کا محافظ آج ہمارے

درمیان نہیں رہا، جانے والے خدا کی تم پہ ہزار ہزار رحمتیں ہوں۔

(۴)

شعبۂ تنظیم دارالعلوم دیو بند کے جواں سال کارکن مولانا غیاث الدین آسامی چند روزہ علالت کے بعد ۲۵؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ کو رحلت کر گئے، مرحوم دارالعلوم سے فراغت کے بعد شعبۂ تنظیم سے وابستہ ہو گئے تھے۔

مرحوم دارالعلوم کے ایک فرض شناس خادم ہی نہیں بلکہ اس کے سچے عاشق تھے، اور اسی جذبہ سے دارالعلوم کی خدمت کرتے تھے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کی اپنی خاص رحمت ونصرت سے دستگیری فرمائے۔

(ماہنامہ دارالعلوم جولائی ۱۹۹۴ء)

دو المناک حادثے

حلقۂ دیوبند کے لئے یقیناً یہ خبر انتہائی اندوہناک وغم انگیز ہے کہ مورخہ ۱۲ر شوال ۱۴۱۵ھ کو قطب ارشاد امام ربانی حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہ کے نبیرۂ کبیر حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود، عرف حکیم ننو میاں اپنے ہزاروں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر راہئ عالم جاودانی ہو گئے۔
اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور نخبۃ العصر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے تلمیذ سعید، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاز صحبت، بلند پایہ عالم دین اور نامور طبیب تھے۔ قوت حافظہ، کثرت مطالعہ اور استحضار علوم میں اپنے معاصر فضلاء میں امتیازی شان کے مالک تھے، رسمی طور پر علمی مشاغل نہ ہونے کے باوجود اہم اور دقیق و لطیف مسائل پر بے تکان اس طرح گفتگو فرماتے تھے کہ مخاطب حیرت و استعجاب سے دم بخود ہو جاتا تھا، خاص طور پر حقائق و معارف اور اسرار و حکم پر انہیں ایسی دسترس حاصل تھی کہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ کے بعد اس اختصاص میں کوئی اور ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا تھا۔ حضرات اکابر رحمہم اللہ کے احوال و واقعات اور آداب و اخلاق کے گویا حافظ تھے، اور اپنی مجلسوں میں بڑے مؤثر انداز میں ان کا ذکر کرتے رہتے تھے، زبان و بیان اور تحریر و تقریر پر یکساں قدرت رکھتے تھے، عام طور پر جلسوں اور عمومی اجتماعات میں شرکت اور وعظ و تقریر سے بچتے تھے لیکن اگر اتفاق

سے کسی جلسہ میں تقریر کی نوبت آجاتی تھی تو انداز بیان کی شگفتگی اور علمی نکات کی فراوانی سے پورے مجمع کو بےخود بنا دیتے تھے، آج سے چودہ سال پہلے ۲۴؍ جمادی الاخریٰ سنہ۱۴۰۱ھ کو عالمی موتمر کے اجلاس عام دیوبند میں حکیم صاحب مرحوم و مغفور حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم کی دعوت پر شریک ہوئے تھے اور تقریر بھی فرمائی تھی، بس مت پوچھئے کہ تقریر کیا تھی؟ حقائق و معارف اور اسرار و حکم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر تھا جس کی موجوں کا تلاطم دلوں کی دنیا کو زیر و زبر کر رہا تھا اور مجمع کی زبان پر صل علیٰ و مرحبا کی صدائیں بلند تھیں۔

حضرت حکیم صاحبؒ طبعی طور پر نمود و نمائش سے گریزاں اور عزلت پسند تھے، مزاج و مذاق کی اسی کیفیت کا اثر تھا کہ پوری زندگی گنگوہ کے ایک زاویہ میں گذار دی اور عقیدت مندوں کی طلب و اصرار کے باوجود سفر و سیاحت کے لئے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا اور اپنے لئے زندگی کی جو وضع پسند کی، مدت العمر اس پر قائم رہے، فن طبابت میں ید طولیٰ حاصل تھا اور قدرت کی جانب سے دستِ شفا کی دولت سے بھی ہم کنار تھے۔ اس لئے اس ذریعہ سے انہیں اس قدر حاصل ہو جاتا تھا کہ کسی اور طرف نظر اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

سیرت قدوسیہ، اجتماع گنگوہ، الکتاب المحمود فی خطاب ابن مسعود یعنی حضرت تھانویؒ اور حکیم صاحب کے مابین مراسلت کا مجموعہ یہ چند رسائل مرحوم کی تحریری یادگار ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے حکیم صاحب مرحوم کو گوناگوں تعلق تھا، دارالعلوم ان کے جد امجد حضرت گنگوہی کی توجہات کا ایک طویل زمانہ تک مرکز رہ چکا تھا

اور خود ان کا مادر علمی تھا اور تقریباً پانچ چھ سال تک اس کی مجلس شوریٰ
کے رکن رکین بھی رہ چکے تھے، اس لئے ان کی کوئی مجلس دار العلوم کے
تذکرے سے عام طور پر خالی نہیں ہوتی تھی، دار العلوم کے طلبہ و اساتذہ اور
حضرات ذمہ داران بھی حضرت حکیم صاحب سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔
چونکہ حضرت حکیم صاحب سے متعلق دو مضمون شائع ہو چکے ہیں ایک
اپریل کے شمارے میں اور دوسرا اسی زیر نظر شمارہ میں، اس لئے انہی سطور پر
یہ سوگوار تحریر ختم کی جارہی ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حکیم صاحب کی
مغفرت فرمائے اور حضرات انبیاء، شہداء، صدیقین اور صالحین کے ساتھ ان کا
حشر فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر و ضبط کی توفیق ارزانی کرے۔

حضرت حکیم صاحب علیہ الرحمۃ کا غم ابھی تازہ تھا کہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء
مطابق ۱۴ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ کو تقریباً ساڑھے سات بجے شب میں دار العلوم
دیوبند کے قدیم استاذ اور سابق مددگار مہتمم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی
کی وفات حسرت آیات کا حادثہ پیش آگیا حضرت مولانا کیرانوی عرصہ سے شوگر
کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ادھر ماہ شعبان سے گردوں کے فعل میں اختلال
پیدا ہوگیا تھا، اسی وقت سے برابر علاج و معالجہ کا سلسلہ جاری رہا لیکن
افاقہ کے بجائے مرض بڑھتا ہی رہا، تا آنکہ تدبیر پر تقدیر غالب آگئی اور مولانا
نہ جانے کتنے تلامذہ و عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر رحمتِ حق سے پیوست
ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سلسلۂ نسب و تاریخ پیدائش

حضرت مولانا وحید الزماں بن مولانا
مسیح الزماں بن مولانا محمد اسماعیل

بن مولانا حسین احمد، ۲۷ر فروری ۱۹۳۰ء / ۱۳۴۹ھ کو ضلع مظفر نگر کے مشہور قصبہ کیرانہ میں پیدا ہوئے، آپ ایک علمی خانوادہ کے چشم وچراغ تھے، آپ کے والد، دادا پر دادا سب عالم تھے اور آپ کی دادی مؤلف مظاہر حق شرح مشکوٰۃ نواب قطب الدین دہلوی کی پرپوتی تھیں۔

تعلیم و تحصیل متوسطات کی تعلیم اپنے آبائی وطن کے مدرسہ عربیہ جامعہ مسجد کیرانہ میں حاصل کی، بعد ازاں ۱۹۴۸ء / ۱۳۶۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور چار پانچ سال یہاں زیر تعلیم رہ کر ۱۹۵۲ء / ۱۳۷۲ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ اور دیگر اساتذہ حدیث سے دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ زمانہ تحصیل ہی میں "سلسلۃ الدروس العربیہ" کے نام سے ہفت روزہ دیواری پرچہ آویزاں کرتے تھے اور عربی زبان کے شائق طلبہ کو عربی کی مشق وتمرین بھی کراتے تھے، نیز دارالعلوم میں آنے والے عرب مہمان کے سپاسنامے لکھنے کی خدمت بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔

علمی و ملی خدمات فراغت تعلیم کے بعد رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اور ان کی معیت میں اہم قومی و ملی خدمات انجام دیں اور بڑی بڑی سرکاری ضیافتوں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں ۹ر افراد پر مشتمل ہندوستان سے ایک خیرسگالی وفد سعودی عرب گیا جس میں مولانا مرحوم ایک ترجمان کی حیثیت سے شامل تھے۔

۱۹۵۹ء میں دارالفکر کے نام سے دیوبند میں ایک علمی واشاعتی ادارہ قائم کیا جس کے تحت "القاسم" کے نام سے ایک ماہنامہ مجلہ مولانا ہی کی ادارت میں نکلتا تھا، علاوہ ازیں، انگریزی زبان وادب کی تعلیم کے لئے شبینہ کلاسیں

جاری کی گئیں، جن میں عربی کی تعلیم مولانا خود دیتے تھے۔ مولانا کی مشہور اردو عربی لغت "القاموس الجدید" کا پہلا ایڈیشن اسی ادارہ سے شائع ہوا تھا۔

دارالعلوم میں تقرر اور تعلیمی وانتظامی خدمات

۱۹۶۳ء / ۱۳۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذِ عربی آپ کا تقرر ہوا، اور اپنی حسنِ کارکردگی کی بنیاد پر ایک سال کے اندر درجۂ وسطیٰ (ب) میں ترقی کرکے پہنچ گئے پھر چند سال میں ترقی کرکے درجۂ وسطیٰ (الف) پھر ۱۹۷۵ء / ۱۳۹۵ھ میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی، اور عربی زبان و ادب کے ساتھ طحاوی شریف، اور نسائی شریف کا درس آپ سے متعلق ہو گیا۔

۱۹۶۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے عربی زبان میں ایک سہ ماہی مجلہ "دعوۃ الحق" کے نام سے آپ کی ادارت میں جاری ہوا جو ایک عرصہ تک پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا جس نے اپنی ظاہری معنوی خوبیوں کی بنا پر علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا، دعوۃ الحق کے بند ہو جانے کے بعد اس کی جگہ پر "الداعی" کا اجراء عمل میں آیا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی ایک عرصہ تک آپ ہی کے سپرد رہی۔

طلبہ دارالعلوم کی مؤقر عربی انجمن "النادی العربی" بھی آپ ہی کی یادگار ہے جس سے وابستہ ہوکر ہر سال سیکڑوں طلبہ عربی تقریر و تحریر کی مشق کرتے ہیں۔ جب تک مولانا مرحوم دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، النادی العربی کی سرپرستی اور نگرانی آپ ہی سے وابستہ رہی اور آپ کی توجہ اور محنت سے اس دوران عربی تقریر و تحریر پر قابو یافتہ طلبہ کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی جس سے دارالعلوم دیوبند کی نیک نامی میں مزید اضافہ ہوا، اور خود حضرت مولانا کی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہو گیا، درحقیقت

مولانا کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

حضرت مولانا کیرانوی علیہ الرحمہ ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رکین بھی رہے۔ ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ کے ایک سہ رکنی وفد میں بحیثیت قائد وفد کے متعدد عرب ممالک کا دورہ بھی کیا، نیز جمعیۃ علماء ہند کے پندرہ روزہ عربی اخبار الکفاح کے مدیر اعلیٰ اور اس کے تصنیفی شعبہ مرکز دعوت اسلام کے ڈائرکٹر بھی ایک عرصہ تک رہے جس سے بہت ساری کتابیں شائع کیں۔

اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند کے موقع پر دارالعلوم کی عمارتوں کی تجدید و تزئین کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد کی گئی، چونکہ فرصت کم اور کام بہت زیادہ تھا اس لئے عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ کام کی تکمیل نہ ہو سکے گی، لیکن آٹھ ماہ کی مختصر سی مدت میں اپنی شب و روز کی انتھک محنتوں سے دارالعلوم کی نہ صرف قدیم عمارتوں کو آراستہ پیراستہ کر دیا بلکہ جدید عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا کہ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں ہو گیا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اس غیر معمولی دوڑ دھوپ اور بے پناہ مشقت نے آپ کی صحت کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ پھر مکمل صحت یابی میسر نہیں آئی اور عمر کے ساتھ مرض و ضعف بھی بڑھتا چلا گیا۔

دارالعلوم کے حالیہ انقلاب کے بعد جب نئی انتظامیہ کی زیر نگرانی دوبارہ دارالعلوم میں تعلیمی و تدریسی سلسلہ کا آغاز ہوا تو اس موقع پر آپ کو مجلس تعلیمی کا ناظم منتخب کیا گیا، بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں معاون مہتمم کا اہم منصب آپ کو

تفویض ہوا، اس زمانہ میں بھی مولانا مرحوم نے اپنی صحت سے بے نیاز ہوکر دارالعلوم کے تعلیمی و انتظامی معیار کو بلند سے بلند تر بنانے میں انتھک جدوجہد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرض کنٹرول سے باہر ہوگیا اور علاج و معالجہ کے ساتھ راحت و آرام ڈاکٹروں کی تجویز کے مطابق ضروری ہوگیا، اس لئے اپنے مزاج و عادت کے برخلاف کچھ دنوں کے لئے سارے کام موقوف کردیئے، لیکن بے کار بیٹھنا مولانا کی طبیعت و فطرت کے خلاف تھا اس لئے کچھ وقفے کے بعد پھر کام پر آگئے، مگر اب صحت انتظامی معاملات میں سر کھپانے کے لائق نہیں تھی اس لئے اہتمام سے تعلق ختم کرکے دوبارہ شعبۂ تدریس میں چلے گئے لیکن یہ سلسلہ بھی تادیر قائم نہ رہ سکا، اس حال میں بھی مولانا کی ہمت جوان اور حوصلہ بلند تھا، مگر مولانا سے اب مزید کام لینا ان پر ایک طرح کا ظلم تھا، اس لئے مجلس شوریٰ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تاحیات پنشن مقرر کرکے تدریس کے بار سے بھی ہلکا کردیا۔

شانِ عبقریت مولانا مرحوم کی زندگی دراصل حرکت و عمل سے عبارت تھی، اور چونسٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں انہوں نے جس قدر مختلف النوع خدمات انجام دی ہیں، ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے، وہ تنہا مدرس ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے مربی بھی تھے، مردم سازی اور رجال کار کی تیاری میں وہ اپنی مثال آپ تھے، ایک بلند پایہ مدرس و معلم کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مقرر بھی تھے، علاوہ ازیں غیر معمولی تصنیفی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے، اپنی انتہائی مصروف و ہنگامہ خیز زندگی میں نہ جانے وہ کس طرح سے تصنیف و تالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔ چنانچہ تقسیم الہند والمسلمون فی الجمہوریۃ الہندیۃ (اردو سے ترجمہ) آخرت کا سفر نامہ، شرعی نماز، انسانیت کے حقوق، اچھا خاوند،

اچھی ہیوی،، القاموس الجدید (اردو سے عربی اور عربی سے اردو ڈکشنری) القراۃ الواضحہ عربی ریڈر (تین حصے) وغیرہ آپ کی تصنیفی یادگار ہیں۔ آخر الذکر دونوں کتابوں کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

مولانا کی ان گوناگوں خدمات اور کارناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہ ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے جو دنیا میں خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا کی وفات کی اطلاع جیسے ہی دارالعلوم میں پہنچی، پورا دارالعلوم اداس ہوگیا، صبح کو کلمۂ طیبہ پڑھ کر ایصال ثواب کیا گیا، بعد ازاں جلسہ تعزیت میں حضرت مولانا ریاست علی بجنوری مدظلہ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے تعزیتی تقریر کی جس میں مولانا کی علمی اور فعال زندگی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی، وفات کا حادثہ دلّی میں پیش آیا تھا جہاں مولانا زیر علاج تھے، میت رات کے پچھلے پہر دیوبند پہنچی، اسی وقت سے طلبہ و اساتذہ کا مولانا کے گھر آخری زیارت کے لئے تانتا لگا رہا۔

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی اتفاق سے بجنور تشریف لے گئے تھے رات ہی کو فون سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دی گئی، چنانچہ صبح سویرے وہ بھی آ گئے اور برائے تعزیت مولانا مرحوم کے مکان پر تشریف لے گئے حضرت مہتمم صاحب کے ہمراہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی، مولانا عبدالخالق مدراسی اور راقم السطور نے بھی مولانا مرحوم کے دولت کدہ پر حاضر ہوکر تعزیت کی سنت ادا کی، اور صاحب زادۂ محترم اور برادران گرامی قدر کو تسلی دی اور صبر و ضبط کی تلقین کی، تقریباً گیارہ بجے جنازہ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں لایا گیا اور دارالعلوم کے استاذ حدیث مولانا نعمت اللہ زید مجدہ نے نماز جنازہ پڑھائی ایک محتاط اندازہ کے مطابق جنازہ میں دس ہزار سے کم کا اجتماع نہیں تھا،

نمازِ جنازہ کے بعد طلبہ وعلماء کے کاندھوں پر سوار ہوکر چمنستان قاسمی کا یہ عندلیب شیدا مزارِ قاسمی میں پہنچ کر ہمیشہ کے لئے آسودہ خواب ہوگیا۔

دعا ہے کہ خدائے غفار وستار مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں مقام کرامت سے نوازے اور ان کے پسماندگان بالخصوص اہلیہ محترمہ اور صاحبزادگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۹۵ء)

وقعت الواقعہ

دنیا کی سب سے بڑی دینی تحریک "جماعت تبلیغی" کے سربراہ اور امیر حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی (حضرت جی) ۱۰ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۹۵ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا و یورپ میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا کون مسلمان ہوگا جو "حضرت جی" کے نام نامی اور دعوت و تبلیغ سے متعلق ان کی انتھک جدوجہد اور بے پناہ خدمات سے آشنا نہ ہو؟ حضرت مولانا مرحوم ایک بلند پایہ عالم، محقق استاذ، صاحب نظر محدث، متبع سنت بزرگ، لاکھوں افراد کے پیر و مرشد اور جماعت تبلیغی کے بانی و معمار حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی دہلوی قدس سرہ کے ساختہ و پرداختہ اور معتمد خلیفہ تھے حضرت مولانا کاندھلویؒ نے اپنی حیات کے آخری ایام میں اپنے جاری کردہ دعوت و تبلیغ کے تعلق سے جن لوگوں پر اطمینان واعتماد کا اظہار فرمایا تھا ان میں ایک حضرت مولانا انعام الحسن مرحوم و مغفور بھی تھے اس لئے حضرت مولانا کی وفات تنہا ایک فرد کی وفات نہیں، صرف ایک عالم دین کی رحلت کا حادثہ

نہیں بلکہ ایک دور کا اختتام، ایک روایت کا خاتمہ اور ایک باب عقیدت ومحبت کا انسداد ہے اور بلا تردد کہا جا سکتا ہے:

"کانہ بنیان قوم تہدما"

ضلع مظفر نگر یوپی کے مشہور مردم خیز اور علمی وثقافتی قصبہ کاندھلہ میں ۱۸؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ موافق ۲۰؍فروری ۱۹۱۸ء چہارشنبہ کو پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

مولانا انعام الحسن بن مولانا اکرام الحسن بن مولانا رضی الحسن بن مولانا حکیم محمد ابراہیم بن مولانا نور الحسن بن مولانا ابوالحسن خاتم مثنوی مولانا روم حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

صاحب فیض بزرگ "حافظ منگتو" کی خدمت میں قرآن پاک حفظ کیا، اور اپنے نانا مولوی حکیم عبدالحمید بڈولوی سے اردو، فارسی کا درس لیا اور خوش خطی کی مشق کی۔ تقریباً نو سال کے تھے کہ حضرت مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت قدس سرہٗ اپنے ساتھ نظام الدین دہلی لائے اور یہیں رہ کر حضرت مولانا دہلوی اور حضرت مولانا احتشام الحسن سے عربی، صرف، نحو، ادب، فقہ وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر آگے کی تعلیم کے لئے ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ سابق امیر جماعت تبلیغی کی رفاقت میں مظاہر علوم کے اساتذہ مولانا صدیق احمد کشمیریؒ، مولانا عبدالشکورؒ، مولانا قاری سعید احمدؒ صدر مفتی اور مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی سے شرح ملا جامی، کنز الدقائق، اصول الشاشی، میر قطبی، قطبی تصدیقات وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء میں مظاہر علوم ہی میں دورۂ حدیث کی کتابیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، حضرت

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ، حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری کی خدمت میں علی الترتیب پڑھیں اور دورہ حدیث کی بقیہ کتابیں یعنی سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شرح معانی الآثار للطحاوی نظام الدین دہلی میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ سے مکمل کیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جماعت تبلیغی سے وابستہ ہو گئے اور حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحبؒ دہلوی کے حکم سے دعوت و تبلیغ کے لئے طویل طویل دوروں پر گئے۔ حضرت اقدس دہلوی سے بیعت بھی ہوئے اور مراحل سلوک طے کر کے ۱۳۶۳ھ میں اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔

امیر جماعت حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی وفات ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ نے بحیثیت امیر جماعت مولانا مرحوم کا انتخاب فرمایا، اگرچہ اس انتخاب پر اس وقت بعض حلقوں سے اظہار حیرت کیا گیا لیکن بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب نہایت مناسب موزوں اور درست تھا۔

اس انتخاب کے بعد دعوت و تبلیغ کے اس ہمہ گیر کام کی پوری ذمہ داری مولانا مرحوم کے کاندھوں پر آ گئی تھی جسے انہوں نے نہ صرف بحسن و خوبی انجام دیا بلکہ اس کے دائرہ عمل میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا، ادھر کئی سالوں سے صحت خراب رہی مگر مقصد کی دھن اور کام کی لگن میں صحت کی خرابی سے بے پرواہ ہو کر طویل طویل ملکی و غیر ملکی دورے کرتے رہے اور وعظ و خطابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اسی مسلسل محنت نے مولانا مرحوم کو اندر سے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔

مولانا مرحوم اسلامی علوم حدیث، فقہ، نحو، لغت وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مدرسہ کاشف العلوم نظام الدین میں جب دورہ حدیث کا سلسلہ قائم ہوا تو بخاری شریف کا درس آپ ہی سے متعلق کیا گیا، تقریباً چالیس سال کی طویل مدت تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا اور مروجہ نصاب کی تقریباً سب ہی کتابیں زیر درس رہیں، آخر میں صحاح ستہ میں سے کوئی ایک کتاب زیر درس رہی مگر قریب کے چند سالوں سے خرابی صحت اور غیر معمولی ضعف کی بنا پر یہ خوش گوار سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔

مولانا مرحوم کا آخری تبلیغی سفر ضلع مظفر نگر کے قصبہ کسیرہ کا ہوا، وہاں سے فارغ ہو کر وطن کاندھلہ ایک روز قیام کر کے ۸ رمحرم کو نظام الدین مرکز واپس ہو گئے، یہیں ۱۰ رمحرم ہفتہ کی رات میں تقریباً نو بجے دل کا سخت دورہ پڑا، فوراً ہسپتال لے جائے گئے، جہاں ڈاکٹروں بالخصوص امراض القلب کے عالمی شہرت کے معالج ڈاکٹر خلیل اللہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ تین گھنٹوں تک کوشش میں لگے رہے مگر وقت موعود آچکا تھا اور دین کا داعی چند گھنٹوں کی علالت کے بعد تقریباً ڈیڑھ بجے شب میں اپنے ہزاروں متعلقین اور لاکھوں مریدین ومسترشدین کو اللہ کے حوالہ کر کے خود اس کی آغوش رحمت میں پہنچ گیا۔

موت ایک لابدی حقیقت ہے جو بھی دنیا میں آیا ہے لازمی طور پر اس سے دوچار ہوگا۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔ لیکن اللہ کی راہ اور عشق الٰہی میں جان دینے والا مرد مومن مر کر بھی مرتا نہیں۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بلاشبہ مولانا مرحوم بھی اسی راہ عشق کے قتیل ہیں جن کا نام دوام

انشاءاللہ زندہ وباقی رہے گا۔

دارالعلوم دیوبند میں بذریعہ دفتر جمعیۃ علماء ہند تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح کو حادثہ فاجعہ کی خبر پہنچی، اس وقت مسجد کے مائک سے اس وحشت اثر خبر کا اعلان ہوا اور دیکھتے دیکھتے دارالعلوم کا چپہ چپہ حزاں زار ماحول غم والم کی فضاں میں تبدیل ہوگیا، دارالعلوم سے جنازہ میں شرکت کے لئے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم، حضرت صدر المدرسین مولانا نصیر احمد خانصاحب ناظم تعلیمات حضرت مولانا قمر الدین صاحب، استاذ حدیث حضرت مولانا سید ارشد مدنی وغیرہم کے علاوہ چار پانچ سو طلبہ مختلف سواریوں سے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے اور بقیہ اساتذہ وطلبہ ترقی درجات اور مغفرت کی دعاؤں میں مشغول رہے۔

تقریباً ڈیڑھ بجے ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ اب حضرت جی اس دنیا میں نہیں رہے اور نصف گھنٹہ بھی نہیں گذرا ہوگا کہ اس الم ناک حادثہ کی خبر پوری دنیا میں پھیل گئی اور کچھ وقفہ کے بعد ہی سے فون اور فیکس اندر ملک وبیرون ملک سے جنازہ میں شرکت کے لئے آنے والوں کی اطلاعات آنی شروع ہوگئیں، دن گذار کر ۸ بجے شام کو نماز جنازہ کا اعلان ہوا تھا لیکن صبح ہوتے ہوتے ہر چہار طرف سے لوگ امنڈ پڑے، ہمایوں مقبرہ کے متصل نرسری پارک کے وسیع میدان میں بعد نماز مغرب جنازہ کی نماز ادا کی گئی، مگر یہ وسیع میدان اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگ پڑ گیا، ایک محتاط اندازہ کے مطابق ڈھائی تین لاکھ کا مجمع جنازہ میں شریک رہا، ملک کے شہروں کے علاوہ سعودی عرب، قطر، عرب امارات وغیرہ سے بھی متعلقین پرائیویٹ جہازوں کے ذریعہ پہنچ گئے تھے۔

راقم الحروف کے قدیم ونہایت شفیق استاذ حضرت مولانا عبدالقیوم بکھراوی ۱۶رذی الحجہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۷ ارمئی ۱۹۹۵ء چہارشنبہ کو دارفانی سے رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت استاذ محترم ایک علمی ودینی گھرانہ کے چشم وچراغ تھے، آپ کے دادا حافظ رمضان صاحب، حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے مجاز بیعت تھے اور والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحمٰن دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی ؒ کے اکابر خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ ۱۳رمحرم ۱۳۲۴ھ کو اپنی نانیہال راجہ پور سکرہ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی۔ ۱۳۴۱ھ میں کانپور کے مشہور عربی مدرسہ اشرف العلوم میں داخل ہوئے، اور یہاں تین چار سال زیر تعلیم رہے۔ ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور مسلسل پانچ سال وہاں رہ کر مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی ؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی ؒ، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی ؒ وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے دورہ حدیث پڑھ کر ۱۳۵۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، اور ۱۰رمحرم ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں حضرت شیخ المشائخ مولانا عبدالغنی پھولپوری ؒ بانی مدرسہ کی طلب پر استاذ مقرر ہوئے پھر یہ تعلق زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔

راقم الحروف نے "تذکرہ علماء اعظم گڑھ" کی ترتیب کے زمانہ میں حضرت الاستاذ کی خدمت میں ایک خط لکھ کر گذارش کی تھی کہ اپنے والد محترم حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراوی قدس سرہٗ کے حالات تحریر فرمادیں، چنانچہ

حسب درخواست وہ تحریر لکھ دی، اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"جب میں دیوبند سے فارغ ہو کر ۱۳۵۰ھ میں مکان آیا تو آنے کے ساتھ ہی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں جو میرے والد کے پیر بھائی اور حقیقی دوست تھے ۱۰ر محرم ۱۳۵۱ھ میں مجھے مدرسہ بیت العلوم میں مدرس رکھ لیا ..... اب میری ملازمت کو چھیالیس سال ہو رہے ہیں، بزرگوں کی دعا کا اثر ہے کہ حوادث و مصائب کے باوجود اتنے زمانہ تک علوم دینیہ کی خدمت کا موقع ملا، اب میری حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری بقیہ زندگی بھی انہیں طلبہ و علماء و صلحاء کی خدمت میں گذرے اور انہیں سے تجہیز و تکفین کرادے اور حشر اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ ہو، اور ایمان پر خاتمہ ہو"

یہ شوال ۱۳۹۵ھ کی تحریر ہے اس حساب سے کل مدت تدریس ۶۵ برس ہوتی ہے۔ ۶۵ سال کا یہ طویل زمانہ صرف ایک مدرسہ میں گذار دیا۔ جس کی مثال اصحاب درس علماء میں کم تر ہی ملے گی، مولانا کو بیت العلوم سے تعلق عشق کی حد تک تھا اس سے دوری اور فرقت کو برداشت نہیں کر پاتے تھے۔

سادگی، تواضع اور خوش خلقی میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، پابند اوقات اس درجہ تھے کہ اس میں تخلف مشکل ہی سے پیش آتا، قرآن کی تلاوت عادت ثانیہ بن چکی تھی چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے زبان پر کلام الٰہی کی آیتیں جاری رہتیں، پڑھانے کا انداز ایسا نرالا تھا کہ اسے پڑھانا نہیں بلکہ اسے گھول کر

بلانا کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش پوری فرمادی اور علمار وصلحار ہی کے ہاتھوں تجہیز وتکفین عمل میں آئی اور انہیں کے کاندھوں پر سوار ہو کر بکھرا سے بیت العلوم پہنچے اور اسی کی خاک میں آسودہ خواب ہوگئے۔

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے معمور فرمائے اور ان کی دعا کے مطابق صدیقین شہدار صالحین کے ساتھ ان کا حشر فرمائے اور جنت کے درجات عالیہ سے ہم کنار فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ دارالعلوم جولائی ۱۹۹۵ء)

مولانا ولی حسن ٹونکی

بقلم: مولانا مرغوب احمد لاجپوری

۲ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ مطابق ۳ر فروری ۱۹۹۵ء شب جمعہ بوقت سحر میرے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات نے خصوصًا پاکستان اور عمومًا پورے عالم اسلام کے تمام دینی اور علمی حلقوں کے اہل قلوب کو متاثر کر کے رکھ دیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

راقم الحروف ۱۹۸۶ء میں جب برطانیہ آیا، ابھی چند مہینے گذرے تھے کہ یہ فرحت بخش اطلاع ملی کہ آج شام بعد عصر حضرت مفتی ولی حسن صاحب تشریف لا رہے ہیں، حضرت کا کچھ غائبانہ تعارف تو پہلے سے تھا مگر شوق زیارت نے عصر کا انتظار ایسا مشکل بنا دیا کہ "الانتظار اشد من الموت" کی مثل کا عملی تجربہ ہوگیا، یہ حضرت کی پہلی زیارت و ملاقات تھی، پھر تو حق تعالیٰ نے ۱۴۰۸ھ

میں حضرت سے شرف تلمذ کا موقع عنایت فرمایا۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

ولادت حضرت رح کی ولادت ۱۹۲۴ء میں ہوئی، مفتی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا مفتی انوار الحسن خاں صاحب جید عالم و مفتی تھے، غالباً عدالت شرعیہ ٹونک میں عہدہ افتاء پر بھی فائز تھے، آپ کے جد امجد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ٹونکی رح ریاست ٹونک کے مایہ ناز علماء میں سے تھے، انہوں نے تن تنہا "معجم المؤلفین" کے نام سے عربی مصنفین کی ایک وسیع انسائیکلو پیڈیا مرتب کی تھی، جو برسوں تشنہ طباعت رہی، بعد میں اس کی چند جلدیں شائع ہوئیں، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ٹونکی رح اپنے علاقہ میں فتویٰ کے معاملہ میں بھی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے اور مفتی محمد حسن اور مولانا محمود حسن اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب رح کے استاد بھی تھے، الغرض مولانا رح کا تعلق علمی خاندان سے تھا جن میں مفتی صاحب کے والد ماجد، جدّ امجد کے علاوہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث و مہتمم مولانا حیدر حسن خانصاحب رح جیسی معروف شخصیات شامل ہیں۔ ؎

این سلسلہ طلائے ناب است

این خانہ ہمہ آفتاب است

تعلیم حضرت مفتی صاحب رح نے فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں اپنے والد ماجد صاحب رح سے پڑھیں، گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ والد ماجد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا، رمضان المبارک کی تعطیلات میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب بغرض تعزیت ٹونک تشریف لائے، اور مفتی صاحب کو ندوہ لے جانے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ آپ دار العلوم ندوہ میں داخل ہوئے اور چار سال رہ کر ندوہ کا چار سالہ نصاب ختم کیا، اس دوران مولانا حیدر حسن خانصاحب رح

سے (جب کہ موصوف ظہر سے قبل طویل وضو فرماتے تھے) الفیہ ابن مالک کا کچھ حصہ اور منطق کے ایک دو رسالے بھی پڑھے۔

اس کے بعد ٹونک تشریف لائے کیوں کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ بھی ندوہ سے الگ ہو کر ٹونک تشریف لے جا چکے تھے، ندوہ کے بعض اساتذہ نے حضرت مفتی صاحب کے متعلق مولانا حیدر خاں صاحب سے یہ سفارش بھی کی کہ اس کو ندوہ ہی میں رہنے دیا جائے مگر مولانا نے فرمایا کہ اسے پرانے طرز کا عالم بنانا ہے، چنانچہ مفتی صاحب نے ٹونک ہی میں رہ کر مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے حماسہ، ملا حسن اور فلسفہ کی بعض کتابیں پڑھیں، تا آنکہ مولانا رح کا بمرض فالج انتقال ہوگیا، پھر مفتی صاحب نے عدالت شرعیہ ٹونک میں ملازمت اختیار کر لی، اور اس دوران الہ آباد سے مولوی اور پنجاب سے مولوی عالم اور مولوی فاضل سے امتحانات دیئے۔

مگر ابھی تک تشنگی علم باقی تھی اور علم حدیث و تکمیل درس نظامی کا شوق دامن گیر تھا، اس لئے ملازمت کو خیر باد کہہ کر "مظاہر علوم سہارنپور" تشریف لائے، یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد "دار العلوم دیوبند" آئے، اور موقوف علیہ اور دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کی، بخاری اور ترمذی شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنیؒ سے اور ابوداؤد و شمائل ترمذی مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے اور مؤطا، مولانا عبدالحق صاحبؒ سے اور بقیہ کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔

درس و تدریس

دیوبند سے فراغت کے بعد دوبارہ ٹونک تشریف لائے اور عدالت شرعیہ جسے سولہ قسم کے مقدمات کو فیصل کرنے کا حق تھا، اس کے منصب افتار و قضار کو زینت بخشی، اور تقسیم ہند تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس درمیان مفتی صاحبؒ نے اپنے جدامجد مولانا مفتی محمود

صاحبؒ کے باقی ماندہ کام کی تکمیل کا آغاز بھی فرمایا، مگر تقسیم ہند کا وقت آگیا تو مفتی صاحبؒ نے پاکستان کے سفر کا فیصلہ کرلیا اور کراچی تشریف لے گئے، اس وقت کراچی میں دینی تعلیم کا ایک ہی مرکزی ادارہ تھا، جو کھڈہ کے علاقے میں "مظہر العلوم" کے نام سے معروف تھا، لیکن ظاہر ہے وہ تمام اہل علم کو اپنے اندر سمو نہیں سکتا تھا۔ اس لئے مفتی صاحب نے اس وقت پرنس روڈ پر واقع "میٹرو پولیس ہائی اسکول" میں اسلامیات کے استاذ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے آرام باغ کی باب الاسلام مسجد میں "امداد العلوم" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا جس میں حفظ و ناظرہ کے علاوہ ابتدائی فارسی و عربی تک کی تعلیم کا انتظام تھا، مفتی صاحب مرحوم کے ایک رفیق درس اور دارالعلوم کراچی کے سابق ناظم مولانا نور احمد صاحب اس مدرسہ کی بنا میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کے دست و بازو کے طور پر کام کرتے تھے، موصوف چونکہ دارالعلوم دیوبند میں مفتی ولی حسن صاحبؒ کے ہم سبق رہ چکے تھے اور انہیں پوری طرح اندازہ تھا کہ علم و فضل کا یہ شہسوار درحقیقت کسی ہائی اسکول میں پڑھانے کے لئے نہیں، بلکہ اسلامی علوم کے کسی بڑے مرکز سے فیض رسانی کے لئے پیدا ہوا ہے، چنانچہ انہوں نے ابتداء میں "امداد العلوم" کے مدرسے سے ان کا رابطہ کرایا، اور جب سنہ ۱۹۵۱ء میں نانک واڑہ میں دارالعلوم کراچی کی بنیاد پڑی تو وہ مفتی صاحبؒ کو مستقل طور پر ہائی اسکول سے دارالعلوم لانے میں کامیاب ہوگئے اور دارالعلوم کراچی سے حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی علمی خدمات کا آغاز فرمایا، اور وہاں پانچ سال تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے فتویٰ نویسی

کی خدمات بھی جزوی طور پر مفتی صاحب کے سپرد کردی تھیں۔

۱۹۵۶ء میں جب دارالعلوم کراچی نانک واڑہ کی تنگ عمارت سے کورنگی کے ایک وسیع رقبہ زمین پر منتقل ہوا چونکہ یہ جگہ شہر سے دور ہے اسلئے روزانہ یہاں آمدورفت بہت مشکل اور مشقت طلب تھی، دوسری طرف مفتی صاحب کو بعض ایسے گھریلو اعذار لاحق تھے جن کی وجہ سے وہ مستقل طور پر دارالعلوم کے احاطے میں قیام سے بھی معذور تھے۔ اس لئے مفتی صاحب اس موقع پر دارالعلوم سے مستعفی ہوکر محدث جلیل حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ؒ کے مدرسہ عربیہ ٹاؤن سے منسلک ہو گئے اور اسی سے اخیر تک وابستہ رہے۔

اوصاف وکمالات

حضرت مفتی صاحبؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے علم اور مطالعہ کو صرف درسیات کی حد تک محدود رکھتے تھے، بلکہ ان کا شب وروز کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ مطالعہ تھا، اور وہ ہر علم وفن کے بارے میں وسیع مطالعے کے حامل تھے، اور کتابوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں، جب کسی شخص کو کسی خاص موضوع پر مواد کی تلاش ہوتی، تو وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس پہنچ جاتا، اور حضرت اس کو برجستہ بہت سی کتابوں کے نام بتا دیتے اور اس سائل کا کام بنجاتا۔

یوں تو حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے لیکن انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے مزاج لکھنؤ کے مطابق تاریخ اور ادب کے ساتھ بھی خصوصی وابستگی حاصل تھی، اس لئے ادب کا درس بھی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے دیا کرتے تھے، بلکہ ابتداء عربی ہی سے طلبہ میں عربی تقریر وتحریر کا ذوق پیدا فرمایا کرتے تھے۔

حق تعالےٰ نے مفتی صاحب کو بڑی جامعیت اور اعلیٰ صلاحیت سے

نوازا تھا، ہر فن پر کمال حاصل تھا مگر خاصۃً فقہ میں عجیب ملکہ حاصل تھا، گویا فقہ آپ کا خصوصی موضوع تھا، عام طور پر فقہ کی کتب کے مسائل کلیات سے سمجھا دیا کرتے، ہدایہ کے درس میں نہ صرف یہ کہ ہدایہ کے مباحث کو بڑے دل نشیں پیرایہ میں سمجھاتے بلکہ متعلقہ مسئلے کے اصولی پہلو پر بطور خاص روشنی ڈالتے۔ اور مسئلے سے نکلنے والی اصولی ہدایات کی نشان دہی بھی فرماتے، اور بسا اوقات یہ بھی بتاتے کہ ان اصولی ہدایات سے وقت کے نو بہ نو مسائل میں کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت مفتی صاحبؒ عصر حاضر کی تمام فکری تحریکوں سے پوری طرح باخبر تھے اور جدید مسائل کے بارے میں اپنے آپ کو تازہ ترین معلومات سے مزین رکھتے تھے، چنانچہ ان کے درس میں بھی یہ ساری معلومات اس طرح منعکس ہوتی تھیں کہ طالب علم کی فقہی بصیرت کو جلا اور ترقی ملتی تھی اور فقہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوتی تھی۔

فقہ میں جو خاص ذوق آپ کو ودیعت ہوا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ دقیق سے دقیق مسائل بڑی آسانی سے حل فرما دیا کرتے تھے۔ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کی تمام تر ذمہ داری آپؒ ہی کے ذمہ تھی، آہستہ آہستہ اس شعبہ کے رفتار کار میں اضافہ ہوتا رہا، اور مفتی صاحبؒ ۱۳۸۱ھ میں اس کے سربراہ اور رئیس ہو گئے۔

جامعہ میں درس نظامی کے ساتھ مختلف تخصصات کا اجراء عمل میں آیا تو حضرت مفتی صاحب کو تخصص فی الفقہ کا نگراں مقرر کیا گیا، اس تخصص کی نگرانی کے ذریعہ سیکڑوں طلبہ کو فیض پہنچایا۔

حضرت بنوریؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو آپ کے تفقہ پر بڑا اعتماد تھا مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حضرت بنوریؒ نے آپ کو "فقیہ العصر"

کا لقب دیا تھا، اسی اعتماد کی وجہ سے جدید مسائل میں اجتماعی غور و فکر کے لئے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے نام سے ایک کمیٹی کی تشکیل وجود میں آئی تو حضرت مفتی صاحب پر نظر انتخاب پڑی بلکہ آپ اس مجلس کے رکن رکین تھے۔

خدا کرے حق تعالےٰ مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی اشاعت کی کوئی صورت بنا دے اور کوئی قدر داں شاگرد اس عظیم کام کے لئے کمر بستہ ہو جائے۔ میری فائل میں داڑھی کے متعلق مولاناؒ کا ایک فتویٰ نظر سے گذرا، اس کو نظر ناظرین کرتا ہوں۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

۱۔ داڑھی کترے حافظ کے پیچھے نماز خواہ فرض ہو یا تراویح ہو، کیا حکم ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

۲۔ بعض مساجد میں انتظامیہ کی طرف سے ایسے حفاظ کو تراویح کی اجازت دی جاتی ہے، کیا انتظامیہ پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

الجواب

باسمہ تعالےٰ

۱۔ بصورت مسئولہ ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔ ڈاڑھی منڈانا یا ایک مشت سے کم کرنا ناجائز و حرام ہے، ڈاڑھی کترا حافظ بے شک فاسق فاجر ہے جب تک کہ اس فعل سے توبہ نہ کرے نیز مکروہ تحریمی پر عمل کرنا عملاً حرام ہے، جو شخص ڈاڑھی ایک مشت سے کم کراتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے، ڈاڑھی ایک مشت رکھنے پر چاروں مذاہب کا اتفاق ہے۔ شامی، عالمگیری اور فقہ کی دوسری کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ عالم گیری کی عبارت ہے:

"والقصر سنة فيها وهو ان يقبض الرجل لحيته
فان زاد منها على قبضة قطعه ذكرمحمد۔"

۲۔ اس فعل قبیح کے ارتکاب میں انتظامیہ برابر کی شریک ہوگی بنیز تواریخ میں لکھا ہے کہ جب کسریٰ شاہ ایران نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک پھاڑ کر اپنے ماتحت گورنر یمن باذان کو لکھا کہ دو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجو، وہ جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے پاس بھیج دیں، باذان کے جب دو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو ان دونوں کی ڈاڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں:

"وكان على زى الفرس من حلق لحاهم واعفاء
شواربهم فكره صلى الله عليه وسلم، النظر اليهما
وقال ويلكما من امركما بهذا.قال امرنا ربنا يعنيان
كسرىٰ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولٰكن
ربي قد امرني باعفاء لحيتي وقص شاربي۔"

ان دونوں مجوسیوں کی فیشن کے مطابق ڈاڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں تو حضور علیہ السلام کو ان کی مکروہ شکل بہت ہی ناپسند آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم پر ہلاکت ہو، تم کو کس نے یہ مکروہ شکل بنانے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمارے رب کسریٰ نے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن میرے رب نے مجھے ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔

غور کیجئے وہ دونوں مہمان تھے، کافر تھے، ہمارے مذہب کے پابند ہی

نہ تھے مگر چونکہ ان کی یہ بری صورت فطرت سلیمہ کے خلاف تھی، اور شیطان لعین کے حکم کے مطابق تھی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ مکروہ شکل دیکھنی گوارہ نہ ہو سکی، ان سے منہ موڑ لیا، اور ان کو بد دعائیہ جملہ فرمایا کہ تم پہ ہلاکت ہو، ساتھ ہی یہ بھی تصریح فرمادی کہ میرے رب تعالیٰ نے تو مجھے پوری ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹانے کا حکم فرمایا ہے گویا جو ڈاڑھی اللہ تعالےٰ کو پسند ہے اور جس کا اس نے حکم دیا ہے اس کی مقدار وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکھ کر بتائی کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی، پس آپ کے محب امتیوں کو غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ ان مجوسیوں کی اتباع کر کے روزانہ ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں اور ان کے یہ اعمال روزانہ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حرکات دیکھ کر کتنا دکھ ہوگا۔ اور میدان قیامت میں حضور علیہ السلام کے امتی ایسی مکروہ صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوں تو اس وقت اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے منہ موڑلیں تو کتنا بڑا خسارہ ہے۔

کتبہ: ولی حسن

دارالافتاء، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری

ٹاؤن کراچی، ۲۱، جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ

جامعہ علوم اسلامیہ میں مفتی صاحب مرحوم نے تقریباً ہر فن کی کتابیں پڑھائیں، پھر اخیر میں جامع ترمذی اور بخاری شریف سالوں تک پڑھاتے رہے جامع ترمذی پڑھانے سے قبل حضرت بنوری رح کے درس ترمذی میں دو سال تک خصوصیت سے شرکت فرماتے رہے اس کے بعد حضرت رح نے ترمذی ان کے حوالہ کردی اور حضرت بنوریؒ کی وفات کے بعد صحیح بخاری کی تدریس میں حضرت بنوری رح کی جانشینی کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا، اس

دوران ہزارہا شاگردوں نے فیض حاصل کیا اور اطراف عالم میں دینی و علمی خدمات میں مصروف ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ کا صدقہ جاریہ ہے، حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں راقم الحروف کو آپ سے بخاری شریف و ترمذی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوگئی، اس کے بعد مرض کی وجہ سے حضرت کا سلسلۂ تدریس موقوف ہوگیا، راقم الحروف دوران درس حضرت کی کچھ باتیں لکھ لیا کرتا تھا وہ امانت افادہ عام کے لئے ملفوظات کے عنوان سے حوالہ قرطاس کرتا ہوں۔ (آخر میں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرت رح کا درس محدثانہ، فقیہانہ ہوتا تھا۔ درس ترمذی میں فقہی شان کا غلبہ ہوتا، اور درس بخاری میں محدثانہ رنگ غالب رہتا، بخاری کی بہ نسبت ترمذی میں تفصیلی کلام فرماتے کبھی کبھی مختلف کتابوں کے حوالے بتلاکر طلبہ سے وہ حوالجات نکلواتے اور فرمایا کرتے تھے کہ میرے شیخ حضرت مدنی رح کا طرز بھی ایسا ہی تھا۔ راقم نے بارہا مفتی صاحبؒ سے سنا ہے کہ:

> ”حضرت مدنیؒ ترمذی بہت تحقیق سے پڑھاتے اور دوران درس حضرت کے سامنے بہت ساری کتابیں رہتیں، ان کے حوالے دیا کرتے اور طلبہ کو دکھایا کرتے، اور اہم مباحث کو بہت آسان کرکے سمجھاتے۔“

مفتی صاحبؒ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ محبت تھی، ذکر مبارک سے اکثر اشکبار ہوجاتے، بعض مرتبہ کیفیت بلکل بے قابو ہوجاتی جس کا اثر شاگردوں پر بھی ظاہر ہوجاتا، استاذ کے آنسو کے ساتھ تلامذہ کی آنکھیں بھی اشک بار نظر آتیں۔

آپ کے عشق نبویؐ کا کچھ اندازہ اس وقت ہوا کہ ۱۴ ر شوال ۱۴۰۸ھ

بروز یکشنبہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ نے ہماری جماعت کا امتحان لیا۔ مشکوٰۃ میں حجۃ الوداع کی طویل حدیث موضع امتحان تھی، ایک ساتھی نے یہ عبارت " ثم اذن فی الناس بالحج فی العاشرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم حاج" (مشکوٰۃ) پڑھی کہ مولانا رحؒ کی آنکھیں بے اختیار آنسو بھر لائیں، چوں کہ یہ پہلا موقع تھا، میں بہت متاثر ہوا پھر تو ایسے مواقع متعدد مرتبہ نظروں سے گذرے۔ خصوصاً کتاب التفسیر میں واقعہ افک کی عبارت جب طالب علم نے پڑھی، مفتی صاحبؒ کی حالت بکاریہ ہوگئی کہ سبق نہ پڑھا سکے، دوسرے دن بڑی مشکل سے بھراتی ہوئی آواز میں درس دیا۔ ایسے موقع میں تقریباً سارے ہی طلبہ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی، جو دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

مفتی صاحبؒ کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی، لیکن آپ کا درس انتہائی دل نشین اور دل چسپ ہوتا تھا، طبیعت میں غضب کی ظرافت تھی جس سے زبان کی معصومانہ لکنت اس تقریر میں کمی کرنے کے بجائے اور اضافہ کر دیتی تھی۔

تواضع

اللہ تعالےٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو جن صفات وخصوصیات سے نوازا تھا وہ بمشکل ہی کسی ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں، گویا یہ شعر آپ کے مطابق حال تھا ؎

لیس علی الله بمستنکر — ان یجمع العالم فی واحد

ایک طرف تو فقہ وحدیث کے پہاڑ اور ادب عربی اور دیگر علوم کے بحر ذخار مگر اس علم وفضل کے بلند مقام کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کوئی اجنبی دیکھنے والا پتہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اس سادہ سے پیکر میں علم وفضل کے کیسے خزانے جمع ہیں، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ

ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔ ؎

تواضع کا طریقہ سیکھ لو صراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

یہی حال حضرت مفتی صاحبؒ کا بھی تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ایک بڑا امتیازی وصف یہ تھا کہ آپ اظہارِ حق میں بڑے نڈر واقع ہوئے تھے، ارباب تمول اور دنیوی عہدہ رکھنے والوں کے سامنے بے دھڑک اظہارِ حق کرنے میں "لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم" کے مصداق تھے، ایک مرتبہ مساجد کے سلسلہ میں عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسی مساجد منہدم کی جاسکتی ہیں جو کچی آبادی میں حکومت کی اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی ہوں، حضرت مفتی صاحب نے عدالت کے خلاف انہدام مسجد کے عدم جواز کا فتویٰ دیا، جس پر ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ درج ہوا، چنانچہ عدالت میں پیشی ہوئی، اور حضرت سے طلب معافی کا مطالبہ ہوا، مفتی صاحبؒ نے ججوں کے سامنے بغیر کسی مرعوبیت کے فرمایا:

"میرا تعلق علماء دیوبند سے ہے اور علماء دیوبند کبھی بھی حکومت یا اربابِ اقتدار کے سامنے جھکا نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک "الدین النصیحۃ" کے تحت حق بات کہا کرتے ہیں، میں اپنے فتویٰ پر قائم ہوں اور کبھی بھی معافی نہیں مانگوں گا۔"

جس پر حاضرین نے بھرپور داد دی، عدالت برخاست ہوئی اور کراچی کے عوام کے جوش و خروش سے خائف ہو کر حکومت نے اسلام آباد میں پیشی کا فیصلہ کیا، مگر نصرت خداوندی شامل حال رہی اور بالآخر عدالت کو اپنے توہین عدالت کے مقدمہ میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔

تصنیف و تالیف

وسعت مطالعہ اور تدریس و افتار کے ساتھ حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو بہترین تحریری صلاحیت سے بھی نوازا تھا، غالباً ان کی سب سے پہلی کتاب "تذکرۃ الاولیار" شائع ہوئی تھی، پھر حکومت کے بنائے ہوئے خلافِ شریعت عائلی قوانین کے خلاف آپ کی فاضلانہ کتاب "عائلی قوانین شریعت کی روشنی میں" بڑی مقبول ہوئی، فتنہ انکار حدیث کے خلاف بھرپور کام کیا اور اس موضوع پر "فتنۂ انکار حدیث" نامی کتاب لکھی، ان کے علاوہ "بیمۂ زندگی"، "پرائیویڈنٹ فنڈ" اور "قربانی کے مسائل" کے نام سے تحقیقی و علمی تصانیف مرحوم کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ "بینات"، "البلاغ" و دیگر ماہناموں میں آپ کے وقیع مقالات اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے، حضرت بنوریؒ کی سوانح حیات "بینات نمبر" میں محدث العصر کے عنوان سے مفتی صاحبؒ نے حضرت بنوریؒ کی خدمت علم حدیث پر جو تفصیلی مضمون تحریر فرمایا ہے وہ آپ کی غیر معمولی صلاحیت پر شاہد عدل ہے۔

بیعت و ارشاد

حضرت مفتی صاحبؒ کا اصلاحی تعلق شروع میں حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ سے رہا اور کئی بار ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی، موصوف کی وفات کے بعد برکۃ العصر حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ سے بیعت ہوئے۔ اور ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء میں خلافت سے نوازے گئے جب کہ حضرت شیخؒ جنوبی افریقہ میں معتکف تھے، مفتی صاحب کی کمال عبدیت کا یہ عالم تھا، فرماتے تھے "میں اپنے آپ کو حضرت شیخ کے لوگوں میں سب سے زیادہ گندہ، نجس، نااہل سمجھتا ہوں"۔

مرض و وفات

آج سے تقریباً چھ سال قبل مفتی صاحبؒ پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس میں قوت گویائی بھی باقی نہ رہی، مسلسل

علاج کے نتیجے میں اتار چڑھاؤ آتے رہے، لیکن معذوری کی سی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہ آیا جو حضرتؒ کو عملی زندگی میں دوبارہ لاسکے، بالآخر شب جمعہ ۲ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کو داعی اجل کا پیغام آگیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے عرصے سے رمضان اور جمعہ کے انتظار میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کے پہلے ہی جمعہ میں انہیں اپنے پاس بلالیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی نماز جنازہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے پڑھائی، اور مرحوم کی حسب خواہش و وصیت دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

نوٹ: مولانا مفتی صاحبؒ کے یہ حالات ماہنامہ بینات (مارچ ۱۹۹۵ء) اور ماہنامہ البلاغ (اپریل ۱۹۹۵ء) اور "حضرت شیخ الحدیث اور ان کے خلفائے کرام" سے ماخوذ ہیں۔

ملفوظات

۱۔ لوگ کشف و کرامت کے پیچھے پڑے ہیں حالانکہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ حسن خاتمہ کی دولت نصیب ہوجائے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی نسبت بڑے آب و تاب کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف منتقل ہوئی، اسی طرح مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی نسبت منتقل ہوئی مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ کی طرف، اسی لئے مولانا نعمانی نے رد شیعیت پر بڑا کام کیا۔

۳ - حضرت مدنی رح مذاقاً فرمایا کرتے تھے " لکل شیٔ نصاب ونصاب الشای ثلاث " رواہ مسلم (یعنی راوی الحمدللہ مسلمان ہے)۔

۴ - مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے فرمایا کہ " باسی روٹی صبح کو شہد کے ساتھ دو تین نوالے کھالے اس کا حافظہ اچھا ہوگا۔

۵ - حضرت شیخ الہند کے نواسے فرمایا کرتے تھے " جسے نیند نہ آتی ہو وہ گھی سونگھا کرے۔

۶ - حضرت بنوریؒ کے والد صاحبؒ سے کسی نے یہ سوال کیا کہ وضو میں پہلے کلی کرنے پھر ناک صاف کرنے کی کیا حکمت ہے، جواباً فرمایا " پہلے کلی کر کے ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کا مزہ کیسا ہے اور ناک میں پانی ڈال کر ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کی خوشبو کیسی ہے "!

۷ - جو آدمی یہ آیت " سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ " تین سو تیرہ (۳۱۳) مرتبہ پڑھے وہ دشمن کے شر سے محفوظ رہے گا۔

۸ - اس زمانے میں غسل خانے اور بیت الخلا ایک ساتھ بنانے کا رواج ہوگیا تو ایسی جگہ پر وضو کے وقت مسنون دعائیں نہ پڑھے۔

۹ - حدیث کی اردو کتابیں (ترجمہ) پڑھ کر لوگ منکر حدیث بن جاتے ہیں لیکن مظاہر حق بڑی اچھی کتاب ہے اس کو پڑھ کر کوئی گمراہ نہیں ہوگا۔

۱۰ - حدیث کی علتوں کو جاننا بہت مشکل ہے۔ امام بخاریؒ اس فن کے امام تھے، ان کے بعد امام نسائی رح پھر امام مسلم رح پھر امام ابو داؤد رح پھر امام ترمذیؒ۔

۱۱ - ابواب سب سے بہتر بخاری کے ہیں، پھر نسائی کے، پھر ابو داؤد کے۔

۱۲ - تقلید نہ کرنے سے آدمی دین سے نکل جاتا ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو

مدینہ منورہ میں مکاشفہ ہوا تھا، کہ حنفی مسلک کی تقلید کرو ورنہ مشکل ہو گا۔

۱۳۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حدیث پڑھی شیخ ابوالطاہر المدنیؒ سے استاذ فرمایا کرتے تھے " ولی اللہ مجھ سے الفاظ سیکھتا ہے اور میں اس سے معانی سیکھتا ہوں۔

۱۴۔ ایک چیز ترش ہے ایک شیریں اور بعض کچھ ترش کچھ شیریں۔ اسی طرح ایک حدیث "حسن" ہے ایک "صحیح" ہے اور ایک "حسن صحیح" ہے۔

۱۵۔ علم حدیث کا ماخذ " واما بنعمة ربك فحدث " ہے (فتح الملہم)

۱۶۔ قرآن کی حفاظت اللہ نے کی اور حدیث کی حفاظت کا کام اللہ نے امت سے لیا، محدثین نے بڑی محنت فرمائی۔ صرف حدیث کے راویوں کے بارے میں کام کیا اس کا اندازہ اس بات سے نکالا جا سکتا ہے کہ دس ہزار راویوں کے حالات ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

۱۷۔ گناہوں میں اعلیٰ درجہ معصیت ہے اور کمزور درجہ ذنب ہے۔

۱۸۔ جو بلا وضو نماز پڑھے اور ثواب کی نیت رکھے وہ کافر ہے اور جو مال حرام سے زکوٰۃ دے اور ثواب کی نیت رکھے وہ بھی کافر ہے۔

۱۹۔ عبادات اور عادات میں فرق کرنے والی چیز نیت ہے۔

۲۰۔ سب سے پہلے جس نے فقہ کو مدون کیا وہ امام محمدؒ ہیں اور جس نے سب سے پہلے (صحیح) حدیث کو جمع کیا وہ امام بخاریؒ ہیں، امام محمدؒ سے پہلے لوگوں نے جو کتابیں لکھیں وہ اکثر زہد میں تھیں۔

۲۱۔ ساری حدیثوں کا باوا آدم " زہریؒ " ہیں اور معترضین (منکرین حدیث) کو انہیں پر بڑا اعتراض ہے۔

۲۲۔ میرے استاذ فرمایا کرتے تھے " سیرۃ ابن ہشام " ایسی ہے جیسے

بخاری۔

۲۳۔ یہ جو کہتے ہیں کہ بندر نے زنا کیا، اس کو دوسرے بندروں نے سنگ سار کیا، حضرت مدنیؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بندر نہیں تھے بلکہ جنات تھے۔

۲۴۔ یثرب موت کے کنویں کو کہتے ہیں چوں کہ گرمی کی وجہ سے لوگ بہت مرجاتے تھے اس لئے اس کا نام یثرب ہوگیا۔

۲۵۔ بعض لوگوں نے کہا، ابن جریر طبری کے نزدیک مسح علی القدمین جائز ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ابن جریرؒ نے یہ کہا ہے کہ پاؤں محل شقاق ہے اس لئے جب دھوئے تو ہاتھ بھی پھیرلے، اس کو لوگوں نے غلط سمجھ لیا۔

۲۶۔ قرآن کو اہل ہند نے خوب اور زیادہ سمجھا اگرچہ اترا ہے دوسری جگہ۔

۲۷۔ او۔ مولویو! حدیث کو صرف قال نہ بناؤ بلکہ حال بناؤ۔

۲۸۔ علم حدیث کی تین تعریفیں منقول ہیں:

(۱) "علم یعرف به اقوال النبی صلی الله علیه وسلم واحواله" اس علم کا نام علم روایۃ الحدیث ہے۔

(۲) "علم یبحث منه عن کیفیة اتصال الحدیث بالنبی صلی الله علیه وسلم من حیث رواتها ضبطاً وعدلاً وبحیثیة اتصالاً وانقطاعاً وغیر ذلك" اس علم کا نام علم اصول الحدیث ہے۔ اس پر ابن صلاح نے بڑا کام کیا ہے۔

(۳) "علم باحث عن المعنی المفهوم من الفاظ الحدیث وعن المراد مبینا عن القواعد

العربية والضوابط الشرعية " اس علم کا نام علم درایۃ الحدیث ہے۔

اس کا موضوع راوی اور مروی ہے اور غرض وغایت " الفوز بسعادۃ الدارین" ہے۔

۲۹۔ آج یورپ میں مسلمان لڑکی کی شادی کافر سے ہو رہی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ ہند و پاک واپس آجائیں اگرچہ پیدل سفر کر کے آنا پڑے، وہاں رہنے سے بہتر ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۹۵ء)
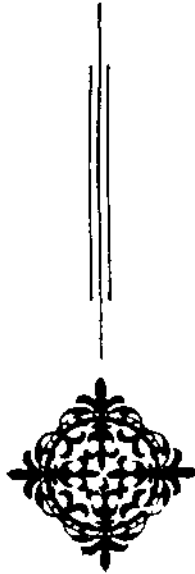
تاریخ وفات مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

نمایاں لوح تاریخی

۱۴۱۷ھ

نحمد اللہ المبدی العظیم و نصلی علی النبی الکریم

۱۹۹۶ء

مزار فیض گنجور - قبر شیر خدا - اہل ہنر قاضی اطہر

۱۴۱۷ھ ۱۴۱۷ھ ۱۴۱۷ھ

بآہ حضرت - پاک نہاد مولانا عبد الحفیظ صاحب

۱۴۱۷ھ ۱۴۱۷ھ

معدن گہر قاضی اطہر مبارکپوری - اہل تصنیفہائے کثیرہ

۱۹۹۶ء ۱۴۱۷ھ

نیکو لقب الحاج مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

۱۹۹۶ء

رحمۂ الوہاب الاول العظیم - نوّر مرقدہ الہادی العظیم الرحیم

۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء

برّد مضجعۂ الحی العزیز الحلیم

۱۴۱۷ھ

اعوذ باللہ المقسط القوی من الشیطن الرجیم

۱۹۹۶ء

بسم اللہ الفتاح الحسیب الرحمٰن الرحیم

۱۴۱۷ھ

قال الودودُ الہادی، وسقاھم ربھم شرابا طھورًا

۱۴۱۷ھ

اکرام المعید المحیی علیکم ادخلوا الجنہ

۱۴۱۷ھ

ان اللہ العلی الجلیل یرفع العلم برفع العلماء

۱۴۱۷ھ

موتُ العالِم اللثیق موتُ العالَم

۱۴۱۷ھ

قال حبیب اللہ الوکیل الوالی، الموتُ جِسْرٌ یُوصِل الحبیبَ الی الحبیب

۱۴۱۷ھ

برخاک پاک او دما دم ابر سلامتی شود — بقلم عقیدت آگیں محمد عثمان معروفی

۱۹۹۶ء — ۱۹۹۶ء

محمد عثمان المعروفی کان الملک لہٗ

۱۴۱۷ھ

زیبا نگار قاضی اطہرؒ — نجم مُنَوّر قاضی اطہر مبارکپوریؒ

۱۴۱۷ھ — ۱۹۹۶ء

سخن مطبوع محمد عثمان معروفی

۱۹۹۶ء

حبیب قطعۂ تاریخ

۱۴۱۷ھ

وفات تیری یہ قاضی اطہر بھلا سکے گا نہ چرخ دوراں
تو آسمانِ علوم و فن کا عجیب تھا نیر درخشاں

تو ایک شاعر تو اک صحافی تو اک مصنف تو اک مدرس
عظیم اک انجمن تھا تنہا عجیب اک دیدہ ور تھا انساں

کبھی تھا لاہور میں تو زمزم کا ایک اعلا رئیس تحریر
تو بمبئی انقلاب اور البلاغ کا تھا مدیر تاباں

کبھی وطن میں رہا مدرس کبھی ترا درس بمبئی میں
اکیڈمی شیخ ہند کا دیوبند میں تھا تو ایک نگراں

فقط تعلم تھا اور تعلیم اور تصنیف شغل تیرا
رواں تھی ستر برس سے تیری صحافت و درس فقہ و قرآں

تری تصانیف شوق سے دیوبند و دہلی نے طبع کی ہیں
ملا ہے علمی ایوارڈ چودہ سو پانچ ہجری میں نشان شایاں

تعلقِ ہند اور عرب ہے تری کتابوں کا خاص موضوع
عظیم اسلام کا مورخ کہ ایک ملت ہے جس پہ نازاں

کتاب "خیر القرون کی درسگاہیں" اعلا تری نگارش
تری کتابوں کا مصر میں ترجمہ ہوا اور طبع ہوئیں واں

ترے تدبر ترے تعمق پہ خود ہیں شاہد تری کتابیں
تو ایک علامۂ زماں تھا عجم ہے نازاں عرب ثنا خواں

خلا ہوا تجھ سے ایسا پیدا جو پُر بظاہر نہ ہو سکے گا
کہ رفعِ علما سے حق تعالیٰ کرے گا یوں رفع علم دوراں

یقین آیا یہ تیری رحلت سے موت عالِم ہے موت عالَم
لحد منور ہو تیری جس پر ہو رحمتِ حق مدام باراں

صفر کی تاریخ تھی اٹھائیس الم کا چودہ سو سترہ سنہ
جولائی پندرہ، سنہ ہے انیس سو چھیانوے میں لقاء رحماں

"فروغ کوکب" (۱۳۲۴ھ) تری ولادت "جمیل" (۸۳) ہے تیری عمر ساری
"عجیب اشتغال" (۱۴۱۷ھ) تیری رحلت ترا کرے وصف کیا یہ عثماں

تری ولادت ہے عیسوی سنہ سے "بخت خرسند" (۱۹۱۶ء) عمر ہے "نیک" (۸۰)
وصال ہے "باغ زندگی بخش" (۱۹۹۶ء) بات عثماں کی نمایاں

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ ابھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لے کر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اسکی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پتہ: ڈرافٹ وچیک کے لئے

"دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر 247554

ماہ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۸	فی شمارہ -/۶	سالانہ -/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
مہتمم دار العلوم دیوبند	استاذ دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم۔ دیوبند سہارنپور (یوپی)

سالانہ بدل اشتراک:
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۰۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہو گا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

پچھلے مہینے یہ جانکاہ خبر دلوں پر صاعقہ بن کر گذری کہ ملک کے مشہور صاحب قلم عالم و محقق، مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ۲۸؍صفر ۱۴۱۷ھ ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء بروز یکشنبہ تقریباً دس بجے شب میں اس سرائے فانی سے رحلت کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اللّٰہم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ ونقّہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

یوں تو دنیا کے اس مسافر خانہ سے سبھی کو ایک نہ ایک دن رختِ سفر باندھنا ہے شب و روز کے ہنگاموں میں نہ جانے کتنوں کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہوگئے بہت سوں کی اس دائمی جدائی پر دلوں کو شدید رنج و الم بھی ہوتا ہے لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن کی رحلت کی خبر دلوں پر بجلی گرادے، اور جن کی یاد ان لوگوں کے دلوں میں بھی ہوک اور سخت بے چینی پیدا کردے جو ان سے قرابت اور رشتہ داری کا رسمی رابطہ نہیں رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کو اپنی رحمتوں میں شرابور کرے، وہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی زندہ دلی اور وسیع علمی خدمات کی وجہ سے علمی دنیا میں ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور جو شخص بھی علم و تحقیق کی کچھ قدر و منزلت اپنے دل میں رکھتا ہے اس کے لئے بلاشبہ قاضی صاحبؒ کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔

ان کی وفات گرچہ پوری علمی دنیا کے لئے ایک ایسا حادثہ ہے جسے تادیر بھلایا نہیں

جا سکے گا، لیکن اس ناچیز کے لئے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے ان کے قریبی اعزہ کے لئے اس لئے کہ وہ اس ناچیز پر اس درجہ شفیق و مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ کم و بیش پچیس سال تک قاضی صاحب کی صحبتیں نصیب رہیں، صرف عمومی محفلوں میں نہیں، نجی مجلسوں اور سفر و حضر میں ان کی معیت نصیب ہوئی، ہر حال میں مرحوم کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں کو نظرانداز کر کے مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بے تکلف نہیں بلکہ بتلطف چھوٹے بن جاتے تھے۔ قاضی صاحب ہی کی بے پناہ شفقتوں اور مخلصانہ ہمت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔ جزاه الله عني وعن العلم خير الجزاء۔

سادگی و بے تکلفی، کتب بینی کا ذوق، مطالعہ کی وسعت، کتابیں جمع کرنے کا بے پایاں جذبہ، پاکیزہ شعری مذاق، علمائے امت و سلف صالحین کے تذکروں سے عشق کی حد تک شغف، علمائے دیوبند کے مسلک پر تصلب کے باوجود دوسروں کے ساتھ توسع و رواداری خوردوں کی ہمت افزائی اور انہیں آگے بڑھانے کا بے لوث جذبہ، اور ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں مشغولیت وغیرہ قاضی صاحب کی کتاب زندگی کے وہ دل کش ابواب ہیں جن سے خود ان کی شخصیت رعنائیوں کا مرقع بن گئی تھی۔

تاریخ ولادت قاضی صاحب ۴ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری نے "عبدالحفیظ" نام رکھا مگر وہ اپنے قلمی نام قاضی اطہر مبارکپوری ہی سے مشہور و معروف ہوئے۔ اور اصل نام اس طرح متروک ہو گیا کہ اب کم ہی لوگ اس سے واقف ہوں گے۔

طلب و تحصیل قصبہ کے اساتذہ سے قرآن مجید، اردو زبان اور ریاضی وغیرہ کی مکتبی تعلیم مکمل کر کے سنہ ۱۳۴۵ھ میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی تعلیم کا آغاز کیا اور وہاں کے اساتذہ مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری، مولانا شکر اللہ مبارکپوری، مولانا بشیر احمد مبارکپوری، مولانا محمد عمر مبارک پوری وغیرہ سے نحو و صرف، ادب

بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ وغیرہ مروّجہ نصاب کی تمام کتابیں پڑھیں۔ ان اساتذہ کے علاوہ اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری سے عروض و قوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے۔ قاضی صاحب کی علمی تربیت میں مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا بڑا حصہ ہے قاضی صاحب میں کتب بینی اور مطالعہ کا چسکہ پیدا کرنے والے اصل میں یہی ہیں۔ نئی نئی کتابیں لاکر قاضی صاحب کو دیتے اور اس کے مطالعہ پر انہیں اکساتے اس طرح رفتہ رفتہ کتب بینی ان کی عادت ثانیہ بن گئی۔

مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مروّجہ نصاب مکمل کر لینے کے بعد جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مراد آباد کا علمی سفر کیا اور فخر المحدثین مولانا سید فخرالدین احمد شیخ الحدیث سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابوداؤد، اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل سنبھلی سے صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۵۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

ذوقِ مطالعہ قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنی مختصر خود نوشت سوانح حیات "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" میں لکھا ہے:

> "غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون و دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔۔۔۔ چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب دیکھتا تھا۔۔۔۔ بعض اساتذہ از راہِ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر زیادہ نہ پڑھو ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تو میں عرض کرتا کہ اگر ایسا ہوا تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا۔ کثرتِ مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی۔۔۔۔۔ اور چکر آنے لگتا تھا" (ص ۲۱ - ۲۲)

اسی ذوقِ مطالعہ کی یہ برکت تھی کہ قاضی صاحب نے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں دیکھ لی تھیں، انہوں نے خود درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

فہرست ابن ندیم، وفیات الاعیان، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، دلائل النبوۃ،

سبحة المرجان فی آثار ہندوستان، آکام المرجان فی احکام الجان حیاۃ الحیوان، الصواعق المحرقہ العمدۃ فی الشعر ونقدہ، المحاسن والاضداد، الشعر والشعراء، المیزان الکبریٰ، سیرت ابن ہشام وفاء الوفاء، المستطرف، دیوان فرزدق، کتاب الملل والنحل، العقد الفرید، رسالۃ الغفران تہذیب التہذیب، توالی التاسیس وغیرہ۔

اس فہرست کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا ..... اسی طرح جمعیۃ الطلبہ (مدرسہ احیاء العلوم) کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔" (ص ۲۳-۲۴)

اس فہرست کو ملاحظہ کیجئے اور بتائیے کہ آج کے ہمارے وہ فضلاء جو کسی اور کام میں نہیں بلکہ علمی مشغلہ میں لگے ہوئے ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے ان کتابوں کو دیکھا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے بہت سوں کو ان کتابوں میں سے اکثر کا نام بھی معلوم نہ ہوگا تو میرا خیال ہے کہ یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

اسی ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ قاضی صاحب کا سینہ معلومات کا گنجینہ بن گیا تھا، جو بعد میں ان کے نوک قلم سے رواں ہوکر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوگیا جسے دیکھ کر ایک خلقت انہیں مؤرخ اسلام کہنے پر مجبور ہوگئی، اور بلاشبہ قاضی صاحب کو یہ حق تھا کہ وہ جگر مرحوم کے الفاظ میں کہیں۔ ے

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

درس و افادہ علوم و فنون کی تحصیل سے رسمی فراغت کے بعد تعلیم و تدریس سے جدید علمی سفر کا آغاز کیا۔ اور اپنی مادر علمی مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں چار پانچ سال تدریسی خدمت انجام دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسی کا یہ اولین تجربہ شاید کچھ مناسب نہیں ثابت ہوا جس کی جانب خود قاضی صاحب نے نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں:

"مدرّسی کا یہ چار پانچ سالہ دور میرے حق میں صبر ایوب اور گریۂ یعقوب کا دور تھا" (ص ۱۴۹) انجام کار احیاء العلوم سے علیحدہ ہوکر نومبر ۱۹۴۴ء میں "مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر" سے وابستہ ہوگئے جہاں انہوں نے ردّ شیعیت اور رد قادیانیت سے متعلق اہم مضامین و مقالات سپرد قلم کئے۔ پھر "زمزم کمپنی لمیٹیڈ لاہور" کے اصرار بجد پر "مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر" سے الگ ہوکر "زمزم کمپنی" سے منسلک ہوگئے یہاں ۱۹۴۶ء تک مسلسل اس میں کام کرتے رہے اس مدت میں کمپنی کی جانب سے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔ افسوس کہ یہ گرانقدر علمی سرمایہ تقسیم ہند کے ہنگامہ کی نذر ہوگیا۔

زمزم کمپنی سے وابستگی ہی کے دوران قاضی صاحب کے والد ماجد فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے حرمین شریفین کے سفر پر گئے تو خانگی ضروریات کے لئے تقریباً تین چار ماہ گھر پر رہے اور عارضی طور پر چند اسباق احیاء العلوم میں پڑھاتے رہے۔ پھر جنوری ۱۹۴۷ء سے ملک کے مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر نگرانی روزنامہ زمزم لاہور میں اخبار نویسی اور صحافت کی خدمت انجام دی۔ اور تقسیم ملک سے کچھ پہلے فارقلیط کی معیت میں اس خیال سے وطن آ گئے کہ تقسیم کے ہنگامہ کے بعد واپس آجائیں گے مگر حالات نے دوبارہ لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔

۱۹۴۸ء کی ابتداء میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم سکریٹری حکومت یوپی کی نگرانی میں بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار "انصار" جاری کیا مگر یہ اخبار حکومت کے عتاب کی وجہ سے سات آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اس لئے بہرائچ سے منتقل ہوکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے آئے اور پورے ایک سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ اپنی مشہور تصنیف "رجال السند والہند" کی تدوین کی ابتداء ڈابھیل کے زمانۂ قیام ہی میں کی تھی۔

غرض تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً آٹھ سال مبارکپور، امرتسر، لاہور، بہرائچ، ڈابھیل کے تعلیمی و صحافتی اداروں میں رہ کر تدریس، صحافت، مضمون نگاری اور شعرگوئی میں گذر گئے۔

بمبئی میں قیام اور تصنیفات کا سلسلہ

ان مختلف تعلیمی و صحافتی اداروں کے تجربات سے انہیں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ ان کا اندر بیٹھا ہوا فرہاد علم ان اداروں کے رسوم و قیود کا پابند نہیں رہ سکتا اس لئے

انہوں نے طے کیا کہ ان اداروں کی نگرانی سے آزاد ہو کر کسی جگہ جم کر یکسوئی کے ساتھ تصنیفی و تحقیقی کام میں لگ جانا چاہئے۔ لیکن خانگی ضروریات اور معاشی مسائل سے صرفِ نظر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن جاری رکھنے کے لئے سرزمین بمبئی سب سے زیادہ موزوں نظر آئی چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ بمبئی پہنچ گئے، جسے خود انہوں نے اپنے علمی سفر کی آخری منزل کہا ہے۔ ابتدا میں دفتر جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر میں فتویٰ نویسی کی، پھر جون ۱۹۵۰ء میں جب روزنامہ جمہوریت کا اجراء ہوا تو نائب مدیر کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہو گئے، مگر یہ وابستگی تا دیر قائم نہ رہ سکی اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ قاضی صاحب کو اس سے علیحدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے بعد روزنامہ انقلاب بمبئی، سے منسلک ہو گئے اور "جواہر القرآن"، نیز "احوال و معارف" کے عنوان سے علمی، تاریخی، سیاسی موضوعات پر مشتمل روزانہ دو تین کالم لکھتے رہے یہ سلسلہ چالیس سال کی طویل مدت تک جاری رہا جو صحافت کی تاریخ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر ۱۹۵۲ء میں تنظیم خدام النبی کی زیرِ نگرانی "ماہنامہ البلاغ" جاری ہوا تو اس کی ادارت میں شامل ہو گئے، تقریباً بیس پچیس سال تک یہ مجلہ قاضی صاحب کی ادارت میں جاری رہا جو علمی حلقہ میں وقعت و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ملک کے مؤقر رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ناچیز سب سے پہلے اسی ماہنامہ البلاغ کے ذریعہ غائبانہ طور پر قاضی صاحب سے متعارف ہوا، ان قلمی مصروفیتوں کے ساتھ دس سال تک انجمن ہائی اسکول بمبئی میں دینیات و اخلاقیات کی تعلیم دی۔

قاضی صاحب کی یہ ساری مصروفیات اگرچہ یک گونہ علمی ہی تھیں مگر دراصل ان کا تعلق "چکی کی مشقت" سے تھا جو اہل و عیال اور خانگی ضروریات کے لئے ناگزیر تھیں، ان کا اصل کام وہ تھا جسے وہ ایک معمولی سے حجرے میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے قاضی صاحب خود لکھتے ہیں:

"تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں قیام رہا جس شہر میں "شبلی مرحوم" کنارِ آب جو بائی و گل گشتِ اپالو" کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی

سے کمرے میں "مرکز علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری و مقالہ نویسی کا دورِ شباب گذارا...... بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا۔ اس لئے میں نے دولت و ثروت کے اس "اندرون قعر دریا" میں تیس سال سے زائد "تختہ بند ہونے کے باوجود" اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی و اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔" (ص ۵۱-۵۲)

قاضی صاحب نے تحقیق و تصنیف کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ اردو زبان کے لئے بڑی حد تک اجنبی ہونے کے ساتھ بظاہر خشک تھا لیکن اس خشک اور سنگلاخ زمین میں انہوں نے علم و تحقیق کے ایسے ایسے خوشنما و دلکش بیل بوٹے سجا دیئے اور اپنی تاریخی و تحقیقی تحریروں میں ادب کی چاشنی اس طرح پیوست کر دی کہ وہ ایک دلچسپ اور شگفتہ موضوع بن گیا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی شگفتگی اور معلومات و تحقیقات کی رعنائیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ جب تک کتاب مکمل نہ ہو جائے اسے چھوڑتا نہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے ان کی کتاب "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کے مقدمہ میں کتنی صحیح اور مبنی بر حقیقت بات لکھی ہے کہ:

"واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے، ان کی ان گرانقدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا اور نادر خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب منزل مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ لے کر آئے۔" (ص ۵۵۹)

عرب و ہند تعلقات پر اردو میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی گرانمایہ تصنیف "عربوں کی جہاز رانی" میں ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ مولانا موصوف نے اس وسیع اور پھیلے ہوئے موضوع کو ایک خاص عنوان میں محدود کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے موضوع سے

دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے زیادہ گفتگو کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب نے اس موضوع کی وسعتوں کو محدود کرنے کی بجائے اس کی عمومیت اور ہمہ جہتی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے ہر ہر گوشہ پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ اور مطالعہ کی وسعت اور ذہن رسا کی برکت سے بیش بہا اور معلومات کا ایک ایسا سدابہار علمی گلستاں سجادیا ہے جس کی رعنائیوں میں ماہ وسال کی گردش سے اضمحلال آنے کی بجائے مزید تازگی وشگفتگی بڑھتی جائے گی۔

اس خاص موضوع کے علاوہ قاضی صاحب نے تاریخ اور طبقات ورجال کے موضوع پر نہایت وقیع اور پراز معلومات کتابیں تصنیف کی ہیں جو علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور عام طور پر علمی وتحقیقی کام کرنے والے ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور آج ان کی اکثر کتابیں بطور حوالے کے استعمال ہوتی ہیں۔ یہ رتبۂ بلند عام طور پر کم ہی مصنفین کو نصیب ہوتا ہے۔ آیندہ سطور میں قاضی صاحب کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ کیجئے جس سے ان کے کام کی اہمیت اور وسعت وگیرائی کا کسی حدتک اندازہ ہوسکتا ہے۔

اردو تصانیف

۱۔ عرب وہند عہد رسالت میں، ۲۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ۳۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، ۴۔ خلافت عباسیہ اور ہندوستان ۵۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

ان پانچوں کتابوں کے متعدد ایڈیشن ہندوپاک سے شائع ہوچکے ہیں۔ نیز مصر کے نامور ادیب وعالم ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت نے پہلی اور آخری کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرکے مصر سے شائع کیا۔

۶۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ۷۔ دیار پورب میں علم اور علماء، ۸۔ مآثر ومعارف، ۹۔ آثار واخبار، ۱۰۔ مختصر سوانح ائمہ اربعہ، ۱۱۔ تاریخ تدوین سیر ومغازی، ۱۲۔ خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت، ۱۳۔ خواتین اسلام، دس سے تیرہ تک یہ چاروں کتابیں شیخ الہند اکاڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع کی ہیں، بقیہ مذکورہ ساری کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں پھر پاکستان سے۔

۱۴ - معارف القرآن، ۱۵ - علیؓ وحسینؓ، ۱۶ - طبقات الحجاج، ۱۷ - تذکرہ علمائے مبارکپور، ۱۸ - تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، ۱۹ - افادات حسن بصریؒ، ۲۰ - اسلامی نظام زندگی ۲۱ - حج کے بعد، ۲۲ - مسلمان، ۲۳ - اسلامی شادی، ۲۴ - قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک، (مختصر خود نوشت سوانح) یہ مذکورہ کتابیں مختلف اداروں سے شائع ہوئیں جن میں سے آخر کے چند رسالوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

عربی تصانیف ۲۵ - رجال السند والہند، یہ کتاب دوبار شائع ہوچکی ہے ایک مرتبہ بمبئی سے اور دوسری مرتبہ قاہرہ سے، ۲۶ - العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین، یہ بھی بمبئی اور قاہرہ سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئی ہے، ۲۷ - الہند فی عہد العباسیین، یہ خلافت عباسیہ اور ہندوستان کی تعریب ہے اور دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔

تحقیق وتعلیق ۲۸ - جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول، ابوالفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی کی اصول حدیث پر عمدہ اور بہترین کتاب ہے جو پہلی مرتبہ قاضی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچی۔ اس کتاب کو بمبئی کے دو مکتبوں نے شائع کیا پھر تیسری مرتبہ مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے شائع کرکے عرب دنیا میں بھی اسے عام کردیا۔

۲۹ - تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین البغدادی۔ یہ کتاب بھی مخطوطہ ہی تھی جسے قاضی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی نے طبع کیا۔

۳۰ - دیوان احمد، یہ قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین مرحوم کے عربی اشعار وقصائد کا مجموعہ ہے جسے قاضی صاحب نے مرتب ومدوّن کرکے دیوان احمد کے نام سے شائع کیا۔

ان مستقل تصنیفی وتحقیقی کاموں کے علاوہ سیکڑوں سے زائد علمی وتحقیقی مقالات و مضامین بھی سپرد قلم کئے جو ملک کے مؤقر اور اہم رسائل معارف اعظم گڈھ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ برہان دہلی، صدق لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئے، اگران مقالات کو ان کے موضوع کے اعتبار سے مرتب کرکے شائع کیا جائے تو اس کی بہت ساری جلدیں تیار

ہو سکتی ہیں۔

قاضی صاحبؒ کی تصانیف اور خدمات پر ایک اجمالی نظر

قاضی صاحب طرز تحریر اور اسلوب بیان میں شبلی اسکول سے متاثر تھے۔ علامہ شبلی اور ان کے مخصوص تلامذہ کی طرح قاضی صاحب کی علمی و تاریخی تحریروں میں بھی ادب کی چاشنی رچی بسی ہے۔ اسی کے ساتھ ان میں بیان کی قوت، سلاست و ضاحت اور علمی وقار پایا جاتا ہے۔ غیر علمی اور مبتذل الفاظ ان کے یہاں تلاش کرنے سے بھی شاید نہ ملیں۔ مآخذ مصادر کے سلسلے میں بھی وہ قریب سے قریب تر اور قدیم مآخذ پر بالعموم اعتماد کرتے ہیں اور نقل و روایت میں پوری احتیاط برتتے ہیں اسی بنا پر علمی دنیا میں ان کے حوالوں پر مکمل طور پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مدارس اور یونیورسٹیوں دونوں حلقوں میں یکساں مقبول ہیں اور جس طرح علماء و فضلاء ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، جدید علوم و فنون کے ماہرین بھی اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں ان سے مدد لیتے اور حوالہ کے طور پر انہیں استعمال کرتے ہیں۔

علمائے ہند میں قاضی صاحب کو یہ شرف و مجد حاصل ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ و ثقافت اور یہاں کے طبقات و رجال پر جس وسیع پیمانے پر انہوں نے کام کیا ہے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی صاحب نزہۃ الخواطر کے علاوہ اس باب میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ ان کی کتابوں سے اشخاص و رجال کے تراجم علاحدہ کر کے مرتب کئے جائیں تو ان کی متعدد ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی عمر سند ہجری کے اعتبار سے بیاسی سال سے متجاوز تھی لیکن ان علمی و قلمی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کی عام صحت جسمانی ساخت اور چستی و ہمت کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے فیوض و حسنات کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔ لیکن ادھر چند مہینوں سے ان کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں جن

سے تشویش تھی، پھر قاضی صاحب کے پوتے مولوی فرحان سلمۂ متعلم دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند سے معلوم ہوا کہ اب رو بصحت ہیں جس سے یک گونہ اطمینان ہوگیا تھا اور یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ وہ جلد ہی چلے جائیں گے۔ لیکن موت ایک ایسی چیز ہے جس نے اندازوں اور تخمینوں کو ہمیشہ شکست دی ہے۔ آخر کار معمولی سی علالت کے بعد وہ اچانک اس دارفانی سے رخصت ہوگئے اور ایک دن سب کو ہی یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ مگر یہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے پیچھے اپنا شاندار کام چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی تو بلاشبہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

(بقیہ صـ۳۹ـ کا)

آہستہ آہستہ چوستے رہیں کہ عرق ہلکا ہلکا حلق سے اترتا رہے۔

۱۶۔ **مصفی خون**: برادہ شیشم، نیب کی کلی، سرس کی چھال، صحرائی انجیر چاروں اجزا ہم وزن ملاکر عرق نکلوالیں اور ۳ تولہ سے ۵ تولہ صبح وشام پیتے رہیں۔

مذکورہ بالا مجربات کے سلسلہ میں بہتر یہی ہے کہ کسی ماہر طبیب کے مشورے کے بغیر انہیں ہرگز استعمال نہ کیا جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان امراض کے علاج میں حضرؒ کی روحانیت بھی کارفرما رہتی ہو۔ خاص طور سے عرق النسا کے علاج میں جس میں مٹی کا تیل پینے کو نافع بتایا گیا ہے۔ عام حالات میں یہ ترکیب نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت کے پاس اس کا کوئی ایسا تریاق موجود ہو جسے وہ فوراً استعمال کروادیتے ہوں گے۔ لہٰذا جب ان مجربات کی تصدیق دواؤں کے افعال وخواص کی روشنی میں کوئی حاذق طبیب کردے تو پھر انہیں بلاخوف وخطر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

امام اہل السنۃ احمد بن حنبلؒ

اور ان کی کتاب المسند

(۱۶۴ - ۲۴۱ھ)

ولادت باسعادت امام احمد بن حنبلؒ کی ولادت باسعادت ایک خالص عربی خاندان میں ہوئی۔ اس خاندان کا تعلق قبیلہ بنی شیبان سے ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۰ ربیع الاول ۱۶۴ھ ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا نزار میں مل جاتا ہے۔ آپ نجیب الطرفین ہیں۔ یعنی والد اور والدہ دونوں عربی النسل ہیں۔

اسم گرامی اور خاندان آپ کا اسم گرامی ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال الذہلی الشیبانی المروزی ثم البغدادی ہے۔ اموی اور عباسی سلطنت میں آپ کے خاندان کو بڑی فضیلت اور مرتبہ حاصل رہا ہے۔ آپ کے دادا خراسان کے بعض علاقوں کے والی اور حاکم تھے۔ اور والد محترم عباسی دور میں عربی لشکر کے قائد اعلیٰ کے رتبہ پر فائز تھے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے اہل خاندان خراسان میں بودوباش رکھتے تھے۔ شیخ ابوزہرہؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت شہر بغداد میں ہوئی، اس لئے کہ ان کے والد فوج کی ملازمت ترک کر کے بغداد منتقل ہو چکے تھے۔ مگر حافظ ابو یعلی الخلیلی فرماتے ہیں:

انہ وُلد بمرو ثم حمل الی بغداد وھو رضیع۔

(امام احمدؒ) کی ولادت بمقام مرو ہوئی اور شیرخوارگی کے زمانہ میں انکو بغداد لایا گیا۔ (واللہ اعلم)

والد محترم کی وفات بعض مؤرخین نے ذکر فرمایا ہے کہ آپ کی ولادت سے قبل ہی والد مکرم عین عالم شباب میں صرف ۳۰ سال کی عمر میں وفات پاگئے تھے۔ شیخ ابوزہرہ کے الفاظ ہیں:

والغلام الصغیر لم یکد یری نور الوجود، حتی فقد اباہ الشاب لم یکن قد تجاوز الثلاثین۔

اور یہ چھوٹا بچہ ابھی اپنے وجود کا نور بھی نہ دیکھ پایا تھا کہ اپنے نوجوان باپ جسنے ابھی عمر کی ۳۰ منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں کے وجود سے محروم ہوگیا۔

تعلیم وتربیت حکومت کی ملازمت ترک کرنے سے دنیوی شان وشوکت تو باقی نہیں رہی تھی۔ مگر آپ کی پرہیزگار والدہ نے اپنے لاڈلے فرزند کو دینی شان وشوکت کا مالک بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اور خود امام احمدؒ کا رجحان بچپن ہی سے علوم دینیہ کی طرف تھا۔

طلب علم کا غیر معمولی شوق امام احمدؒ کو بچپن میں علم کے حصول کا جو شوق تھا اس کا اندازہ امام احمدؒ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

کنت ربما اردت البکور فی الحدیث فتأخذ امی بثیابی حتی یوذّن النّاس او یُصبحوا۔

بسا اوقات میں حدیث شریف کے لئے منھ اندھیرے نکلنے کا قصد کرتا تھا مگر میری والدہ میرے کپڑے تھام لیتی تھیں یہانتک کہ لوگ اذان دیتے یا اجالا ہوجاتا۔

شہر بغداد مرکز علم یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر بغداد کو معدن علم اور مرکز علماء شمار کیا جاتا تھا۔ ہر علم وفن کے ماہرین اور اساتذہ بڑی تعداد میں موجود تھے ان میں قراء، محدثین، فقہاء، صوفیاء، فلاسفہ، حکماء، علماء لغت اور بڑے بڑے شعراء موجود تھے۔ اور بغداد کے گلی کوچے علمی مجلسوں سے معمور تھے۔

حفظ قرآن اس بابرکت علمی ماحول میں آپ نے حفظ قرآن مجید سے اپنی تعلیم کی ابتداء

فرمائی ۔ اس کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے ، عباسی سلطنت کے قاضی القضاۃ ، امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد رشید امام ابویوسفؒ سے استفادہ فرمایا اور پھر حدیث پاک کو سننے ، اس کو یاد کرنے اور جمع کرنے کا شوق دامن گیر ہوا کہ فقہ کا منبع اور مصدر کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ۔

علم حدیث شریف کی ابتداء بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ نے ۱۷۹ھ میں علم حدیث کی تعلیم کی طرف توجہ فرمائی جب کہ آپ کی عمر پندرہ سال کی تھی ، مگر بعضوں نے اس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال لکھی ہے ۔ سب سے پہلے ان محدثین کرام سے حدیث شریف سننا شروع فرمایا جو بغداد میں موجود تھے ۔

اساتذہ آپ کے اساتذہ میں عبد الرحمٰن بن مہدی ، ابوبکر بن عیاش ، سفیان بن عیینہ ، اور یحیٰی القطان کے نام مشہور ہیں ۔ ہُشیم بن بشر کی خدمت میں بھی چار سال گذارے ہیں ۔ سوانح نگاروں نے آپ کے اساتذہ کی تعداد ۴۰۰ سے زائد لکھی ہے ۔

علم کے لئے سفر بغداد میں جب علم حاصل کر چکے تو ان محدثین کرام کی خدمت میں حاضر ہونے اور استفادہ کرنے کے لئے جو بغداد کے علاوہ دوسرے شہروں میں مقیم تھے ، آپ نے رختِ سفر باندھا ، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے ۱۸۶ھ میں بصرہ کا سفر فرمایا اور اگلے سال ۱۸۷ھ میں حجاز کا ، حجاز مقدس میں حضرت امام محمد بن ادریس الشافعیؒ سے ملاقات ہوئی ، اور ان سے علمی استفادہ کیا ۔ طلب حدیث کے لئے صرف بصرہ کا پانچ بار سفر کیا ، اس کے بعد شہر کوفہ کا رخ فرمایا ۔ پھر مسلسل حجاز کے اسفار جاری رہے ۔

حجاز کا پہلا سفر ۱۸۷ھ میں ہوا ، اس کے بعد ۱۹۱ھ ، ۱۹۶ھ ، ۱۹۷ھ اور ۱۹۸ھ میں ، ان اسفار میں تحصیل حدیث کے ساتھ حج سے بھی مشرف ہوتے رہے ، تین مرتبہ پیدل حج ادا کیا جس میں ایک بار تو راستہ بھول جانے کے سبب کافی پریشانی اٹھانی پڑی

مگر پھر بھی ہمت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔

یمن کا سفر مذکورہ مقامات میں علم حاصل کرنے کے بعد یمن کے مشہور محدث عبدالرزاق بن ہمام رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد کیا۔ اور ان سے علم حدیث حاصل کرنے کے لئے یمن کا پر مشقت سفر کیا۔ امام احمدؒ جب حجاز میں تھے اس وقت شیخ عبدالرزاق بن ہمام بھی حجاز تشریف لائے ہوئے تھے، مگر امام احمدؒ نے ان سے وہاں حدیثیں سنانے کی درخواست کرنا مناسب نہ سمجھا۔

علم کا کمالِ احترام شیخ ابوزہرہؒ نے تحریر فرمایا ہے:

وآثر ان يركب متن الصعاب للذهاب اليه في اليمن لاعتقاده انه كلّما عظمت المشقة في الطلب اشتدّ الحرص على ما اخذ، ولانّ النيّة الحسنة يجب ان تنفّذ ولان الطلب من الشيخ في وقت اطمئنانه وقراره خير من طلب علمه في سفره وترحاله ولذا سافر اليه في صنعاء ......

امام احمدؒ نے (شیخ عبدالرزاقؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے) یمن کا دشوار گذار سفر اس لئے پسند فرمایا کہ اُن کا یہ کامل یقین تھا کہ علم کی طلب میں جتنی مشقت ہوتی ہے حاصل شدہ چیز سے اسی مقدار میں لگاؤ ہوتا ہے اور اس لئے کہ انہوں نے پہلے ہی یمن کے سفر کی نیت کر رکھی تھی اس کو پورا کرنا چاہتے تھے، اور یہ بھی ایک خیال تھا کہ شیخ سے سفر کی رواروی کی حالت میں احادیث سننے کے بجائے ان کے وطن میں اطمینان وسکون کی حالت میں حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے، اسلئے صنعاء کا سفر کیا۔

اللہ اللہ کیسی پاکیزہ نیت اور علم کی کیسی قدردانی ان اکابر کے دل میں تھی۔ آج علم کے لئے تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنا طلبہ کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے علم [illegible] نہیں جو اِن علماء متقدمین کے علم میں تھی۔ اللہم وفقنا [illegible] آمین۔

راہ کی مشقت اور امام احمدؒ کی استقامت امام احمدؒ کو یمن کے اس سفر میں

بہت کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، زادِ راہ ختم ہوگیا، رفقاء سفر نے امداد کرنی چاہی مگر امام کی غیرت نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ چنانچہ جمّالین (شتربانوں) کی خدمت کرکے تھوڑی مزدوری پہ گذر بسر فرمانے لگے، کبھی کبھی سوت کات کر فروخت فرماتے۔ صنعاء میں بعض اہلِ ثروت بھی تھے انہوں نے بھی تعاون کرنا چاہا مگر امام احمدؒ کو علم کی راہ میں کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں ہوا۔ لانه لا يريد ان يكون لاحد عليه فضل الا فضل العلم والمتقى۔ (مجھے جینا ہی نہیں بندۂ احسان ہوکر) کسی شاعر نے کتنی سچی بات کہی ہے۔

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے — بے غوطہ زنی گنج گہر کس کو ملا ہے

بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے — بے جورکشی تاج ظفر کس کو ملا ہے

جو رتبۂ بالا کے سزاوار ہوئے ہیں — وہ پہلے مصیبت کے طلب گار ہوئے ہیں

مع المحبرة الی المقبرة

امام احمدؒ طلب حدیث کے لئے اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں اپنی پشت پر کتابوں کی گٹھریاں لادے لادے پھرتے رہے۔ ایک مرتبہ کسی بے تکلف شناسا سے راستہ میں ملاقات ہوگئی تو اس نے دریافت فرمایا۔ مرّةً الى الكوفة و مرةً الى البصرة الى متى؟ (کبھی کوفہ اور کبھی بصرہ کا یہ چکر کب تک کاٹتے رہوگے؟) آپ نے جواب میں تاریخی جملہ فرمایا جو ہر طالب علم کو لوحِ قلب پر نقش کرلینا چاہئے۔ فقال احمد: مع المحبرة الى المقبرة۔ (قلم دان کا ساتھ قبرستان تک ہے) امام موصوف کا بس یہی مشغلہ تھا کہ گھوم پھر کر شیوخ سے احادیث سنتے اور انہیں سینہ میں محفوظ کرنے کے ساتھ صحیفہ میں بھی لکھ کر محفوظ کردیتے۔

یہ دورِ تدوین تھا

یہ دور وہ تھا جس میں مختلف علوم کی تدوین کا کام شروع ہوچکا تھا۔ فقہ اسی دور میں مدون ہوا، عربی نثر، لغت اور اشعارِ عرب کو جمع کرنے اور مدون کرنے کا کام اسی زمانہ میں ہوا۔ امام احمدؒ نے حدیثِ پاک کو مدوّن کرنے کا ارادہ فرماکر اس عظیم کام کا بیڑہ اٹھایا۔

کمالِ احتیاط

روایت حدیث شریف میں کمالِ احتیاط سے کام لیتے تھے، باوجود حدیث کے یاد ہو جانے اور ذہن میں محفوظ ہونے کے جب بھی کوئی

شخص طلب حدیث کے لئے حاضر ہوتا تو اپنے تحریر کردہ اوراق کو طلب فرماکر اس کو سناتے تھے، یہ آپ کا کمالِ احتیاط و تثبت تھا۔ اہل مرو میں سے کچھ لوگ سماعِ حدیث کے لئے حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ نے اپنے فرزند عبداللہ سے فرمایا کہ کتاب الفوائد تلاش کرو مگر ان کو یہ کتاب نہیں ملی تو امام صاحب خود کھڑے ہوئے اور حدیث شریف سنائی۔

علم فقہ سے تعلق علم حدیث شریف سے اس قدر شغف کے باوجود علم فقہ سے بھی ان کو برابر تعلق رہا، آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، آثارِ صحابہؓ اور تابعین کے فتاویٰ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع فرمایا تھا اور اسی مجموعہ سے فقہ کی تدوین اور مسائل کے استخراج میں کام لیتے تھے۔

آپ کو امام شافعیؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان کے مرتب کردہ اصول کو نہ صرف یہ کہ پیش نظر رکھتے بلکہ اس میں اضافہ بھی فرماتے تھے۔ تاہم امام احمدؒ پر حدیث شریف ہی کا رنگ غالب تھا۔ اسی لئے ابن جریر طبریؒ نے تحریر فرمایا کہ:

انه كان محدّثا ولم يكن فقيهًا۔ (امام احمدؒ) محدث تھے فقیہ نہیں تھے۔

ابن قتیبہؒ نے بھی ان کو صرف محدثین کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ دراصل امام احمدؒ کا فقہ احادیث و آثار اور اقوالِ صحابہؓ سے قریب ہے۔ حتیٰ کہ وہ صحابہؓ کے مختلف اقوال میں بھی کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے، اگر کسی مسئلہ میں صحابۂ کرام سے دو یا تین طرح منقول ہوتیں تو ان کے مذہب میں سب کی گنجائش ہوتی الا یہ کہ کسی رائے کی تائید رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہو جاتی تو پھر اس کے مطابق مسئلہ ہوتا۔ شیخ ابوزہرہ تحریر فرماتے ہیں:

"حتى انه كان لا يرجح بعضها على بعض، فاذا روى رايان لاثنين من الصحابة او الثلاثة اعتبر آراءهم جميعا اوجهًا في مذهبه، او آراء فيه، الا اذا ايد احد الآراء بحديث النبي (صلى الله عليه وسلم) او عمل له فانه يختار ذوى سنواه، لان رأى الصحابي منهما يكن مقامه مؤخر عن قول النبي صلى الله عليه وسلم"

۴۰ سال کی عمر میں تدریس کی ابتداء

تذکرہ نویسوں نے آپ کی تدریس کی ابتداء کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:

جلس احمد بن حنبل للتدريس والفتيا وقد بلغ الاربعين، وكان اقبال الناس على مجالسه عظيما.

امام احمدؒ تدریس اور فتوی کی مسند پر چالیس سال کی عمر میں تشریف فرما ہوئے اور آپ کی علمی مجلس کی طرف لوگوں کا رجحان بہت زیادہ تھا۔

آپ کی مجلس کی امتیازی شان

تذکرہ نویسوں نے مزید لکھا:

وكانت مجالسه تمتاز بالوقار والسكينة وحسن الانصات و اجلال العلم، وكانت بعيدة عن كل مايذهب جلال العلم وروعة الدين وكان للفقراء تقديم على الاغنياء.

امام احمدؒ کی مجلس علم وقار، سکون، خاموشی سے درس کی سماعت اور علم کی عظمت میں امتیاز رکھتی تھی، یہ مجلس ہر ایسے کام سے جس سے علم کا وقار مجروح ہو، دین کی عظمت گھٹ جائے کوسوں دور تھی، فقراء کو مالداروں سے آگے رکھا جاتا تھا۔

اور علامہ مروزیؒ فرماتے ہیں:

لم ار الفقير في مجلس اعز في مجلس ابي عبد الله وكان مائلا اليهم مقصرا عن اهل الدنيا و كان فيه حلم ولم يكن بالعجول وكان كثير التواضع ....

ابوعبداللہ کی مجلس سے بڑھ کر کسی جگہ بھی فقیر کو زیادہ معزز نہیں دیکھا گیا۔ اہل دنیا سے صرف نظر فرماتے تھے، آپ میں بردباری تھی نہ جلد بازی فرماتے اور آپ ایک منکسر المزاج اور متواضع تھے۔

بعض لوگ صرف ادب و تہذیب سیکھنے مجلس میں آتے تھے

الشیخ ابوبکر یعقوب بن یوسف المطوعیؒ فرماتے ہیں:

جلست الی ابی عبد اللہ احمد بن حنبل ثلاث عشرۃ سنۃ وھو یقرأ المسند علی اولادہ، ماکتبتُ عنہ حرفاً واحداً، وانما اکتب آدابہ واخلاقہ واتحفظہا۔

میں ابوعبداللہ امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں ۱۳ سال تک حاضر ہوتا رہا، آپ اپنے صاحبزادہ کو مسند سناتے تھے مگر میں نے اس مدت میں ایک حرف بھی نہیں لکھا، میں تو صرف آپ کا ادب و اخلاق لکھتا تھا اور اسی کو محفوظ کرتا تھا۔

غیر معمولی حافظہ

اللہ تعالیٰ نے امام احمدؒ کو غیر معمولی قوت حفظ سے نوازا تھا، لاکھوں حدیثیں مختلف سندوں اور متن کے ساتھ یاد تھیں۔

ڈاکٹر محمد رجب البیومی نقل فرماتے ہیں:

حدث الامام احمد عن نفسہ قال کنت اذاکر وکیعاً فربما ذکر تسعۃ احادیث او عشرۃ فاحفظہا فاذا دخل قال اصحاب الحدیث امل علینا فاملہا علیہم فیکتبونہا۔

امام احمدؒ خود بیان فرماتے ہیں کہ ہم امام وکیع کے ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، بسااوقات آپ نو یا دس حدیثیں سناتے تھے تو میں سنکر یاد کرلیتا تھا، پھر جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوجاتے تھے تو طلبا حدیث مجھ سے فرماتے تھے کہ ان حدیثوں کو لکھا دو، پس میں ان کو املاء کرادیتا اور وہ سب لکھ لیتے تھے۔

اور شیخ ابو زہرہ فرماتے ہیں:

قد اوتی حافظۃ واعیۃ، وبدیہۃ حاضرۃ۔

(آپ کو محفوظ کرنے والا حافظہ اور بدیہہ گوئی کی صفت ملی تھی)۔

امام احمدؒ فارسی زبان سے واقف تھے

مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کا خاندان مَرو سے بغداد منتقل ہوا تھا، آپ کے خاندان کا خراسان کے علاقہ میں طویل قیام رہا ہے۔ چچا جان کی ملازمت بھی وہاں عباسی سلطنت کے کاتب کے عہدہ پر تھی، اس لئے اس خاندان میں فارسی زبان سے واقفیت اچھی خاصی حد تک تھی، اور اسی خاندانی بول چال کے ذریعہ امام احمدؒ بھی فارسی زبان سے

واقف ہوگئے تھے، امام ذہبیؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

لما قدم عليه من خراسان ابن خالته، فكان احمد يسألنه عن خراسان واهلها وربما استعجم القول على الضيف فيكلمه احمد بالفارسية.......

امام احمدؒ کے یہاں خراسان سے ان کے خالہ زاد بھائی تشریف لائے، تو امام صاحب ان سے خراسان اور وہاں کے باشندگان کے بارے میں دریافت فرماتے تھے اور کبھی مہمان کو سوال سمجھنے میں دشواری ہوتی تو امام احمدؒ ان سے فارسی میں گفتگو فرماتے تھے...

(باقی آئندہ)

(بقیہ صلا۳ کا)

اعتقادیوں سے منزہ ہر طرح کی خود پرستانہ طرف داریوں سے پاک، کیونکہ یہاں حقیقت کی صداقت موجود ہے، اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلانِ حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی ہے اس فیصلہ میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے کرنا پڑا۔ ضروری ہے کہ یہ فیصلہ خود اسی کی زبانی سنا جائے، اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک گوشہ سے شہادت طلب کی جائے، افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی جو اس موضوع پر علمی حیثیت سے وقیع سمجھی جاسکے، ہم نے مقدمہ تفسیر میں اس کی کوشش کی ہے، اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے، یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں، اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لئے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد دوم ص۴۹۵)

مقام محمود کی نادر تشریح

مولانا آزاد کی قرآن فہمی کا کمال

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل اور نماز تہجد کی تاکید کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ آپ کو مقام محمود پر فائز کیا جائے گا۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰ أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا۔ وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا۔

اور اے پیغمبرؐ! رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا پہر) شب بیداری میں بسر کیا کرو، یہ تمہارے لئے ایک مزید عبادت ہے۔

قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک ایسے مقام پر فائز کرے جو نہایت پسندیدہ اور تعریف کا مقام ہے۔ اور تم اے نبی! یہ دعا کیا کرو کہ اے پروردگار! مجھے جہاں کہیں پہنچا، سچائی کی فتح کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے مجھے نکال تو حق و صداقت کی فتح کے ساتھ نکال اور مجھے اپنی خاص قوت عطا فرما جو ہر حال میں میری مددگار ہو۔

اس سے پہلے پانچ فرض نمازوں کا حکم عام دیا گیا ہے اور اس کے بعد تہجد کی نماز خصوصی کا حکم دیا گیا ہے، یہ نماز خاص طور پر صرف آپ پر فرض کی گئی۔

اس کی حکمت شاہ عبدالقادر صاحب بیان کرتے ہیں:

یہ حکم خاص طور پر اسے نبی! تم کو دیا جا رہا ہے کیونکہ تمہیں سب سے بڑا مرتبہ (مقام محمود)

عطا کیا جائے گا۔ یعنی اس انعام عظیم سے شکریہ کے طور پر یہ خاص نماز آپ پر فرض کی گئی ہے۔
مقام محمود کے لغوی معنی وہ مرتبہ جس کی تعریف وتوصیف کی جائے، شاہ صاحب نے
اسی لغوی مفہوم کی رعایت سے ترجمہ کیا۔ تعریف کا مقام۔ اہل فارسی ترجمہ کرتے ہیں
پسندیدہ مقام۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں مقام محمود کی تفسیر شفاعت کبریٰ
کے مقام سے کی جو مقام آپ کو قیامت کے دن عطا کیا جائے گا۔

احادیث میں۔ قابل تعریف۔ کے دو پہلو بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ میں بندگان الٰہی کی سب سے زیادہ شفاعت کروں گا، اس لئے خدا کی مخلوق میں
میں سب سے زیادہ قابل تعریف قرار پاؤں گا۔

فیشفع لا یشفع احد بعدہ اکثر مما یشفع وھو المقام المحمود
الذی قال اللہ تعالیٰ الخ

پھر حضورؐ بندگان الٰہی کی اس قدر سفارش کریں گے کہ اس کے بعد اس سے زیادہ
سفارش نہیں کی جائے گی۔

۲۔ میں اس دن خدا تعالیٰ کی حمد وثنا کا وہ حق ادا کروں گا جو اس وقت تک ادا نہیں کیا
گیا، اس لئے اس دن میں خدا تعالیٰ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے کے سبب خدا کے
نزدیک سب سے زیادہ تعریف کے لائق قرار پاؤں گا۔

فاقع ساجدا لربی ثم یفتح اللہ علی ویلھمنی من محامد وحسن
ثناء علیہ شیئا مالم یفتحہ علی احد قبلی۔

میں سجدہ میں سر رکھدوں گا، پھر خدا تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد وثنا، اور تعریف وتوصیف
کے وہ کلمات الہام کرے گا جو مجھ سے پہلے کسی پر القا نہیں کئے گئے۔

اس کے بعد یا رب امتی ۔ یا رب امتی ۔ کی صدائیں بلند کرکے اپنی امت کے لئے
شفاعت کروں گا۔ (ابن کثیر جلد ۳ ص ۵۵)

ان احادیث کی روشنی میں تمام متقدمین اور متاخرین عربی اور اردو مفسرین نے

مقام محمود کے وعدہ کو آخرت کے ساتھ خاص رکھا ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں مقام محمود کے خداوندی وعدہ اور انعام کو دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق کیا ہے۔

مولانا کی تفسیری عبارت آگے نقل کی جارہی ہے جس میں مولانا نے احادیث شفاعت کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام محمود کے اس پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جو آخرت کی زندگی میں پیش آئے گا۔ کیونکہ وہ پہلو پردۂ خفاء میں ہے اور ایمان بالغیب سے تعلق رکھتا ہے۔

ان احادیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو حصر پر دلالت کرے اور اس سے دنیا کی نفی مقصود ہو۔ اور عقل سلیم کے مطابق اور دوسرے قرآنی اشارات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ جو مقام محمود آپ کو عطا کیا گیا وہ دنیا کی فانی زندگی سے شروع ہوا اور آخرت کی غیر فانی زندگی میں مکمل ہوا۔

مولانا آخرت کی زندگی کے مقام شفاعت کو مقام محمود کا ایک مَشْہَد (ظہور کی جگہ) قرار دیتے ہیں۔ مولانا کی تائید میں چند علمی پہلو اور عبارتی قرینے حسب ذیل ہیں۔

پہلا قرینہ! اسم محمدؐ کی ترجیح۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کے دو نام تجویز کئے تھے، ایک نام احمد اور دوسرا نام محمدؐ۔

شارح مسلم علامہ نووی ؒ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کے گھر والوں (دادا) پر خدا کی طرف سے یہ الہام و القاء ہوا کہ اس بچہ کے نام محمد اور احمد رکھنا (جلد ۲ صـ۲۶۱)

قریش کے سرداروں نے عبدالمطلب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے اس پوتے کا نام ایسا کیوں رکھا جو آج تک (تین ہزار سال تک) آپ کے آباؤ اجداد نے اپنے کسی بچہ کا نہیں رکھا۔ عبدالمطلب نے اس کا جواب دیا کہ میں نے اس بچہ کا نام محمد اس لئے رکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں اور اللہ کی مخلوق زمین میں اس کی تعریف و توصیف کرے۔

(فتح الباری جلد ۷ صـ۱۲۳)

قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دو ناموں میں سے جس نام پاک کو زیادہ پسند کیا وہ نام پاک محمدؐ ہے۔

چنانچہ محمدؐ کا لفظ قرآن میں چار مقام پر آیا ہے۔

محمد رسول اللہ (الفتح ۲۹) ما محمد الا رسول (آل عمران ۱۴۴)

ما کان محمد ابا احد (احزاب ۴۹) بما نزل علی محمد (سورہ محمد ۲)

اور احمد کا لفظ صرف ایک مقام پر جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسمہ احمد (الصف ۶)

لغت میں جو معنی لفظ محمد کے ہیں وہی معنی لفظ محمود کے ہیں، لفظ محمد کو قرآن کریم نے اس لئے ترجیح دی کہ اس میں صرف مفعولی معنی ہیں، یعنی تعریف کیا گیا۔

احمد کے معنی میں فاعلی مفہوم زیادہ تعریف کرنے والا اور مفعولی مفہوم زیادہ تعریف کیا گیا، دونوں موجود ہیں۔ احمد تفضیل کا صیغہ ہے۔

قرآن کریم نے معنی مفعولی میں متعین ہونے کی وجہ سے محمدؐ کے لفظ کو ترجیح دی ہے۔ تاکہ محمدؐ کا مبارک لفظ ذہن میں اس کے مفعولی مفہوم کو قائم کر دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ طیبہ اور شہادتین کے اندر بھی محمدؐ ہی کے لفظ کو داخل کیا ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے۔

مولانا آزاد کی نظر اس حقیقت پر بھی ہے کہ آپ کا نام پاک محمدؐ ہی قرآن کریم میں کثرت سے آیا ہے اور آپ کے دادا کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بھی بیان کرادی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ دونوں جہان میں مقام محمود پر فائز قرار دیئے گئے ہیں

نام محمد رکھنے کی اجازت!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نام (محمد اور احمد) رکھنے کی اجازت دی ہے۔

حضرت جابر ابن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں:

سمّوا باسمی ولا تکتنوا بکنیتی انما انا قاسم۔ (تجرید بخاری جلد ۲ ص...)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی کہ تم لوگ میرا نام رکھ لیا کرو لیکن

میری کنیت نہ رکھا کرو، بے شک میں قاسم ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ابوالقاسم حضورؐ کی مخصوص کنیت ہے، اس لئے لفظ قاسم نام تو رکھا جا سکتا ہے لیکن اس کی کنیت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ فقہار و محدثین میں سے ایک جماعت اسی کی قائل ہے اس کے برعکس جمہور دیگر دلائل کی بنیاد پر اس کے جواز کی طرف گئے ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورؐ کے نام پاک محمدؐ اور احمدؐ بھی رکھے جا سکتے ہیں اور ان دونوں ناموں کی کنیت بھی رکھی جا سکتی ہے۔

قاسم نام کی تشریح بھی حضورؐ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

ما اعطیکم ولا امنعکم، انا قاسم اَضَعُ حیث اُمِرْتُ (تجرید ص۱۱)

میں تمہیں نہیں عطا کرتا اور نہ دینے سے روکتا ہوں، میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، لیکن مجھے جہاں حکم دیا جاتا ہے وہیں خرچ کرتا ہوں۔

ایک مشہور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

اِنّما انا قاسم واللّٰہ یعطی۔ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ تعالےٰ ہی ہے۔

محمدؐ سابق کتابوں میں | یجروید میں حضورؐ کو ۔ نراشش ۔ کہا گیا ہے جو محمد لفظ کے ہم معنی ہے یہ سنسکرت کا لفظ ہے، اور بھوشں پران میں نراشش کی علامتیں بھی بیان کی گئی ہیں اور اس پر علمار سنسکرت نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

انجیل کی مدیانی زبان میں آپ کو ۔ فارقلیط ۔ کہا گیا ہے اور یہ لفظ بھی محمد کے ہم معنی ہے۔

علمائے تحقیق نے اس پر اہم کتابیں لکھی ہیں۔

دوسرا قرینہ | مولانا آزاد مرحوم کی نظر سورہ والضحیٰ کی حسب ذیل آیت پر بھی رہی ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (نمبر۳)

اس آیت میں اکثر علماء نے آخرۃ کے لفظ کا ترجمہ آخرت بمعنی قیامت کیا ہے، یعنی آپ کے لئے دنیا کی زندگی سے آخرت کی زندگی بہتر ہے۔

البتہ شاہ رفیع الدین نے آخرۃ کا ترجمہ لغوی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے" اور البتہ پچھلی حالت بہتر ہے واسطے تیرے پہلی حالت سے"

شاہ عبدالقادر صاحب نے حالت کا لفظ نکال دیا اور یہ ترجمہ کیا۔

"البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو اگلی سے"

مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ بعض اہل اشارات (صوفیاء کرام) نے آخرت اور اولیٰ کو عام رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی پوری زندگی میں آپ برابر ترقی کرتے رہیں گے اور ترقی کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ہر آنے والا دور گذرے ہوئے دور سے بہتر ہوگا۔

مولانا آزاد اس آیت (سورہ والضحیٰ) کی تفسیر تک نہیں پہنچے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل پر جہاں جہاں مولانا نے قلم اٹھایا ہے وہاں وہاں حضورؐ کے مقامات عالیہ میں ترقی وارتقاء دائمی پر روشنی ڈالی ہے اور وعدۂ الٰہی کی صداقت کا اظہار کیا ہے۔

تیسرا قرینہ، ربط آیات مولانا آزاد نے مقام محمود کی آیت کے سیاق وسباق پر بھی نظر ڈالی، مقام محمود کی بشارت کے بعد حضورؐ کو جو دعاء تلقین کی گئی اس میں سیاسی قوت کے حصول کی طلب ہے۔

کیونکہ آپ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہونے والے تھے اور مدینہ منورہ کا سیاسی اقتدار آپ کو حاصل ہونے والا تھا۔

اس موقعہ پر خلاق نے یہ ہدایت کی کہ اے نبی! آپ ملنے والے اقتدار حکومت کے لئے یہ دعاء کریں کہ اس حکومت سے حق وصداقت کی فتح ہو۔

وہ حکومت دنیوی تخت وتاج کے حصول کے لئے نہ ہو عدل وعدالت کے حصول کے لئے ہو۔

اس دعا کا مقام محمود کے ساتھ ربط و تعلق یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ مکہ کی پرصعوبت زندگی کے امتحان سے نجات پاکر مدینہ منورہ کی باعزت و بااختیار زندگی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور آپ کو اجتماعی زندگی میں عدل و عدالت کے قیام سے قابل تعریف مرتبہ حاصل ہونے والا تھا۔

مکہ مکرمہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں آپ کو صبر و استقامت سے مقام محمود عطا ہوا اور مدینہ منورہ میں عدل و عدالت اور شجاعت سے مقام محمود کے مرتبہ عالی پر آپ فائز ہوئے۔

مولانا آزاد علیہ الرحمہ کو قرآنی فہم و بصیرت کا جو مقام عطا ہوا اس میں مولانا منفرد و ممتاز حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔

مولانا آزاد کی مجتہدانہ تفسیر!

مولانا آزاد رحؒ نے مقام محمود کی تفسیر میں حسب ذیل تفسیری حاشیہ تحریر کیا ہے۔

(۴) آیت (۷۹) میں مقام محمود سے مقصود ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستائش کیجائے فرمایا کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پہ پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے اور مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی حتیٰ کہ مخالف قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے، ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ انہی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لئے عظمت و ارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا۔ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی، کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو، لیکن کروڑوں دلوں

میں اس کی ستائش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی، محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔

ما شئت قل فیہ فانت مصدق

فالحب یقضی والمحاسن تشہد

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے، اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اُڑ جا سکتی ہے، لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں۔ اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بنا دیتیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

محمودیت اسی میں حاصل ہو سکتی ہے جس میں حسن و کمال ہو کیونکہ روحیں حسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کھل سکتی ہیں لیکن حسن و کمال کی مملکت وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔

غور کرو جس وقت سے نوعِ انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوعِ انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستائشیں کن انسانوں کے حصہ میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصہ میں یا خدا کے اُن رسولوں کے حصہ میں جنہوں نے جسم و ملک کو نہیں روح و دل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے، اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی۔ یایہا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (۵۶:۳۳)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک جز وہ معاملہ ہوگا جو قیامت کے دن پیش آئے گا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا علم آپ بلند کریں گے، بعد بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا و آخرت دونوں کے لئے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلائق ہے وہاں بھی محمود

وممدوح ہوگی۔ (جلد دوم صفحہ ۳۶۴)

"رحمۃ للعالمین" کے مقام کی بصیرت افروز تشریح

مولانا آزاد نے رسول پاکؐ کے وصفِ رحمۃ للعالمین کی جو بصیرت افروز تشریح کی ہے اسے بھی مقام محمود کی تشریح کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون ان فی ھذا البلاغا لقوم عابدین وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ (الانبیاء)

اور دیکھو! ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھدی تھی کہ زمین کی وراثت انہی بندوں کے ہاتھ میں آئے گی جو نیک ہوں گے، اس بات پر ان لوگوں کے لئے جو عبادت گذار ہیں ایک بڑا ہی پیغام ہے۔ اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ تمام دنیا کے لئے رحمت کا ظہور ہو۔ (جلد دوم صفحہ ۴۸۴)

یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ یعنی رحمۃ للعالمین! یہ ظہور صرف کسی ایک ملک کسی ایک قوم کسی ایک نسل ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے رحمت کا ظہور ہے، یہ وصف بیان کر کے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کر دی ہے، اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لئے رحمت کا ظہور ثابت ہوا ہے، تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا، ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا حقیقت کیلئے اعتراف کر لیں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے ہر طرح کی مذہبی خوش

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح

بحیثیت طبیب حاذق

ڈاکٹر عبدالناصر ایم، ڈی اسکالر جامعہ ہمدرد ۔ نئی دہلی

دارالعلوم دیوبند کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جہاں اس نے بڑے بڑے محدثین، مفسرین، فقہا، ادبا، حفاظ اور قرار پیدا کئے وہیں اس سے بعض ایسی مایہ ناز ہستیوں کا بھی تعلق رہا ہے جنہوں نے علم الادیان کے ساتھ ساتھ علم الابدان کی طرف بھی اس کی عظمت وشرافت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ اکابر میں مولانا یعقوب نانوتوی (م ۱۸۸۴ء)، مولانا انور شاہ کشمیری (م ۱۹۳۳ء)، مولانا جمیل الدین بجنوری (م ۱۹۳۶ء) مولانا محمد حسن دیوبندی (م ۱۹۲۶ء) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) وغیرہم کے اسمار گرامی اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس فن شریف کو ان حضرات نے کبھی ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ خدمتِ خلق کرنا ہی ان کا نصب العین رہا۔ ان علمار کا خیال تھا کہ طب نبوی کو جو احادیث کا ایک خاص باب ہے اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ علم طب کو مکمل طور پر حاصل نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مدارس عربیہ میں طبی کتابیں بھی داخل نصاب رہی تھیں۔ اس طرح ان بزرگوں نے علم دین کے ذریعہ جہاں خلق خدا کو روحانی طور پر فیض پہونچایا وہیں علاج ومعالجہ کے ذریعہ ان کے جسمانی دکھ درد کا مداوا کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ کا نام نامی انہی دونوں خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ آپ گنگوہ

ضلع سہارنپور کے ایک معزز خاندان میں ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولانا شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی، فارسی کی کتابیں اپنے ماموں سے پڑھیں اور مولوی محمد بخش رامپوری سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۲۶۱ھ میں دہلی تشریف لے آئے اور یہاں پر اس وقت کے قابل ترین اساتذہ سے جن میں مفتی صدرالدین خاں آزردہؒ (م ۱۸۶۸ء)، مولانا مملوک علی نانوتویؒ (م ۱۸۳۲ء)، شاہ احمد سعید مجددیؒ اور شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ (م ۱۸۷۸ء) وغیرہم شامل ہیں، علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں معرکہ شاملی میں بھی پیش پیش رہے اور اس کے نتیجہ میں ۶ ماہ تک انگریزوں کی قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہاں سے رہائی کے بعد گنگوہ تشریف لے آئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی قبول فرمائی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء کو آپ کا وصال ہوا اور گنگوہ میں تدفین عمل میں آئی۔

دنیا آپ کو ایک بڑے عالم، محدث، فقیہ اور شیخ کامل کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ آپ ایک حاذق طبیب بھی تھے۔ آپ نے علم طب حاصل تو کیا لیکن صرف اللہ کی مخلوق کی نفع رسانی کے لئے۔ دہلی کے مشہور طبیب اور نباض حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا (م ۱۹۴۱ء) کو حضرتؒ سے خصوصی تعلق تھا اور وہ حضرتؒ کی صحبت سے فیضیاب بھی ہوئے تھے۔ حکیم نابیناؒ کا بیان ہے کہ انہیں نباضی میں مہارت حضرت علیہ الرحمہ کی دعاؤں کی برکت سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ حضرت کے صاحبزادہ حکیم مولوی مسعود احمدؒ دہلی طبیہ کالج سے فارغ التحصیل تھے اور انہوں نے گنگوہ میں مطب بھی کیا تھا۔ اسی طرح حضرتؒ کے پوتے مولانا عبدالرشید محمود عرف حکیم ننھو میاں نے بھی اپنے والد محترم اور جد بزرگوار کے نقش قدم پر چل کر اس فن کو حاصل کیا اور گنگوہ کے اطباء میں ایک خاص مقام حاصل کیا، گذشتہ سال

آپ کی وفات ہوئی۔

صاحبزادۂ محترم نے جب مطب کا سلسلہ شروع کیا تو پھر حضرتؒ نے اس مشغلہ کو تقریباً ترک فرمادیا تھا لیکن بعض مریضوں کے بے حد اصرار سے وقتاً فوقتاً آپ معمولی دوائیں تجویز کر دیتے تھے۔ یہ حضرت کی وفات سے ۴۰ - ۵۰ سال پیشتر کا زمانہ تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں تو صرف دینی خدمت ہی ان کا مشغلہ رہ گیا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم نے "تذکرۃ الرشید" میں حضرتؒ کے حالات اور خدمات کو قلمبند کیا ہے اور اس کے ایک باب میں ان کے مطب کا بھی ذکر کیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں آپ کا ذکر بحیثیت معالج و طبیب کے "تذکرۃ الرشید" کے اسی باب سے اخذ کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کو علم طب حاصل کرنے کی تحریک کیسے پیدا ہوئی اس کا ایک عجیب واقعہ صاحب تذکرۃ الرشید نے تحریر کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت کی نانی کو اسہال وقفے کی شکایت ہوئی۔ حضرت کے ماموں جو ایک کامیاب طبیب تھے وہ ان کے زیر علاج رہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب اپنے مرض سے بہت عاجز آگئیں تو اپنے نواسے سے کہا کہ بیٹا تو بہت بڑا عالم ہے میرے لئے تو ہی کوئی علاج تجویز کر دے تاکہ اس موذی مرض سے نجات ملے۔ نانی کی یہ بات سن کر دل پر بہت اثر ہوا اسی وقت اٹھے اور "میزان الطب" مرتبہ حکیم محمد اکبر ارزانی میں بحث معدہ نکال کر مطالعہ شروع کیا اور پھر اپنے ماموں سے نانی کے مرض کی تشخیص معلوم کی، جواب ملا کہ بند ہیضہ کی شکایت ہے۔ پھر حضرت نے کہا کہ ان کو ورم معدہ کی شکایت ہے۔ چنانچہ اسی کا علاج کیا جس سے نانی صاحبہ کو شفا حاصل ہوگئی۔ اس کامیاب علاج سے آپ کی اتنی شہرت ہوئی کہ اطراف سے مریض آپ کے پاس آنے لگے۔ جب یہ محسوس کیا کہ لوگ اپنے امراض سے پریشان ہیں تو ان کو نفع پہونچانے کی غرض سے میزان الطب اور اکسیر اعظم مرتبہ حکیم اعظم خاں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا اور پھر معالجات و تشخیصات میں ایسا کمال پیدا کیا کہ اچھے سے اچھے طبیب بھی آپ کی حذاقت کے قائل ہوگئے۔

آپ کے مطب کا دستور یہ تھا کہ آپ آسان اور مختصر اجزاء پر مشتمل ادویہ مفردہ سے ہی علاج کرتے تھے اور نسخہ میں زیادہ تر چھال اور بوگ کا استعمال کراتے تھے، بقول مولانا عاشق الٰہی ادویہ مرکبہ کا استعمال گنگوہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا، آپ سے پہلے گنگوہ کے عطار ادویہ مرکبہ کی تیاری سے ناواقف تھے۔ عورتوں کے امراض میں نبض اور قارورہ کی مدد سے ہی تشخیص کرتے تھے۔ زیادہ تر دیہاتی مریض ہی آپ کے زیر علاج رہتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنی جہالت کے سبب بات کو دیر میں سمجھتے تھے اور بار بار ایک ہی چیز کی تکرار کرتے تھے۔ چنانچہ انہی کے لب و لہجہ اور زبان میں انہیں سمجھاتے تھے۔ ناگواری کا اظہار کبھی نہیں کیا حالانکہ یہ بات پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر بہت گراں گذرتی تھی۔ غرض کہ جب آپ طب کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں ایسے معرکۃ الآراء علاج کے نمونے پیش کئے جن کا ذکر نہ صرف دلچسپی سے خالی ہوگا بلکہ آج کے دور میں ان سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ایسے ہی آپ کے چند واقعات اور مجربات درج کئے جارہے ہیں:

۱۔ صاحب تذکرۃ الرشید بحوالہ ڈاکٹر محمد نذیر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اکثر معدہ کی شکایت رہتی تھی اور وہ قبض میں مبتلا رہتے تھے۔ معدہ کی خرابی کی وجہ سے دماغ و دیگر اعضاء بھی متاثر ہوگئے تھے جس کی وجہ سے ضعف بڑھتا جارہا تھا۔ وہ گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت گنگوہی سے اپنی تکالیف بیان کیں۔ حضرت نے فرمایا "اجی تم تو ڈاکٹر ہو"۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت بہت دوائیں استعمال کرچکا ہوں کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا چار ماشہ معجون فلاسفہ صبح و شام کھالیا کرو چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ دن بدن نفع ہوتا گیا اور بالآخر یہ شکایت رفع ہوگئی۔

۲۔ ایک صاحب کو جو حضرت کی خدمت پر مامور تھے، خارش کی شکایت ہوئی۔ گندھک جیسی دوا اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ حضرت کو اس کی بو ناگوار

گذرے گی۔ اس لئے مرض بڑھتا گیا۔ بالآخر حضرت کو اطلاع ہوئی۔ آپ نے فرمایا بالائی میں گلاب ملاکر خوب کھاؤ اور گلاب ہی میں سفیدہ کاشغری ملاکر بدن پہ مل لیا کرو۔ اسی روز سے ان صاحب نے یہ دوائی و غذائی علاج شروع کیا۔ چند دنوں میں ان کی خارش بالکل ختم ہوگئی۔

۳۔ ایک پٹواری سبزی فروش نامرد تھا۔ اپنے علاج کے لئے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت نے ۳ دانہ بادام اور ایک خرما (چھوارہ) سوتے وقت کھالینے کو فرمایا۔ اسی دوا سے اس کی یہ حالت دور ہوگئی اور وہ تندرست ہوکر صاحب اولاد ہوگیا۔

۴۔ ایک جوان ہندو بچہ مسوڑھوں کے ورم میں مبتلا تھا اس کے لئے حضرت نے یہ نسخہ تجویز فرمایا فلفل سیاہ، عاقر قرحا اور پوربی ہلدی (آنبہ ہلدی)۔ اس کو بطور منجن استعمال کرائیں۔ جیسے ہی ملا گیا فوراً ورم میں کمی ہونا شروع ہوگئی اور تین مرتبہ کے استعمال سے بالکل آرام مل گیا۔

۵۔ ایک شخص نے مرض طحال کے بارے میں کہا کہ مجھے اس کی دوا معلوم ہے صرف ایک دن میں آرام ہوجاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کا عمل کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ اس کے استعمال سے مریض کو قے و دست آکر صحت ہوجاتی ہے، وہ شخص دوا کا نام بتانے سے گریز کررہا تھا حضرت نے فرمایا فلاں دوا ہے، دوا کا نام سنتے ہی وہ شخص حیرت میں پڑگیا اور پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا، حضرت نے فرمایا اتفاقاً ذہن میں نام آگیا۔

۶۔ ایک عورت عرصہ سے مرض استحاضہ میں گرفتار تھی۔ خون بکثرت جاتا تھا۔ اس کے شوہر نے حضرت سے حال کہا حضرت نے اس کے حسب حال یہ نسخہ تجویز فرمایا۔ اینٹ کا کھورا پانی کے ساتھ پھنکاؤ جس سے آرام مل گیا۔

۷۔ ایک ساٹھ سالہ شخص کو لقوہ ہوگیا۔ گنگوہ کے ایک طبیب نے مہنگے نسخے استعمال کرائے جو اس شخص کی دسترس سے باہر تھے، وہ شخص حضرت کے پاس آیا۔ آپ نے

فرمایا کہ شہد کا استعمال کرو اور پانی کی جگہ بھی غذا بکثرت کھلاؤ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا غالباً تیسرے یا چوتھے روز مرض بالکل ختم ہوگیا۔

۸۔ ایک نوجوان شخص کو پانچ سال سے مرض استسقا تھا۔ آپ نے اس کے لئے عرق مکو و عرق کاسنی پلانے کو کہا اور روٹی بھی انہیں عرقیات میں بھگو کر کھلانے کو فرمایا۔ نیز بدن کو ایک گرم تنور میں دفن کرانے کو کہا (غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ مریض استسقا کو گرم مقام پر رکھا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے عمل سے پسینہ خوب آکر مائیت کا اخراج ہوتا ہے) چنانچہ ان ہدایات پر عمل کیا گیا جس سے ۱۵ سے ۲۰ روز میں اس مستسقی کو آرام ہوگیا۔

۹۔ ایک حکیم صاحب مدت تک بخار میں مبتلا رہے جس سے ان کو تپ دق تجویز کی گئی اس لئے وہ زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔ انہوں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا حال بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ آکھ کے چند زرد شدہ پتے لے کر آگ میں جلائیں اور اس کی راکھ کو شہد میں ملاکر ۲-۳ رتی کی مقدار میں صبح کو چاٹ لیا کریں۔ ان حکیم صاحب نے اس نرالے کشتہ کے نسخہ کو حضرت کی رائے کے مطابق استعمال کرنا شروع کیا۔ ۲-۳ روز ہی گذرے تھے کہ نفع محسوس ہوا اور ہفتہ عشرہ میں مکمل آرام ہوگیا۔

۱۰۔ ایک شخص پرانے بخار اور دق میں مبتلا تھا حضرت نے فرمایا ۴ ماشہ آکاش بیل بکری کے آدھ پاؤ دودھ میں جوش دے کر پی لیا کرو اور متواتر کئی ماہ تک پیو۔ چنانچہ اس شخص نے تین مہینے استعمال کیا۔ خدا کی شان کہ مرض بالکل جاتا رہا۔

یہ تھے وہ چند واقعات جن سے حضرت گنگوہیؒ کی حذاقت اور ان کی معالجانہ سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب آپ کے چند معمولات مطب و مجربات کا ذکر کیا جارہا ہے۔

معمولات مطب و مجربات

۱۔ عسر ولادت اس مرض میں آپ چرچیٹہ کی جڑ ران پر بندھواتے تھے اور

قند سیاہ ۲ تولہ اور کنجد سیاہ ۳ تولہ جوش دے کر پلواتے تھے۔

۲۔ **تپ کہنہ**: مصری، مصطگی ہم وزن سفوف کرکے ۲ ماشہ کی خوراک میں استعمال کرواتے تھے۔

۳۔ **زہریلے جانوروں کا کاٹنا**: جس جگہ پر سانپ، بچھو یا بھڑ کاٹ لے تمباکو کو وہاں مل لیا جائے۔ سانپ کے کاٹنے پر تمباکو کا دھواں جو کیٹ کی طرح جم جاتا ہے کھرچ لیا جائے اور کاٹی ہوئی جگہ پر اُسکا لیپ لگایا جائے اور سرمہ کی طرح سلائی میں بھر کر آنکھوں میں اچھی طرح لگا دیا جائے اور اسی کو پانی میں گھول کر اس شخص کو اگر ہوش ہو تو پلا دیا جائے اور اگر زہر چڑھنے سے بے ہوش ہو گیا ہے تو منہ کھول کر کسی تدبیر سے حلق میں ڈال دیا جائے۔

۴۔ **دیدان امعار (آنتوں میں کیڑے)**: تمباکو کا پتّہ کچل کر کھلا دیا جائے۔

۵۔ **زکام**: سبوس گندم ۶ ماشہ کی مقدار اچھی طرح پانی میں جوش دے کر قدرے نمک ملوا کر پلواتے تھے اور اگر زکام کے ساتھ ساتھ حرارت بھی محسوس ہوتی تھی تو چھ ماشہ سونف کا اسی میں اضافہ فرماتے تھے۔

۶۔ **قبض**: سنا رکی کوٹ کر ہم وزن قند سفید ملالیں اور سوتے وقت ۶ ماشہ کی پھنکی لے لیا کریں۔ اگر دو چار اسہال کی ضرورت ہو تو حب نشاط ۶ ماشہ استعمال کرواتے تھے اور سیاہ مرچ، ایلوہ اور سہاگہ کو عرق گھیکوار میں پسوا کر بھی استعمال کرواتے تھے۔

۷۔ **امراض طحال**: سہاگہ کھیل کرکے شہد میں ملا کر چبانے کو مفید بتاتے تھے۔

۸۔ **عرق النسا**: ایک مرتبہ اس مرض میں مٹی کا تیل پینا نافع بتایا تھا اور ایک شخص کو استعمال بھی کروایا تھا فوراً نفع ہوا۔

۹۔ **امراض جگر و طحال**: ۲ تولہ شربت بزوری کو آدھ پاؤ عرق مکو میں ملا کر پینا مفید بتایا ہے۔ مرض طحال میں ایک مرتبہ یہ نسخہ تجویز فرمایا۔ تخم شبت ۲ تولہ گلقند آفتابی میں ملا کر صبح کو چبائیں اور ایک ماشہ سہاگہ بریاں پیس کر ایک تولہ سکنجبین سادہ میں ملا کر شام کو چاٹیں۔

۱۰۔ **جریان** : پاؤ بھر گائے کا دودھ ہانڈی میں آگ پر رکھا جائے اور ۶ ماشہ تالمکھانہ اس میں ملاکر اچھی طرح جوش دیا جائے یہاں تک کہ کھیر ہو جائے اس میں ایک ڈیڑھ تولہ شکر ملاکر صبح کے وقت کھالیا جائے چند روز میں نفع ہوگا۔

۱۱۔ **تقویت دماغ** : ناریل خورد ایک سیر، خشخاش ایک سیر، چھوارے ۲۱ عدد، بادام ۲۱ عدد اور دکھنی مرچ ۳ تولہ کوٹ چھان کر ڈیڑھ پاؤ کھانڈ ملاکر سفوف بنالیں اور ایک تولہ سے ۲ تولہ صبح کے وقت استعمال کیا کریں۔ تقویت دماغ کے لئے اپنے صاحبزادہ کے لئے ایک مرتبہ یہ نسخہ تجویز فرمایا۔

پوست ہلیلہ زرد ۳ تولہ، پوست بہیڑہ ۳ تولہ، آملہ ۳ تولہ، اسطوخودوس ۳ تولہ، ناگرموتھا ا تولہ، لونگ ا تولہ، دارچینی ا تولہ، مصطگی ا تولہ کو کوٹ کر شہد خالص ملاکر ۶۔۶ ماشہ صبح و شام استعمال کریں۔

۱۲۔ **جاڑہ بخار** : چھ ماشہ خوب کلاں (خاکسی) اور چھ ماشہ سونف دونوں کو آدھ پاؤ پانی میں اتنا جوش دیں کہ چھٹا تک بھر رہ جائے پھر میٹھا کر پی جائیں۔ بچوں کے لئے نصف خوراک ہونی چاہیے۔

۱۳۔ **بواسیر** : کوکر جھنڈی کو جو ایک بودار گھاس کا نام ہے اور جو پالک کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً غلاظت کے قرب و جوار میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کو بھکرم بھی کہتے ہیں کوٹ کر اس کا عرق پیا کریں اور اسی کی ٹکیہ نیم گرم کر کے مسّوں پر باندھ لیا کریں، جب تک کہ پورا فائدہ نہ ہو برابر استعمال کیا کریں۔

۱۴۔ **وجع المفاصل** : برگ سنبھالو ۳ ماشہ کو چائے کی طرح پانی میں جوش دیکر نمک ملاکر گرم گرم پی لیا کریں۔ یہ نسخہ ریاحی درد کے لئے زیادہ نافع ہے۔

۱۵۔ **کھانسی** : رب السوس، کاکڑا سینگی، مغز بادام، مغز چلغوزہ چاروں دواؤں کو ہم وزن کوٹ کر اور مویز منقی ملاکر چنے کے برابر گولیاں بنالیں اور ایک گولی منہ میں ڈال کر اس کا رس چوستے رہیں ایک ختم ہو جائے تو دوسری گولی چوسیں۔ اس طرح متواتر استعمال سے آرام ہوگا یا صرف کاکڑا سینگی ہی کو پانی میں گھول کر گولی بنالیں اور

مذہب کے خلاف ایک تحریک

محمد یوسف قاسمی ٹانڈہ رام پور

اکیس ویں صدی کی دہلیز پر کھڑا ہو کر، آج کا انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ ارتقائی منازل طے کرتے کرتے بہت دور جا چکا ہے۔ اور آئندہ سالوں میں اس کے لئے مزید ارتقائی مراحل سے گذرنا یقینی ہے۔ اپنی اس غلط سوچ کی وجہ سے وہ اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے، کہ ارتقاء ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تاریخ کے ہر دور میں جاری رہا ہے، اس کا خیال ہے کہ ارتقاء کے لئے کوئی دائرہ بھی نہیں، اور دنیا میں کوئی ایسی شے بھی موجود نہیں، جو ترقی پذیر نہ ہو۔ یہاں تک کہ مذہب، اقدار، اخلاق اور عقائد وغیرہ سب تغیر پذیر ہیں۔ اگر کوئی شخص فطرت کی مخالفت کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو وہ بھی بجائے خود ترقی ہے، عیش کوشی، فیشن پرستی اور بدعنوانی سب ترقیات کے زمرہ میں ہیں۔

یہ سوچ انسان کی خوش فہمی یا نادانی پر مشتمل ہے، اس لئے ناقص ہے، یہیں سے انسانیت کے بھٹکنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ کیونکہ جس دائرہ "فطرت" سے تجاوز کر کے وہ ارتقاء کے حصول میں مصروف ہے وہ ارتقاء نہیں۔ انحراف ہے، جس کو مذہب کے مخالف حضرات نے نظریۂ ارتقاء کا جاذب نظر پر کشش لبادہ اوڑھا دیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مذہب سے منسلک حضرات بھی نظریۂ ارتقاء کے فریب میں آجاتے ہیں اور اس کی حقیقت جانے بغیر قائل ہو جاتے ہیں، اس لئے نقصان سے دوچار ہوتے ہیں، کیونکہ فلسفۂ ارتقاء اپنے اندر ایسی کشش رکھتا ہے کہ انسان [illegible]

طرف دوڑتا چلا جاتا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ وہ جس سمت جارہا ہے وہ ارتقار کی نہیں انحطاط کی جہت ہے۔ ہاں اگر اس نظریہ کی حقیقت کو جان لیا جائے، اور اس کے موجدین کی غلط سوچ سے شناسائی حاصل کرلی جائے تو عین ممکن ہے کہ اس نظریہ سے انسان خود کو محفوظ کرسکے، اس لئے قدرے تفصیل سے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

نظریۂ ارتقار کے پسِ پردہ راز

دراصل نظریۂ ارتقار کو ایک خاص مقصد کے تحت وضع کیا گیا ہے اور وہ مقصد مذہبی تصور کا خاتمہ ہے۔ اس لئے کہ یہ "نظریہ" مذہب، اخلاق اور اقدار کا دشمن ہے۔ وہ بالآخر لوگوں کے لئے یہ نتیجہ فراہم کرتا ہے کہ اخلاق ایک خارجی شے ہے، مذاہب انسان کے تراشیدہ اوہام ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، خدا کا انسان کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں، بلکہ انسان اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔ یہ نظریہ دوسرا نتیجہ فراہم کرتا ہے کہ جب انسان کی تخلیق میں خدا کا کوئی دخل نہیں تو وہ خدا کی ملکیت بھی نہیں، بلکہ انسان خود مالک حقیقی ہے، یہیں سے مذہب کا تصور ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے، بس یہی راز ہے اس نظریہ کے گھڑنے کا۔

نظریۂ ارتقار کا وجود اور اس کے نتائج

"نظریۂ ارتقار" کی خامیاں اس وقت تک سامنے نہیں آسکتیں جب تک کہ اس کے وجود کو ذرا تفصیل سے بیان نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کے سنگین نتائج واضح ہوسکتے ہیں۔ اس لئے اس کی مختصر تاریخ بالفاظ دیگر اس کے وجود کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مذکورہ سوچ کا سب سے پہلا باضابطہ موجد ڈارون (DAROEN) ہے جس نے انسان کی تخلیق کی کہانی اس انداز میں گھڑی جس سے مذہب، اخلاق اور قدریں بے دخل ہوگئیں ڈارون نے بیان کیا کہ انسان ہر دور میں ارتقائی مراحل سے گذرتا رہا، وہ شروع میں پانی سے وجود میں آنے والا ایک کیڑا تھا جو تاریخ کے مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے، مختلف تغیرات سے دوچار ہوتا رہا، یہاں تک کہ بندر بن گیا اور اس کے بعد انسان ہوگیا، پھر انسان میں بھی تبدیلی ہوتی رہی، یہاں تک کہ آج کا انسان پہلے کے انسان سے مختلف ہے۔ اس کہانی کو پیش کرکے ڈارون نے ہر شے کو تغیر کی نذر کردیا۔ گویا کہ اس اختراعی کہانی کو بیان کرکے

ڈاروِن نے تین تصور دیئے۔ پہلا تصور دائمی ارتقاء، دوسرا تصور عدم تغیر کا انکار، تیسرا تصور انسان کی اصل حیوان بتائی۔

ابتداءً مغرب میں اس حیوانیت و انسانیت کے درمیان کشمکش رہی، کیونکہ لوگ انسان کو محترم سمجھتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ انسانیت کا رشتہ حیوانیت کے ساتھ جوڑ کر اسے ذلیل کیا جائے، مگر کچھ دنوں کے بعد مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مذکورہ سوچ پر اتفاق کرلیا۔ دراصل اس وقت وہ کلیسا کے بیجا تشدد سے عاجز آگئے تھے اس لئے ہر ممکن طور پر کلیسا کی غلامی سے نجات چاہتے تھے، اور اس کی سب سے اچھی صورت یہی تھی کہ سرے سے مذہب کا ہی انکار کردیا جائے۔ اس طرح کلیسا کا طلسم خود بخود ٹوٹ جائے گا۔

آگے چل کر ڈاروِن کی اس گھڑی ہوئی کہانی کو منظم طور پر ایک تحریک کی شکل دے دی گئی اور جو بنیاد ڈاروِن نے ڈالی تھی اس پر تعمیر ہونے لگی۔ تین یہودی عالموں نے اس نظریہ کی اشاعت و تبلیغ میں بلکہ مزید دلائل سے مزین کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ تینوں یہودی عالم مارکس، فرائڈ، اور ڈرکائیم ہیں جنہوں نے اگرچہ الگ الگ موضوعات سے بحث کی (چنانچہ مارکس کا میدان معاشیات ہے، فرائڈ کا نفسیات اور ڈرکائیم کا اجتماعیات) تاہم مذہب سے بیزاری کے معاملہ میں یہ تینوں مذکورہ نظریہ پر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں، اور "نظریۂ ارتقاء" کو مضبوطی فراہم کرتے ہیں۔

مارکس مارکس کا میدانِ بحث اگرچہ معاشیات ہے مگر اس نے اس پر صرف علمی بحث ہی نہیں کی بلکہ اسے مذہب بناکر پیش کیا جس میں پوری زندگی کا مخصوص زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے، اور اس میں ڈاروِن کے تینوں تصورات موجود ہیں "مارکس کے نزدیک مادی قوت ہی انسانی تاریخ کا فعال عنصر ہے" (انسانی زندگی میں جمود وارتقاء)

"اس کی نظر میں مذہب، اخلاق، اقدار اور روایات سب انتہائی مضحکہ خیز ہیں اور آسمانی ہدایات وغیرہ انسانوں کے تراشیدہ اوہام ہیں، ساری دنیا کی دراصل حقیقت مادیت ہے" "اقدار معاشی حالت کا ایک عکس ہیں"

اس نظریہ سے مارکس کا مقصد واضح ہوجاتا ہے کہ وہ دو باتوں کا افشا کرنا چاہتا ہے اوّل لادینیت (SECULARISM) کیونکہ اس کے نزدیک مذہب بنیاد پرستوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ اور حقیقی دنیا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں، دوم اخلاق واقدار کا کوئی وجود نہیں۔

فرائڈ فرائڈ نے اگرچہ نظریۂ ارتقاء سے سو فیصد تو اتفاق نہیں کیا مگر ڈارون کے اس تصور کو ضرور لے لیا کہ انسان کی اصل حیوان ہے ظاہر ہے کہ اس نے اس خیال کی وضاحت کرکے یہ بتادیا کہ انسان ترقی پذیر ہے اور جب یہ مان لیا گیا کہ انسان خود بخود وجود میں آگیا تو فوراً خدا کا انسانی تخلیق سے بے دخل ہونا لازم آگیا اور اس نتیجہ پر مزید یہ ٹکڑا منطبق ہوگیا کہ جس طرح انسان خود بخود وجود پذیر ہوگیا تو اسے اس بات کا بھی حق ہے کہ وہ اپنے ہی وضع کردہ قوانین پر عمل کرے، مافوق الفطرت طاقت کے قوانین کو اصل نہ سمجھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرائڈ کا میدان بحث "نفس انسانی، اس کے مشاعر اور انفعالات" ہیں مگر پھر بھی مذہب کے سلسلہ میں فرائڈ کی بحث کے نتائج مارکس کے نتائج سے ہم آہنگ ہیں۔

فرائڈ نفس انسانی کو غلاظت میں لتھیڑنا چاہتا ہے۔ وہ انسان کی تحقیر میں ڈارون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ نفس انسانی صرف حیوانی ہی نہیں بلکہ حیوان کا بھی ایک جز "جنس" ہے، اس کے نزدیک "جنس ہی تمام افعال پر مسلط ہے" وہ اس کا رشتہ مذہب، اخلاق اور روایات کے ساتھ منطقی طور پر جوڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری زندگی جنس سے ابھرتی ہے اور جنس کا وجود پیدائش کے وقت سے ہی ہوتا ہے۔ استدلال میں وہ اور زیادہ وحشی ہوجاتا ہے۔ وہ دلیل اس طور پر پکڑتا ہے کہ بچوں کا دودھ پینا، بول وبراز کرنا، ماں سے لپٹنا سب جنسی اعمال ہیں، جن سے انسان کی ساری نفسیاتی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ بچہ اپنی ماں سے جنسی عشق کرتا ہے، پھر جب وہ باپ کو اپنی راہ میں حائل پاتا ہے تو اخفاء (SALFRISM) کرلیتا ہے۔ اسی طرح لڑکی بھی اپنے باپ سے جنسی عشق کرتی ہے۔ مگر وہ بھی اخفاء پر مجبور ہوتی ہے اور آگے چل کر یہی اخفاء اخلاق اور اقدار کا روپ دھار لیتا ہے۔ مذہب کا تعلق جنس کے ساتھ وہ اس طور پر

کرتا ہے کہ ابتدائے انسانیت میں اولاد نے اپنی ماں سے جنسی عشق کیا مگر جب باپ کو راہ میں حائل دیکھا تو اسے قتل کر دیا، لیکن جب بعد میں اسے ندامت ہوئی تو باپ کی یادگار بنائی اور آگے چل کر اس کی پرستش کرنے لگا، مذہب وجود میں آگیا۔ غرض اس نے اس کہانی کو پیش کر کے مذہب، اخلاق اور روایات کو گندی چیز ثابت کرنا چاہا ہے تاکہ دنیا ان سے بدظن ہو جائے۔

ڈرکایم

ڈرکایم جس کا میدانِ بحث "اجتماعیات" ہے۔ وہ بھی مذہب و اقدار کے معاملہ میں ڈارون، مارکس اور فرائڈ کی تحریک میں شامل ہے۔ اور ان کے نظریات سے متفق ہے۔ وہ کھینچ تان کر اپنی بحث کو وہیں تک لے جاتا ہے۔ جہاں مذہب سے بیزاری کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ ڈرکایم نے اپنی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب اور اخلاق فطری نہیں، ان کی کوئی قیمت نہیں۔ اور نہ ہی وہ کسی ٹھوس وضع پر قائم ہیں، اس کے نزدیک اخلاق، اقدار اپنی شکل اس سماج سے اخذ کرتے ہیں جس میں کہ وہ موجود ہوتے ہیں دراصل اس کے یہاں "معاشرہ ہی سارے اجتماعی مظاہر کی بنیاد ہے، نہ کہ انسان"!

ڈرکایم نے ڈارون کے تینوں تصورات لئے۔ اس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقار کو بھی اپنایا اور عدم تغیر کے انکار کو بھی لیا، انسان کی اصل حیوان بھی بتائی، ڈرکایم نے اپنی بحث کے دوران اس امر کا خاص خیال رکھا کہ بہر صورت یہ ثابت ہوتا رہے کہ مذہب فطری نہیں نکاح فطری نہیں اور اخلاق کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ وہ کسی ٹھوس حقیقت پہ مبنی ہیں۔

تینوں یہودی عالم مندرجہ ذیل نکات پہ ہم آہنگ ہیں۔ (۱) مذہب اور اخلاق پر حملہ (۲) ان کی تقدیس سے انکار (۳) ان کے بارے میں شکوک و شبہات قائم کرنا (۴) اس حملہ کی بنیاد سائنس اور علمی بحث ہونی چاہئے (۵) مذہبی اور اخلاقی اباحیت کو ارتقار کا نام دیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تینوں عالم الگ الگ موضوعات سے بحث کرتے ہوئے بھی مذہب کے سلسلہ میں کیوں متحد ہو جاتے ہیں اور اپنی بحثوں کے نتائج مذہب کے خلاف کیوں نکالتے ہیں؟ کیا یہ محض اتفاق ہے یا پھر ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تحریک ہے مذہب واقدار کے خلاف، اور لادینیت کے موافق، اس لئے بیسویں صدی کی دہلیز پار کرتے ہو کر لوگوں کو

اچھی طرح سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے سلسلہ میں اسلام کا موقف

نظریۂ ارتقاء کے سلسلہ میں اسلام کا موقف واضح ہے کہ یہ تصور فقط ایک تحریک ہے دین مروت کے خلاف، اس لئے کہ اس کی بنیاد لادینیت پر ہے، یہ ایک غیر مذہبی اور غیر اسلامی نظریہ ہے، جس کا مقصد عوام الناس کو دھوکہ دینا ہے اس لئے اس سے تحفظ ضروری ہے۔

اسلام کی نگاہ میں ہر شئے تغیر پذیر نہیں، بلکہ کچھ اشیاء ایسی ہیں جن میں ارتقاء کے امکانات ہیں جیسا کہ عقلِ انسانی ترقی کرتی رہتی ہے مگر انسانی وجود سے خارج ہوکر نہیں بلکہ اس کے تحت رہ کر۔ اسی طرح فلسفۂ ارتقاء کے بارے میں مذہب اسلام کی سوچ یہ ہے کہ وہ فطرت کی حدود میں رہ کر ممکن ہے۔ اور جو ترقی فطرت سے خارج ہوکر ہے، وہ ارتقاء نہیں، انحراف ہے گویا کہ مذہب اسلام ارتقاء کے لئے "دائرہ فطرت" کا تعین کرتا ہے۔

رہی انسانی تخلیق کے بارے میں ڈارون کی گھڑی ہوئی کہانی تو اس کے رد میں قرآن کی یہ آیت موجود ہے۔ "یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ" (نساء)۔ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔

اس آیت سے ڈارون کے "نظریۂ ارتقاء" کی دو بنیادی باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ ایک تو اس بات کی کہ معاذ اللہ خدا بے دخل ہے۔ مذکورہ آیت بتاتی ہے کہ انسان کو وجود بخشنے والا خدا ہے۔ انسان خود بخود وجود پذیر نہیں ہوا، اس لئے خدا کی کارسازی کا ثبوت مل جاتا ہے۔ دوسری اس گھڑی ہوئی کہانی کی تردید ہوتی ہے جو اس نے انسان کے بارے میں گھڑی، قرآن نے صاف کہہ دیا کہ انسان کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا اور اس جاندار میں روح پھونکنے والا براہِ راست خدا ہے۔ خدا کی وجودیت و خالقیت ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ "واذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ" (البقرۃ) اور بلاشبہ تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

جب مذکورہ آیت سے خدا کی ربوبیت اور ملکیت ثابت ہوگئی تو یہ بھی خود بخود ثابت ہوگیا کہ مالکِ حقیقی اپنے بندوں پر اپنے قوانین کا نفاذ کرسکتا ہے۔ اس کے قانون میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کے مقابلہ میں کوئی نظام یا اختراعی کہانی گھڑنے کی گنجائش ہے۔ بس یہیں سے مذہب کا اثبات ہوجاتا ہے۔

عقائد کی بابت اسلام کا موقف یہ ہے کہ یہ ایک غیر متغیر شے ہے جو تاریخ کے کسی دور میں نہیں بدلی اور نہ ہی اس میں ترقی کے امکانات ہیں قرآن نے اس کا عہد بعہد اس طرح جائزہ لیا ہے۔

"لقد ارسلنا نوحًا الی قومہ فقال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ" (اعراف ۵۹) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔" "والی عادٍ اخاھم ھودا قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ" (اعراف ۶۵) "والی مدین اخاھم شعیبا قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ" (اعراف ۸۵)

ایک ہی دعوت ہے جو تاریخ کے ہر دور میں دی جارہی ہے۔ ایک ہی عقیدہ ہے جو کبھی تغیر پذیر نہیں ہوا اور آخر میں قرآن نے عقائد کی تبدیلی کی بندش کی مہر لگادی۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (مائدہ ۳) آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور تم پر نعمتوں کو تام کردیا اور میں نے تمہارے لئے اسلام دین کو پسند کرلیا۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظریۂ ارتقاء ایک غیر مذہبی نظریہ ہے جس کی بنیاد لادینیت پر ہے اور یہ مذہب کے خلاف ایک تحریک ہے۔

از: کریمی اسڑونصرپور سندھ

دہلی سے شمال مشرق میں ۹۰ میل کے فاصلے پر دیوبند کا مشہور قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے سہارنپور ضلع میں شہر سہارنپور کے جنوب میں ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

ہندوستان کے اِس مشہور و معروف قصبے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قصبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بھی موجود تھا۔ یہاں ایک مقبرے کے متعلق جو "شاہ جنگل بانس" کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے، بتایا جاتا ہے کہ "شاہ جنگل بانس" شیخ سعدیؒ کے معاصر تھے اور علامہ ابن جوزیؒ کے شاگرد۔ شیخ سعدیؒ جب ہندوستان سیاحت کی غرض سے آئے تو "شاہ جنگل بانس" سے ملاقات کے لئے دیوبند بھی تشریف فرما ہوئے تھے۔ (شیخ سعدی کی سیاحتِ ہند تحقیق طلب ہے)۔

"شاہ جنگل بانس" کے مزار کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک تالاب ہے جس کے ارد گرد کثیر مندر ہیں۔ ہندوؤں کے لئے یہ جگہ متبرک ہے، یہاں ہندوؤں کا ایک میلہ بھی لگتا ہے۔

قصبہ دیوبند میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور تمام قدیم دور سے صدیقی (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد) اور عثمانی (حضرت عثمانؓ کی اولاد) شیخوں کے دو خاندان آباد ہیں۔

دسویں صدی ہجری کے آخر میں حاجی سید ابراہیم صاحب لکھنؤ سے سفر کرتے ہوئے سیاحت کی غرض سے دیوبند پہنچے۔ دیوبند انہیں ایسا پسند آیا کہ یہاں پر ہی

شادی کی اور یہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون پذیر ہو گئے۔ اس طرح دیوبند میں تیسرے بزرگ خاندان کا اضافہ ہوا یعنی سادات خاندان جو کہ اہل شہر میں انتہائی محترم رہا۔

شہر دیوبند کی یہ خاص خوبی ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ آبادی ساداتوں اور شیخوں کی ہے۔ اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی مخالف اور حامی دو جماعتیں شہر میں موجود ہیں۔ لیکن عقائد دونوں کے ایک ہیں۔ شہر میں مساجد کی اکثریت ہے۔ تقریباً ۶۰ ہزار کی مسلم آبادی میں ۱۰۰ سے زائد مساجد ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں۔ اسٹیشن سے بازار جانے والی سڑک جامع مسجد پہنچتی ہے۔ اس سڑک کے ایک طرف خالص مسلمانوں کی آبادی ہے اور دوسری جانب ہندوؤں کی۔ مسلمانوں کی آبادی میں ہندوؤں کے مکان دو چار سے زیادہ نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی آبادی میں مسلمانوں کے کئی محلے ہیں۔

دیوبند میں ایک مختصر مکتب یا مدرسہ قائم کرنے کا پہلا خیال دیوبند کے سادات خاندان کے حضرت سید عابد حسینؒ کے ہی ذہن میں آیا اور اس بزرگ نے اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کے تایا مولانا مہتاب علیؒ سے مشورہ کیا۔ تیسرے بزرگ جو کہ ان کے ساتھ اس تجویز میں شامل ہوئے وہ جناب شیخ نہال احمد صاحب رئیس اعظم دیوبند تھے۔ دارالعلوم کی قدیم عمارت والی زمین شیخ نہال احمد صاحب اور آپ کے اقارب کی تھی۔ چوتھے بزرگ جو کہ نہ صرف اس تجویز میں شامل ہوئے بلکہ انہوں نے ایک چھوٹے مکتب کی جگہ پہ ایک بڑے عالیشان بین الاقوامی مدرسہ کا نہ صرف خاکہ دیا بلکہ اُس کو پایۂ تکمیل تک بھی پہنچایا وہ تھے دارالعلوم دیوبند کے حقیقی بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (قارئین کو یہ بات ذہن نشین رہے کہ دیوبند، نانوتہ، گنگوہ اور تھانہ بھون ضلع سہارنپور اور مظفرنگر کے ہی شہر ہیں اور انہی شہروں کی نسبت سے بزرگوں کو نانوتوی، گنگوہی اور تھانوی کہا جاتا ہے)۔

بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی تعلیم دہلی میں نانوتہ ہی کے ایک بزرگ حضرت مولانا مملوک علیؒ کے پاس حاصل کی۔ حصول تعلیم میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی آپ کے ساتھی اور رفیق تھے۔ اور پوری تعلیم دونوں نے مل کر حاصل کی۔

دونوں بزرگوں کے تین مشہور و معروف اساتذہ حضرت مولانا مملوک علیؒ حضرت مولانا مفتی صدرالدینؒ، حضرت مولانا عبدالغنی مجددیؒ ہیں جو براہ راست یا ایک واسطہ سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اور جانشین حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح دارالعلوم دیوبند کا روحانی خمیر مشہور مفکر، حکیم، مجدد حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کا ہے اور اصل میں دارالعلوم دیوبند ولی اللّٰہی تعلیم اور تحریک کا بنیادی مرکز ہے۔ جہاں سے پوری دنیا نورِ نبویؐ سے جگمگا اُٹھی۔

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بمطابق ۱۸۶۷ء بروز جمعرات وہ سعید ساعت آپہنچی جب مندرجہ بالا اہل اللہ کا اجتماع ہوا۔

حضرت حاجی عابد حسینؒ نے چندہ کے لئے رومال پھیلایا اور پہلا چندہ خود حاجی صاحب ہی نے دیا۔

مسجد چھتہ کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے سائے میں ایک معمولی مدرسہ کا افتتاح ہوا جس نے آگے چل کر اپنے سایہ اور پھلوں سے پوری دنیا کو نفع پہنچایا۔

اسی ماہ میں ایک اشتہار کے ذریعے مدرسہ کے قیام کے اعلان کے ساتھ یہ ظاہر کیا گیا کہ اِس وقت ۴۰۱/۸ (چارسو ایک روپیہ آٹھ آنے) چندہ جمع ہو چکا ہے اور سولہ طلبہ کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔

اسی سال کے اواخر میں طلبہ کی تعداد ۷۸ ہو گئی۔ جن میں سے ۵۸ بیرونی تھے ۵۲ طلبہ کی خوراک کی ذمہ داری اہلِ شہر نے خود ہی لی اور اساتذہ میں اضافہ کر کے ۵ اساتذہ مقرر کئے گئے۔ ان پانچ اساتذہ کے ہیڈ (صدر مدرس) حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کو مقرر کیا گیا۔ یہ بزرگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے استاد محترم حضرت مولانا مملوک علیؒ کے فرزند ارجمند تھے جو ہر فن میں خاصے علم کے مالک تھے۔

مدرسہ کے سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی حافظ سید عابد حسینؒ مقرر ہوئے، آپ کے بعد حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ مہتمم ہوئے۔

مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ ان پاک نفوس سے مزین تھی (۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۲) حضرت حاجی سید عابد حسینؒ (۳) مولانا مہتاب علیؒ (شیخ الہند کے تایا) (۴) مولانا ذوالفقار علیؒ (شیخ الہند کے والد محترم) (۵) مولانا فضل الرحمنؒ (۶) شیخ نہال احمدؒ (۷) منشی فضل حقؒ۔

سب سے پہلا دورۂ حدیث دارالعلوم میں ۱۲۸۹ھ کو شروع ہوا اور مدرسہ کے سب سے پہلے فارغ التحصیل جن کو سندِ تکمیل اور دستارِ فضیلت عطا ہوئی وہ یہ پاک نفوس تھے:

(۱) سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ (اسیر مالٹا) (۲) مولانا عبدالحق ساکن پورقاضی (۳) مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۴) مولانا فتح محمد تھانویؒ (۵) مولانا عبداللہ جلال آبادی۔

دارالعلوم کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت چاردانگ پھیل گئی۔ مسجد چھتہ ناکافی ہوئی تو قاضی والی مسجد اور کرایہ کے مکانات میں کام چلایا گیا، وہ بھی ناکافی ہوئیں تو جامع مسجد کے احاطے میں تین اطراف میں کافی حجرے اور کمرے بنوائے گئے اور وہ بھی ناکافی ہوئے تو شہر سے باہر ایک کھلا اور وسیع پلاٹ مدرسہ کے لئے حاصل کیا گیا اور اِس طرح ۲ر ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ بعد نماز جمعہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی پہلی عمارت کی بنیاد رکھی گئی بنیاد رکھنے کی تقریب میں اہل اللہ کے مجمع کا ایک عجیب روح پرور منظر تھا، دلوں پر ایک عجیب سرور تھا، ایک عجیب خوشی تھی سب کے قلوب فرحت سے مالا مال تھے۔

بنیاد کی سب سے پہلی اینٹ میاں جی منّے شاہؒ سے رکھوائی گئی، دوسری اینٹ حضرت حاجی سید عابد حسینؒ نے رکھی اور اس کے بعد حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سب کے ساتھ مل کر بنیاد میں اینٹیں چنیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالك۔ ذالك فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مدرسہ دارالعلوم دیوبند کا پس منظر اور اس کے مقاصد اور موجودہ صورتِ حال پر مختصر نظر ڈالنے سے مضمون کے پھل کا ذائقہ اچھی طرح لیا جا سکے گا۔

پس منظر اور مقاصد

مغل سلطنت کے آخری چراغ کو گل ہوئے ۱۳۰ برس گذر چکے۔ ہندو اور مسلمان حریت اور استخلاص وطن کی آخری جنگ (۱۸۵۷ء) میں ناکام ہو چکے تھے۔ سنہرے رنگ کا قومی نشان، صلیبی نشان کے آگے جھک چکا تھا۔ دہلی کے لال قلعے پر اسلامی پرچم کی جگہ "یونین جیک" (برطانوی جھنڈا) لہرا رہا تھا، ایک ایک کر کے ہر اُس شخص کو موت کی نیند سُلا دیا گیا یا جلاوطن کر دیا گیا جس نے ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں ذرا بھی جدوجہد کی تھی۔ صدہا علمائے دین جنہوں نے دار و رسن کی مظلومانہ موت کو لبیک کہا اور شہادت کا جام پی کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ اِس تباہی نے مسلمانوں کو اس طرح پیس ڈالا کہ عمل تو دور کی بات سیاست کے نام سے ہی رعشہ طاری ہو جاتا تھا اور پھر خفیہ پولیس کی اس طرح گرفت کہ سحر کے وقت بد دعائیں دینے کے لئے بھی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔

اِس صورت حال میں انگریزوں نے دوسری کاری ضرب ہندوستان کے تعلیمی نظام پر لگائی اور مندرجہ ذیل مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کا تعلیمی نظام ترتیب دیا۔

(الف) برطانوی شہنشاہیت کے لئے کاسہ لیس پیدا کئے جائیں۔

(ب) کیونکہ قرآنی احکامات کی موجودگی میں برطانوی شہنشاہیت سے وفاداری ممکن نہیں، اس لئے مسلمانوں کو مذہب سے ناآشنا بنایا جائے۔

(ج) تعلیمی نصاب ایسا ہونا چاہئے کہ تعلیم حاصل کرنے والے برطانوی شہنشاہیت کیلئے ایماندار غلام بن جائیں یعنی مذہب کا احترام، وطن کا احساس، علماء کا احترام اور آپس (ہندو مسلم وغیرہ) میں رواداری سے محروم کر دیئے جائیں، ان میں تفرقہ پھیلے، ہندو مسلم تنازعے پیدا ہوں اور لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کامیاب ہو۔

ایسی ناگفتہ صورت حال میں سیاست کے نام پر کوئی بھی تحریک انگلش پالیکس میں حرام تھی۔ کسی بھی قومی تنظیم کا قیام ناممکن، تو کچھ ایسے پاک نفوس تھے کہ اُن کے مقدس ایمان کے نورِ فراست نے دیدۂ بصیرت کو اِس قدر تیز کر دیا تھا کہ مستقبل بعید کو اپنے

تدبر وتفکر کے آئینے میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے۔ دشمنانِ اسلام اگرچہ اسلام کو فنا کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن اسلام اپنے پاکبازوں کے ذریعے سے اپنا اعجاز دکھانا چاہ رہا تھا اور بلاشبہ وہ ایک جدید حیات کے لئے مچل رہا تھا۔

ان پاک نفوس نے اصحابِ صفہ کے طرز پر ایسے مدارس قائم کرنے کی سعی کی جو صرف اور صرف اللہ کے توکل پر قائم کئے جائیں۔ جو مسلمانوں کو مسلمان اور اسلام کو اپنی حقیقت پہ باقی رکھ سکیں۔

انگریزی کالجوں اور اسکولوں کے مقابلے میں ایسے مدارس کا ہونا انتہائی مشکل تھا کیونکہ زمانے کی تبدیلی، طبائع میں تغیر، انگریزوں کا اقتدار ایسے مدارس کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن ان مقدس ہستیوں نے ملّت کے تحفظ اسلام کی بقا کے لئے ہر قربانی، جفاکشی، فاقہ مستی اور ایثار کو قبول کر لیا اور محض اللہ پہ بھروسہ کرتے ہوئے ولی اللّٰہی خاندان کے جانشینوں نے سرزمین دیوبند، سہارنپور اور پھر مراد آباد کی طرف عنانِ جدوجہد کو منعطف کیا، اور ان میں سے بین الاقوامی سطح پہ جو چیز مقبول ومعروف ہوئی وہ ہے دارالعلوم دیوبند۔

دیوبند کے مندرجہ بالا مقاصد کے علاوہ یہ دو نقاط بھی مرکزی اور اساسی ہیں۔

(الف) آزادیِ ضمیر کے ساتھ ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان ہو، کوئی سنہری طمع، مرتبانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔

(ب) اِس کا تعلق عام مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ ہو کہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے جو کہ ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پہ قائم رکھ سکنے میں مددگار ہو اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم اس وقت تک کے لئے محفوظ ہو جائے جب تک یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے۔ نیز یہ توکل علی اللہ اور عوام کی طرف احتیاج خود مدرسہ کے ارکان کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا سیاستی ٹھاٹھ اُن میں بالکل ہی پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن ایک جمہوری تعلق جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنا کر رکھے اور اس طرح

ان کی آپس میں اصلاح ہوتی رہے۔

نوٹ: یہ پورا مواد "علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے" از سید محمد میاںؒ سے ماخوذ ہے۔

موجودہ حالات مندرجہ بالا مضمون کے قاری خاص طور پر دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل نقاط پر غور فرمائیں۔

(۱) یونین جیک کی جگہ پر امریکی جھنڈا پس پردہ مسلسل لہرا رہا ہے۔

(۲) انگریزوں کی پیدا کی ہوئی ہندو مسلم نفرت اور تنازعات ہندوستان اور پاکستان کے لئے مستقل جنگ کی صورت میں اُسی طرح موجود ہے۔

(۳) مسلمانوں کی اجتماعی قوت ریزہ ریزہ کرنے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں اور پاکستانی مسلمانوں کی راہیں مستقل طور پر علیحدہ ہوگئیں۔

(۴) پاکستان کے مسلمانوں کو آپس میں مستقل لڑانے کے لئے ایک دوسرے کے لسانی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حقوق پر ڈاکہ زنی کے لئے پاکستان کے مختلف صوبوں کو ایک دوسرے پر نام نہاد مذہبی اور اخلاقی نیز آئینی اور فوجی حدود کی مدد سے مسلط کرتے ہوئے اُن میں باہمی نفرت اور عداوت کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

(۵) ولی اللّٰہی انقلابی تحریک جس کی حقیقی تعبیر شیخ الہندؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے۔ ان کی تعلیمات اور افکار کو نظرانداز کر دینے کی مہم چلائی جارہی ہے، انگریز کے ڈنڈے کی جگہ پر پاکستانی ڈنڈے سے انکو برابر مسخ کیا جا رہا ہے۔

ان حالات میں دیوبند کے حقیقی ورثار کیا یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ دیوبند اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا، یا یہ کہ دیوبند کے مقاصد کے حصول کی جدوجہد اب بھی جاری ہے؟

یادِ رفتگاں

(۱)

حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے برادر کبیر، نامور صاحب تدریس عالم دین حضرت مولانا امانت اللہ معروفی یکم ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ کو اس سرائے فانی سے رحلت کر کے عالم جاودانی میں پہنچ گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اگرچہ جسمانی طور پر کمزور ونحیف تھے۔ لیکن علم ودین میں نہایت قوی اور طاقتور تھے حضرت محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی قدس سرہ جن علماء کے علم ودیانت پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا مرحوم بھی تھے۔

اپنے تلامذہ کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ رکھتے، اور فراغت کے بعد بھی ان پر نظر رکھتے تھے اور اپنے مفید مشوروں سے انکی رہنمائی کرتے رہتے تھے تعلیم وتدریس کے ساتھ ملی وسماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابتداء ہی سے جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، وفات کے وقت بھی جمعیۃ علماء ضلع مئو کے صدر تھے۔ جمعیۃ کے مرکزی اجلاسوں میں اپنی خرابی صحت کے باوجود شرکت کرتے تھے۔ ذہانت، معاملہ فہمی اور اصابت رائے میں اپنے معاصرین میں بھی مشہور تھے اور سب ہی ان اوصاف میں ان کی سبقت کے قائل ومعترف تھے۔ مولانا مرحوم پورہ معروف ضلع مئو میں ۱۳۴۸ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف میں باقی ایک سال مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھا پھر وہاں سے دارالعلوم دیوبند آگئے۔ اور یہاں دو سال رہ کر ۱۳۶۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، حدیث کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، فراغت کے بعد حضرت شیخ مدنی قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور کئی سال رمضان المبارک کے ایام حضرت مدنیؒ کی فیض بخش صحبتوں میں گذارے اور تاحیات آستانۂ مدنی سے وابستہ رہے فراغت کے بعد اپنی مادرعلمی مدرسہ اشاعت العلوم کی تعمیر وترقی میں لگ گئے، اور اعزازی طور پر اس

میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، پھر ۱۳۹۳ھ سے صدارت تدریس اور نظامت کی خدمت بھی مولانا سے متعلق ہوگئی، جسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا مولانا مرحوم کے دور صدارت میں مدرسہ اشاعت العلوم نے اچھی خاصی ترقی کی۔ اور بڑے اچھے اچھے طلبہ ان کی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر بڑے مدارس میں پہنچے۔

یکشنبہ ۲۶ ؍شوال کو ۱۰ بجے دن میں مرکزی دارالعلوم محمدیہ کے ایک پرانے قضیہ کو سلجھانے کے لئے گئے اور اپنے فہم و تدبر سے فریقین کو راضی کرکے فیصلہ لکھ رہے تھے کہ دماغ پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور ہوش و حواس مختل ہوگئے، بیہوشی کے عالم میں چار دن مئو کے اسپتال میں رہ کر یکم ذی قعدہ کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انکے درجات کو بلند سے بلند فرمائے۔

(۲)

یکم ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو ۹ بجے شب میں جناب الحاج احمد حسین صاحب بھاگلپوری خلیفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

حاجی صاحب مرحوم اپنے علاقہ میں بڑے ہر دل عزیز تھے۔ مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ رسمی طور پر عالم تو نہیں تھے لیکن صورت و سیرت کے لحاظ سے بالکل صف علماء کے فرد معلوم ہوتے تھے، اور اپنی مساعی جمیلہ سے بہت سے لوگوں کو عالم و فاضل بنا دیا، اس لئے عالم نہ ہونے کے باوجود وہ ایک عالم گر تھے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ سے عشق کی حد تک تعلق تھا۔ ان کی کوئی مجلس حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتی تھی ان کی ایک ایک اداؤں کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کرتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کی یادگار کے طور پر شہر بھاگلپور میں تیس کمروں پر مشتمل دو منزلہ مسافر خانہ تعمیر کرایا تھا۔

جمعیۃ علماء سے بھی خصوصی تعلق رکھتے تھے اور آخر عمر تک اس کے کاموں سے دلچسپی لیتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پر لگا
[illegible] ابن تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہنچ رہی ہے اور
اب [illegible] کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے [illegible]
کیا جا رہا ہے یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پہ رقم بھی کثیر خرچ ہوگی لہٰذا
مخلصین کی [illegible] آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے
بہتر ہے کہ ایک [illegible] رقم لگا دی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اس [illegible]
انجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے [illegible]
[illegible] خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ [illegible]
سرگرمی [illegible] تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد [illegible]

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس
[illegible] اس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان [illegible]
[illegible] رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب [illegible]
اس کار خیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقربا کو بھی اسکی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں [illegible]
[illegible] ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

پتہ

ڈرافٹ و چیک بنام "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076
اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

[illegible] حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم [illegible]

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۱	شمارہ نمبر ۹	فی شمارہ /۶	سالانہ /۶۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

استاذ دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم۔ دیوبند، سہارنپور۔ یو، پی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ۔ /۴۰۰ روپئے پاکستان سے ہندوستانی رقم۔ /۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم۔ /۸۰ ہندوستان سے۔ /۶۰

Ph. 01336-22429 Pin-247554

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کر دیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل......

دین اسلام کی حفاظت و صیانت، تجدید و احیاء اور بقاو دوام کیلئے تدبیر الٰہی ہر زمانے میں ایسے رجال سے کام لیتی رہی ہے جنھوں نے دنیا کے مشاغل سے یکسو ہو کر اپنی پوری زندگی خدمتِ دین کے لئے وقف کردی خدائے کارساز جس سے دین کا جو کام لینا چاہتا ہے اسے اس کام کے مناسب استعداد و صلاحیت سے آراستہ کردیتا ہے اور اس کام کے لئے اس کے دل میں ایسا جذبہ، داعیہ اور شوق وولولہ پیدا فرمادیتا ہے کہ گویا دنیا میں کرنے کا بس یہی کام ہے۔

چونکہ دین اسلام کے مختلف شعبے ہیں اور حکمتِ الٰہیہ سبھی شعبوں کو باقی رکھنا چاہتی ہے اس لئے اللہ رب العزت نے خدام دین میں ذوق بھی مختلف رکھے ہیں کسی کو دین کے کسی شعبہ سے فطری وذوقی مناسبت ہے تو کسی کا کسی دوسرے شعبے سے تعلق خاطر ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل او اندر دلش انداختند

اور ہر شخص اپنے اپنے ذوق اور رجحان طبع کے مطابق خدمتِ دین کی کوئی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی فطری اختلاف ذوق کی برکت ہے کہ دین کے سارے شعبے قائم و دائم ہیں۔ کارخانۂ خدمت دین میں تقسیم کار کا یہ ایسا تکوینی اصول کار فرما ہے کہ بغیر کسی ظاہری اصول بندی کے خدام دین اپنے اپنے کاموں میں رواں دواں ہیں۔

اسی تکوینی اصول کے مطابق بعض حضرات دین کے کسی ایک شعبہ کے کارکن ہوتے

ہیں اور بعض سے ایک سے زیادہ شعبوں کی خدمت لی جاتی ہے اور بعض مخصوص حضرات کو عنایت الٰہیہ خدمات دینیہ کا قطب مدار بنادیتی ہے حق تعالیٰ ان کی شخصیت میں ایسی موزونیت، ایسی جامعیت، ایسی جاذبیت اور روحانی مقناطیسی قوت ودیعت فرمادیتے ہیں کہ اس دور کے مختلف ذوق و مزاج کے اہل دل و رجال کار کشاں کشاں ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اس طرح ان کی ذات مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ان کی تاثیر صحبت اور تربیت و توجہ سے دین کے تمام شعبوں میں حیات تازہ پیدا ہو جاتی ہے اور علم و عرفان کی رگوں میں نیا خون دوڑنے لگتا ہے۔

حفاظت دین کا یہ وہ تکوینی نظام ہے جسے تدبیر الٰہی ہر دور میں بروئے کار لاتی رہی ہے۔ خود برصغیر (ہندوپاک) کی اسلامی و دینی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ جب سے ظلمت کدۂ ہند نور اسلام سے منور ہوا ہے ہر دور میں ایک نہ ایک ایسی مرکزی شخصیت موجود رہی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت شیخ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر، حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت شیخ علاء الحق پنڈوی، حضرت شیخ اشرف سمنانی، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت شیخ حسام الدین مانکپوری، حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی، حضرت خواجہ محمد معصوم مجددی، حضرت شیخ آدم بنوری، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شیخ مظہر جان جاناں، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ غلام علی مجددی، حضرت سید احمد شہید بریلوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت قطب ارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی اور دیگر بہت سے اکابر اپنے دور میں مرجع خلائق رہے ہیں (رحمہم اللہ)

حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ ہمارے آج

کے موجودہ عہد میں اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور اسی مقدس قافلہ کے ایک فرد فرید تھے۔ اکابر مشائخ کے بعد جس طرح حضرت مفتی صاحب کی طرف خلق خدا کا رجوع ہوا اور آپ نے اپنے تعلیمی و فقہی مشاغل اور پیرانہ سالی وامراض و عوارض کے باوجود جس ہمت و عزیمت اور بلند ہمتی کے ساتھ اصلاح وارشاد اور مردم سازی کی وسیع پیمانہ پر خدمت انجام دی اس سے اکابر سلف کی یاد تازہ ہوگئی (جزاہ عناو عن سائر المسلمین خیر الجزاء)

سوانحی خاکہ:۔ حضرت فقیہ الامت کا اسم گرامی محمود حسن ابن حامد حسن ابن محمد خلیل ہے۔ حضرت قطب ارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی کے وصال کے ٹھیک دو سال کے بعد ۸/ یا ۹/ جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ شب جمعہ میں قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں آپ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تحصیل:۔ سن تمیز کو پہنچے تو آپ کے والد ماجد نے حضرت شیخ الہند سے بسم اللہ کراکر آپ کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرادیا گنگوہ کے با فیض معلم حافظ کریم بخش صاحب نابینا سے قرآن پاک پڑھا فارسی آمدنامہ اور بوستاں کے کچھ اجزاء مولانا فخر الدین گنگوہی سے اور عربی کی اولین کتاب میزان الصرف اپنے والد بزرگوار سے پڑھی۔

پھر ۱۳۴۲ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مظاہر علوم میں داخل ہوئے اور یہاں سات سال رہ کر عربی کی ابتدائی کتابوں سے لیکر انتہائی کتابوں کی تعلیم حاصل کی اور دورۂ حدیث کی تکمیل کے لئے ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم دیوبند آگئے اور بخاری و ترمذی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے، ابوداؤد شریف حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب سے اور مسلم حضرت مولانا رسول خاں صاحب سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد پھر مظاہر علوم آگئے اور یہاں دوبارہ داخلہ لیکر بخاری اور ابوداؤد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی صاحب سے، طحاوی، مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد حضرت مولانا منظور احمد صاحب سے، نسائی، ابن ماجہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری سے پڑھی۔ اسی کے ساتھ فن تجوید اور قرآت کی تکمیل بھی مظاہر علوم سے کی۔

درس و افتاء:۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں معین مفتی کی حیثیت سے فتویٰ نویسی کا آغاز کیا دو سال کے بعد حسنِ کارکردگی کے پیش

نظر معین مفتی سے ترقی دے کر نائب مفتی بنائے گئے۔ ۱۳۷۰ھ تک اسی منصب پر فائز رہے۔ افتاء کی انتہائی ذمہ دارانہ خدمت کے ساتھ اس دوران ابتدائی اور متوسط کتابوں کا درس بھی آپ سے متعلق رہا۔

محرم الحرام ۱۳۷۱ھ میں اہل کانپور کی طلب و خواہش پر جامع العلوم کانپور تشریف لے گئے اس دیار میں یہ مدرسہ اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کافی شہرت کا حامل تھا اور ایک زمانہ میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بھی یہاں تدریسی خدمت انجام دی تھی۔ یہاں کے دوران قیام میں آپ نے درس و تدریس، فقہ و فتاویٰ، وعظ و تذکیر اور اصلاح و ارشاد کی خدمات بڑی لگن اور عزم و حوصلہ کے ساتھ انجام دیں اور خوب مقبولیت و شہرت بھی حاصل ہوئی۔

۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور ارباب انتظام کی پیہم کوششوں کے نتیجہ میں آپ کانپور سے سبکدوش ہو کر دارالعلوم دیوبند آگئے اور مسند افتاء کو رونق بخشی۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث استاذنا المحترم حضرت مولانا سید فخر الدین نور اللہ مرقدہ نے اپنی پیرانہ سالی اور امراض و عوارض کی بناء پر تدریسی ذمہ داریوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی غرض سے بخاری جلد ثانی حضرت مفتی صاحب کے حوالہ کردی مفتی صاحب نے افتاء کی انتہائی نازک اور اہم ذمہ داری کے ساتھ درس بخاری کی عظیم تر خدمت کو بھی بحسن و خوبی انجام دیا۔ دارالعلوم دیوبند سے اس رسمی و آئینی تعلق کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک یہ وابستگی قائم رہی۔ اس مدت میں افتاء اور دارالافتاء کے طلبہ کے درس کے ساتھ حدیث پاک کا درس بھی آپ سے متعلق رہا چنانچہ اس سال بھی امراض کی شدت اور ضعف و نقاہت کے باوجود نسائی شریف کا درس دیا اور پورے انشراح و انبساط کے ساتھ نصاب کی تکمیل کرائی۔

علم فقہ میں آپ کا مقام:۔ فقہ و فتاویٰ میں حضرت مفتی صاحب انتہائی معتمد و مستند سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے تحریر کردہ فتاویٰ نہایت جامع اور استدلالی ہیں۔ کیسا ہی نازک جزیہ یا اہم مسئلہ ہو اس کا جواب اس قدر متانت اور شائستگی کے ساتھ مختصر اور جچے تلے مناسب الفاظ میں تحریر فرماتے تھے کہ پڑھنے والا آپ کے تبحر علمی، فقہی دسترس اور علم و مطالعہ کی وسعت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہتا۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فقہی جزیات کے حفظ

واستحضار میں مفتی صاحب کا کوئی سہیم وشیل نہیں تھا اسی بناء پر حضرت مفتی صاحب جب کسی مسئلہ کے بارے میں یہ فرمادیتے کہ "مجھے مصرح طور پر یہ جزیہ نہیں ملا" تو اہل علم باور کر لیتے تھے کہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ یہ جزیہ مذکور نہیں ہے۔ بایں ہمہ شرعی ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ جس مسئلہ کے متعلق پوری تحقیق مستحضر نہ ہوتی صاف فرمادیتے کہ "مجھے اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق نہیں ہے" اگرچہ اس کا اتفاق کم ہی ہوتا۔

بیعت وارادت:۔ حضرت فقیہہ الامت کو بیعت و ارادت کا تعلق حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری سے تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک سلسلۂ گفتگو میں خود فرمایا کہ "حضرت شیخ سے میری بیعت ۴۹ھ کی ہے" حضرت مفتی صاحب نے جب بیعت کی درخواست حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں پیش کی تو فرمایا کہ "تم کو حضرت مدنیؒ سے بیعت ہونا چاہئے اور اس میں کوئی اشکال ہو تو کہو، میں جواب دونگا۔" مفتی صاحب نے عرض کیا؛ حضرت! سنا ہے کہ طبعی طور پر رغبت ورجحان جدھر ہو وہاں سے فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت مدنیؒ کی زندگی مجاہدانہ زندگی ہے اور اتنا زبردست مجاہدہ میرے بس کا نہیں ہے۔" اور باوجود اصرار کے کئی مہینے تک حضرت شیخ نے بیعت نہیں فرمایا اور مزید اصرار پر استخارہ مسنونہ کا حکم دیا اور پھر اس کے بعد بیعت فرمالیا۔

اجازت وخلافت:۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں حضرت شیخ کی جانب سے اجازت وخلافت کی تفصیل خود بیان فرمائی ہے جسے حضرت مفتی صاحب ہی کے الفاظ میں درج کیا جارہا ہے۔ فرمایا:

"اجازت کو میں ابھی تک سمجھا ہی نہیں۔ صورت یہ پیش آئی کہ گنگوہ میں ایک عورت تھی اور اس کے بڑے اوراد و وظائف تھے۔ میں جب گنگوہ گیا تو انھوں نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ میرے پیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ تم مجھے مرید کرلو میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا میں کیسے مرید کردوں میری نیت یہ تھی کہ حضرت مدنیؒ جب گنگوہ تشریف لائیں گے تو حضرت مدنی سے بیعت کرادونگا حضرت تھانویؒ اپنے علاج کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ شیخ ان کی عیادت کے لئے جارہے تھے میں ان کے ساتھ پیدل ہی سہارنپور سے جارہا تھا۔ اس زمانہ میں گاڑی واڑی کا دستور نہیں تھا۔ ان سے میں نے اس وقت عرض کیا کہ گنگوہ میں ایک عورت ہے اور اس

طرح سے ہے ابھی میں پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا کہ شیخ نے فرمایا کہ وہ اگر تم سے مرید ہونا چاہے تو مرید کرلو۔" میں نے کہا حضرت مجھ سے کیا مرید ہوتی اور میں کیا مرید کرتا؟ میری نیت تو یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کے آنے کی کوئی تاریخ ہو تو میں ان کو اطلاع کرادوں کہ فلاں دن حضرت مدنیؒ آئیں گے ان سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت نے فرمایا:

شرمانے کی بات نہیں وہ اتنے اوراد و ظائف پڑھتی ہیں ان کے اتنے احوال ہیں اور اب تک اپنے کو کسی کے حوالے نہیں کیا۔ جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے پوچھنا۔ یہ میری اجازت ہے۔

میں کچھ نہیں سمجھا کہ واقعی اجازت ہے، میں یہ سمجھا کہ یہ تفریحی فقرہ ہے۔ پھر میں جب کانپور چلا گیا تو بہت دن بعد حضرت شیخ نے خط لکھا کہ "خبر نہیں تم سے کوئی مرید ہوا یا نہیں، کوئی بیعت ہونا چاہے تو اسے بیعت کرلیا کیجئے۔" میں نے جواب میں لکھا کہ حضرت! بعض لوگوں نے ناواقفیت کے تحت مجھ سے بیعت ہونا چاہا لیکن میں نے ان کو مشورہ دیا کہ فلاں فلاں بزرگ سے ہونا کسی نے اصرار کیا تو میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے اجازت نہیں ہے۔" حضرت شیخ نے لکھا کہ "شاید تمہیں یاد نہیں رہا جب حضرت تھانویؒ علاج کے لئے آئے ہوئے تھے اس وقت اجازت اور اس پر اشکال سب رفع کرچکا ہوں۔ مشورہ تو دوسروں سے بیعت کا دینا چاہئے اور یہ اچھی بات ہے لیکن دوسرے کے کہنے پر اس کی بات مان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کے خلفاء میں مفتی صاحب کا مقام و مرتبہ:۔

حضرت مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ تک حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور اپنے پیر مرشد حضرت شیخ الحدیث قدس اللہ اسرارہما کی خدمت و صحبت میں رہ کر بہت زیادہ ریاضت و مجاہدہ اور ذکر واذکار کیا چنانچہ ایک مجلس میں حضرت شیخ نے فرمایا کہ "میں نے مفتی محمود حسن کو چالیس سال تک رگڑا تب کہیں جاکر خلافت واجازت دی۔"

مولانا منور حسینؒ صاحب حضرت شیخ کے خلفاء میں خصوصی مقام و مرتبہ کے حامل مانے جاتے ہیں ان کا اپنا بیان ہے، ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالجبار اعظمی صاحب حضرت کی مجلس میں حاضر تھے ناکارہ کی موجودگی میں بعض بزرگوں کے خلفاء کے

اختلاف کا تذکرہ آیا تو فرمایا کہ "تم لوگ مل جل کر کام کرتے رہو گے اختلاف پیدا نہیں کرو گے۔"

اس مجلس سے اٹھنے کے بعد میں نے مولانا عبدالجبار صاحب سے کہا: میں نے تو مفتی صاحب کو اپنا بڑا بھائی اور امیر تسلیم کرلیا ہے۔ انشاء اللہ ان کی رائے کے خلاف نہیں کروں گا۔ مولانا عبدالجبار صاحب نے بھی غالبًا فرمایا کہ میں نے بھی انھیں امیر تسلیم کرلیا ہے۔ انشاء اللہ انکے خلاف نہیں کرونگا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا منور حسین اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کا حضرت شیخ الحدیث کے خلفاء میں کیا مقام و مرتبہ تھا؟ اور خود حضرت شیخ الحدیث قدس اللہ اسرارہ کی نظر میں ان کی کیا اہمیت تھی۔ جب ایسے بااختصاص بزرگ حضرت مفتی صاحب کو اپنا امیر قرار دیتے ہیں تو پھر دوسرے خلفاء کے نزدیک حضرت مفتی صاحب کی کیا قدر و منزلت رہی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں

اوصاف و کمالات:۔ حضرت فقیہ الامت وسعتِ نظر، کثرت مطالعہ، قوت حفظ میں معاصر ارباب علم میں ممتاز تھے۔ علوم فقہ کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم حدیث کے ماہر، ادب میں بلندپایہ، شعر و سخن سے بہرہ مند، زہد و تقویٰ میں کامل اور سیر چشمی و فیاضی میں سلف کے نمونہ تھے۔

کسی فقہی و علمی سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی اور زیر لب مسکراہٹ سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہو گئے ہیں۔ اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کرچکا ہوتا ہے اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دیکر خوش ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب بالعموم سوالات کے الزامی جواب دیکر سائل کے شوق و طلب کا امتحان لیتے جب طلب صادق پاتے تو پھر مسئلہ کا تحقیقی جواب دیتے۔ جو اسقدر قریب الفہم، مرتب اور بقدر ضرورت مختصر ہوتا کہ سائل اس سے اطمینان کی حلاوت محسوس کرتا اور اس کا ذہن روشن ہو جاتا۔

حضرت مفتی صاحب کی مجلسوں میں بیٹھنے والا عام طور پر یہ تاثر لیکر اٹھتا کہ وہ معلومات

بالخصوص فقہ و حدیث اور اکابر و اسلاف کے واقعات و ملفوظات کے بحر بیکراں اور حافظہ کے بادشاہ ہیں۔ اور طبقۂ علماء میں ایسا متواضع، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار اور حاضر جواب شخصیت کا مالک ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔

حضرت مفتی صاحب ایک عرصہ سے مختلف تکلیف دہ امراض کی مشقتیں جھیلتے رہے مگر اس مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منہ سے نہیں نکلی۔ کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحہ کے لئے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور مرتے دم تک علم و معرفت، احسان و سلوک اور رشد و اصلاح کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند کیا اور اخلاص و احسان کی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

زندگی کے آخری لمحات اور مرض وفات :۔ حضرت مفتی صاحب کے متوسلین و مریدین یوں تو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں علاوہ ازیں یورپ اور افریقہ میں بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متوسلین کی خواہش اور پیہم اصرار پر ۲۰ر اپریل ۱۹۹۶ء کو اپنے خادم خاص مولانا محمد ابراہیم افریقی کی معیت میں وہاں کے لئے روانہ ہوئے۔ ابتداً طبیعت ٹھیک رہی۔ اور حسب معمول طویل علمی و اصلاحی مجالس بھی ہوتی رہیں۔ وعظ و تذکیر اور مجالس ذکر کا سلسلہ بھی جاری رہا قرب و جوار اور دور و دراز کے اسفار بھی کئے جن میں ارباب مدارس اور متعلقین و متوسلین سے ملاقاتیں بھی ہوئیں اور اجتماعات میں خطاب بھی فرماتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کو مثانہ کی نالی میں غدود کی شکایت عرصہ سے تھی۔ جو اس سفر میں تکلیف دہ حد تک بڑھ گئی اور یہ غدود بڑھ کر مثانہ تک پھیل گیا۔ جس کا آپریشن ہوا اور ہر ہفتہ اس کی صفائی بھی ہوتی رہی۔ آخری صفائی سے پہلے ڈربن کا سفر پیش آیا ارادہ یہ تھا کہ ادھر سے فارغ ہو کر مجوزہ پروگرام کے مطابق ہراری، ملاوی، چپاٹا اور ری یونین ہوتے ہوئے عمرہ و زیارت کے لئے حرمین شریفین کی حاضری کے بعد ہندوستان کو واپسی ہو جائے۔ لیکن ڈربن کے سفر کے دوران کھانسی شروع ہو گئی اور فالج کا اثر بھی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے غذا اور پانی سانس کی نالی سے پھیپھڑہ میں جانے لگا جس کی بذریعہ آلہ صفائی ہوتی رہی اس دوران مرض میں کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی اضافہ بالآخر ۱۲ر ربیع الثانی۔ ۲۸ر اگست کو شب طبیعت زیادہ

خراب ہو گئی اور ناچار آپ کو جوہانسبرگ کے پارک لین ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ اور خاص نگرانی کے شعبہ میں رکھا گیا۔ علاج سے قدرے افاقہ محسوس ہو تے لگا تھا کہ اچانک ۱۹ر ربیع الثانی ۔ ۲ر ستمبر کی شام کو ضعف غیر معمولی طور پر بڑھ گیا اور ساڑھے سات بجے فضل وکمال کا یہ پیکر، حسنِ اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا، دینداری و پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع وانکساری کا یہ سراپا، استقلال واستقامت کا یہ مجسمہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا۔

جانے والے جا! رحمت الٰہی تیری منتظر اور مغفرتِ خداوندی تیرے لئے چشم براہ ہو گی!

سوگواروں کے ہجوم میں ہسپتال سے جسد عنصری کو باہر لایا گیا۔ نیو ٹاؤن کے مدرسہ میں غسل وکفن سے فراغت کے بعد خادم خاص مولانا محمد ابراہیم صاحب کے نئے مکان میں میت رکھ دی گئی۔ وفات حسرت آیات کی خبر سنتے ہی علماء و فضلا اور متعلقین و متوسلین کا دریا امنڈ پڑا۔ افریقہ کی قانونی مجبوری سے شب میں تدفین نہیں ہو سکی اس لئے دوسرے دن ساڑھے ۹ بجے جنازہ گھر سے روانہ ہوا۔ قبرستان تقریباً ۵ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا گھر سے قبرستان تک گاڑیوں کی قطاریں تھیں اندازہ کے مطابق دس ہزار کا مجمع شریک جنازہ ہوا۔ جو جنوبی افریقہ کے لئے ایک تاریخی مجمع تھا۔ جنازہ کی نماز مولانا محمد ابراہیم خادم خاص کے مشورہ سے مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی خلیفہ حضرت مفتی صاحب نے پڑھائی اور ساڑھے دس بجے ہلسبرگ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے اس خزانۂ خوبی کو دفن کردیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور فقیہ الامت :۔ ۲ر ستمبر ہی کو شب میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے بذریعہ فون اس حادثۂ عظیم کی خبر دارالعلوم میں پہنچ گئی اسی وقت دارالعلوم کے مائک سے اعلان ہوا جس کے سنتے ہی جو شخص جہاں تھا فرطِ غم سے ششدر و حیران ہو کر رہ گیا صبح کو دعائے مغفرت و ایصال ثواب کا نظم کیا گیا جس کا سلسلہ شام تک جاری رہا اسی دوران حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ استاذ حدیث دارالعلوم نے حضرت مفتی صاحب کے اوصاف وکمالات کا مجمع کے سامنے تذکرہ بھی کیا لیکن غم سے نڈھال ان دونوں حضرات پر رقت طاری ہو گئی جس وجہ سے دونوں حضرات کو مجبوراً اپنی تقریر مختصر کردینی پڑی۔

دارالعلوم دیوبند کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ابتدائے قیام سے یہاں علم وذکر دونوں

شعبوں پر برابر توجہ دی جاتی رہی ہے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے دور تک بغیر کسی انقطاع واضمحلال کے یہ بابرکت سلسلہ جاری وساری رہا حضرت شیخ مدنی قدس سرہ کی رحلت کے بعد اس میں اضمحلال وفتور آگیا لیکن حضرت مفتی صاحب کے یہاں آجانے کے بعد یہ مبارک سلسلہ پھر شروع ہوگیا تھا اور ان کی قیام گاہ مسجد چھتہ ایک مستقل خانقاہ بن گئی تھی اور ادھر دس پندرہ سالوں سے حضرت مفتی صاحب کی جانب لوگوں کا رجوع اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مسجد چھتہ ذکر خداوندی سے ہمہ وقت گونجتی رہتی تھی اور حضرت مفتی صاحب کے دم قدم سے دارالعلوم کی مضمحل خصوصیت میں پھر سے نکھار آگیا تھا اس لئے حضرت مفتی صاحب کی وفات بطور خاص دارالعلوم دیوبند کے لئے ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی بظاہر مشکل نظر آتی ہے۔

آثار وباقیات:۔ حضرت مفتی صاحب نے نہ کوئی اپنا ذاتی مکان چھوڑا نہ جائیداد چھوڑی اور نہ دنیا کا کوئی سازوسامان اور نہ کوئی پس ماندہ رقم، وفات سے کچھ یوم پہلے اپنے خادم مولانا محمد ابراہیم سے فرمایا کہ میرے جیب میں کچھ روپے پڑے ہیں جو میرے کفن کے لئے ہیں یہ ہے فقیرانہ بے نیازی اور زہد کی انتہا کہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کفن تک کا بوجھ کسی پر ڈالنا گوارا نہیں۔ متاعِ دنیا سے یہ تہی دامنی خود اختیاری تھی کیونکہ مفتی صاحب پر اللہ نے فتوحات کے دروازے چوپٹ کھول دئے تھے لیکن جو کچھ آتا تھا اسے ضرورت مند طالبان علم، مدارس، اور اہل حاجت پر صرف کردیا کرتے تھے نہ جانے کتنے مدارس، طلبۂ علم، اور واردین وصادرین ان کی فیاضیوں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے حضرت مفتی صاحب کے باقیات میں دنیا کی کسی چیز کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ علم ودین کے آثار وباقیات سے آپ کی کتاب زندگی معمور ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے تلامذہ ہند وبیرون ہند میں پھیلے ہیں اور اپنی اپنی جگہوں پر دینی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ پھر لاکھوں سے متجاوز متوسلین ومتعلقین ہیں جن میں سیکڑوں تکمیل سلوک کے بعد خلافت واجازت سے آراستہ ہو کر ملک اور ملک کے باہر رشد وہدایت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان کے علاوہ آپ کے علمی آثار میں آپ کی دو درجن سے زائد تصانیف ہیں جن میں فتاویٰ محمودیہ اپنی نوعیت کا ایک تاریخی وشالی کام ہے اس کی اب تک اٹھارہ جلدیں شائع ہوچکی

ہیں جو آٹھ ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل ہیں باقی جلدیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں میرے محدود علم کے مطابق اردو زبان میں فقہ و فتاویٰ کا اس قدر ضخیم کوئی دوسرا مجموعہ نہیں ہے۔
(۲) مواعظ فقیہہ الامت (۹ جلدیں) (۳) ملفوظات (۱۰ جلدیں) (۴) مکتوبات (۳ جلدیں) (۵) وصف شیخ جس میں اپنے شیخ و مرشد حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری کے اوصاف و کمالات کو منظوم فرمایا ہے۔ (۶) وصفِ محبوب، (۷) حدود اختلاف، (۸) ارمغانِ اہل دل، (۹) اسباب غضب، (۱۰) اسباب لعنت، (۱۱) اسباب مصائب اور ان کا علاج، (۱۲) حب رسول اور مسلک علماء دیوبند، (۱۳) حقیقت حج، (۱۴) سرکاری سودی قرض، (۱۵) رفع یدین، (۱۶) آسان فرائض، (۱۷) شاہد قدرت، (۱۸) معمولات یومیہ اور شجرہ، (۱۹) خلاصۂ تصوف، (۲۰) احسان سلوک، (۲۱) افریقہ اور خدمات فقیہہ الامت، (۲۲) شوریٰ اور اہتمام، (۲۳) گلدستۂ سلام، (۲۴) مسئلہ تقلید اور جماعت اسلامی، (۲۵) حواشی بہشتی گوہر، (۲۶) مسئلہ تنقید اور جماعت اسلامی، (۲۷) ثمرۂ توحید، (۲۸) حقوق مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

حضرت فقیہ الامت کا یہی ان کے تلامذہ، مریدین و خلفاء اور ان کی تصانیف پس ماندہ اثاثہ اور ان کی یادگار ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ان کی یادگار ان کے حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کی یاد ہے۔ مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہوتا ہے مگر حضرت فقیہ الامت کا مزار ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کے دل ہیں

بعد از وفات تربت من از زمیں مجو   در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے اور رحمت و غفران کی ان پر بارش برسائے اور علم و اہل علم کی جانب سے ان کو بہترین جزاء سے نوازے۔ آمین

اختر امام عادل
استاذ دارالعلوم حیدر آباد
و مدیر ماہنامہ حسامی حیدر آباد

عالمی نبوت کی عالمی شان

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

سیرت نبوی پر بہت کچھ لکھا گیا، ہر زبان میں لکھا گیا، مختلف انداز میں لکھا گیا۔ چودہ سو سال سے یہ سلسلہ جاری ہے اور اس قوت سے جاری ہے کہ کسی اور موضوع پر لکھنے والوں نے اتنا نہیں لکھا، اور نہ پڑھنے والوں نے پڑھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سیرت نبوی کا حق ادا ہو گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ سامنے آگیا۔ اگلوں سے لیکر پچھلوں تک کی تمام تحریرات کو یکجا کیا جائے تو جہاں بہت سی باتیں ہم کو مکرر معلوم ہونگی وہیں بہت سے بیش قیمت اضافے بھی ملیں گے، ہر نیادور سیرت نبوی کا کوئی نیا پہلو سامنے لاتا ہے اور ہر انسانی عہد مطالعہ سیرت کو ایک نیا رخ دیتا ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، سیرت نبوی معارف و عجائب کا ایسا خزینہ ہے کہ ہر روز ایک نئی چیز دریافت ہوتی ہے۔ اور دنیا کی تمدنی ترقیات و ایجادات کے ساتھ ساتھ حیاتِ نبوی کا ایک ایک پہلو روشن ہوتا جاتا ہے۔

بین الاقوامی پیغمبر

اس سے آپ کی بین الاقوامیت اور آفاقیت کا ثبوت ملتا ہے، آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر آئے، آپ تو سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں، مگر ان انبیاء کی سیرتوں، اور تعلیمات میں محدودیت ہے، الگ الگ خطوں اور قبیلوں کے لئے الگ الگ پیغمبر آئے بعض مرتبہ تو ایسا

بھی ہوا کہ ایک ساتھ کئی پیغمبروں نے ملکر تبلیغ رسالت کا کام کیا، سب محدود وقتوں کے لئے آئے، محدود احکام و نظریات لیکر آئے۔ گذشتہ پیغمبروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کی تعلیمات اس کے عہد کے بعد بھی پوری طرح زندہ رہی ہو، جو اپنے خطہ کے علاوہ دوسرے خطوں کے انسانوں کے لئے بھی مشعل راہ بنا ہو اور جس کی سیرت میں ایسی جامعیت اور ایسی رنگارنگی ہو کہ کوئی دور اور کوئی علاقہ اس سے بے نیاز نہ ہو۔ یہ خصوصیت حاصل ہے تو صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، یہود و نصاریٰ اپنے مذہبی نظریات کو لے کر زندہ ہیں مگر خود وہ نظریات نہ زندہ ہیں نہ محفوظ، نہ کامل ہیں نہ جامع، جن لوگوں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے سوا کسی بھی مذہب میں موجودہ دور کے تمام تقاضوں کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

حضورؐ کی آفاقیت نظامِ فطرت کی روشنی میں

غور کرنے سے ایسا لگتا ہے کہ گویا نبوت ایک چھوٹے سے نقطے سے شروع ہوئی اور عہد بہ عہد انسانی عروج اور تمدنی ضروریات کے لحاظ سے پھیلتی چلی گئی، اور یہ پھیلاؤ بڑھتے بڑھتے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر تمام ہو گیا اور ایسا ہونا فطری تھا۔ اس لئے کہ رسول خدا کی طرف سے آتا ہے جو رب العلمین ہے، سارے جہاں کا پروردگار ہے، جس کی نعمتیں ہر ایک کے لئے عام ہیں، جو محدود نہیں لامحدود ہیں، جس کی ذات ہماری سوچ و فکر سے بھی بالاتر ہے، وہ کسی خاص خطہ یا قبیلہ و قوم کا پروردگار نہیں۔ وہ سارے جہان کا پالنہار ہے۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ اس کی طرف سے کوئی ایسا رسول بھی آئے جو کسی خاص خطہ یا قوم تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ساری انسانیت کا پیغمبر ہو۔ وہ اگر رب العلمین ہے تو اس کا رسول رحمت اللعالمین ہو۔ خدا تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا تو اس کی ضرورتوں کے سامان بھی پیدا کئے۔ ہر دور اور ہر علاقہ میں جیسی ضرورت تھی اس کے مطابق سامان پیدا کئے۔ عام ضروریات کی چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے بعض چیزیں محدود طور پر پیدا کیں تو بعض غیر محدود طور پر، انسان کو فرش کی ضرورت تھی تو اللہ نے ایک طرف ہر انسان کو الگ الگ مخصوص فرش دیئے جو وہ اپنے گھر میں استعمال کرتا ہے۔ تو دوسری طرف ایک ایسا وسیع فرش

زمین بھی ان کے لئے پیدا کیا جو تمام انسانوں کے لئے عام ہے، اس میں کسی خطہ وقبیلہ کی تمیز نہیں۔ انسانوں کے تمام چھوٹے چھوٹے فرش اسی فرش زمین پر بچھے ہوئے ہیں، اگر یہ فرش عام نہ ہو تو چھوٹے چھوٹے فرشوں کے بچھنے کی بھی کوئی جگہ نہ ہو قرآن نے کہا:

واللہ جعل لکم الارض بساطا (سورہ نوح: ۱۹)

اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کا بچھونا بنادیا

والارض فرشنٰہا فنعم الماھدون (ذاریات: ۴۸)

اور زمین کو ہم نے فرش بنایا پس کتنا اچھا بچھایا

اسی طرح انسان کو چھت اور مکان کی ضرورت تھی جس کے سائے میں وہ اپنی زندگی کے شب وروز بسر کرے، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں بھی اپنی اسی سنت پر عمل کیا کہ ایک طرف ہر انسان کو الگ الگ مکان اور چھت دیئے جس میں وہ اپنے خاندانوں اور اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہے تو وہیں پروردگار نے آسمان کی وسیع پھیلی ہوئی چھت پیدا کی، جس میں کسی قبیلہ وقوم اور رنگ ونسل کی تمیز نہیں۔ اس کا سایہ سارے انسانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر دنیا کا یہ بڑا مکان اور آسمان کی پھیلی ہوئی چھت نہ ہو تو روئے زمین پر بنے ہوئے ہمارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا بھی کہیں ٹھکانہ نہ ہو۔

والسماء بنینٰہا باید وانا لموسعون (ذاریات: ۴۷)

اور آسمان کی عمارت ہم نے ہاتھ سے بنائی اور ہم ہی اس کو وسعت دینے والے ہیں۔

والسقف المرفوع (طور: ۵) اور بلند چھت (آسمان) کی قسم۔

انسان کو پانی کی ضرورت تھی، جس کو وہ خود پئے۔ اپنے جانوروں کو پلائے۔ اپنی کھیتیاں سیراب کرے اور اپنی دیگر ضروریات پوری کرے۔ اللہ نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک طرف مختلف خطوں میں محدود طور پر ندی، نالے اور تالاب پیدا کئے۔ جس کے پانی سے علاقہ علاقہ کے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف انسان کی عمومی ضرورت کی تکمیل کے لئے ابر باراں اور بحر بیکراں کا بھی انتظام کیا۔ جس پر کسی ایک قوم یا خطہ کی اجارہ داری نہیں۔ ان کی فیاضی ساری دنیا کے لئے عام ہے وہ نہ کسی رنگ ونسل کو دیکھتے ہیں۔ اور نہ علاقہ وقوم کو وہ روئے زمین کے ہر خطے پر برستے اور بہتے ہیں۔ جس کا جی چاہے فائدہ اٹھائے اور

جس کا جی چاہے چھوڑدے۔

وانزلنامن السماءماءطھورا (فرقان : ۴۸)

اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا

والبحرالمسجور (طور : ٦)　　　　اور دریائے شور کی قسم جو لبریز ہے۔

اسی طرح انسان کو روشنی کی ضرورت تھی، تاکہ روئے زمین پر وہ چلے پھرے۔ مناظر قدرت کو دیکھے اور محظوظ ہو۔ اس کے لئے خدا نے ہر علاقہ کے لحاظ سے الگ الگ چراغ، مشعلیں اور برقی قمقمے پیدا کئے۔ جن سے انسان محدود طور پر روشنی حاصل کرتا ہے۔ وہیں خالق کائنات نے وسیع سطح پر دن کے لئے سورج اور رات کے لئے چاند کو پیدا کیا، جس کی فیاضی نور کسی ایک خطہ و قوم کے لئے محدود نہیں۔ بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے عام ہے۔

وجعل القمرفیھن نورا وجعل الشمس سراجاً (نوح : ١٦)

اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا۔ جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ روشن مشعل ہے۔

اسی طرح اگر انسان کی تمام ضروریات کا جائزہ لیا جائے تو ہم کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والے سامان دو سطحوں پر نظر آئیں گے۔ ایک خاص اور محدود سطح پر، دوسرے عام اور غیر محدود سطح پر اور خدا کی یہ سنت صرف مادی اور دنیاوی ضروریات کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ دینی اور روحانی ضروریات کے باب میں بھی یہی دستور الٰہی جاری ہے، ہدایت اور رہنمائی انسان کی دینی و روحانی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل رب العالمین نے رسالت کے ذریعہ فرمائی۔ اور اس کے لئے ایک طرف مختلف خطوں اور قوموں کے لحاظ سے الگ الگ پیغمبر بھیجے، جن سے مختلف قوموں اور قبائل نے الگ الگ استفادہ کیا۔ اور دینی رہنمائی حاصل کی تو دوسری طرف سنت الٰہی کے مطابق ضرورت تھی کہ کوئی ایسا رسول بھی دنیا میں مبعوث ہو جو جغرافیائی، لونی، نسلی تمام حدود سے بالاتر ہو کر ساری انسانیت کا پیغمبر ہو۔ اور تمام انس و جن کی عمومی ہدایت کے لئے کافی ہو۔

چنانچہ اسی ضرورت کی تکمیل رب العلمین نے رحمت اللعالمین کی شکل میں فرمائی۔ آپ

کو تمام انس و جن کا پیغمبر بنایا اور رنگ و نسل اور علاقائیت و قومیت کے تمام امتیازات و تعصبات کا خاتمہ فرمایا۔ آپ کسی ایک خطہ و قوم کے لئے نہیں آئے بلکہ قیامت تک کے لئے ساری دنیا کے ہادی و پیغمبر بن کر تشریف لائے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو چھوٹی چھوٹی نبوتوں کے چراغ بھی روشن نہ ہوتے۔

انسانیت سے پہلے پیغمبر انسانیت

اگر آپ ان چیزوں میں غور کریں جن کو اللہ تعالی نے انسانوں کی عمومی ضرورت کی تکمیل کے لئے وسیع تر سطح پر پیدا کیا تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق انسانی تخلیق سے قبل ہی کردی گئی تھی۔ آسمان ہو یا زمین آب و گل ہو یا شمس و قمر یہ تمام کے تمام انسان کی خلقت سے قبل ہی پیدا کردیے گئے تھے۔ اسی طرح اگر آپ دیکھیں تو نظر آئے گا کہ ہدایت و رسالت کے باب میں بھی یہی ہوا ہے۔

عن ابی هريرة قال قالوا يا رسول الله! متى وجبت لك النبوة قال و آدم بين الروح والجسد رواه الترمذی (مشکوۃ ص ۵۱۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ آپ کو نبوت کب ملی۔ تو فرمایا کہ اس وقت جب کہ حضرت آدم ابھی روح اور جسم کے درمیان ہی تھے (یعنی پوری طرح پیدا ابھی نہ ہوئے تھے)

حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انی عند الله مكتوب خاتم النبيين و ان آدم منجدل فی طينته رواه فی شرح السنة واحمد (مشکوۃ ۵۱۳)

میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھ دیا گیا تھا جبکہ آدم ابھی خلقت کے مرحلے ہی میں تھے انسانوں کی تخلیق سے قبل ہی ہادی عالم، رسول انسانیت، پیغمبر انس و جن کو پیدا کردیا گیا، اور اگرچہ بحیثیت بشر ابھی تک آپ وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لئے کہ ابھی ابوالبشر آدم ہی کا وجود نہیں ہوا تھا۔ مگر قالب بشری میں آنے سے قبل ہی آپ کو نبوت سے سرفراز

کردیا گیا اور انسان کی روحانی ضرورت کا سامان اس کی ضرورت سے قبل ہی کردیا گیا۔
اس طرح حضرت آدم کے بعد جن لوگوں کو نبوت و رسالت سے نوازا گیا وہ قومی پیغمبر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے ہی نبوت دی گئی۔ اس لئے آپ بین الاقوامی پیغمبر بن گئے۔

عالمی نبوت کی عالمی شان

خالق کائنات کی ربوبیت کامل تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کامل، خدائے بزرگ و برتر رب العلمین ہے تو اس کے محبوب پیغمبر رحمتہ اللعالمین ہیں۔ خدا تمام اقوام عالم کا پروردگار ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقوام عالم کے پیغمبر ہیں۔ رنگ و نسل کی تفریق، اور علاقہ و زبان کا امتیاز نہ وہاں نہ یہاں۔

خداتعالیٰ نے آپ کو رحمتہ اللعالمین کا خطاب دیا

وما ارسلناك الا رحمة اللعالمين (انبیاء : ۱۰۷)

اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر

اور رحمتہ اللعالمین نے قرآن کی زبان میں یہ اعلان فرمایا۔

یاایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقاکم (حجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا اور نسلوں اور قبیلوں میں تم کو اس لئے تقسیم کیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق کوئی ذریعہ امتیاز نہیں، امتیاز و شرف اسی کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہو۔

اسلام رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کی اہمیت خدائی نشانی کے طور پر تسلیم کرتا ہے مگر انہیں تفریق کی بنیاد نہیں بناتا۔

ومن آیاته اختلاف السنتکم والوانکم (سورہ روم : ۲۲)

تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

ان هذه امتکم امة واحدة و انا ربکم فاتقون (سورہ مومنون ۵۲)

بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور میں ایک ہی تمہارا پروردگار ہوں۔ پس مجھ سے ڈرو۔

خدا کے پیغام کو یوں تو سارے ہی نبیوں نے انسانوں تک پہونچایا، مگر محدود سطح پر، خدا نے جب چاہا کہ اپنا پیغام وسیع تر سطح سے سارے انسانوں تک پہونچایا جائے تو اس نے سید الانبیاءؑ، رحمۃ اللعالمین کا انتخاب فرمایا۔

اس طرح اگر ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور خالق کائنات سے آپ کی نسبت کے جس پہلو پر بھی نگاہ ڈالیں ہم کو کمال ہی کمال نظر آئے گا۔ اور تمام انبیاء کے درمیان آپ کا خصوصی امتیاز سمجھ میں آئے گا۔ اس کی ایک دو مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے۔

عبد و معبود کا کمال

اللہ تعالیٰ رب الارباب (تمام مالکوں کا مالک) ہے۔ اس سے بڑا کوئی مالک نہیں، کوئی پروردگار نہیں، کوئی شہنشاہ نہیں، کوئی حاکم نہیں وہ احکم الحاکمین ہے۔ حکومت، ربوبیت، خالقیت اور بادشاہت کا آخری سے آخری درجہ اُسی خدائے بزرگ و برتیر کے پاس ہے کوئی اس سے اوپر نہیں، کوئی اس کا سا بھی نہیں۔ دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے تو وہ "عبد کامل" (پورے بندے) ہیں، یہاں عبدیت کی جو آخری سے آخری سطح ہو سکتی ہے وہ پائی جاتی ہے یوں تو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا، اور سب کو اپنا بندہ و غلام قرار دیا، مگر ان تمام بندوں میں بندگی کی صفات اور خدا کی غلامی میں جو ذات گرامی سب سے آگے گئی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، بندگی اور عبدیت کا سب سے زیادہ اور خالص مظاہرہ جس نے کیا وہ حضورؐ ہیں اس طرح خدائے تعالیٰ معبود کامل، تو حضور عبد کامل، خدا کی ربوبیت اور حاکمیت کامل، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں تو حضور کی عبدیت اور بندگی بھی کامل، اس میں آپ کا کوئی شریک نہیں، آپ خدا کے خالص بندے تھے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر نام لئے جس ذات گرامی کو قرآن نے عبد (بندہ) کہکر پکارا ہے وہ حضورؐ کی ذات گرامی ہے، یوں تو دیگر انبیاء کو بھی قرآن میں عبد (بندہ) کہا گیا ہے، مگر ساتھ ہی ان کا نام بھی لے لیا گیا ہے۔

سورہ مریم میں حضرت زکریا کے لئے فرمایا:

ذكر رحمة ربك عبده زكريا (مریم : ۲)
یہ تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے بندہ زکریا پر۔
سورۂ ص میں کہا۔
واذكر عبدنا داؤد (ص : ۱۷) اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کیجئے،
ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا۔
واذكر عبدنا ايوب (ص : ۴۱) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجئے۔

اس کے بالمقابل پورا قرآن دیکھ جایئے، ہمارے حضور کو جہاں عبد کہا گیا ہے وہاں آپ کا نام لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی، خدا نے جب "اپنا بندہ" کہکر یاد کیا تو اس سے مراد بندگی کے فرد کامل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوئے، آپ کی عبدیت اس درجہ ہے کہ بندہ کہتے ہی ذہن آپ کی طرف جاتا ہے، کوئی نہیں جو اس کامل بندگی میں آپ کا شریک ہو، اسی لئے خدا آپ کو بڑے پیار و محبت کے ساتھ اپنا بندہ کہکر یاد کرتا ہے۔

سبحن الذى اسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام الى المسجد الاقصى
(بنی اسرائیل : ۱)
کیا ہی پاک ہے وہ خداوند قدوس جس نے ایک رات اپنے عبد کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔

سورہ "جن" میں فرمایا :
وانه لما قام عبد الله يدعوه كادوا يكونون عليه لبدا (سورہ جن : ۱۹)
اور جب اللہ کا بندہ (عبد) تبلیغ حق کے لئے کھڑا ہوتا ہے تاکہ اللہ کو پکارے تو کفار اس کو اسطرح گھیر لیتے ہیں گویا قریب ہے کہ اس پر آگریں گے۔

سورۂ کہف کا آغاز اس آیت سے کیا۔
الحمد لله الذى انزل على عبده الكتاب (سورۂ کہف : ۱)
تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری۔

سورۂ فرقان کی پہلی آیت ہے۔
تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا (سورہ فرقان : ۱)

کیا ہی پاک ذات ہے اسکی جس نے "الفرقان" اپنے بندہ پر اتارا تاکہ وہ تمام عالم کی ضلالتوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔

سورہ نجم میں ہے:

فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحی (سورہ نجم: ۱۰)

پھر اس نے اپنے بندہ کو وحی کی جو وحی کرتا تھا

سورہ حدید میں ارشاد ہوا۔

ینزل علی عبدہ آیات (سورہ حدید: ۹) وہ اپنے بندہ پر آیتیں اتارتا ہے۔

حضورؐ کا مقام محمود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن مقامات بلند پر فائز تھے۔ ان میں اہم ترین مقام "مقام محمود" ہے قرآن مجید میں اس تعلق سے ایک آیت آئی ہے ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لك عسیٰ ان یبعثك ربك مقاما محمودا (بنی اسرائیل: ۷۹) اور (اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پہر شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے قریب ہے اللہ تجھے ایسے مقام پہونچادے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔

مقام محمود عامی اور دائمی ستائش کا مقام ہے، جہاں پہونچکر انسان روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جاتا ہے، کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو، لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی، ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی، ــ یہ انسانی عظمت کی سب سے آخری منزل ہے۔ اس سے زیادہ بلند مقام انسان کو نہیں مل سکتا، بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم:

"یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے، اس سے زیادہ اونچی جگہ اولاد آدم کو نہیں مل سکتی، اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، انسان کی سعی وہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جاسکتی ہے، لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے، سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد وملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں، اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و

ممدوح بناویتیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، محمودیت اسے ہی حاصل ہو سکتی ہے جس میں حسن و کمال ہو کیونکہ روحیں حسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستائش میں کھل سکتی ہیں۔ لیکن حسن و کمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔" (رسول رحمت ۱۵۷)

یہ آیت کریمہ اس وقت اتری جب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے آخری سال گذر رہے تھے، آپ کی مظلومی و بے کسی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ دشمنانِ اسلام کا ظلم و ستم روز بروز بڑھتا جارہا تھا، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسی مظلومی و بے سر و سامانی سے کیسی فتح عظیم بر آمد ہونے والی ہے، اور اس شکست خوردہ اور مظلوم انسان کو کیسا بلند مقام ملنے والا ہے۔ مکہ والوں نے آپ کو ستایا، پریشان کیا یہاں تک کہ آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو اپنا وطن تک چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن خدا فیصلہ کر چکا تھا کہ آپ کو اس عظیم منصب سے نوازے گا۔ جو اس نے کسی دوسرے انسان کو نہیں دیا، آج لوگ ان کو برا بھلا کہہ رہے ہیں ایک وقت آئیگا کہ ساری دنیا انکی تعریف کرے گی، اور نام "محمد" کی شان کا ظہور ہوگا ان کو مقام محمود دیا جائیگا، جس کی بدولت دنیا میں بھی ان گنت لوگ ان کی مدحت کے ترانے گائیں گے ہزاروں لاکھوں اربوں دلوں میں ان کا احترام ہوگا، اور آخرت میں بھی وہ سب سے اونچا، سب سے پسندیدہ، رب کا محبوب، سب کی نگاہوں کا مرکز، اور محبتوں اور عقیدتوں کا محور ہوگا، ہر طرف خدا کے بعد اسی کا جلوہ ہوگا— ووضعنا عنك وزرك ○ الذی انقض ظهرك○ورفعنالك ذكرك (الم نشرح : ۲-۳-۴)

اور (اے نبی!) ہم نے آپ کا وہ بوجھ اتار کر پھینک دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کا چرچا اتنا اٹھایا کہ ہر طرف اس کو عام کر دیا۔ (دنیا ہو یا آخرت)

پھر انہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن کو مقام محمود ملے گا، لواء الحمد سے بھی نوازا جائے گا۔ جس کی پناہ حاصل کرنے کیلئے ہر انس و جن ترسے گا، مگر اس کے سایے میں صرف ان لوگوں کو جگہ مل سکے گی جنہوں نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کیا ہوگا کہ وہ آپ کے ہیں، کسی اور کے نہیں۔

بالآخر اللہ نے آپ کو دنیا ہی میں وہ مقام محمود دیدیا (اور آخرت میں بھی دے گا) آج ہر

طرف ان ہی کا چرچا ہے، صرف منبروں، محرابوں اور میناروں سے نہیں، بلکہ کفر وشرک کے محلوں سے، جہل وضلالت کی درسگاہوں سے، الحاد و دہریت کی دانشگاہوں سے، تحقیق و تصنیف کے اداروں سے بلکہ ہر ذرۂ کائنات سے آپ کی مدح وتعریف کی صدائیں آرہی ہیں۔

ساری دنیا آپ کی مداح

اس کی تصدیق چاہتے ہو تو آپ ان اداروں اور دانشگاہوں میں جایئے جہاں کفر والحاد یا مادیت پر کام ہورہا ہے، ان کتابوں اور مضامین کو پڑھئے جن کے مصنفین مسلمان نہیں غیر مسلم ہیں۔ ان بیانات اور تقاریر کو سنئے جو کفر و دہریت کے سورماؤں کی زبانوں سے صادر ہوئی ہیں، آپ کو وہ سب کچھ نظر آجائے گا۔ جو بیان کیا گیا، یہاں تفصیل کا موقع نہیں، علماء نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان کو دیکھنا چاہئے۔ میں نمونے کے طور پر حضورؐ کے بارے میں چند ان محققین اور مؤرخین کے خیالات پیش کرتا ہوں جو نہ صرف یہ کہ غیر مسلم تھے، بلکہ غیر مسلموں میں ان کو اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا۔

۱۔ ڈاکٹر ڈی رائٹ

"محمدؐ اپنی ذات اور قوم کیلئے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کے لئے ابر رحمت تھے تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں، جس نے احکام خداوندی کو اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو۔" (اسلامک ریویو اینڈ مسلم انڈیا۔ فروری سنہ ۱۹۲۰ء)

۲۔ میجر آرتھر گلن لیونارڈ

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہایت عظیم المرتبت انسان تھے، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مفکر اور معمار تھے، انہوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے مقابلہ کی فکر نہیں کی اور جو تعمیر کی وہ صرف اپنے ہی زمانہ کے لئے نہیں کی بلکہ رہتی دنیا تک کے مسائل کو سوچا اور جو تعمیر کی وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے کی۔" (نقوش رسول نمبر ص ۷۴۴ ج ۴)

۳۔ ڈاکٹر جی ویل

"آپ کی (یعنی رسول کریم کی) خوش اخلاقی، فیاضی، رحمدلی

۴۔ مسٹر ایڈورڈ مونٹے

"آپ نے سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی تطہیر کے لئے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے وہ آپ کو انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے (حوالہ بالا)

۵۔ ڈاکٹر ای۔ اے فریمن

"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بڑے پکے اور سچے راست باز ریفارمر تھے" (معجزات اسلام ص ۶۷)

۶۔ ڈاکٹر لین پول

"اگر محمد سچے نبی نہ تھے تو کوئی نبی دنیا میں بر حق آیا ہی نہیں (ہسٹری آف دی مورش ایمپائر یورپ)

۷۔ مسز اینی بسنٹ

"پیغمبر اسلام کی زندگی زمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی ہے اور تاریخ روزگار شاہد ہے کہ وہ لوگ جو حضورؐ پر حملہ کرنے کے خوگر ہیں جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ حضورؐ کی زندگی سادگی، شجاعت اور شرافت کی تصویر تھی۔" (قاسم العلوم۔ ربیع الاول ۱۳۵۳)

۸۔ میجر آرتھر کلن مورنڈ

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا شبہ اپنے عہد مبارک میں ارواح طیبہ میں سے تھے، وہ صرف مقتدر راہنما ہی نہ تھے، بلکہ تخلیق دنیا سے اس وقت تک جتنے صادق سے صادق اور مخلص سے مخلص پیغمبر آئے، ان سب سے ممتاز رتبہ کے مالک تھے" (استقلال۔ دیوبند ۔ ۱۹۳۶ء)

۹۔ گاندھی جی

"وہ (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) روحانی پیشوا تھے، بلکہ ان کی تعلیمات کو سب سے

بہتر میں سمجھتا ہوں۔ کسی روحانی پیشوا نے خدا کی بادشاہت کا پیغام ایسا جامع اور مانع نہیں سنایا جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے "(رسالہ "ایمان" پٹی ضلع لاہور۔ اگست ۱۹۳۶ء)

۱۰۔ لالہ مہر چند لدھیانوی

"بانی اسلام کی ذات والا صفات سراپا رحم و شفقت تھی اگر بانی اسلام کے بس میں ہوتا تو سرزمین عرب میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پاتا، جو لڑائیاں ہوئیں، نہایت مجبوری کی حالت میں ہوئیں۔ (مدینہ۔ جولائی ۱۹۳۲ء)

۱۱۔ لالہ لاجپت رائے

"میں پیغمبر اسلام کو دنیا کے بڑے بڑے مہاپرشوں میں سمجھتا ہوں (رسالہ مولوی۔ رمضان ۱۳۵۲ھ)

۱۲۔ فراق گورکھپوری

"میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر اسلام کی بعثت کو، ان کی شخصیت اور ان کے کارنامہائے زندگی کو تاریخ کا ایک معجزہ سمجھتا ہوں" (پیشوا۔ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ)

۱۳۔ پیشوائے اعظم بدھ مذہب مانگ تونگ صاحب

"حضرت محمدؐ کا ظہور بنی نوع انسان پر خدا کی ایک رحمت تھا، لوگ کتنا ہی انکار کریں مگر آپ کی اصلاحات عظیمہ سے چشم پوشی ممکن نہیں، ہم بدھی لوگ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرتے ہیں ان کا احترام کرتے ہیں" (معجزات اسلام ص ۶۶)

۱۴۔ ڈاکٹر کلارک

"حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو ہی یہ خوبی ملی ہے کہ اس میں وہ تمام اچھی باتیں موجود ہیں جو دیگر مذاہب میں نہیں پائی جاتیں۔" (میزان التحقیق ص ۲۲)

۱۵۔ جارج برناڈشا

"موجودہ انسانی مصائب سے نجات ملنے کی واحد صورت یہی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم)اس دنیا کے رہنما بنیں"(نقوش رسول نمبر ص ۸۲ ۴/ ج ۴)

آخر وہ کون سی بات ہے ؟جس نے روئے زمین کے انسانوں کو حضور کا مداح اور ان گنت زبانوں کو ان کی ستائش کے لئے زمزمہ سنج بنادیا۔ یہ اسی مقام محمود کا فیض ہے جس پر آپ کے سوا کوئی نبی اور رسول فائز نہ ہوسکا، ہر طرف آپ ہی کی ستائش، ہر جانب آپ ہی کی مدح، کوئی ملک ہو، کوئی عہد ہو، کوئی قوم ہو، کوئی نسل ہو، سب کے سب آپ کے شیدا اور معترف، کوئی بھی سمجھدار انسان نہیں جس نے آپ کی تعریف کرنے سے انحراف کیا ہو، ہر دل کو آپ کا اعتراف، ہر زبان پر آپ کی تعریف۔ سبحان اللہ! کیا مقام محمود ہے؟ خالق و مخلوق کے نزدیک کیا آپ کا بلند مقام ہے؟

خدا نے آپ کو نام لیکر نہیں پکارا

تعریف ہمیشہ انسان کی صفات کی ہوتی ہے، اس کی ذات میں جو خوبی ہوتی ہے وہ بھی صفات کے راستے سے آتی ہے جو جتنی خوبیوں والی صفات رکھے گا اس کی شخصیت اتنی ہی زیادہ محبوب و محمود ہو جائے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جن صفات کمال سے نوازا تھا۔ وہ دنیا میں کسی کو نہیں دی گئیں، اسی لئے ساری دنیا آپ کی گرویدہ اور مداح ہو گئی۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ اللہ پاک بھی آپ کا کتنا خیال فرماتا ہے کہ پورے قرآن میں کہیں آپ کو نام لیکر خطاب نہیں کیا گیا، ہر جگہ کسی نہ کسی صفت کے ذریعہ آپ کو پکارا گیا۔

جبکہ دوسرے اولوالعزم انبیاء جن کے تخاطب کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ ان کا نام لیکر ان کو خطاب کیا گیا۔

حضرت آدم سے کہا گیا۔

یآدم اسکن انت وزوجك الجنة (بقرہ: ۳۵)

اے آدم آپ اور آپ کی بیوی جنت میں رہائش اختیار کرلیں۔

حضرت موسیٰ کو خطاب کیا گیا۔

وما تلك بیمینك یاموسی (طٰه: ۱۷) اور اے موسی آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟

حضرت داؤد کو خطاب ہے۔

یاداؤدانا جعلناك خليفة في الارض (ص : ۲٦)
اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔
حضرت زکریا کو مخاطب کیا گیا۔
یازکریاانانبشرك بغلام من اسمه يحی (مریم : ۷)
اے زکریا! ہم آپ کو ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں جس کا نام یحیی ہوگا۔
حضرت یحیی سے کہا گیا
یایحیٰ خذالکتاب بقوة (مریم : ۱۲)
اے یحیی کتاب کو پوری قوت کے ساتھ پکڑ لیجئے۔
حضرت عیسیٰ کو پکارا گیا۔
یاعیسیٰ انی متوفیك ورافعك الی (آل عمران : ۵۵)
اے عیسیٰ میں آپ کو وفات دینے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔

اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "یا محمد" یا "یا احمد" کہکر پکارنا چاہئے۔ مگر حضور کی شان تعظیمی انسانوں میں قائم کرنے کے لئے خود خدا نے بھی تخاطب میں آپ کا نام لینا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ کہیں صدائے تعظیم و تکریم سے نوازا

یاایھاالرسول بلّغ ماانزل الیك (مائدہ : ٦۷)
اے رسول آپ پہونچادیجئے وہ چیز جو آپ پر اتاری گئی۔
یاایھاالنبیُ جاھدالکفار والمنافقین (تحریم : ۹)
اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے۔

یا پھر صدائے محبت و عشق سے پکارا۔ یاایھا المزمل (اے کملی میں لپٹے ہوئے) یاایھا المدثر حد تو یہ ہے کہ جس شہر کی خاک کو آپ کے قدموں نے مس کیا وہ بھی اللہ کو اس درجہ محبوب ہے کہ قرآن میں اس کی قسم کھاتا ہے۔

لااقسم بھذاالبلد وانت حلّ بھذاالبلد۔ (البلد : ۱۔۲)
اے پیغمبر! ہم شہر مکہ کی قسم کھاتے ہیں اور اس لئے کہ تم اس میں مقیم ہو۔

ایک بار بنی تمیم کا ایک وفد مدینہ میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر

تشریف رکھتے تھے، ان لوگوں کو بارگاہ نبوت کے آداب سے واقفیت نہ تھی۔ ان لوگوں نے آپ کا نام نامی لیکر پکارنا شروع کیا، یامحمد اخرج الینا یعنی اے محمد! ہمارے پاس تشریف لائیے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کے ساتھ یہ گستاخی گوارانہ ہوئی، اور ان حضرات کو اس آیت کریمہ کے ذریعہ تنبیہ فرمائی۔

ان الذین ینادونك من ورك الحجرات اکثرھم لایعقلون ولو انھم صبروا حتی تخرج الیھم لکان خیرالھم (الحجرات : ۴۔۵)

اے پیغمبر! جولوگ آپ کو مکان کے باہر سے نام لیکر پکارتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو مطلق عقل و تمیز نہیں۔ بہتر تھا کہ وہ صبر کرتے اور جب آپ باہر نکلتے تو مل لیتے۔

نام محمد کی ایک خاص شان

آپ کے نام میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ انبیاء کرام علیھم السلام میں سے کسی نبی کا نام ایسا نہیں پایا جاتا کہ وہ نام ہی ان کے کمالات کی خبر دے، مثلاً

آدم : کے معنی گندم گوں ہیں۔ حضرت ابوالبشر کا یہ نام ان کے جسمانی رنگ کو ظاہر کرتا ہے

نوح : کے معنی آرام کے ہیں باپ نے ان کو آرام وراحت کا باعث قرار دیا۔

اسحٰق : کے معنی ہنسنے والا، آپ ہشاش بشاش چہرہ والے تھے

یعقوب : پیچھے آنے والا یہ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے اور بعد میں ظاہر ہوئے

موسیٰ : پانی سے نکالا ہوا جب ان کا صندوق پانی سے نکالا گیا تو یہ نام رکھا گیا

یحیٰ : عمر دراز بوڑھے ماں باپ کی بہترین آرزوؤں کا ترجمان

عیسیٰ : سرخ رنگ، چہرہ گلگلوں کی وجہ سے یہ نام تجویز ہوا

ان ناموں میں سے کوئی بھی نام مسمّیٰ (شخصیت) کی عظمت روحانی یا نبوت کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کرتا مگر اسم "محمد" کی شان خاص ہے، نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی شخصیت کا نام ہے جس کی تعریف کے غلغلے سارے جہان میں مچ گئے ہیں۔ (نقوش رسول نمبر جلد سوم ص ۲۸۸ شمارہ نمبر ۱۳۰۔ جنوری ۱۹۸۳ء)

اس طرح سیرت نبوی کے جس گوشے پر بھی نگاہ ڈالی جائے رب العالمین کے نزدیک آپ کی محبوبیت و عظمت، انبیاء کرام کے درمیان آپ کا امتیاز اور ساری انسانیت پر آپ کے

احسانات عظیم کا انکشاف ہوتا چلا جائے گا، اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنے سب سے عظیم اور محبوب پیغمبر کی امت میں پیدا کیا، ہم اس خدائے بزرگ و برتر کے جس قدر بھی شکر گذار ہوں اور اس نبی رحمت پر جتنی تعداد میں بھی درود و سلام بھیجیں کم ہے۔

الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه وصلى الله على رسوله وعلى آله و اصحابه وسلّم

سیر الاولیاء کی تفسیر وحدیث میں تحریفات

اخلاق حسین قاسمی

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء (وفات ۷۲۵ھ) کے حالات پر سیر الاولیاء بڑی مشہور کتاب ہے لیکن اس کتاب میں مصنف (امیر خورد) نے حضرت سلطان المشائخ کے حوالہ سے جو موضوع احادیث نقل کی ہیں ان سے نہ صرف رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے بلکہ اس سے حضرت سلطان المشائخ کے علم حدیث پر بھی حرف آتا ہے اور حدیث نبوی میں اہل تحقیق کی رائے کے مطابق حضرت سلطان جی کا جو بلند مرتبہ ہے وہ مشکوک ہو جاتا ہے۔

سیر الاولیاء کے بارے میں اس کے فاضل مترجم (اعجاز الحق قدوسی صاحب مطبوعہ کراچی) نے یہ لکھا ہے

"اس (امیر خوردؒ) نے بالخصوص حضرت سلطان المشائخ اور آپ کے خلفاء کے سوانحی حالات، ملفوظات، نوشتوں اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے معارف تصوف اور تعلیمات کی نہایت سلیقے اور ترتیب سے اس طرح چمن بندی کی ہے کہ اس کے آراستہ کئے ہوئے گلشن کی بہاروں کو کبھی خزاں کا ہاتھ چھو نہیں سکتا۔" ص ۳۰

مترجم صاحب کی اس تعریف میں کتنی ہی حقیقت ہو لیکن جہاں تک حضرت سلطان المشائخ کے خاص موضوع (علم حدیث) کا تعلق ہے اس کی روایت و ضاحت میں امیر خوردؒ نے اس احتیاط کا قطعاً ثبوت نہیں دیا جو ہمیں خواجہ حسنؒ کی ترتیب و تالیف (فوائد الفواد) میں نظر آتا ہے، اس ناچیز نے اپنی کتاب (فوائد الفواد کا علمی مقام) میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

مترجم صاحب نے امیر خوردؒ کو ایک ثقہ راوی اور عینی شاہد قرار دیا ہے۔ لیکن مولفؒ نے چند روایات کی نقل و روایت میں ایسی بے احتیاطی کی ہے جسے دیکھ کر مترجم صاحب کا یہ بیان

انتہائی کمزور ہو جاتا ہے اور غیر علمی بھی۔

مولف سیر الاولیاء نے حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی حدیث فہمی کا عنوان قائم کرکے اس کے تحت مختلف مثالیں تحریر کی ہیں۔

ان مثالوں میں مصنف نے شیخ علیہ الرحمہ کے حوالہ سے جو قابل اعتراض اور غیر ذمہ دارانہ موضوع روایت نقل کی ہیں ذیل میں ان پر نظر ڈالی گئی ہے۔

تفسیر قرآن میں تحریف!

(۱) امیر خورد فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ کی ایک دستی تحریر دیکھی جسمیں یہ تحریر تھا کہ جس رات خواجہ حسن بصری کی وفات ہوئی اس رات کو آواز آئی۔

ان اللہ اصطفی آدم ونوحا وآل ابراہیم وآل الحسن

بے شک اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا آدم کو اور نوح کو اور آل ابراہیم اور آل حسن کو۔

یہ آیت سورہ آل عمران (۳۳) کی ہے اور اس میں آل ابراہیم کے بعد آل عمران علی العالمین ہے امیر خورد کی اس روایت کے مطابق شیخ نے اس آیت میں تحریف کی۔

کتاب کے مترجم جناب اعجاز الحق صاحب قدوسی ہیں جو مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی اولاد میں سے ہیں، موصوف ایک صاحب علم اور صاحب نسبت بزرگ ہیں انہیں خود محسوس ہوا کہ یہ واقعہ انتہائی غلط ہے اور شیخ محبوب الٰہیؒ جیسے محتاط اور راسخ فی العلم بزرگ کی شخصیت کو عام روایتی قسم کے صوفیوں کی صف میں کھڑا کردینے والی بات ہے۔ اس لیے موصوف نے اس پر ایک حاشیہ لکھا اور اسے الحاقی قرار دیا۔ (ص ۱۰۴)

(۲) امیر خوردؒ نے طہارت کی قسمیں بیان کرتے ہوئے حسب ذیل آیت تحریر کی اور یہ لکھا کہ شیخ اس آیت کو اصحاب صفہ کی تعریف میں فرماتے تھے۔ آیت یہ ہے۔

فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین (توبہ ۱۰۸)

اس مسجد میں وہ لوگ ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ یہ مسجد قبا کے مسلمانوں کی تعریف میں ہے، یہ مسجد بنی عمرو ابن عوف کے محلہ میں واقع ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے

مدینہ منورہ تشریف لائے تو پہلے آپ نے اسی محلہ میں قیام کیااور یہاں مسجد قباء تعمیر فرمائی۔

امام بخاریؒ کی روایت میں مسجد قباء کا تذکرہ ہے، البتہ مفسرین کاایک قول یہ بھی ہے کہ اس آیت کا، تعلق مدینہ منورہ کی مسجد نبوی اور اس سے متعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے (حاشیہ جلالین)

چونکہ صحابہ کرام میں اصحاب صفہ کی جماعت مسجد نبوی کے ایک چبوترہ پر مقیم رہتی تھی اور اپنا سارا وقت یہ درویش صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے میں صرف کرتے تھے اس لئے شیخ علیہ الرحمہ نے اس آیت کی تعریف کا خاص مصداق اصحاب صفہ کو قرار دیااور شان نزول میں یہ تعمیم شیخ علیہ الرحمہ کی ذوقی تاویل ہے اور مفسرین کے ایک قول کے مطابق اس تاویل کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے شان نزول کی اصل روایت سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ اس میں عموم پیدا کیا۔ سیر الاولیاء کی تشریح سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت زینب کاواقعہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی اونچ نیچ کے قرآنی تصور کو رائج کرنے کے لئے اپنے خاندان سے عمل شروع کیااور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کیا، زید کو آپ اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور اس محبت کی وجہ سے لوگوں میں آپ زید ابن محمدؐ (محمدؐ کے منہ بولے بیٹے) مشہور ہوگئے تھے۔

حضرت زینب نے حضورؐ کے حکم سے زید کے ساتھ نکاح کے رشتہ میں منسلک ہونا منظور تو کرلیا لیکن دونوں کے درمیان نبھاؤ نہ ہوسکا اور زید نے زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کرلیا۔ حضورؐ نے بہت سمجھایا مگر بات نہ بن سکی اور دونوں میں جدائی ہوگئی۔

اس واقعہ پر قرآن کریم کی حسب ذیل آیات نازل ہوئیں۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا

زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (احزاب ۳۷)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس موقع کو یاد فرمائیں جب آپ اس شخص (حضرت زید) سے فرمارہے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے اور آپ نے احسان کیا تھا کہ اے زید! تم اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو، اور اس وقت آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ آگے چل کر ظاہر کرنے والا تھا اور آپ اس معاملہ میں عام لوگوں کے طعن تشنیع سے ڈر رہے تھے، حالانکہ آپ کو خدا تعالیٰ ہی سے ڈرنا چاہئے۔ پھر جب زید کا زینب سے جی بھر گیا اور ضرورت پوری ہوگئی (طلاق ہوگئی اور مدت پوری ہوگئی) تو پھر ہم نے زینب کو آپ کے نکاح میں دیدیا (یعنی نکاح کی اجازت دیدی) تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالک بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ لے پالک اپنی بیویوں سے اپنی حاجت پوری کرلیں (یعنی طلاق دیدیں) اور اللہ کا فیصلہ ازلی عمل میں آنے والا ہی تھا۔

ہم نے اس آیت کا اتنا مطلب خیز ترجمہ کردیا ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں رہی، حضورؐ نے حضرت زید کو حضرت زینب کے ساتھ نبھانے اور نکاح قائم کرنے کا مشورہ دیتے وقت اپنے دل میں کیا بات چھپا رکھی تھی؟

وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعہ یہ اطلاع دیے چکا تھا کہ زید اور زینب کے درمیان ناچاقی ہوگی اور پھر آپ کو زینب کی دل جوئی کرنے کے لیے اسے اپنے نکاح میں لینا ہوگا۔

اس علم کے باوجود آپ حضرت زید کو نکاح قائم رکھنے کا مشورہ دے رہے تھے، اور آپ کا یہ مشورہ دینا ایک اخلاقی بات تھی، آپ اپنے علم وحی کی وجہ سے زید کو اجازت یا حکم کیسے دے سکتے تھے؟

آپ جانتے تھے کہ ہوگا وہی جو مقدر ہوچکا ہے، مگر میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اس رشتہ کو قائم رکھنے کا مشورہ دوں جو خود میں نے قائم کیا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ مستقبل میں ہونے والی بات (زینب کے ساتھ نکاح) کے بارے میں معاشرہ کے لعن طعن کا اندیشہ رکھتے تھے کیونکہ عربوں میں لے پالک بیٹے بھی

حقیقی بیٹوں کی طرح تھے اور ان کی مطلقہ بیویوں کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا۔

خداوندعالم کے سامنے یہی مصلحت تھی کہ آپ زینب سے نکاح کریں اور عربوں کے غلط خیال کی عملی طور پر تردید اور اصلاح سامنے آئے۔

خدا تعالیٰ نے حضرات انبیاء کی زندگی کو دین و شریعت کا نمونہ قرار دیا ہے اور اس وجہ سے ان کی زندگیوں میں اس قسم کے واقعات نمودار ہوتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اس مشورہ کے وقت آپ کے ذہن میں یہ دینی مصلحت نہیں آئی تھی۔ لیکن یہ توجیہ کمزور ہے۔

واضح اور مضبوط بات یہ ہے کہ حضورؐ سب کچھ جانتے اور سمجھتے تھے لیکن آپ اسے ضروری سمجھتے تھے کہ اخلاقی فرض پورا کریں اور زید کو طلاق دینے سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

قرآن کریم نے دل میں چھپانے کی بات اتنے اشارہ اور اجمال میں کہی ہے کہ اس سے حضورؐ کے دشمنوں اور منافقوں کو آپ کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا یہی وہ گروہ منافقین تھا جس نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی اور حضورؐ کے خاندان کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

منافقین نے اس سے یہ مطلب نکالا کہ حضورؐ کے دل میں حضرت زینب کی محبت پوشیدہ تھی اور آپ دل سے یہی چاہتے تھے کہ زید طلاق دیدیں مگر آپ نے بطور تکلف انہیں نکاح قائم رکھنے کا مشورہ دیا۔

لیکن یہ مطلب بالکل خلاف حقیقت ہے، رسول اکرمؐ کو شروع ہی میں حضرت زینب کے ساتھ نکاح کرنے سے کس چیز نے روکا تھا، آپ کے دل میں اگر ان کی محبت پوشیدہ تھی تو کیا حضرت زینبؓ اس رشتہ کو اپنے لئے باعث فخر خیال کر کے اسے قبول نہ فرماتیں۔

منافقین اور نو مسلم یہودی طبقہ نے اس الزام کو اسقدر اچھالا اور اس باطل مفہوم کو قرآن کریم کی تفسیر میں اس طرح داخل کیا کہ بعض مفسرین بھی اس تاویل کے قائل ہوگئے، چنانچہ محقق ابن کثیر کو لکھنا پڑا۔

ذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر ھھنا آثاراً عن بعض السلف رضی اللہ عنہم احببنا ان تصوف عنہا صفحا لعدم صحتہا۔ (جلد ٤ ص ٤٩١)

محدث ابن ابی حاتم اور مفسر ابن جریر طبری نے اس واقعہ کے بارے میں ایسے اقوال بعض اسلاف سے نقل کئے ہیں جن سے پہلو تہی کرنا بہتر ہے کیونکہ وہ تاویلی اقوال درست نہیں ہیں۔

حضرت امام زین العابدینؒ کا اعلان!

محبت کی یہ تاویل سبائی فرقہ (اہل تشیع) کے ذریعہ بھی پھیلی چنانچہ کلبی جو ایک شیعہ مسترد اور گمراہ راوی ہے اس کے نام سے کتابوں میں یہ شرمناک تاویل آگے بڑھی، معاملہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور اہل بیت رسول کے ساتھ محبت کا دعوی کرنے والوں میں اہانت رسول کرنے والے بھی موجود تھے۔

چنانچہ اہل بیت نبوی کے چشم وچراغ، محدثِ جلیل، فقیہ کامل اور صاحب ورع وتقوی بزرگ حضرت امام زین العابدین کے یہ بات علم میں آئی کہ اس باطل تاویل کو سبائی گروہ کے لوگ حضرت امام حسن بصری کی طرف منسوب کرکے لوگوں میں پھیلا رہے ہیں، کیونکہ حضرت حسن بصریؒ اہل بیت نبوت سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے حوالہ سے ایک طرف اہل بیت بدنام ہوتے اور دوسری طرف عام مسلمانوں میں یہ تاویل معتبر سمجھی جاتی۔

چنانچہ زید ابن جدعان کہتے ہیں کہ ایک روز حضرت علی ابن حسین (زین العابدینؒ) نے مجھ سے سوال کیا **سألنی علی بن الحسين رضی الله عنه، ما يقول الحسن فی قوله تعالی وتخفی فی نفسك ما الله مبديه۔ فذكرت لهٗ فقال۔ لا، ولكن الله تعالی اعلم نبيهٗ انها ستكون من ازواجه قبل ان يتزوجها فلما اتاه زيدؓ ليشكوها اليه قال، اتق الله وامسك عليك زوجك فقال قد اخبرتك أنّی مزوجكها وتخفی فی نفسك الخ وهكذا روی عن السدی (ابن كثير ٤ ص ٣٩١)**

اے زید! سورہ سورہ احزاب کی
اس آیت کے بارے میں حسن بصری کی رائے کیا ہے؟

میں نے ان کو بتلایا (کہ محبت کی تاویل کرتے ہیں) آپ نے اس کی تردید کی اور فرمایا، اللہ تعالی نے اپنے نبی کو خبر دی (وحی کی) کہ زینب تمہارے حرم پاک میں داخل ہوں گی، یہ اطلاع

نکاح سے پہلے دی گئی پھر جب زید حضرت زینب کی شکایت کرنے آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں اللہ سے ڈرایا اور نکاح قائم رکھنے کی ہدایت دی، اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ اے نبی! میں آپ کو اطلاع دے چکا تھا کہ میں زینب کی آپ کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔ آپ دل میں اسے چھپائے ہوئے تھے۔

مولانا تھانویؒ نے محبت کی تاویل کے باطل ہونے کی ایک داخلی برہان یہ بیان کی۔ اور جس چیز کو حضورؐ نے چھپا رکھا تھا اسے خدا نے ظاہر کر دیا اور وہ بات نکاح کی ہے، اگر وہ مخفی بات محبت کرنے کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ وعدہ کے مطابق اسے ظاہر کرتا.

سیر الاولیاء کی عبارت!

امیر خوردؒ نے حضرت سلطان المشائخؒ سے اس واقعہ کی جو روایت نقل کی ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔

لکھتے ہیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینب بنت جحشؓ کا جو قصہ "روح الارواح" میں لکھا ہے اسے پڑھو اور دیکھو کہ خدائے عزوجل نے عاشقوں کے حق میں کیا کرم فرمائے ہیں اور کس قسم کی ترغیبیں دی ہیں۔" (۷۱۵)

اسکا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب زید کے گھر کے دروازے پر آئے آپ کی نظر حضرت زینب پر پڑی، یہ پہلی نظر تھی اور پہلی نظر کا شریعت میں مواخذہ نہیں لیکن پہلی ہی نظر میں خرمن صبر برباد ہو گیا، غیب سے ندا آئی کہ اے محمدؐ تمہاری وہ نظر جو ہمارے سوا غیر پر پڑی، ہم اس پر قادر تھے کہ اس نگاہ اور خیال کو تمہارے دیدہ ودل سے بالکل نکال دیتے لیکن اس میں یہ راز تھا کہ ہم نے اس طرح مفلسوں اور شکستہ دلوں کے دل کو خوش کیا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم باوجود منصب رسالت اور قوت نبوت کے اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکے تو اس بے چاری مشت خاک کی کیا ہستی ہے کہ دیدہ ودل کو قابو میں رکھ سکے چنانچہ شیخ سعدی فرماتے ہیں

نظر بند نیکواں رسمے است معہود   نہ ایں بدعت من آوردہ بعالم (ص ۷۱۷)

کلبی کے حوالہ سے شیخ المشائخؒ نے یہ الفاظ بھی نقل کیے۔

رسالت مآب جب زید سے ملنے ان کے گھر آئے تو آپ کی نظر زینب پر پڑی اور وہ

آپ کو پسند آگئیں اور آپ نے یہ کلمات فرمائے۔ سبحان اللہ، مقلب القلوب۔ پاک ہے اللہ جو قلوب کو بدلنے والا ہے جب یہ کلمات زینب نے سنے تو وہ بیٹھ گئیں، جب زید گھر آئے تو انھوں نے سارا قصہ سنایا، زید حضورؐ کے پاس آئے اور زینب کی برائیاں بیان کرکے انہیں طلاق دینے کی اجازت طلب کی (۷۱۶)

اس کے بعد امیر خورد نے تبریز کے ایک دیوانہ کے عشق مجازی کی داستان بیان کی اور عشق و محبت پر چند فارسی اشعار نقل کئے۔

دراصل صاحب روح الارواح (جو ایک صوفی تھے، محقق محدث نہیں تھے) نے حضرت زینب کے بارے میں ان ضعیف آثار سلف کو نقل کیا ہے جنہیں اہل تحقیق نے نہایت سختی سے مسترد کیا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ روح الارواح کی تعریف کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ قاضی حمید الدین ناگوری کو یہ کتاب زبانی یاد تھی اور وہ وعظ میں اس کے مضامین بیان کرتے تھے، (فوائد ۲۶۷)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ صوفیاء میں اس کتاب کی شہرت سے فائدہ اٹھاکر کسی مخالف نے روح الارواح کا یہ مضمون سیر الاولیاء میں داخل کردیا۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کی طرف منسوب کردیا۔ لیکن وہ ہستی جس کا علم و عمل نور نبوت سے مستنیر و مستفیض تھا اس کی زبان مبارک اس قسم کی مہمل باتوں کو مزے لے لے کر کیسے بیان کرسکتی ہے۔ اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ ساری بحث الحاقی ہے۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا۔

ماکان لنبی ان یکون لہ خائنۃ الاعین۔۔ کسی نبی کے لئے یہ بات مناسب نہیں کہ اس کی آنکھوں سے کوئی خیانت سرزد ہو!

مترجم صاحب نے اس واقعہ پر یہ حاشیہ ضرور لکھا ہے۔ "روح الارواح کی یہ روایت بہت سے ذہنی اشتباہ اور اشکال پیدا کرتی ہے۔"

لیکن حاشیہ کے یہ الفاظ انتہائی کمزور ہیں، مترجم صاحب کو اس کی مدلل تردید کرنی چاہیے تھی، اور اپنی کتاب نیک بیبیاں۔ کے مطالعہ کی دعوت دے کر وہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتے تھے۔

ہندوستان کے ایک ہندو مورخ نے ۱۹۵۰ء میں رسول پاکؐ اور حضرت زینبؓ کے درمیان محبت پر ایک گستاخانہ مضمون تحریر کیا تھا جو دلی کے مشہور آریہ سماجی اخبار پرتاپ میں شائع ہوا تھا۔ علماء نے اس گستاخی پر کافی احتجاج کیا۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اہل قلم انہی اردو تراجم کو دیکھ کر اس قسم کی گستاخی کرتے ہیں۔

کلبی، ایک کذّاب راوی!

حضرت ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال جن سندوں سے منقول ہیں ان میں سب سے زیادہ ضعیف سند محمد بن سائب کلبی کی ہے۔

کلبی کی روایت کو تمام محدثین نے متروک قرار دیا ہے، کلبی سے روایت کرنے والوں میں ایک راوی محمد ابن مروان سدی الصغیر ہے، محدثین نے اسے واضع الحدیث (حدیثیں گھڑنے والا) قرار دیا ہے جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

کلبی کی سند میں سدیّ الصغیر بھی ہو تو یہ سند "سلسلہ الکذب (جھوٹ کی ٹولی) تصور کی جائے گی۔" (اتقان جلد ۲ ص ۱۸۹)

کلبی جب مرنے لگا تو اس پر خوف خدا غالب ہو گیا اور اس نے مرتے وقت اپنے شاگردوں سے کہا اور اعتراف کیا۔

میں نے جو کچھ بھی بروایت ابو صالح عن ابن عباس بیان کیا ہے وہ سب جھوٹ ہے (در منثور جلد ۶ ص ۴۲۳)

کلبی کے اقوال تفسیری نقل کرنے والوں میں ایک امام ثعلبی بھی ہیں، جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ٹونے کے واقعہ کو بڑھا چڑھا کر جھوٹ کا ایک افسانہ بنادیا اور وہ ہماری تفسیروں میں داخل ہو گیا۔

غور کیجئے کہ جو محدث وفقیہ روایت حدیث میں امام بخاری اور امام مسلم کے معیار صحت کا قائل ہو وہ کلبی جیسے کاذب راوی کا قول نقل کر سکتا ہے۔

ایک نہایت غلط الحاقی روایت!

امیر خوردؒ نے حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ کے دستِ مبارک سے (بقول ان کے)

لکھی ہوئی ایک تحریر کا حوالہ دے کر ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ فلاں قبیلہ میں ایک باندی ہے۔ تم اسے میرے لئے دیکھو، حضرت عائشہ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئیں اور ایک فرشتہ کی بتائی ہوئی دعاء پڑھی، جس سے وہ باندی مرگئی اور حضرت عائشہؓ خوش ہوگئیں۔

اس الحاقی روایت پر مترجم صاحب نے یہ نوٹ لکھا ہے۔

یہ روایت صوفیہ کی سنی سنائی ہے، وہ مومنین سے حسن ظن کی بناء پر راوی کے بارے میں کھود کرید نہیں کرتے تھے اس لئے بعض روایات کو صحیح باور کر لیتے تھے، محدثین اس روایت سے ناآشنا ہیں۔ (صفحہ ٢٦٨)

یہ نوٹ بھی غلط فہمی پیدا کرتا ہے، یہ روایت جس ہستی کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ عام صوفیوں کے زمرہ کا صوفی نہیں ہے، جو محض ایک مسلمان کے ساتھ حسن ظن کی وجہ سے غلط روایات قبول کر کے اسے زبانی بھی نہیں تحریری طور پر نقل کرے بلکہ وہ ایک محدث اور فقیہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی گمراہ شخص نے امیر خورد کے حوالہ سے حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ کی طرف اس موضوع روایت کو منسوب کر دیا ہے۔

فوائد الفواد میں الحاق کی تردید!

پاکستان کے مشہور محقق عالم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے تاریخ تصوف میں حضرات صوفیاء کرام کی کتابوں میں قرامطہ اور باطنیہ فرقوں کی طرف سے الحاق و تدسیس کی مثالیں پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ صوفیاء و مشائخ کی طرف منسوب کتابیں ناقابل اعتبار ہیں۔

چشتی صاحب نے اس باب میں شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات پر بھی گرفت کی ہے اور شیخ کے کلام میں سے انہیں اگر کچھ ملا ہے تو وہ صرف مولانا نور ترک کے بارے میں ایک تعریفی فقرہ ملا ہے۔

چشتی صاحب نے یہ فقرہ شیخ محدث دہلویؒ کی اخبار الاخیار سے لیا ہے، شیخ محدث نے مولانا نور ترک کے مختصر تذکرہ میں لکھا ہے۔

"اگرچہ قاضی منہاج نے طبقات ناصری میں اس شخص کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ

اس سے تشنیع مذہب (گمراہی عقیدہ) لازم آتی ہے مگر فوائد الفواد میں یہ مذکور ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ اگرچہ بعض علماء نے اس کی مذمت کی ہے مگر وہ از آب آسماں پاکیزہ تر بود۔ وہ آسمان کے پانی سے بھی زیادہ پاکیزہ تھے۔"

قاضی منہاج درباری قاضی تھے اور مسجد قوۃ الاسلام میں حکومت کے امام تھے قاضی صاحب نے اس وقت کی مسلم حکمراں سلطانہ رضیہ بنت التمش اور اس عہد کے واقعات پر طبقاتِ ناصری کے نام سے یہ تاریخی کتاب لکھی ہے۔

چشتی صاحب قاضی منہاج کی شہادت کو ہم عصرانہ شہادت قرار دے کر اسے یقینی طور پر صحیح ثابت کرتے ہیں۔ (اسلامی تصوف ۵۹)

چشتی صاحب کو اس فیصلہ سے پہلے شیخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کی وہ پوری تقریر پڑھنی چاہیے تھی جس میں شیخ نے بڑی تفصیل سے نور ترک صاحب کے فضائل بیان کیے ہیں اور نہ صرف اپنی رائے دی ہے بلکہ نور ترک صاحب کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام بابا فرید رحمتہ اللہ کی نیک رائے بھی بیان فرمائی ہے۔

یعنی سوال صرف ایک فقرہ کا نہیں بلکہ پوری تقریر کا ہے۔ جو فوائد جلد ۴ مجلس ۱۵ ص ۸۵۲ پر موجود ہے۔

اب فیصلہ کرنا ہے کہ طبقات ناصری کے مصنف کی شہادت معتبر ہے یا ان دونوں بزرگوں کی شہادت قابل اعتبار ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنی تقریر میں مولانا نور ترک اور علماء شہر کے درمیان کشیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

اور لیا علماء شہر تعصبے تمام بود سبب آنکہ ایشاں را آلودہ دنیا دیدی، ایشاں بداں سبب اورا بداں چیزہا منسوب کردند یعنی نور ترک علماء شہر سے سخت کبیدگی رکھتے تھے کیونکہ یہ لوگ دنیاداری میں آلودہ تھے اور علماء شہر نور ترک کی اس سختی کے سبب ان کے بارے میں طرح طرح کے الزامات لگاتے تھے۔

شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے نور ترک کو صاحب تاثیر فرمایا کہ ان کے وعظ میں بڑی تاثیر ہوتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان کی اس کمزوری کو بھی بیان فرمایا۔

"لمادست بکسے نداشت، ہرچہ گفتی بہ قوتِ علم گفتی و قوت مجاہدہ۔"

لیکن نور ترک کسی شیخ سے وابستہ نہیں تھے اور وہ (اسرار و رموز) کے سلسلہ میں اپنے مواعظ میں جو کچھ کہتے تھے اپنے ذاتی علم اور ذاتی کشف سے کہتے تھے۔

شیخ رحمۃ اللہ کا اشارہ وحدۃ الوجود کے باریک حقائق کی طرف ہے۔ ایک مجلس میں شیخ رحمۃ اللہ نے مولانا نور ترک کے بارے میں فرمایا۔ انہوں نے ہندوستان سے ترک وطن کر کے مکہ معظمہ میں قیام کر لیا تھا اور اپنے گھر کے دروازہ پر یہ لکھ کر لگا دیا تھا کہ جو میرے گھر میں آئے اگر اس کے پاس مسواک نہ ہو تو میرے گھر میں اس کا داخلہ ممنوع ہے۔ (جلد ۴ مجلس ۴۶ ص ۸۲۷)

شیخ علیہ الرحمہ نے دنیادار اور دربار حکومت سے وابستہ علماء کی دنیاداری کے مقابلہ میں شیخ نور ترک کے زہد اور ترک دنیا کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

مولانا نور ترک کا ایک غلام تھا جو دھنیا تھا اور وہ مولانا کو روزانہ ایک درہم دیتا تھا، اسی ایک درہم میں مولانا گذارہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ سلطانہ رضیہ نے سونے کی ایک اینٹ مولانا کی خدمت میں بھیجی، مولانا نے اپنے عصا سے اسے ٹھکرا دیا اور اس پر عصا مار کر کہا یہ کیا ہے ؟ اسے لے جاؤ!

اس زاہدانہ زندگی کے ساتھ نور ترک کا درباری علماء پر نکتہ چینی کرنا اور علماء کی طرف سے اپنے دفاع میں ان کو بدنام کرنا ایک قرین قیاس بات ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ مولانا نور ترک کے بارے میں قاضی منہاج کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن قاضی صاحب کے وعظ میں ہر پیر کو شرکت فرماتے تھے اور ایک موقع پر قاضی صاحب کے متعلق فرمایا:

مردے کہ صاحب ذوق بودہ است۔۔۔ وہ بڑے صاحب ذوق تھے۔ اور ایک روز انہیں شیخ بدرالدین غزنوی کے دولت خانہ میں دعوت دی گئی جہاں سماع ہو رہا تھا۔ قاضی صاحب شریک سماع ہو گئے اور اتنے بے خود ہوئے کہ اپنے کپڑے پھاڑ لیئے۔ (جلد ۴ مجلس ۴٦ ص ۸۲۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ کو قاضی صاحب سے کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی، بلکہ مولانا نور ترک کے بارے میں ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔

پانچ بزرگان دین کے عقیدہ ختم نبوت پر قادیانیوں کی غلط بیانی

(از حافظ محمد اقبال رنگونی مانچسٹر)

مسٹر رشید چودھری اگر اپنے بیان میں سچا ہے تو مرزا طاہر سے درج ذیل عبارت پر دستخط کرائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی بنیاد توحید و آخرت کے ساتھ ساتھ جس اساسی عقیدے پر ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا عقیدہ ہے۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم کردیا گیا آپ کے بعد اب کسی کو نبوت نہیں دی جائیگی اور نہ ہی کسی کو اجازت ہے کہ وہ اپنا نام نبی رکھے اور اپنے اوپر کسی آسمانی ہدایت کی وحی نازل ہونے کا دعویٰ کرے۔

عقیدہ ختم نبوت کا یہ مفہوم قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات اور امت مسلمہ کے تمام اکابر نے بیان کیا ہے اور بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کا انکار کرے یا اس میں کسی تاویل کی راہ نکالے اسکا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاتم النبیین ہونے کی تصریح کے ساتھ اس بات کی بھی خبر دی کہ میرے بعد کچھ ایسے کذاب اور فریبی پیدا ہوں گے جن کا دعویٰ ہوگا کہ وہ خدا کے رسول ہیں یہ مدعیان نبوت صرف جھوٹے ہی نہیں بلکہ دجال (بڑے فریبی) بھی ہونگے۔

لاتقوم الساعة حتی یبعث دجالون کذابون من ثلثین کلهم یزعم انه رسول الله (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۹، صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹۷)

وانه سیکون فی امتی کذابون ثلثون کلهم یزعم انه نبی (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۸)

اس حدیث پاک میں لفظ دجالون سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مدعیان نبوت کھلے طور پر ختم نبوت کاانکار کرنے کے بجائے دجل اور فریب کی راہ تلاش کریں گے۔وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بھی مانیں گے اور آپ کی امت میں سے ہونے کا دعویٰ بھی کریں گے مگر ساتھ ہی اپنے دعوئ نبوت کو ملا کر حق وباطل خلط ملط کرکے دجل کا حق ادا کریں گے اور اپنے آپ کو مسلمان بتلانے کے لئے قرآن وحدیث کو بڑی بے دردی سے استعمال کریں گے تاکہ اس کے ذریعہ ناواقف اور ان پڑھ مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں لاسکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اسی دجل سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ میں خاتم النبیین ہوں یعنی میرے بعد کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں وانا خاتم النبیین لانبی بعدی (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۸۔ جامع ترمذی ج ۲ ص ۴۵)اور نہ ہی اب کسی کو یہ نام دیا جائے گا۔ومع هذا الایطلق اسم النبوة ولا النبی الاعلی المشرع خاصة فحجر هذا الاسم الخصوص وتصف معین فی النبوة (فتوحات مکیہ جلد ا ص ۵۶۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی نے دعوئ نبوت کیا اور دجل وفریب کے ذریعہ اپنی نبوت ثابت کرنے کی ہر ممکن راہ تلاش کی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے ہر قسم کے دعووں کو مسترد کردیا اور ایک لمحہ کیلئے بھی یہ بات گوارانہ فرمائی کہ وہ نبی یا امتی نبی کے نام سے اپنا تعارف کرائیں۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کے متعدد مدعیان نبوت ابھرے جنھوں نے دجل وفریب سے کام لیکر امت مسلمہ کو گمراہ کرنے کی سازش کی لیکن ہر دور کے علماء نے ان دجالوں کے دجل وفریب کا پردہ چاک کیا اور عوام الناس نے انکی ہر جگہ ناکہ بندی کی اور کھل کر کہا کہ جو لوگ یہ دعوی کرتے ہیں یا جو انکے دعوی کو قبول کرتے ہیں وہ سب کے سب امت مسلمہ سے کٹ چکے ہیں انکا اسلام سے اب کوئی رشتہ باقی نہ رہا۔

آج سے ایک صدی قبل ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری میں قادیان کے مرزا غلام احمد نے دعوی کیا کہ وہ خدا کا نبی اور رسول ہے اس کا دعوی نبوت اس لحاظ سے سابق مدیان نبوت سے منفرد رہا کہ اس نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے جلیل القدر اکابر پر افتراء کیا اور کھلے بندوں یہ کہنے میں نہ شرمایا کہ یہ بزرگان دین بھی اسی عقیدے پر تھے

جس پر میں (مرزا غلام احمد قادیانی) ہوں۔ ان بزرگوں کی ناتمام عبارتوں اور پھر ان عبارات کو سیاق و سباق سے ہٹا کر ایک ایسے معانی پہنائے گئے جس نے شیطان کے بھی ناک کان کاٹ دئے ہیں۔ دجل و فریب۔ افتراء واتہام قادیانی مبلغین اور انکے مناظرین کا امتیازی نشان ہوتا ہے اور یہ لوگ جب تک دجل و فریب سے کام نہیں لیتے انکا یہ کاروبار کبھی نہیں چل سکتا اور یہ لوگ پھر کبھی تیس دجالوں میں سے نہیں ہو سکتے۔ مرزا غلام احمد نے خود دجال کا یہ معنی لکھا ہے۔

(۱) دجال کیلئے ضروری ہے کہ کسی نبی بر حق کا تابع ہو کر پھر سچ کے ساتھ باطل ملادے (تبلیغ رسالت ج ۳ ص ۲۰۰)

(۲) دجال کے معنی بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ جو شخص دھوکہ دینے والا اور خدا کے کلام میں تحریف کرنے والا ہو اسکو دجال کہتے ہیں (تمہ حقیقت الوحی حاشیہ ۲۴)

مرزا غلام احمد کے مذکورہ بیان کو اسکے دعووں کے آئینہ میں دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ مرزا غلام احمد اور اس کے جانشین اس معنی میں پورے اترتے ہیں اور دجل و فریب کی اس گہرائی میں اترے ہیں جہاں شاید سابق مدعیان نبوت نہ اترے ہوں۔ حال ہی میں قادیانیوں کا ایک پر فریب بیان اخبار میں شائع ہوا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ انکا دجل خوب واضح ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ کس درجہ شرم و حیا سے نا آشنا ہیں۔

ہفت روزہ دی نیشن لندن کی ۲۶ر جولائی کی اشاعت میں قادیانی سیکرٹری مسٹر رشید چودھری نے دعویٰ کیا کہ قادیانیوں کا عقیدہ ختم نبوت کے باب میں وہی موقف ہے جو شیخ ابن عربی، امام شعرانی، مولانا روم، ملا علی قاری، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ہے۔ قادیانی سیکرٹری نے اس سلسلے میں انکی بعض عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔

قادیانی مبلغین کا مذکورہ بزرگوں کو اپنا ہمنوا بتلانا اور انہیں اسی عقیدہ کا قائل قرار دینا جو مرزا غلام احمد اور قادیانیوں کا ہے سوائے دجل اور فریب کے اور کچھ نہیں ہے اسلئے کہ یہ بزرگان امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت زمانی اور ختم نبوت مرتبی (دونوں) کا عقیدہ رکھتے تھے اور اسی عقیدے پر تھے جو تمام امت کا متفقہ عقیدہ رہا ہے ان بزرگوں کے یہ عقائد انکی تالیفات، ملفوظات اور مکتوبات میں بصراحت موجود ہیں جبکہ مرزا غلام احمد قادیانی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت زمانی کا صریح منکر تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا سلسلہ جاری مان کر خود مدعی نبوت بن بیٹھا۔

قادیانیوں کا یہ دجل کوئی آج کی پیداوار نہیں۔ جب بھی انکے عقائد کھلتے ہیں اور قادیانیت عوام کی عدالت میں آتی ہے توانکے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں اور بوکھلاہٹ کے مارے دجل وفریب کے ذریعہ یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا عقیدہ وہی تھا جو پہلے بزرگوں کا تھا (معاذ اللہ)۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ان میں سے کچھ بزرگوں کی عبارات سے استدلال کیا اس کے بعد اسکے جانشین اور قادیانی مناظرین اسی دجل کے سہارے مرزا قادیانی کی نبوت جتلانے کے درپے رہے۔ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے ان بزرگوں کا نام استعمال کیا گیا تاکہ ان بزرگوں کے نام پر مسئلہ ختم نبوت میں الحاد و زندقہ کی راہ کو ایک شاہراہ کے طور پر قائم کیا جاسکے اللہ رب العزت جزائے خیر عطا فرمائے مفکر اسلام محقق العصر حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم العالیہ کو کہ آپ نے سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمتہ اللہ کی فرمائش پر عقیدہ الامت فی معنی ختم النبوت کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی جس میں قادیانیوں کے ان تمام مغالطات کا پردہ چاک کیا گیا جن کے سہارے وہ مسلمانوں کو الحاد کی گہری دلدل میں گرا رہے تھے اور بدلائل ثابت کیا کہ ان تمام بزرگوں کا ہمیشہ سے یہ اجماعی عقیدہ رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہے۔ اب جو بھی نبوت کا دعوی کرے گا (خواہ اسکا دعوی تشریعی ہو یا غیر تشریعی) وہ قطعی طور پر دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔

آج سے تقریباً دس سال قبل اس قسم کے دجل وفریب پر مبنی ایک رسالہ "ہمارا موقف" لندن کے قادیانی مرکز سے شائع ہوا تھا اس رسالہ کا مولف قادیانی امام مرزا بشیر احمد تھا۔ احقر نے اس رسالہ میں اٹھائے گئے شبہات اور اشکالات۔ اعتراضات کا جواب الجواب الصحیح لرد الموقف الصحیح کے نام سے شائع کیا۔ اور قادیانی مرکز بھیجا۔ مگر انھیں جرأت نہ ہوئی کہ اس رسالہ میں دئے گئے جوابات کا جواب الجواب پیش کرتے اور قادیانی مغالطات کو سچ بتاسکتے۔

فالحمدللہ علی ذلک۔

مگر بے شرمی کی انتہا ہے کہ اب مسٹر رشید احمد چودھری نے مرزا طاہر کے ایماء پر پھر سے دجل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ہمارے عقیدے وہی ہیں جو ان بزرگوں کے تھے۔ ہم اس وقت اسکی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے (تفصیل کے خواہشمند احباب عقیدۃ الامت کا ضرور مطالعہ فرمائیں) البتہ ہم مسٹر رشید چودھری کی اس بات کی تصدیق کیلئے ان بزرگوں میں سے صرف ایک بزرگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کی صرف ایک عبارت پیش کئے دیتے ہیں اور رشید چودھری سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیشوا مرزا طاہر سے اس درج ذیل عبارت پر دستخط کرادیں کہ میرا بھی یہی عقیدہ اور ایمان ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔ اور یہ ختم نبوت کے موضوع پر حضرت موصوف کی آخری تحریر ہے۔

اپنا دین وایمان ہے کہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اسے کافر سمجھتا ہوں (مکتوبات مولانا نانوتوی ص ۱۰۳)

اگر مرزا طاہر کو مذکورہ عبارت پر دستخط کرنے کی جرأت نہیں تو کم از کم اسے چاہئے کہ وہ اپنے سیکرٹری مسٹر رشید سے یہ ضرور سوال کرے کہ جب ہمارا عقیدہ یہ نہیں تو پھر یہ بات کیوں لکھی کہ ختم نبوت کے باب میں ہمارا موقف وہی ہے جو ان بزرگوں کا تھا۔ اگر قادیانیوں کا موقف ان بزرگوں کے موقف سے الگ ہے اور یقیناً الگ ہے۔ تو پھر ان بزرگوں کو اپنا ہم نوا بتلانا دجل وفریب نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر مسٹر رشید اور مرزا طاہر کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی مذکورہ بالا عبارت کے بارے میں انکار ہے کہ عبارت حضرت موصوف کی نہیں تو ہم انہیں انکے نہایت پسندیدہ موضوع مباہلہ کی دعوت دیتے ہیں۔

اگر انہیں ہماری یہ دعوت بھی منظور نہیں تو ہم قادیانی عوام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے رہنماؤں کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے خود اصل بات تک پہنچنے کی کوشش کریں انشاء اللہ انہیں بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ قادیانی رہنماء اور انکے جانشین کس طرح دھوکہ اور دجل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بے ایمان بنادیتے ہیں۔

وماعلینا الاالبلاغ المبین

۱۲/ اگست ۱۹۹۶ء

محمد ندیم صدیقی خادم خاص حضرت قطب دکنؒ
جنرل سکریٹری جمعۃ علماء مرہٹواڑہ

مصلح دکن رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

وہ جو بیچتے تھے دواء دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

امام العارفین سراج السالکین قطب دکن حضرت مولانا الحاج شاہ محمد عبدالغفور صاحب قریشی چشتی صابری نوراللہ مرقدہٗ (مہتمم مدرسہ قاسم العلوم اودگیر و بانی خانقاہ چشتیہ صابریہ رحمت نگر حیدر آباد) دکن کی مشہور و معروف اور مرجع خلائق شخصیت تھی۔ آپ کی پیدائش بروز پیر ۱۳۳۹ھ اپنے آبائی وطن اودگیر میں ہوئی، جو ضلع لاتور مہاراشٹر کا تعلقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور ۱۳۵۲ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور سات سال وہاں تحصیل علم میں مصروف رہ کر ۱۳۵۸ھ میں علم ظاہری سے فراغت پائی اور علم باطنی کے لئے شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا الحاج سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اور پندرہ سال مسلسل ریاضت کے بعد ۱۳۷۳ھ میں علم باطنی کی تکمیل کر کے اپنے پیر و مرشد سے شرف خلافت حاصل کیا۔ یوں تو آپ نے بہت سے اساتذہ سے علمی استفادہ کیا ہے اور سبھی سے آپ کو حد درجہ محبت تھی، لیکن حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے عجیب والہانہ تعلق تھا جس کا اندازہ دشوار ہے، اس بات سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی یہ خواہش تھی کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے یہاں بلائیں، لیکن تقدیر نے امید بر لانے کی اجازت نہ دی اور حضرتؒ واصل بحق ہوگئے۔ حضرتؒ کے انتقال کے بعد آپ نے صاحبزادہ محترم حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی مدظلہ سے اسی خواہش کا اظہار کیا۔ صاحبزادہ محترم مدظلہ نے اس کو قبول کیا تو آپ نے یہ عہد کیا کہ میں صاحبزادہ محترم مدظلہ پر لُٹ جاؤں گا، چنانچہ آپ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ فروخت کیا جس کے ڈیڑھ سو روپے آئے اور آپ نے صاحبزادہ محترم مدظلہ

پر دو سو روپے خرچ کر ڈالے، کبھی ایسا نہ ہوا کہ حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نامی لیا گیا ہو اور آپ کی آنکھوں نے اشک نہ بہایا ہو۔

مکتبِ عشق کے انداز نرالے دیکھے اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے بحیثیت معلم ہائی اسکول میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ہائی اسکول کی مصروفیت کے بعد آپ کے اکثر اوقات عبادت وریاضت اور ترویج دین میں گذرتے۔ جنوبی ہند میں پولیس ایکشن کے بعد کسی سے اسلام کی اشاعت کیا ہوتی، اسلامی وضع قطع اختیار کرنا بھی موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا، حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ عام طور پر لوگ دین سے دور ہونے لگے اور دینی تعلیم کا خیال ان کے ذہنوں سے کوسوں دور ہو گیا، ایسے عالم میں آپ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہن سازی بھی کیا کرتے اور امت کے نونہالوں کو بڑی تمناؤں اور آرزوں کے ساتھ سرپرستوں سے مانگ کر اپنے گھر پر جملہ اخراجات کو پوری کفالت کا ذمہ لیتے ہوئے ان کو پڑھاتے پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند روانہ کرتے۔ یہی سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ آپ کے اس مجنونانہ جذبہ کو دیکھ کر گورنمنٹ کی جانب سے کچھ پابندیاں بھی لگائی گئیں، لیکن آپ کے عزم مصمم میں رتی برابر فرق نہ آیا بلکہ عزائم اور بلند ہوگئے۔ حتیٰ کہ سرکاری ملازمت کو دین کی اشاعت کے لئے بہت بڑا حرج محسوس کرتے ہوئے ۱۹۶۰ء میں آپ نے صرف دین کی خدمت کی خاطر اپنی ملازمت سے استعفیٰ پیش کیا اور پھر آزادانہ طور پر دینی تعلیم وتربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ سرکاری ملازمت کو ترک کرنے پر اقتصادی حالات سے دوچار ہونا پڑا، اکثر اوقات گھر میں فاقے ہوتے لیکن آپ کی نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس پر آپ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے فرماتے کہ آج ہمارے گھر انبیاء علیہم السلام کی سنت زندہ ہو رہی ہے۔

سب سے پہلے آپ نے دارالعلوم نانديڑ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، چھ سال یہاں مصروف خدمت رہے، پھر پانچ سال مدرسہ مصباح العلوم لاتور کو پروان چڑھایا، پھر ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں اپنے والد محترم جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر اودگیر تشریف لائے، اور اپنے دادا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قریشی کا ۱۳۱۵ھ مطابق

۱۸۹۵ء کو لگایا ہوا گلشن مدرسہ قاسم العلوم جس پر مردنی سی چھارہی تھی۔ آپ نے اسے خون جگر سے سینچ کر بام عروج پر پہنچایا اور اخیر تک مدرسہ قاسم العلوم اود گیر ہی آپ کی توجہات کا مرکز بنا رہا۔۔۔ آپ شخص واحد تھے لیکن کئی افراد کا کام کیا کرتے تھے، ان تمام ہی مدارس میں آپ ذمہ دار بھی تھے، مبلغ بھی، مدرس بھی، سفیر بھی، خادم بھی اور مخدوم بھی، بڑے سے بڑا کام کرنے پر آپ میں کوئی فخر تھا نہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں کوئی عار محسوس کرتے۔۔۔ ان مدارس کے علاوہ آپ نے علاقہ کی ضرورت پر عثمان آباد میں شمس العلوم (جو بعد میں قائم نہ رہ سکا) ملگاؤں میں دارالعلوم حسینیہ، رحمت نگر حیدر آباد میں مدرسہ معمورہ، ناندیڑ میں امداد العلوم، پاتوڑ کیمپ تعلقہ منجلیگاؤں میں مدرسہ عربیہ تجوید القرآن اور بیڑ میں شمس العلوم کی بنیاد رکھی، اور سارے جنوبی ہند میں آپ ہی نے دینی مدارس کی داغ بیل ڈالی، لوگوں میں مدارس کی ہر طرح امداد و اعانت کا مزاج بنایا، دینی تعلیم کی اہمیت پیدا کی اور ہزاروں شاگرد و مریدین اور سینکڑوں خلفاء کا ایک جم غفیر گاؤں، گاؤں، دیہات، دیہات جال کی طرح بچھا دیا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس علاقہ میں جو کچھ علماء و حفاظ نظر آتے ہیں وہ سب آپ کی بے لوث کاوشوں کی دین ہے کہ ان میں اکثر آپ کے براہ راست شاگرد یا شاگرد کے شاگرد ہیں اور آپ کی حیثیت استاذ الاساتذہ کی ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مدرسہ کی انتہائی مصروفیت کے باوجود ملی و اجتماعی مسائل میں بھی آپ کافی کوشاں تھے چنانچہ اپنے استاذ محترمؒ کے مشن جمعیۃ علماء سے بہت گہرا تعلق تھا سیاسی و مذہبی رہنما ہونے کے ناتے آپ کو تین بار جیل کی قید بند کی مشقتیں جھیلنی پڑیں۔۔۔ آپ ضلع عثمان آباد جمعیۃ علماء کے صدر بھی رہ چکے اور پھر جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے نائب صدر اور عمر کے آخری بہاروں میں جمعیۃ علماء مرہٹواڑہ کے سرپرست تھے۔ آپ جمعیۃ علماء کی وسعت اور اس کے استحکام کے لئے مستقل سفر کیا کرتے، نیز تحفظ شریعت، اصلاح معاشرہ، تعلیمی بیداری اور انفرادی و اجتماعی تعاون سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔

آپ کی شخصیت اسلام کا اجمالی تعارف تھی، آپ نمونۂ اسلاف اور محی السنہ تھے، عبادت و ریاضت، زہد و قناعت اور شب بیداری آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بلند ہمتی و بلند

نظری، عزم کی پختگی، راست روی آپ کی طبیعت تھی۔ عشق رسول اور محبت الٰہی آپ کی غذاء تھی۔ چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم آپ کے آداب تھے۔ تبحر علمی کے ساتھ خوش طبعی اور خوش مزاجی ایسی تھی کہ لوگ ہر آن آپ کو ہالے کی طرح گھیرے رہتے تھے۔ سخاوت ایسی کہ اپنی پرواہ کئے بغیر سب کچھ لٹا دیتے۔ اور عاجزی وانکساری میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے۔ ہر آنے والے کا حسبِ مرتبہ اعزاز واکرام فرماتے۔ اور آخر عمر تک اپنا کام آپ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ نہایت ضعف میں بھی کسی کا سہارا قبول نہ کیا۔ کوئی مہمان آجاتا تو افراد خانہ کی پرواہ کئے بغیر گھر میں جو کچھ حاضر ہوتا اس کے سامنے پیش کر دیتے۔ آپ کا طرز تعلیم آپ کی کرامت کا بین ثبوت تھا کہ ایک ہفتہ یا ایک عشرہ میں بآسانی "یسر نا القرآن" اور قرآن مجید ختم کرا دیتے اور صرف تین سال میں طلبہ کو تفسیر جلالین تک کامیابی کے ساتھ تعلیم دے کر اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ دلا دیتے دین کی خدمت ایسی وارفتگی کے ساتھ کرتے کہ ہر دیکھنے والا زبان حال سے مجنون کہتا۔۔ ان سب خوبیوں کے باوجود آپ ایک عام آدمی کی طرح رہتے تصنع سے انتہائی نفرت کرتے۔

تواضع کا طریقہ سیکھ لو صراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

آپ ایک جید عالم ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے باکرامت صوفی اور عارف باللہ بھی تھے۔ آپ نے سلوک و تصوف کے موضوع پر دس (۱۰) کتابیں تحریر فرمائیں۔ آپ کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور دکن کے قطبِ سابق و محدثِ دکن حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قطب دکن کا لقب دیا تھا اور یقیناً دکن میں آپ نے اسی شان سے خدمت کی کہ بے علموں کو علم سے نوازا، مردہ دلوں کو زندہ کیا، بے راہ روؤں کو راہ دکھائی تشنگان کو سیراب کیا، خدا کی معرفت سے آشنا کیا اور اُس کے ذکر کا ڈنکا بجادیا، سوتوں کو جگایا، بیٹھنے والوں کو کھڑا کیا اور جو کھڑے تھے ان کو دوڑنا سکھایا بلکہ سوتوں کو جگا کر دوڑنے والا بنادیا۔

آپ پر فالج کے دو حملے ہوئے جس کی بنا پر بڑی نقاہت ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود امت کی فکر ایسی تھی کہ آپ نے اپنے اوپر آرام کو حرام کر دیا تھا، پیروں سے معذور تھے لیکن عزم کی پختگی سے ہزاروں میل کا سفر آپ کے لئے آسان ہو جاتا تھا۔ مرض الوفات میں بھی آپ کا

عزم وہمت اور استقلال جوانوں سے بھی زیادہ جوان تھا گویا یہ شعر آپ کی جامعیت اور کاملیت کے مطابق حال تھا۔

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ / ۲۹ جولائی ۱۹۹۶ء بروز پیر سہ بارہ فالج کا حملہ ہوا جس سے آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی اسی حال میں آپ کو لاتور وویکانند ہسپتال لے جایا گیا۔ آپ قریب پندرہ روز اس میں زیر علاج رہے لیکن دوا کارگر نہ ہو سکی۔

میں ہوں مریض عشق نہ ہو گی مجھے شفا

لے جا کے کیا کرو گے مسیحا کے سامنے

بالآخر چودھویں دن، پھر ایک بار فالج کا حملہ ہوا جو پچھلے تین حملوں سے بھی زیادہ سخت تھا، جس کو آپ برداشت نہ کر سکے اور ۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۹۹۶ء اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں بارہ بج کر بیس منٹ پر علوم نبوت کا وارث، دکن کا قطب، دین اسلام کا داعی، ملت کا رہبر و خیر خواہ اپنے محبوب سے جاملا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہائے اسلام تیرے چاہنے والے نہ رہے

جن کا تو چاند تھا افسوس وہ ہالے نہ رہے

روح پرواز ہو چکی تھی، قلب جاری وساری، یاد الٰہی کی حلاوت میں سرشار تھا اور شہادت کی انگلی وحدانیت کی گواہی دے رہی تھی۔۔۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر اراضئ مدرسہ قاسم العلوم اودگیر کے مقابل میدان میں پڑھائی گئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں محبین و ارفتگین نے شرکت کی۔ پھر آپ کو مسجد بیگ جی صاحبؒ اودگیر کے قبرستان میں والد محترمؒ کے جوار میں رکھا گیا۔ آپ کے سانحہ ارتحال پر سارا علاقہ سوگوار تھا، گویا موت العالم موت العالم کا منظر بنا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت میں بلند سے بلند درجہ نصیب فرمائے، علاقے کے اس خلا کو پُر فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

قلمزن محمد عثمان المعروفی ۱۴۱۷ھ

ذوق محمد عثمان المعروفی ۱۹۹۶ء

تاریخی لوح نمایاں

نَحْمَدُ الحیَّ الجَلِیْلَ العَظِیْمَ وَنُصَلِّی عَلَی النَّبیِّ الکَرِیْم

۱۹۹۶ء

قبر شیر خدا ۱۴۱۷ھ

مزار فیض گنجور ۱۴۱۷ھ

بآہ حضرت ۱۴۱۷ھ

پاک باطن مولانا محمود حسن مفتی دار العلوم دیوبند ۱۴۱۷ھ

یاد زاہد حضرت مولانا محمود حسن صاحب گنگوہی ۱۹۹۶ء

معروف مفتی اعظم ھند ۱۹۹۶ء

برد مضجعه الحی العزیز الحلیم ۱۴۱۷ھ

نور مرقده العظیم الهادی الرحیم ۱۹۹۶ء

رحمة الاول الوهاب العظیم ۱۴۱۷ھ

أعُوذُ باللہ القوی المقسط من الشیطن الرجیم ۱۹۹۶ء

بسم اللہ الحسیب الفتاح الرحمن الرحیم ۱۴۱۷ھ

قال الهادی الودود، وسقاهم ربهم شرابا طهوراً ۱۴۱۷ھ

إن رَحْمَتَ اللہِ قَرِیْبٌ مِنَ المُحسِنِیْن ۱۴۱۷ھ

قال حبیب اللہ الوالی الوکیل، الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب ۱۴۱۷ھ

اکرام المعید الحکم علیکم ادخلوا الجنه ۱۴۱۷ھ

مَوتُ العالِم اللئیق مَوتُ العَالَم ۱۴۱۷ھ

إن اللہ العلی الجلیل یرفع العلمَ برفع العُلماء ۱۴۱۷ھ

بچراغ معرفت ۱۹۹۶ء

پیرِ ھدیٰ محب مولیٰ شیخِ طریقت ۱۹۹۶ء

رسید بمغفرت ۱۹۹۶ء

بر خاکِ پاک او دمادم ابر سلامتی شود ۱۹۹۶ء

فقیہ ملت عالی ہمم مولانا محمود حسن صاحب گنگوہی

۱۴۱۷ھ

طالب اوج مولانا محمود حسن مفتی اعظم ہند

۱۹۹۶ء

اطیب قطعۂ تاریخ

۱۴۱۷ھ

چل بسا ہے مفتی اعظم جو تھا شانِ چمن — نام نامی جس کا تھا مولانا محمود حسن

اک فقیہِ بے مثال اک مفتیِ حاضر جواب — ماہرِ اسرار دیں بھی اور اک رنگیں سخن

مرجع علمائے دیں تھا اک زعیمِ مقتدا — بحرِ علم و شیخ وقت و ہادی قوم و وطن

ایک اعلیٰ مفتیِ دارالعلوم دیوبند — پُر بصیرت قول جس کا بالیقیں دُرِّ عدن

لرزہ براندام جس سے فتنۂ مودودیت — واعظِ گوہر فشاں تھا نازشِ صد انجمن

اس کی مجلس زعفرانی پُر مسرت شادماں — ہوتے تھے کافور جس کی بزم میں رنج و محن

موت عالِم موت عالَم، چشمِ عالَم کیوں ہے نم — پُر ہو کیونکر یہ خلا اے ماہرِ ہر علم و فن

دو ستمبر عیسوی انیس سو اور چھانوے — چودہ سو اور سترہ ہجری میں رحلت جان و تن

جوہر ذاتی (۱۳۲۵ھ) ولادت عمر تیری ہے نبیلِ (۹۲) — قاضی الشہر (۱۴۱۷ھ) ہے رحلت تیری اے فخر زمن

ہے تولد عیسوی تابش چراغ (۱۹۰۷ء) اور عمر فہد (۸۹) — نور ہے باغات لاثانی (۱۹۹۶ء) تری موتِ حسن

مرتبہ عالی ترا ہو جنت الفردوس میں — ہے دعا عثمان معروفی کی رب ذوالمنن

محمد عثمان المعروفی کان الملک لہ (۱۴۱۷ھ) — بقلم عقیدت آگیں (۱۹۹۶ء) محمد عثمان معروفی

تاثراتِ دل

بیاد حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ

از عبدالوحید قاسمی ایم۔اے

نقیبِ موسمِ گُل تھا متاعِ عزت تھا
وہ دورِ شوکت و اقبال کی علامت تھا
گذر گیا سر یہ آراءِ علم و حکمت تھا
وہ فخرِ دین کا پروردہ فخرِ ملت تھا

اداسیوں کے ہر اک سمت سلسلے کیوں ہیں
تھکن سے چور ہمارے یہ قافلے کیوں ہیں
یہ کس کے جانے سے دنیائے علم سونی ہے
فضائے صحنِ چمن ماتمی ہے خونی ہے

پیامِ نو تھا ہر اک فن کے راہ رو کے لئے
خدا کی رحمت و انعام نسلِ نو کے لئے
علومِ دین کی امانت کا پاسبان تھا وہ
دیارِ شرق کی عظمت کا اک نشان تھا وہ

اب اپنے خواب کی تعبیر کون لکھے گا
ہمارے عہد کی تاریخ کون لکھے گا
اے شمعِ خفتۂ زندہ دلانِ اعظم گڈھ
بہارِ رفتۂ دیں پروانِ اعظم گڈھ

تم اپنی صورت و سیرت میں رشکِ اختر تھے
تم اسمِ عرف میں کہتے ہیں لوگ اطہر تھے
حسین پھول تھا وہ ایک باغِ امت کا
یہ کس ہوا نے بجھایا چراغ امت کا

اف اے وحید کہ ابرِ گریز پا تھا وہ
ہمارے شہر کے لئے سایۂ ہما تھا وہ

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دے کر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اس لئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کارخیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

پتہ

ڈرافٹ و چیک کے لئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076

اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

ماہ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۱	فی شمارہ۔ /۶	سالانہ۔ /۶۰

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند، سہارنپور۔ یو، پی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ۔ /۴۰۰ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم۔ /۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم۔ /۸۰ ہندوستان سے۔ /۶۰

Ph. 01336-22429 Pin-247554

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

کمپیوٹر کتابت نواز پبلی کیشنز دیوبند

حرف آغاز

عصر حاضر کو تحقیق و ترقی اور تہذیب و تمدن کا دور کہا جاتا ہے، نت نئی ایجادات و اکتشافات نے آج کے انسان کے حوصلے بہت بلند کر دیئے ہیں، اور وہ زمین کی پنہائیوں اور سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے کے بعد آفتاب و ماہتاب پر کمندیں ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، علم و فن کے ذریعہ دھات کے بے جان پرزوں سے انسانی دماغ کا کام لیا جارہا ہے، مہینوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کر لینا ایک معمولی بات ہے، ابلاغ و ارسال کے ایسے کامیاب ذرائع مہیا کر لئے گئے ہیں کہ چند لمحوں میں اپنی بات پوری دنیا میں پھیلائی جا سکتی ہے، آرام و آسائش اور تزئین و آرائش کے ایسے ایسے سامان تیار ہو گئے ہیں کہ ایک صدی پہلے کا انسان ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اب تو تمدن کا معیار اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں اور ہواؤں کا پر کترتی مرسڈیز کاریں اپنا عروج اور وقار کھوتی جارہی ہیں، ماکولات و ملبوسات کی اتنی قسمیں بنالی گئی ہیں کہ انھیں شمار میں لانا بھی مشکل ہے، غرضیکہ آرام و راحت، اطمینان و سکون، تہذیب و تزئین اور زیبائش و آرائش کے اسباب کی اس درجہ فراوانی اور کثرت کہ آج کے کوردہ اور پسماندہ دیہات بھی پہلے کے قصبات اور شہروں سے کہیں

زیادہ پُر تکلف اور بارونق نظر آتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس مادی عروج و ترقی، ظاہری چمک دمک اور سامانِ راحت کی اس کثرت سے انسان کو چین و سکون اور امن و اطمینان حاصل ہو گیا ہے؟ قلب کو تسکین اور روح کو آسودگی مل گئی ہے؟ اور کیا واقعی تہذیب و تمدن کے ان پُر شور نعروں کی بدولت آج کا انسان پہلے سے زیادہ شائستہ اور مہذب ہو گیا ہے؟ اگر آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دنیا کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ان سارے سوالوں کا جواب آپ کو مایوس کن نفی میں ملے گا، اور مشاہدہ و تجربہ گواہ ہیں کہ آرام و راحت کے یہ اسباب جس قدر بڑھتے جارہے ہیں، قلب کے اضطراب اور روح کی بے چینی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جارہا ہے اور فریب تمدن کے دام صدرنگ میں گرفتار انسانیت تڑپ رہی ہے اور تلاشِ سکون میں دردر کی ٹھوکریں کھارہی ہے، مگر یہ متاع گمشدہ کہیں سے ہاتھ نہیں لگ رہی ہے، عدل و امانت، صبر و قناعت، عفت و حیا، صدق و صفا، اخلاص و محبت، شرافت و مروت، لحاظ و پاسداری، سیر چشمی و خودداری وغیرہ اعلیٰ قدریں جن سے انسانیت عبارت تھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئی ہیں اور انسان اندر سے بالکل بے مایہ اور کھوکھلا ہو کر رہ گیا ہے۔

علم و فن تحقیق و جستجو اور عروج و ترقی کے اس دور میں آخر انسانیت کیوں تباہ ہو رہی ہے، اس کی خلش روز بروز کیوں بڑھتی جارہی ہے اور اس کے اضطراب و انتشار میں آئے دن کیوں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اگر حقیقتاً ہمیں سچے سکون کی طلب ہے اور ہم روح کی آسودگی اور قلب کے چین کے متلاشی ہیں تو ہمیں ان اسباب و عوامل کی کھوج لگانی چاہئے۔ جن کے ذریعہ یہ جنس گرانمایہ حاصل کی جاسکتی ہے، ہم نے ایک طویل عرصہ تک دھات و بھاپ پر محنت کر کے دیکھ لیا، زمین کے پوشیدہ خزانوں کی تحقیق کر ڈالی، آفتاب کی کرنوں اور بجلی کی لہروں کو بھی آزما چکے ہیں۔ ان سب کے دامن اس گوہر نایاب سے خالی ہیں، ہم نے استعماریت و اشتراکیت کا بھی تجربہ کر لیا ہے مگر ان آستانوں سے بھی یہ متاع عزیز ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔

مگر ان مسلسل محرومیوں اور تجربات کی پیہم ناکامیوں سے مایوس ہو کر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں، ہمیں ابھی ایک تجربہ اور کرنا چاہئے، حاضر کے ان پُرفریب و پُرشور نعروں کے درمیان حق و صداقت کی ایک مدھم سی آواز بھی سنائی دے رہی ہے، آیئے کان لگا کر سنیں ممکن ہے روح کو تسکین اور قلب کو آرام کا سامان یہیں فراہم ہو جائے، قرآن حکیم بھٹکی ہوئی انسانیت کو دعوت دے رہا ہے کہ اسے گم کردہ راہ انسانوں دنیا کے ان گورکھ دھندوں میں پھنس کر اپنے آپ کو ضائع مت کرو اگر تمھیں سکون قلب کی تلاش ہے تو آؤ میرے پاس آؤ تمھارے گوہر مقصود کا پتہ میں اور صرف میں ہی بتاسکتا ہوں کیونکہ اس بیش بہا امانت کا امین و محافظ میں ہی ہوں، کان کھول کر غور سے سن لو "اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" اللہ تعالیٰ ہی کی یاد سے قلوب چین پائیں گے، یعنی دولت و حکومت، منصب و جاگیر، مادی ایجادات و اکتشافات، ظاہری عروج و ترقی، اسباب راحت کی فراوانی، ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کو حقیقی سکون و اطمینان سے ہم آغوش نہیں کر سکتی، صرف یاد الٰہی اور ذکر اللہ کا نور ہی دلوں سے ہر طرح کی وحشت گھبراہٹ اور اضطراب و انتشار کو دور کر سکتا ہے۔

یہ اس کتاب مقدس کا اعلان ہے جس کی صداقت اور سچائی کو چودہ سو سال کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود آج تک چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے، ابتدائے نزول سے آج تک اس کا ہر اعلان اور ہر پیشین گوئی حرف بحرف درست ہوتی رہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ایک بار صدق دلی سے اس کا بھی تجربہ کر لیا جائے۔

مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ

المسند، امام اہل السنۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی شاہکار تصنیف ہے، جس کو بجا طور پر احادیث شریفہ کا خزانہ اور دائرۃ المعارف کہا جاتا ہے۔ حافظ ابو موسی المدینی المتوفی ۵۸۹ھ فرماتے ہیں :

هذا الكتاب اصل كبير و مرجع وثيق لاصحاب الحديث، انتقى من حديث كثير و مسموعات وافرة نجعله اماماً و معتمداً وعند التنازع ملجأ ومستنداً .....

یہ کتاب اصحاب حدیث کے لئے بہت بڑی بنیاد اور قابل اعتماد مرجع ہے جس کو بہت سی احادیث اور بہت بڑی تعداد میں سنی ہوئی احادیث سے منتخب کیا گیا ہے اس کو رہنما اور قابل اعتماد کتاب بنایا ہے یہ کتاب اختلاف کے وقت ملجا اور قابل سند ہے۔

امام صاحبؒ نے اس کتاب کو جمع کرنے کے لئے کئی ملکوں کے سفر کئے، اور بے مثال محنت اور غیر معمولی مجاہدات کر کے اس قابل قدر ذخیرہ کو جمع فرمایا ہے۔

حضرت عطا کا بیان ہے کہ امام احمدؒ نے ۱۸٦ھ سے تدوین حدیث شریف کے کام کی ابتداء کر دی تھی، جب کہ آپ کی عمر ۱٦ سال تھی، اور یہ بات خود امام احمدؒ سے بھی منقول ہے فقد جاء فی کتابہ المنهاج ما نصه: كان ابتدائه سنہ ۱۸۰ھ ثمانين ومائتله

امام صاحب حدیث شریف کے علاوہ دیگر علوم اسلامیہ کو منضبط کرنا پسند نہیں فرماتے تھے تاکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لوگوں کے لئے اصل مرجع باقی رہیں۔ حتی کہ امام صاحبؒ نے فقہ کی بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ایک بار فرزند ارجمند عبداللہ

ا۔ مخطوط طبقات الحنابلہ ص ۲۱ بدار الکتب

نے سوال کیا کہ۔

لِماکرِهتَ وضعَ الکتاب وقد عمِلتَ المسند تو آپ نے جواباً فرمایا کہ عملتُ هذا الکتابَ اماماً اذا اختلف الناسُ رجعوا الیه......

آپ نے صرف ایک ہی مقصد طے کر لیا تھا کہ جتنے ثقات سے ملاقات ہو ان سے حدیثیں سنکر جمع کرلی جائیں۔ جو محدثین شہر اور قریب کے تھے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اور جو دوسرے علاقوں میں تھے تو وہاں تک سفر کر کے حاصل فرماتے تھے۔ اور چاہے اس سفر میں کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔

ڈاکٹر محمد رجب البیومی کے بلیغ الفاظ ملاحظہ فرمائیں :

والرحلة فی عهدِ احمد عناء لازب وجُهد مرهق، فلا طریق مُعَبّد و لانفقة تهیّئ الدابة الذلول بل اعتساف فی الوعر والسهل، و خبط فی الصخر والقفر، و صبر علی الفاقة والحرمان، مع ترفع کریم عن العطاء و تأدب شریف علی الهوان والاستجداء[1]

سفر امام احمد کے زمانہ میں پر مشقت اور تکلیف دہ محنت تھی نہ توراہیں ہموار تھیں نہ مصارف کا انتظام تھا کہ تابعدار سواری مہیا کرلی جاتی بلکہ سخت اور نرم زمین میں بھٹک جانے کا اندیشہ تھا اور پہاڑی اور چٹیل زمین میں اندھادھند چلنے کا نام تھا، فاقہ اور محرومی پر صبر کرنا پڑتا تھا امام احمد کی طبیعت میں ہدایا سے شریفانہ انکار بھی تھا اور رسوائی اور مانگنے سے مزاج میں تنفر تھا۔

امام احمدؒ اس طرح احادیث کو مختلف اوراق اور اجزاء میں جمع فرماتے رہے۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب ہونے لگا تو آپ نے اپنے صاحبزادوں اور گھر والوں کو جمع کر کے اس مجموعہ کو سنا کر املا کرایا۔ تاکہ یہ مجموعہ ضائع نہ ہو جائے مگر امام صاحب اس کی ترتیب اور تہذیب نہ کر سکے۔ علامہ شمس الدین الجزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

ان الامام احمد شرع فی جمع المسند، فکتبه فی اوراق وفرقه فی اجزاء متفرقة علی نحو ما یکون المسودة، ثم جاء حلول المنیة فبادر باسماعه لاولاده و اهل بیته ومات قبل تنقیحه و تهذیبه فبقی علی حاله، ثم ان ابنه عبد الله الحق به ما یشاکله وضمّ الیه من مسموعاته مایشابهه ویماثله[2]

امام احمد نے سند جمع کرنا شروع کیا تو اس کو مختلف اوراق میں لکھا اور اس کو متفرق اجزاء

۱۔ ابن حنبل ص ۲۵ مطبوعہ ۱۴۱۵ء ۲۔ مقدمہ المسند تحقیق احمد شاکر

میں بانٹا جیسے مسودہ تیار کیا جاتا ہے پھر جب قرب اجل کا احساس ہوا تو جلدی سے کتاب اپنی اولاد اور گھر والوں کو سنادی اور اس کی تنقیح و تہذیب سے پہلے ہی آپ کی وفات ہوگئی اور کتاب بحالہ رہ گئی پھر آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے مسند میں وہ حدیثیں ملائیں جو مسند کے مشابہ تھیں اور اپنی مسموعات میں سے جو مسند کے مشابہ اور مماثل (یعنی علی شرط المسند) تھیں ان کو کتاب میں شامل کیا۔

علامہ جزریؒ کی اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرزندوں اور گھر والوں کے علاوہ اور لوگوں نے امام سے ان احادیث کو نہیں سنا، جب کہ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ لوگ امام صاحب کی خدمت میں آتے تھے اور آپ ان کو کتاب نکال کر سنایا کرتے تھے۔ مگر اصل بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ درس میں آپ مجموعہ کے مختلف اجزاء سناتے تھے، مگر قرب وفات پر اپنے شاگرد خصوصی اور صاحبزادوں کو مکمل مجموعہ سنا کر املا کرادیا۔

علامہ جزری کی مذکورہ عبارت سے ایک دوسری بات بھی معلوم ہورہی ہے کہ مسند کے موجودہ نسخہ میں اس وقت جو روایتیں ہیں وہ سب امام احمدؒ کی سنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان کے فاضل و ثقہ فرزند عبداللہ بن احمد نے اپنی مسموعات کو بھی اس میں شامل فرمادیا ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ مسموعات امام احمدؒ کے علاوہ دوسرے شیوخ کی ہیں بلکہ یہ وہ روایتیں ہیں جو انھوں نے اپنے والد سے سنی تھیں مگر وہ اس تحریری مسودے میں شامل نہیں تھیں جس کو امام احمدؒ نے وفات سے قبل سنایا تھا۔

گویا کہ مسند کی روایات کی دو طرح تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک وہ روایات جن کو امام نے اپنے فرزندوں کو سنایا اور املا کرایا تھا دوسری وہ روایات جن کو اس آخری وقت میں سنانے کا موقع نہیں ملا مگر صرف عبداللہ بن احمد نے اپنے والد سے سنا تھا۔ اس طرح پورا مجموعہ امام احمدؒ کی روایات ہی کا ہو جاتا ہے۔ شیخ ابوزہرۃ کے الفاظ یہ ہیں :۔ ویکون بهذا ما رواه ابن احمد عن ابيه قسمين احدهما كان باملاء ابيه مع اولاده و اهل بيته، و ثانيهما لم يكن باملاء احمد في هذه الفترة الضيقة بل كان بسماع عبد الله عن ابيه خاصة و بهذا كان المجموع كله هو المسند برواية احمد ......

بہر حال اس کا جو بھی جواب دیا جائے مگر بعض علماء فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن احمد کے زیادات مسند میں شامل ہیں۔ چاہے ان کے والد کی روایات ہوں یا ان کی روایات کے مشابہ

دیگر ثقہ حضرات کی ہوں۔ البتہ یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ عبداللہ بن احمد خود ثقہ ہیں، اس لئے ان کی زیادات کو قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہونا چاہئے۔[1]

مسند کے راوی طلباء حدیث شریف کے ہاتھوں میں اس وقت مسند احمد کے جو نسخے متداول ہیں اس کے راوی عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ ہیں اس لئے ان کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہے کہ ناقل کے ثقہ ہونے سے منقول کا ثقہ اور قابل اعتماد ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ کی ولادت ۲۱۳ھ میں اور وفات ۲۹۰ھ میں ہوئی ہے امام احمدؒ اپنی اولاد کی تعلیم اور تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے اور خاص طور پر ان کو علوم حدیث کی ترغیب دیکر اس کی طرف متوجہ فرمایا۔ دوسرے فرزندوں کے مقابل عبداللہ بن احمد علم حدیث شریف کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے اس لئے وہ امام احمدؒ کی خصوصی توجہ کے مستحق بن گئے۔ امام احمد ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی فرماتے تھے اور زیادہ سے زیادہ احادیث سننے اور یاد کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ عبداللہ اپنے والد مکرم کے علاوہ دیگر محدثین سے بھی سماع حدیث فرماتے تھے۔ اور اپنے والد صاحب کو سناتے تھے۔ فرماتے ہیں :۔

كنت اعرض على ابى الحديث فارى في وجهه التغير ويقول كأنك تطلب مالم اسمعه۔ میں اپنے والد کو حدیث سناتا تھا تو ان کے چہرہ پر تغیر محسوس کرتا اور فرماتے تھے کہ تم میری سنائی ہوئی روایات کے علاوہ بھی تلاش کرتے ہو۔

اور والد مکرم کے سامنے پیش کرنے کا منشأ یہ تھا کہ وہ ان روایات کے بارے میں بھی غور فرماویں اور اس کی اجازت مرحمت فرمادیں امام احمدؒ کو ان کا یہ طرز پسند تھا اور فرماتے تھے کہ ابنی عبداللہ محظوظ من علم الحدیث عبداللہ بن احمد کے مقام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ باوجود امام احمد کے فرزند ہونے اور عمر میں کم ہونے کے خود امام احمد ان سے روایت کرتے ہیں بلاشبہ امام احمد ان کی روایات کو قبول فرماتے تھے۔ عبداللہ امام احمد کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق اور محدثین اور ثقہ راویوں سے حدیثیں سن کر یاد کرتے تھے۔

۱۔ عرف میں "زیادات عبداللہ" وہ روایات کہلاتی ہیں جو عبداللہ نے اپنے والد کے علاوہ دیگر شیوخ کی مسموعات سے کتاب میں شامل کی ہیں اور انکی سندیں ممتاز ہیں اور مسند احمد کی روایتیں وہ ہیں جن میں عبداللہ حدثنی ابی کہتے ہیں۔ ذہبی نے ان تمام اساتذہ کی فہرست دی ہے جن سے عبداللہ نے مسند میں روایتیں بڑھائی ہیں اور لکھا ہے وله زيادات كثيرة في "مسند" والده واضحة عن عوالي شيوخه سير اعلام النبلاء ج ۱۳ ص ۵۲۲

ابن عدی فرماتے ہیں:

نبل عبد الله بابیه وله فی نفسه محل من العلم احیا علم ابیه بمسنده الذی قرأه ابوه علیه خصوصا ولم یکتب من احد الامن امره ابوه ان یکتب عنه۔

عبد اللہ نے اپنے والد مکرم سے کمال حاصل کیا ہے ان کے دل (امام احمدؒ) میں عبد اللہ کے لئے خاص مقام تھا اس مسند کے ذریعہ انہوں نے اپنے والد کے علم کو زندہ جاوید بنادیا اور انہوں نے صرف ان روایات کو لکھا جس کے بارے میں ان کے والد نے لکھنے کا مشورہ دیا۔

اسی لئے علماء کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ عبد اللہ بن احمد اپنے والد امام احمدؒ کی مرویات کے بہترین راوی ہیں ابو یعلی نے طبقات میں لکھا ہے:۔

قرات کتاب ابی الحسین بن المنادی و ذکر عبد الله و صالحا (ولدی احمد) فقال کان صالح قلیل الکتابة عن ابیه، اما عبد الله فلم یکن فی الدنیا احد اروی عن ابیه رحمه الله عنه۔[1]

میں نے ابو الحسین بن المنادی کی کتاب کا مطالعہ کیا انہوں نے عبد اللہ اور صالح (امام احمدؒ کے دونوں فرزندوں) کا ذکر فرمایا وہ فرماتے ہیں کہ صالح اپنے والد کی روایات بہت کم لکھتے تھے مگر عبد اللہ سے زیادہ ان کے والد کی روایات لکھنے والا دنیا میں اور کوئی شخص نہیں تھا

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء عبد اللہ بن احمد کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتماد اور ثقہ جانتے تھے۔

پھر عبد اللہ بن احمد سے ان کے شاگرد قطیعی سند کی روایت کرتے ہیں۔[2]

امام ابن تیمیہؒ کا دعوی ہے کہ قطیعی نے بھی مسند کی روایات میں اضافہ کیا ہے۔ اور اس کی زیادات میں بعض ضعیف روایتیں بھی ہیں (مگر بعض علماء نے ابن تیمیہؒ کے اس دعوی کو رد کر دیا ہے اور مسند کے دفاع میں مستقل رسالے لکھے گئے ہیں)

مسند کی ترتیب

عبد اللہ بن احمد اپنے والد سے روایت کرتے رہے۔ اور ان کے علم کو لوگوں میں پھیلاتے رہے پھر ایک راوی سے دوسرے راوی تسلسل کے ساتھ ان روایتوں کو بیان کرتے تھے اور یہ رواۃ ثقات تھے۔ اس طرح یہ قیمتی سرمایہ اور علم

1۔ وما زلنا نری اکابر شیوخنا یشهدون له بمعرفة الرجال وعلل الحدیث والمواظبة علی طلب الحدیث ویذکرون عن اسلافهم الاقرار له بذالك۔ (طبقات الحنابله) صفحہ ۱۳۲

2۔ العالم هو الشیخ المحدث المفید الثقة ابوبکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالك بن شبیب بن عبد الله القطیعی البغدادی. سکن قطیعة الدقیق فنسب الیه

کا خزانہ بعد کی نسلوں تک منتقل ہوتا رہا۔ ہر دور کے علماء نے اس کو محفوظ کیا اور اس کو قبول کیا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ہی نے مسند کی موجودہ ترتیب قائم فرمائی ہے ان کے بعد دیگر محدثین اور حفاظ نے کوشش کی کہ اس کی ترتیب کو بدل کر کتب صحاح کے طرز پر اس کو ترتیب دیں جیساکہ بخاری شریف، مسلم شریف، اور سنن ابوداؤد ہے کیونکہ ان کتابوں کی ترتیب موضوعات کے مطابق ہے۔ اس سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

مگر مسند کی جو ترتیب عبداللہ بن احمد سے منقول ہے وہ موضوعات کے مطابق نہیں بلکہ صحابہ کی مرویات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے مثلاً حضرت ابوبکرؓ کی مرویات پھر عمرؓ اور خلفائے راشدین اور فقہاء صحابہ میں سے حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعودؓ ابن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہم۔ مگر کسی ایک موضوع کی حدیث شریف کی تلاش کرنے والوں کو اس ترتیب میں دشواری پیش آتی ہے

اسی لئے علامہ ذہبیؒ نے لکھا کہ :

لو انه حرر ترتيب المسند وقرب وهذب لاتى اسنى المقاصد فلعل الله تبارك و تعالى ان يقيض لهذا الديوان السامى من يخدمه ويبوبه ويتكلم عن رجاله او ترتيب هيئته ووضعه، فانه محتوعلى اكثر الحديث النبوى ان شاء الله تعالى وقل ان يثبت حديث الا هو فيه.

اگر وہ مسند کو مرتب کر کے لکھتے اور اس کی تہذیب کر لیتے تو بہت اعلیٰ مقصد حاصل ہوتا، شاید اللہ تبارک تعالیٰ کسی اور کو توفیق عطا فرمادے جو اس عظیم اور بلند کتاب کی خدمت کرے اس کی ترتیب کرے، اس کے رجال پر کلام کرے اور اس کی شکل و وضع پر محنت کرے اس لئے کہ یہ کتاب حدیث پاک کے بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے بہت کم ایسا ہوگا کہ کوئی حدیث ثابت ہو اور وہ اس میں موجود نہ ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء کو اس ترتیب میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔

پھر عبداللہ حدیث مرسل میں صحابی کا نام ذکر نہیں فرماتے بلکہ مسند نافع مولی بن عمر یا مسند سعید بن المسیب، مسند شہاب لکھ دیتے ہیں۔

البتہ اس ترتیب میں ایک دوسرے لحاظ سے بڑا فائدہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی بھی معین صحابیؓ کا فقہ جاننا چاہے تو ان کی مرویات دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے مثلاً کوئی فقہ عمرؓ کو جاننا چاہتا ہے تو ان کی مرویات کا مطالعہ کر سکتا ہے اسی طرح دیگر صحابہ و تابعین اور اس طرح ان کے طرز فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پھر صحابہ کے مسانید کو بھی حروف تہجی کے مطابق مرتب نہیں کیا گیا بلکہ ان کی افضلیت کا خیال رکھا گیا، اس لئے پہلے عشرہ مبشرہ اور اس کے بعد درجہ بدرجہ دیگر صحابہ و تابعین کی مرویات ذکر کی گئیں

بعض حفاظ حدیث نے اس ترتیب میں تھوڑی تبدیلی اور تقریب کی سعی فرمائی علامہ جزریؒ فرماتے ہیں :۔

واما ترتیب هذا المسند فقد اقام الله تعالی لترتیبه شیخنا خاتمة الحفاظ الامام الورع ابا بکر محمد بن عبد الله بن المحب الصامت رحمه الله تعالی، فرتبه علی معجم الصحابة ، ورتب الرواة کذلك، وتعب فیه کثیرا، ثم ان شیخنا الامام مورخ الاسلام وحافظ الشام عماد الدین ابا السند ، اسمعیل بن کثیر رحمه الله تعالی اخذهذا الکتاب المرتب من مؤلفه واضاف الیه احادیث الکتب الستة ، معجم الضبرانی الکبیر، ومسند البزار، مسند ابی یعلی الموصلی، واجهد نفسه کثیرا وتعب فیه تعبا عظیما، واکمله الا بعض مسند ابی هریرة فاند مات قبل ان یکمله، فانه عوجل بکف بصره وقال لی رحمه الله ما زلت اکتب فیه الی اللیل حتی ذهب بصری معه ولعلی الله یقیض من یکمله.

بہرحال جہاں تک اس کی ترتیب کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے شیخ۔ عبداللہ بن الصامتؒ کو اس کام کے لئے مامور فرمایا تو انہوں نے اس کتاب کو معجم صحابہ پر مرتب فرمایا اور رواۃ کی ترتیب دی اس کے بعد ہمارے شیخ۔۔ ابن کثیرؒ نے اس مرتب نسخہ کو مؤلف سے حاصل کر کے اس میں کتب ستہ اور معجم طبرانی، مسند بزار مسند ابی یعلی کی احادیث کا اضافہ فرمایا اور اس کام میں بے انتہا مشقت برداشت فرمائی، مسند ابی ہریرہ کو چھوڑ کر باقی حصہ کو مکمل فرمایا۔ مسند ابی ھریرہ کی ترتیب سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں رات کے اکثر حصہ میں لکھا کرتا تھا یہاں تک کے میری بینائی ختم ہو گئی۔ شاید اللہ تعالیٰ اس باقی حصہ کی تکمیل اور ترتیب کے لئے کسی اور شخص کو توفیق عطا فرمادے۔

علامہ جزریؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظ حدیث اس کی ترتیب بالکلیہ تبدیل کئے بغیر تقریب کی کوشش کرتے رہے اور بعضوں نے اس میں دیگر کتابوں کے مجموعات کو شامل کر کے اس کو حدیث شریف کا ایک مکمل مجموعہ بنانے کی بھی محنت کی کہ صحاح وغیرہ دیگر کتب کی جو روایت مسند میں نہیں تھی اس کو بھی شامل کرنا چاہا بلا شک یہ بہت عظیم کارنامہ تھا، کیونکہ اس طرح ایک ہی کتاب میں جملہ احادیث شامل ہو جاتیں اور اگر اس کو پھر موضوعات کے مطابق ترتیب دیا جاتا تو اس کی افادیت مکمل ہو جاتی۔ مگر حافظ ابن کثیرؒ کا

کام مکمل نہ ہو سکا اور اس روشن دل عالم کی ظاہری بینائی تکمیل سے قبل جاتی رہی خصوصاً حضرت ابوھریرہؓ کی روایتوں کا باقی رہ جانا بڑے ذخیرہ کا چھوٹ جانا ہے۔

مسند کی روایات امام احمدؒ اپنے دور کے ثقہ راویوں کی جملہ روایتوں کو جمع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک ہر وہ شخص ثقہ سمجھا جاتا تھا جو عمداً کذب کا مرتکب نہ ہوتا ہو اور اہل تقوی کی روایتوں کو قبول فرمالیتے تھے، اگرچہ ان کا حفظ کامل نہ ہو البتہ اگر ان لوگوں کی روایتوں کے مقابل اصحاب ضبط کی کوئی روایت معارض ہوتی تو اصحاب ضبط کی روایت ہی کو اختیار فرماتے علامہ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں۔

قد يكون الرجل عنده ضعيفا لكثرة الغلط في حديثه ويكون حديثه الغالب عليه الصحة فيروون عنه لاجل الاعتبار و الاعتضاد فان تعدد الطرق و كثرتها يقوى بعضها بعضا حتى يحصل العلم به۔	کبھی راوی امام احمدؒ کے نزدیک اس وجہ سے ضعیف ہوتا تھا کہ اس کی احادیث میں بکثرت اغلاط پائی جاتی تھیں اور کبھی راوی کی اکثر حدیثیں صحیح ہوتیں تو محدثین اس سے متابعت و شواہد کے طور پر روایتیں کرتے تھے کیونکہ اسانید کے تعدد اور کثرت کی وجہ سے بعض کو بعض سے ایسی قوت حاصل ہوتی ہے کہ وہ حدیث مفید علم ہو جاتی ہے۔

اسکی مثال عبداللہ بن لہیعہ ہیں جن کا شمار اکابر مسندین میں تھا اور وہ مصر کے قاضی بھی تھے کثیر الحدیث تھے، مگر ان کی کتابیں آگ میں خاکستر ہو گئیں تو وہ اپنے حفظ سے احادیث سناتے تھے تو بعض مرتبہ اس میں غلطیاں ہو جاتی تھیں مگر ان کی روایتیں اکثر صحیح ہوتی تھیں خود امام احمدؒ فرماتے تھے کہ قد اكتب حديث الرجل للاعتبار به مثل ابن لهيعة۔

مگر امام احمدؒ کے اس طرح کی روایتوں کے قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان روایتوں سے حجت کرنا صحیح سمجھتے ہوں بلکہ اس طرح روایتوں کو جمع کر کے اس پر غور کرنا اور ضابطین کی روایتوں کو سامنے رکھکر اس کو پرکھنا اور نقد کرنا تھا ان روایتوں کو اسی وقت وہ قابل حجت و عملی قرار دیتے جب اس کی کوئی معارض روایت نہ ہو۔

دوسری بات یہ کہ امام احمدؒ حدیث شریف کی صحت کے لئے اتصال سند کی شرط لگاتے تھے اسی لئے وہ حدیث مرسل کو قبول نہیں فرماتے تھے جس روایت کی سند تابعی پر منقطع ہو جاتی یا اور کسی جز میں انقطاع ہوتا تو وہ روایت ان کے نزدیک مرسل ہوتی اور ایسی روایتوں کو ضعیف فرماتے اس لئے کسی باب میں اگر کوئی اور روایت مل جاتی تو مرسل کو ترک فرما دیتے

البتہ اگر کوئی اور روایت نہ ملتی تو آپ کے مقابل اس کو مقدم سمجھ کر قبول فرمالیتے اور اس کو قابل عمل گردانتے اور کسی صحیح روایت کی عدم موجودگی میں ایسی روایتوں کو بھی مسند میں شامل فرمالیتے۔

امام احمدؒ کے زمانہ کے محدثین احادیث مرسلہ کو رسول پاک ﷺ کے زمانے سے بعد کے سبب قبول نہیں فرماتے تھے حالانکہ ان سے پہلے کے دور میں مرسلات کو قبول کیا جاتا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ بالاطلاق حدیث مرسل کو قبول فرماتے تھے کیونکہ ان کا دور عصر نبوت سے قریب تھا اور جو روایتیں انہوں نے سنی ان میں بیشتر حضرات تابعین سے مروی ہوتیں، اور ان تابعین کو پایا اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے اس کے برخلاف حضرت امام شافعیؒ تابعین سے نہیں ملے اس لئے ان کے نزدیک مرسل کو قبول کرنے میں شدت ہے اس لئے انہوں نے تابعی کا بہت سے صحابہؓ سے لقاء ہونے کی شرط لگائی مثلاً حضرت سعید ابن المسیبؒ ان کے علاوہ دوسروں کی روایت قبول کرنے میں محتاط تھے یا مرسل روایت کی تائید میں کوئی متصل روایت ملجاتی یا صحابی کا فتوی ہوتا اس کو قبولیت حاصل ہوتی اس لئے امام احمدؒ نے بھی اتصال سند کی شرط لگادی۔

نیز امام احمدؒ متن حدیث کو بھی جانچتے تھے اگر وہ صحیح حدیث کے موافق ہے تو قبول فرماتے اور اگر حدیث صحیح کے معارض ہو تو اسپر عمل نہیں فرماتے تھے۔

امام احمدؒ نے تدوین حدیث کے باب میں اپنے طریق کو اپنے فرزند عبد اللہ بن احمدؒ کے سامنے ان الفاظ میں واضح فرمایا :۔

قصدت فی المسند الحدیث المشهور وترکت الناس تحت ستر الله ولو اردت ان اقصد ما صح عندی لم ارو من المسند الا الشئ بعد الشئی، ولکن یا بنی تعرف طریقتی فی الحدیث لست اخالف ما ضعف اذا لم یکن فی الباب مایدفعه۔۔	میں نے "مسند" میں مشہور روایات کو لینے کا قصد کیا ہے اور رواۃ کو اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی کے حوالہ کیا ہے (یعنی مستور روات کی حدیثیں بھی لی ہیں) اور اگر میں ان حدیثوں کو لینے کا ارادہ کروں جو میرے نزدیک صحیح ہیں تو میں "مسند" میں کوئی کوئی حدیث ہی لونگا مگر میرے بچے! آپ حدیث کے سلسلہ میں میرا رخ جانتے ہیں کہ میں حدیث ضعیف کو رد نہیں کرتا جبکہ باب میں اسکے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی معارض روایت نہ ہوتی تو حدیث ضعیف کو بھی مسند

میں شامل فرمالیتے تھے مگر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ان کے نزدیک حدیث ضعیف کا معیار کیا تھا!

حدیث کی تقسیم

امام احمدؒ کے بعد محدثین نے حدیث کی تقسیم اس طرح کی:

(۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف

صحیح وہ روایت ہے جس کی سند متصل ہو اور کسی روجہ میں بھی انقطاع نہ ہو، اس کے تمام رواۃ عادل، ثابت العدالۃ اور ثقہ، کامل الضبط، اور صحیح الحفظ ہوں۔ ان میں نہ تو کبھی غفلت ہوئی ہو اور نہ ان کی روایت ثقہ کے خلاف، نہ اس میں شذوذ ہو۔

حدیث حسن اس کی سند متصل ہو مگر کوئی راوی مستور الحال ہو یا ثابت العدالہ کی روایت ہو مگر سند میں اتصال نہ ہو یا راوی عادل اور ثقہ تو ہے مگر اس سے کبھی خطا بھی ہو جاتی ہو ایسی روایت کسی صحیح روایت کے معارض نہ ہونے کی صورت میں قبول کی جاتی ہے۔ یا اس کے طرق متعدد ہوں تو بھی قابل قبول ہے۔

ضعیف جن روایتوں میں صحیح اور حسن کی شرطیں نہ پائی جاتی ہوں وہ ان کے نزدیک ضعیف ہے پھر احادیث ضعیفہ کے بھی درجات مقرر کئے گئے، سب سے زیادہ نا قابل قبول وہ روایت ہے جس کے راوی کے کذب پر کوئی دلیل قائم ہو چکی ہو اور مرتبہ قبول کے قریب وہ ضعیف روایت ہے جو کثرۃ طرق کے سبب مرتبہ حسن کے قریب پہنچ جاتی ہو اور کوئی صحیح یا حسن روایت اس کی معارض نہ ہو۔

مگر یہ تقسیم امام احمدؒ کے دور میں نہیں تھی ان کے زمانہ میں کوئی حدیث یا تو صحیح ہوتی یا غیر صحیح چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :۔ **اول من عرف انه قسم الحديث الى صحيح وحسن وضعيف ابو عيسى الترمذى، ولم تعرف هذه القسمة عن احد قبله وقد بين ابو عيسى مراده فذكر ان الحسن ما تعددت طرقه ولم يكن فيه متهم بالكذب، ولم يكن شاذا وهو دون الصحيح الذى عرفت عدالة قائليه وضبطهم، وقال الضعيف هو الذى عرف ان ناقله متهم بالكذب ردئ الحفظ۔**

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذیؒ سے قبل محدثین کے نزدیک اس طرح کی تین

قسمیں نہیں تھیں وہ لوگ صرف دو تقسیم جانتے تھے صحیح اور ضعیف اور ضعیف دو قسم کی ہوتی تھی ایسا ضعیف جو مانع عمل نہ ہو گویا وہ امام ترمذی کی اصطلاح میں حسن کے مشابہ تھی اور ایسا ضعف جس کا ترک واجب ہو اور وہ واہی روایت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام احمدؒ کے دور میں صرف دو قسمیں تھیں (۱) صحیح (۲) ضعیف اور ضعیف میں وہ روایات بھی شامل تھیں جو بعد کے دور میں حسن کے درجہ میں شمار کی گئیں جس کے راوی مستور الحال ہوں تو امام احمدؒ کسی اور معارض روایت کی عدم موجودگی میں اس کو قبول فرماتے تھے اور متعمد بالکذب کی روایت کو ترک فرمادیتے تھے۔

اس لئے امام احمدؒ کے اس قول کا مطلب کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم کرتے ہیں یہ ہے کہ اس ضعیف کے مقابل کوئی صحیح نہ ہو اس لئے کہ مستور الحال یا غیر ضابط ان کے دور میں ضعیف شمار ہوتی تھیں

مسند کی احادیث ضعیفہ

وہ احادیث جن کو عمومی معنی میں ضعیف کہا گیا ہے جس میں مستور الحال اور ضبط کامل نہ ہونے والی غیر ضابط نیز مرسل اور منقطع بھی شامل نہیں، ایسی روایتیں مسند احمد میں موجود نہیں اور اس کی تصریح خود امام احمد سے منقول ہے اور اسی لئے ایسی ضعیف روایتوں کے شمار میں علماء میں اختلاف موجود ہے اس لئے کہ مستور الحال اور قلیل الضبط کی روایتیں ان کے نزدیک حسن ہیں اور بہت سے متقدمین فقہاء حدیث مرسل اور منقطع کو ضعیف نہیں مانتے تھے۔

مگر ایک سوال یہ ہے کہ آیا مسند میں ایسی روایات بھی ہیں جو متروکہ ثابت ہو چکی ہیں یا جس کے راوی متہم بالکذب ہوں؟ جواب یہ ہے کہ علمی طور پر اس کا احتمال ضرور ہے اور اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ امام احمدؒ روایتوں کو جمع کرنے کے بعد ہمیشہ اس کی تحقیق اور تنقیح اور ضرورت پڑنے پر اس کو حذف بھی فرماتے تھے، چنانچہ مرض الوفات میں ایک ایسی حدیث کو جس کی سند ابو ہریرہؓ تک پہنچتی تھی حذف فرمادیا تھا خصائص المسند میں لکھا ہے :۔

ومن الدليل على انه ما اودعه الامام احمد رحمه الله مسنده قد احتاط فيه اسنادا ومتنا، ولم يورد فيه الا ما صح عنده ما اخبرنا انه روى بالسند المتصل الى ابى هريرة ان النبى ﷺ قال: يهلك امتى هذا الحى من قريش قالوا فما تامرنا يا رسول الله، قال لو ان الناس اعتزلوهم" قال عبد الله، قال ابى فى مرضه الذى

مات فيه: اضرب على هذا الحديث فانه خلاف الاحاديث عن النبی ﷺ"

توجب یہ تنقیح اور تہذیب کا سلسلہ جاری تھا تو ممکن ہے کہ بعض احادیث متروکہ باقی رہ گئیں ہوں اور وفات سے قبل اس کی تنقیح کا موقع نہ ملا ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے عبداللہ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کسی ایسی روایت کو رد نہیں فرماتے تھے جو کسی اہل تقوی سے مروی ہو اگرچہ ان کا ضبط کامل نہ ہو تو یہ احتمال فرض کیا جاسکتا ہے کہ نسیان کے سبب ایسی روایات بھی آگئی ہوں جو صحیح روایات کے خلاف ہوں۔ اسی لئے فن حدیث کے ماہرین نے مسند کی بہت سی روایات پر کلام کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرماویں :۔

مسند میں ایک روایت اس طرح ہے :۔

عن ابی اليمان الحكم ابن نافع حدثنا ابو بكر بن عبد الله عن راشد بن سعد عن حمزة بن كلال قال:۔ سارع عمر بن الخطاب الى الشام حتى اذ اشار فها بلغه ومن معه ان الطاعون فاش فيها، فقال اصحابه: ارجع ولا تقحم عليه، فلو نزلتها وهو بها لم نر لك الشخوص عنها فانصرف راجعاً الى المدينة ففرس من ليلته تلك وانا اقرب القوم منه فلما انبعث انبعثت معه فی اثره، فسمعته يقول: ردونی عن الشام بعد ان شارفت عليه، لان الطاعون فيه وما كان منصرفی عنه مؤخرا من اجلی، وما كان قدوميه معجلی عن اجلی، الا لو قدمت المدينة، ففرغت من حاجات لا بدلی منها، سرت حتى ادخل الشام، ثم انزل حمص، فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول ليبعثن الله يوم القيامة سبعين الفا لا حساب ولا عذاب عليهم۔۔

اس روایت کو محدثین نے ضعیف بتایا ہے کہ اس میں ابو بکر بن عبد اللہ متروك الروایۃ ہیں۔

(ب) اس طرح مسند میں حدیث الطیالسی کو داؤد الاودی اور عبد الرحمٰن المسلی جیسے رواۃ کے سبب محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

(ج) اسی طرح وہ روایت جو ابو سعید عن عبد العزیز والی روایت میں صالح بن محمد زائدہ ہیں جن کے بارے میں امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ لنہ منکر الحدیث نیز اس روایت میں معنیٰ بھی

کلام ہے کہ اسلام میں خائن کی سزا آگ میں جلانا نہیں ہو سکتی

علامہ ابن تیمیہ کی رائے

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ مسند میں کوئی بھی ایسی موضوع روایت نہیں ہے جو امام احمدؒ سے ان کے فرزند کے واسطہ سے نقل ہوئی ہو۔ اگر ایسی کوئی روایت ہے تو وہ قطیعی کی اضافہ کردہ روایت ہوگی، اور قطیعی کے زیادات مسند میں شمار کرنے کے قابل نہیں ہیں امام احمدؒ کے فرزند عبداللہ سے جتنی روایات ہیں وہ بالکل ثابت ہیں ابو زھرۃ فرماتے ہیں :۔

فھو سلیم من کل خبر ثبت انہ مکذوب علی رسول اللہ ﷺ ۔۔۔ مگر ابن حجرؒ کے استاذ عراقی نے اس رائے کی مخالفت کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قطیعی کے زیادات ہی نہیں بلکہ امام احمدؒ سے مروی روایات میں ایسی بعض روایتیں ہیں جن کے رواۃ متہم بالکذب ہیں اور عراقی نے دلیل میں چند روایتیں پیش کی ہیں جن کو محدثین احادیث موضوعہ میں شمار فرماتے ہیں۔

مگر ان کے شاگرد رشید ابن حجرؒ نے امام احمدؒ کی مسند کے دفاع میں کتاب لکھی جس کا نام ''القول المسدد فی الذب عن مسند احمد'' رکھا اور اپنے استاذ عراقی کا رد فرمایا کہ علماء نے جن روایتوں کو موضوع کہا ہے وہ حقیقۃ موضوع نہیں ہیں اس لئے کہ اس کے معارض اور کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اسکے رواۃ کا متعمد بالکذب ہونا بھی ثابت نہیں ہے اور ابن حجرؒ نے امام ابن تیمیہؒ کی تائید فرمائی ہے کہ جو موضوع روایتیں مسند میں پائی جاتی ہیں وہ قطیعی کے اضافے ہیں نہ کہ اصل مسند کی روایات۔

بہر حال ایک بات تسلیم کرنی پڑیگی کہ مسند میں بعض روایتیں ضعیف ہیں اور علماء کا اسپر اتفاق ہے امام احمدؒ مستور الحال کی روایت قبول فرماتے تھے ابو زھرۃ فرماتے ہیں کہ :۔

ولا شك ان الصيانة للمروى عن رسول الله ﷺ تدفع بعض المحدثين للدفاع عن المسندوربما وقعوا بدفاعهم فى تعصب۔۔۔

البتہ پانچویں صدی کے بعد حنابلہ میں بہت سے علماء اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسند میں بعض روایات غیر صحیحہ موجود ہیں علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

قد سئلنى بعض اصحاب الحديث هل فى مسند احمد ما ليس بصحيح فقلت نعم فعظم ذلك على جماعة ينسبون الى المذهب فحملت امرهم على انهم عوام ، و اهملت فكر ذلك ، واذاهم قد كتبوا فتاوى فكتب فيها جماعة من

خراسان ، یعظمون هذا القول ویردونه ویقبحون قول من قاله ، فبقیف دهشا متعجبا ، فقلت فی نفسی واعجبا!! اصار المنتسبون للعلم عامة ایضا وماذالك الا انهم سهوا الحدیث ولم یبحثوا عن صحیحه من سقیمه وظنوا ان من قال ما قلت قد تعرض للطعن فیما اخرجه احمد و لیس کذلك ، فإن الامام روی المشهور ، والجید والردی ثم هو قد رد کثیرا مما روی ، ولم یقل به ولم یجعله مذهبا وختم ابن الجوزیؒ

قد غمنی فی هذا الزمان ان العلماء لتقصیرهم فی العلم ساروا کالعامة و اذا امر بهم حدیث موضوع قالوا قد روی والبکاء ینبغی علی خساسة الهجم و لاحول ولاقوة

بہر حال علماء کے نقطہ نظر میں اس قسم کے اختلاف کے باوجود مسند احمد بہت قیمتی ذخیرہ ہے اور علامہ ابن کثیرؒ کی محنت کے باوجود اس پر دو طرح کام کرنے کی ضرورت ہے (۱) اس کی ترتیب بدل کر موضوعات کے مطابق روایتوں کو جمع کر دیا جائے (البتہ اصل ترتیب والی مسند بھی باقی رکھی جائے) یعنی دو طرح طبع ہو اصل کے مطابق اور موضوعات کی ترتیب پر۔ دوسرا کام یہ ہے کہ مسند کی احادیث پر تحقیق فرما کر صحیح اور سقیم کو چھانٹ دیا جائے اگرچہ دوسری قسم کی روایات بہت کم ہونگی واللہ هو الموفق والهادی الی سواء السبیل

بیاض دل میں فقط ایک نام چھوڑ گیا وہ عمر بھر کے لئے کتنا کام چھوڑ گیا

فقیہ الامت حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے وابستہ

مفتی محمد سلمان منصورپوری

وہ خبر۔ جسے سننے کے لئے کان تیار نہ تھے، وہ حادثہ۔ جس پر یقین کرنے کو دل آمادہ نہ تھا، وہ سانحہ۔ جس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ آہ! وہ وحشت اثر خبر سنائی جاچکی۔ وہ جانکاہ حادثہ پیش آچکا اور وہ الم ناک سانحہ گذر چکا۔ کسے نہیں معلوم کہ دارالعلوم کی روحانی بزم آرائیوں کے روح رواں، مسجد چھتہ کی عظمت کے امین، اس آخری دور انحطاط میں اکابر و اسلاف کی نشانیوں اور کمالات کے جامع، اسلامی علوم و معارف اور اسرار و حکم کے محافظ، ماہر شریعت و طریقت، اسم با مسمی "محمود زماں" فقیہ الامت، حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ اب وہاں تشریف لے جاچکے ہیں جہاں جاکر کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افریقہ آپ پہلے بھی جاتے تھے مگر آپ کے محبین و متعلقین واپسی کے دن گن گن کر ہی دل کو تسلی دیتے رہتے تھے۔ اور یہ انتظار کے لحات بھی ایک خاص کیفیت میں گذر جاتے تھے۔ مگر آہ! اس مرتبہ کے سفر افریقہ نے "آخری سفر" میں تبدیل ہو کر انتظار کی آس بھی ختم کردی ہے۔ اور وہ آفتاب جو ۹۲ سال قبل گنگوہ کے افق سے طلوع ہوا تھا سارے عالم کو اپنی علمی اور روحانی روشنی سے منور کر کے بالآخر گذشتہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۹۹۶ء بروز پیر جنوبی افریقہ کی سرزمین پر ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ واقعی اپنے دور میں اکابر واسلاف اور علماء متقدمین کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ علمی تبحر، قوت حافظہ، کثرت عبادت، اصابت رائے اور مکارم اخلاق میں خود ہی اپنی نظیر تھے۔ کمتر سے کمتر شخص بھی اگر آپ سے استفادہ کرنا چاہتا تو اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ آپ کی مجالس میں جو چاہتا بلا امتیاز شریک ہوتا اور حضرت والا ہر ایک سے محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے اور کسی کے نامناسب اندازیا بے جا سوال پر بھی کبھی چیں بجبیں نہ ہوتے، یہی وجہ تھی کہ ہر شخص آپ سے انسیت محسوس کرتا۔ اور یہ سمجھنے لگتا کہ گویا حضرتؒ کو اسی سے سب سے زیادہ تعلق ہے۔ آپ کے سانحۂ وفات سے گو کہ ان مبارک اور روحانی مجلسوں کا تسلسل ٹوٹ چکا ہے مگر آپ کے خدام و متعلقین اور مستفیدین کے ذہن و دماغ میں آپ کی شفقتوں اور عنایتوں کی یادیں تازہ ہیں۔ اور زندگی بھر انشاء اللہ تازہ رہیں گی۔ احقر کا بھی جی چاہتا ہے کہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کچھ حسین یادیں صفحہ قرطاس پر محفوظ کردے۔ اس لئے کہ اب تو یہی یادیں باقی ہیں جو خواب بن کر دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی طرف سے جو بے پایاں شفقتیں ملیں یہ ناکارہ ان کا کسی طرح بھی مستحق نہ تھا۔ یہ تو آپکی انتہائی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ہم جیسے نالائقوں کو۔ باوجودیکہ حضرتؒ سے بیعت کا تعلق بھی نہ تھا۔ منہ لگانے کے قابل سمجھا۔ اور اپنے جلیل القدر استاذ معظم شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے غایت احترام میں انکی نسبت سے ہم جیسے ناخلفوں کو بھی اپنی محبت اور شفقت سے سرفراز فرماتے رہے۔ چھوٹوں کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ برتاؤ آپ کی سربلندی اور واقعی کمال کی روشن دلیل تھی۔

اب سے کوئی ۲۰-۲۲ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت والد محترم حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب دامت ... کا تہم استاذ دارالعلوم دیوبند "جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ" میں مدرس تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ ایک مرتبہ ختم بخاری شریف کے موقع پر تشریف لائے حسن اتفاق کہ واپسی میں والد صاحب نے احقر کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ دیوبند بھیج دیا۔ آج بھی حضرت والا کے ساتھ اس رفاقت کی یادیں ایسی محفوظ ہیں گویا کہ کل ہی یہ سفر پیش آیا ہو، راستہ بھر حضرت والا خوش دلی کی باتیں فرماتے رہے۔ یہی مبارک اور یادگار سفر احقر کے لئے حضرت اقدسؒ کی عنایات بالغہ کا نقطۂ آغاز بن گیا، اور پھر

کے توسط سے آپکی عظمت کے وہ تابندہ نقوش دل کی تختی پر جم گئے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے۔

جب بھی چھٹیوں میں دیوبند جانا ہوتا اور حضرت مفتی صاحب موجود ہوتے تو حضرت والد صاحب زید مجدہم آپ سے ملاقات کے لئے احقر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے، اور اگر کبھی ساتھ نہ جاتا تو حضرت از راہِ عنایت خود پوچھتے کہ "ہمارے دوست کا کیا حال ہے ؟" ملاقات ہونے پر امتحان بھی لیتے۔ ابتدائی کتابوں کے بارے میں سوال فرماتے۔ اور نحوی جملوں اور صرفی صیغوں کے متعلق دریافت فرماتے اور جب احقر اپنی نااہلی کی بنا پر جواب نہ دے پاتا (اکثر ایسا ہی ہوتا تھا) تو حضرت خود ہی میزان، نحو میر، پنج گنج وغیرہ کی لمبی لمبی عبارتیں ازبر سنا دیتے۔ آپ کے اس قوت حافظہ کو دیکھ کر حاضرین مجلس ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے۔ اور کبھی اپنے مزاج کے مطابق ظرافت آمیز پہیلیاں بھی پوچھا کرتے۔ ایک مرتبہ پوچھا کہ بتاؤ" لے لیالولی نے لنگڑی کا مال "کونسا صیغہ ہے، پھر ہمارے جواب نہ دے سکنے پر خود ہی ارشاد فرمایا کہ "ل" ولی یلی سے صیغہ امر واحد مذکر حاضر۔ "لیا" تثنیہ مذکر حاضر "لو" جمع مذکر حاضر، اور "لی" واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔ اور اگلا جملہ وزن ملانے کی غرض سے ساتھ لگادیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "الشطرنج اباحنیفۃ فتیً ھو الشافعی "کی ترکیب کیا ہے ؟ کیونکہ اس جملہ کو زبانی پڑھنے میں بڑے اشکالات ہوتے ہیں، کہ "الشطرنج" پر فتحہ کیوں آیا؟ "ابا حنیفۃ" منصوب کیوں ہوا اور اس کی "ۃ" پر تنوین کیوں آئی ؟ اور پھر امام ابو حنیفہؒ کو ھو الشافعی کیوں کہدیا گیا ؟۔ پھر خود ہی اس عقدہ کو حل کیا کہ الشطرنج مفعول مقدم ہے اباح فعل کا۔ پھر اباح فعل ی مفعول بہ اور فتیً فاعل ہے۔ اور ھو کی ضمیر جو فتیً کی طرف راجع ہے مبتدا ہے اور الشافعی خبر ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے لطائف حضرت کی مجالس میں سننے کو ملتے تھے۔

ہمارے خاندان کے معزز بزرگ نواب سید محمد یحیی صاحب منصورپوری مرحوم (جو حضرات اکابرؒ کے شیدائی اور حضرت شیخ الحدیث سہارنپوریؒ کے خاص متوسلین میں تھے) کے حضرت مفتی صاحبؒ سے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی نواب صاحب کا بہت خیال فرماتے۔ اور کبھی کبھی نواب صاحب کے اصرار پر منصورپور بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ احقر کو بھی کئی مرتبہ آپ کا منصورپور تشریف لانا یاد ہے۔ ایک مرتبہ رات

میں قیام فرمایااور فجر کے بعد مسجد میں اپنے مواعظ عالیہ سے مستفید فرمایا۔ جس کی کچھ باتیں ابھی تک محفوظ ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "دنیا میں کوئی بھی انسان فکر سے خالی نہیں ہے۔ کسی کو بیماری کا فکر ہے۔ تو کوئی پریشانی میں مبتلا ہے۔ امیر کو امارت چھن جانے کا ڈر ہے تو غریب کو غربت کا غم درپیش ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے آدمی کو ابدی بے فکری حاصل کرنے کے لئے آخرت کا فکر پیدا کرنا چاہئے۔ (مفہوم)

اجلاس صد سالہ کے بعد ہم لوگ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ میں امروہہ سے دیوبند منتقل ہوگئے، اس وقت حضرت مفتی صاحب کا مستقل قیام مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں تھا۔ مگر ذمہ داران دارالعلوم کے اصرار پر ہفتہ میں ایک دن دارالعلوم میں بھی تشریف فرما ہوئے تھے۔ ہر جمعرات کی شام کو دیوبند تشریف لاتے اور جمعہ کی نماز کے بعد واپس سہارنپور تشریف لے جاتے۔ یہ آمدورفت برابر بسوں ہی کے ذریعہ ہوتی تھی، کسی مستقل گاڑی اور کار وغیرہ کا نظم نہ تھا۔ جس سے حضرتؒ کی سادگی اور تواضع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اس وقت آپ کی عمر مبارک ۷۷ سال تھی اور بینائی بھی نہایت کمزور ہوچکی تھی۔ دیوبند آنے کے بعد احقر کو حضرت مفتی صاحبؒ کی مجالس میں کثرت سے شرکت کی سعادت ملی، پورے ہفتہ حضرت کی تشریف آوری کا انتظار رہتا۔ اور جمعرات اور جمعہ میں قیام کے دوران احقر کا زیادہ تر وقت حضرت کے پاس گذرتا تھا۔

حضرت کی مجلسیں نہایت قیمتی، جامع اور مفید ہوتی تھی۔ حضرت والا کو جہاں اکابر اور اسلاف کے واقعات ازبر تھے۔ وہیں فرق باطلہ کے ساتھ آپ کے لاجواب مناظروں، اور نادرونایاب فقہی جزئیات ومسائل کا بھی مجلس میں خوب ذکر رہتا تھا۔ ساتھ میں موقع بموقع لطائف وظرائف کے بیان کی وجہ سے بھی مجلس زعفران زار ہوا کرتی تھی۔ اور حاضرین طویل مجلس کے باوجود اکتاہٹ محسوس نہ کرتے۔ اور حافظہ کا حال یہ تھا کہ جو واقعہ ایک بار سنا کر دوسری مرتبہ کبھی سنانے کی نوبت آتی تو الفاظ وانداز میں سرِ مو بھی فرق نہ آتا۔ احقر نے گوکہ اپنی غفلت اور کم ہمتی کی بنا پر ان افادات کو نوٹ نہیں کیا جس کا افسوس ہے لیکن الحمدللہ حضرت کے بعض مخلص خدام (مولانا محمد سلمان صاحب گنگوہی، اور مولانا مسعود احمد صاحب باغوں والی وغیرھم) نے ان مجالس کے قیمتی ذخائر ملفوظات فقیہ الامت کی صورت میں جمع کردیئے ہیں۔

۱۴۰۳ھ کی ابتداء میں احقر کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے حضرت نے احقر کو "اصول الشاشی" کا درس دینا منظور فرمایا، چنانچہ دیوبند تشریف آوری پر ہر جمعہ کو صبح ۹ بجے کے قریب یہ درس ہوتا۔ جس کے کچھ ضروری نوٹ اب بھی احقر کے پاس ہیں، کتاب کی تمہید میں آپ نے فقہ کے اصول تخریج پر نہایت قیمتی تقریر فرمائی تھی۔ جس میں تخریج مناط، تحقیق مناط، اور تنقیح مناط وغیرہ کا ذکر تھا۔ یہ سلسلہ رجب ۱۴۰۳ھ تک جاری رہا، پھر آپ کا سفر افریقہ پیش آگیا اس لئے یہ درس درمیان میں ہی موقوف ہوگیا۔ کئی مہینہ کے بعد افریقہ سے واپسی پر احقر نے پھر درخواست کی کہ حضرت کوئی کتاب پڑھادیں۔ تو آپ نے خود ہی فن قراءت کی مشہور کتاب "فوائد مکیہ" کا نام تجویز فرمایا۔ اس کا سبق بھی ہر جمعہ کو ہوتا تھا، اور احقر گذشتہ سبق حفظ کر کے حضرت کو سناتا تھا، سال بھر میں یہ کتاب پوری ہوئی۔

۱۴۰۴ھ میں آپ نے مدرسہ مظاہر علوم کی جدید مسجد میں اعتکاف فرمایا تو احقر کو بھی عشرہ اخیرہ کے ابتدائی ایام میں حضرت کے ساتھ اعتکاف کی توفیق میسر آئی۔ حضرت نے نہایت شفقت کا برتاؤ فرمایا۔ ماہ مبارک میں ضعف و ناتوانی کے باوجود آپ نہایت جفاکشی کے ساتھ عبادت میں وقت گذارا کرتے تھے، برسہا برس ماہ مبارک میں روزانہ ایک قرآن کریم ختم کرنے کا معمول رہا۔ ضرورت سے زائد بات چیت بالکل گوارانہ تھی، پورا وقت ذکر و فکر میں گذرتا، اشراق کا وقت جو ماہ مبارک میں عموماً نیند کی نذر ہو جاتا ہے ہم نے دیکھا کہ حضرت والا رمضان میں بھی اشراق کے نوافل کھڑے ہو کر ادا فرماتے اور کم و بیش دو ڈھائی گھنٹہ اس میں صرف ہوتے تھے، اسی طرح ظہر، عصر اور عشاء میں اذان سے قبل ہی سنتوں کی نیت باندھ لیتے اور نماز تک اسی میں مشغول رہتے۔ آپ کے جذبۂ عبادت کو دیکھ کر ہم جیسے کم ہمت جوان بھی شرما جاتے، کبھی کبھی دن میں ۱۱ بجے حضرت کا وعظ بھی ہوتا تھا، آپ کے وعظ کی تاثیر اور اس کا حال سننے والے ہی جان سکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے جو سراپا سادگی کا مرقع اور تصنع و تکلف سے بالکل خالی ہوتے تھے، لیکن ان کی تاثیر ایسی ہوتی کہ دلوں کی دنیا بدل جاتی اور سامعین کے قلوب خوف و رجاء کے جذبات سے سرشار ہو جاتے تھے۔ آپ کی تقریر برائے تقریر نہیں بلکہ برائے اصلاح ہوتی تھی، چنانچہ ہم نے آپ کا کوئی وعظ آدھے پون گھنٹہ سے زیادہ کا نہیں سنا، وعظ مختصر فرماتے جس میں صرف مواد ہی مواد ہوتا۔ زائد

باتیں بالکل نہ ہوتی تھیں۔

ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ سے مدرسہ مظاہر علوم میں داخلی انتشار کی بنا پر جب آپ نے مستقل طور پر دیوبند میں قیام فرمالیا تو مسجد چھتہ کی رونق مزید دوبالا ہوگئی۔ یہاں ہر روز عصر اور عشاء کے بعد آپ کی عمومی مجلس ہوتی، اور علوم و معرفت کے دریا بہائے جاتے، مسجد چھتہ میں آپ کی قیام گاہ مشتاقان زیارت سے بھری رہتی۔ جن میں دارالعلوم کے اساتذہ بھی ہوتے اور طلباء و ملازمین اور باہر سے آئے ہوئے آپ کے متوسلین بھی، آپ کی مجالس کا فیض ظاہری طور پر بھی محسوس ہوتا تھا۔ کتنے ایسے طلباء جو بالکل غافل اور لاپرواہ تھے آپ کی خدمت میں حاضری کی وجہ سے ایسے مائل بہ ہدایت ہوئے کہ ان کے عمدہ دینی حالات دیکھ کر رشک آنے لگا۔ نیز اہل شہر کے لئے بھی یہ مجلسیں ہدایت کا سرچشمہ بن گئیں۔ خود احقر نے دیکھا کہ بہت سے لوگ جن کی داڑھیاں نہیں تھیں انھوں نے داڑھیاں رکھ لیں بے نمازی نمازی بن گئے، اور کتنے دنیادار لوگ دیندار بن گئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اگرچہ اپنی مجالس میں بے تکلفی کا اظہار فرماتے لیکن آپ کا خداداد رعب اہل مجلس پر بہر حال قائم رہتا، خود احقر کا حال یہ تھا کہ حضرت سے بات کرنے کی بآسانی ہمت نہ ہوتی۔ اگر کچھ عرض کرنا بھی ہوتا تو کئی کئی دن سوچنے میں گذر جاتے، وہ تو اللہ تعالی ہمارے حافظ طیب صاحب (مالک کتب خانہ نعمانیہ و خلیفہ حضرت مدنی) کو جزائے خیر دے کہ موصوف نہایت التزام کے ساتھ حضرت کی مجالس میں شرکت فرماتے اور بہت سے لوگوں کے سوالات کی ترجمانی کا کام بخیر و خوبی انجام دیتے تھے، نیز دوسرے کے سوال پر اپنے تنقیحی سوالات ملاکر حاضرین کو مزید استفادہ کا موقع فراہم کرتے تھے۔

عشاء کے بعد کی مجلس میں حالات حاضرہ کے موضوعات بھی زیر بحث آتے، روزانہ حضرت الاستاذ مولانا حامد میاں صاحب مدظلہ استاد دارالعلوم دیوبند رات کو بی بی سی لندن کی خبریں سنکر حضرتؒ کی مجلس میں تشریف لاتے اور اہم خبروں کا خلاصہ اپنے خاص انداز میں پیش فرماتے۔ کبھی ان کی خبروں پر حافظ طیب صاحب کی طرف سے "نقد و جرح" کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو حضرت مفتی صاحبؒ بھی اس دلچسپ مکالمہ سے خوب محظوظ ہوتے، اور درمیان میں کوئی تفریحی جملہ ارشاد فرماکر مجلس کو زعفران زار بنادیتے۔

حضرت مفتی صاحبؒ گو کہ فرق باطلہ کے مقابلہ میں شمشیر برہنہ رہے، اور انکو

مناظروں میں ناکوں چنے چبواتے رہے، لیکن آپ نے اداروں اور جماعتوں کے اختلافات سے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسو رکھا، اور اس معاملہ میں آپ پوری طرح اپنے شیخ اور مرشد شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ جن کا دولت کدہ تحریکات آزادی کے دور میں بھی مختلف الخیال شخصیات کا مشترکہ پلیٹ فارم تھا، اور حضرت شیخؒ ہر ایک سے تعلق استوار رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم، مظاہر علوم، یا جمعیۃ علماء کے کسی اختلاف میں فریق نہیں بنے، لوگوں نے کوششیں بھی کیں لیکن آپ نے سب سے رابطہ برقرار رکھا، اور مخالفین سے خود ملنے تشریف لے جاتے رہے۔ آپ کو اپنی جماعت میں اختلافات اور ان کی بنا پر ترک تعلقات سے سخت اذیت ہوتی تھی، اور مجالس میں اس کا اظہار بھی فرماتے تھے، جب یہ موضوع چھڑ جاتا تو بہت تفصیل سے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے آپسی روابط اور عقیدت واحترام کے واقعات سناتے، اور کبھی کبھی سناتے سناتے آبدیدہ ہو جاتے، آپ کی اسی تڑپ کا مظہر وہ رسالہ ہے جو آپ کے حکم پر آپ کے شاگرد رشید اور خلیفۂ راشد مولانا مفتی محمد فاروق صاحب زید مجدہم نے "حدود اختلاف" کے نام سے تالیف فرمایا، جس میں آپ کے حوالہ سے اکابر واسلاف کے اختلاف کے واقعات جمع کر دئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خاص کر آخری دور میں حضرت مفتی صاحبؒ کے وقت میں بے مثال برکت عطا فرمائی تھی۔ آپ کا مزاج گو کہ فطرۃً تصنیفی نہ تھا، اور تواضع وقناعت کی بنا پر غالبًا اس کا ارادہ بھی کبھی نہ کیا ہوگا۔ لیکن اللہ کو آپ کا فیض جاری کرنا تھا کہ ۱۴۰۴ھ سے ۱۴۱۶ھ تک یعنی کل ۱۲ سال کے عرصہ میں آپ کے "فتاوی محمودیہ" کی ۱۸ ضخیم جلدیں چھپ کر آچکی ہیں اور غالبًا ابھی کئی جلدیں اور آئیں گی۔ اور یہ سب فتاوی خود آپ نے پوری توجہ سے سنے ہیں اور انہیں مناسب حذف وترمیم کے بعد ان کے عنوانات کا املا بھی خود کر دیا ہے۔ مرتب فتاوی حضرت مولانا مفتی فاروق صاحب ہر جمعرات کو دیوبند تشریف لاتے اور حضرت والا کو فتاوی سناتے، کئی کئی گھنٹے ان کے سنانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی طرح "ملفوظات فقیہ الامت" مواعظ فقیہ الامت، مکتوبات فقیہ الامت، اور مختلف موضوعات پر الگ الگ کئی اہم تحریریں اسی مختصر مدت میں آپ کے محب ومحبوب خادم جناب مولانا ابراہیم صاحب افریقی کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوئی ہیں جو آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور شائقین

کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔

۱۴۰۷ھ میں احقر دورۂ حدیث شریف میں تھا، ہم لوگوں نے حضرت الاستاذ مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہم کے توسط سے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں درخواست کی کہ حضرت بخاری شریف کا ایک درس ہم لوگوں کو پڑھادیں۔ حضرت نے از راہ عنایت درخواست قبول فرمالی، اور عشاء کے بعد دارالحدیث میں تشریف لاکر بخاری شریف جلد ثانی "کتاب الزھد والرقاق" کی ابتدائی دو حدیثوں کا درس دیا۔ ابتدا میں آپ نے حدیث مسلسل بالاولیہ الراحمون یرحمہم الرحمن، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ابوداؤد شریف) یعنی رحم کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ "رحمٰن" رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، اللہ تعالیٰ "آسمان والا" تم پر رحم کرے گا۔ کی اجازت طلباء کو مرحمت فرمائی، اس کے بعد حدیث: نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس۔ الصحۃ والفراغ (دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سے لوگ دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت و تندرستی دوسرے فرصت کا وقت اور فراغ عیش) پر مبسوط تقریر فرمائی۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا بیان فرمایا۔ اس درس میں دورۂ حدیث شریف کے سات سو طلباء کے علاوہ دیگر شائقین بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ دارالحدیث اور اس کی تمام گیلریاں بھری ہوئی تھیں۔ سبق کے ختم پر احقر نے عرض کیا کہ "ہم لوگوں کو بخاری شریف کی اجازت مرحمت فرمادیں"۔ تو آپ نے فرمایا "ہاں جتنا حصہ پڑھا ہے اس کی اجازت ہے۔"

۱۴۰۸ھ میں احقر دارالافتاء میں زیر تعلیم تھا۔ حضرت کو یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی۔ اور فرمایا کہ "افتاء کے بغیر مولوی آدھا رہتا ہے" اور واقعہ بھی یہی ہے، کیونکہ مدرسہ سے باہر نکل کر کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ فلاں عبارت کا مطلب کیا ہے؟ بلکہ نماز روزہ وغیرہ کے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ جن میں عموماً افتا پڑھے بغیر مہارت پیدا نہیں ہوپاتی۔ افتاء کے سال حضرتؒ سے الاشباہ والنظائر پڑھنے کی توفیق میسر آئی۔ جو غالباً ایک ڈیڑھ مہینہ میں اپنے نصاب "الفن الاول" تک پہنچ گئی تھی حضرت کا معمول بھی تقریر کا نہ تھا بلکہ صرف حل کتاب کی حد تک گفتگو فرماتے تھے۔ اس کے بعد شرح عقود رسم المفتی پڑھنے کی سعادت بھی ملی، ہم چند ساتھی تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ہفتہ میں پوری کتاب ختم کرلی تھی۔ نیز حضرت والا سے فتاویٰ کی مشق کا موقع بھی ملا، کبھی حضرت خود "نفع المفتی والسائل" سے سوالات لکھا

دیتے، اور احقر جواب لکھ کر حضرت کو سناتا اور کبھی خود ہی سوال جواب لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کرتا۔ تحقیق طلب مسائل میں حضرت کا معمول یہ تھا کہ جواب پر کچھ اشکالات کر کے مسئلہ کے پوشیدہ گوشوں کی طرف متوجہ فرماتے۔ اور خود کوئی حتمی جواب نہ دیتے تھے تاکہ اپنے اعتماد پر پورے مطالعہ کے بعد طالب علم کوئی رائے قائم کر سکے۔ امتحان کے لئے حضرت زبانی سوالات بھی فرماتے رہتے۔ ایک مرتبہ پوچھا کہ "فقہا لکھتے ہیں کہ جمعہ و عیدین کی نماز میں اگر امام سے سہو ہو جائے تو سجدہ سہو واجب نہیں، تو کیا جمعہ و عیدین کے علاوہ اگر کثیر مجمع ہو تو بھی یہی حکم ہوگا؟ احقر نے عرض کیا کہ :اس حکم کی علت یہ لکھی ہے کہ لوگ فتنہ میں نہ پڑ جائیں" اس تعلیل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی فتنہ کا خطرہ ہو وہاں یہی حکم رہنا چاہئے اور یہ حکم جمعہ و عیدین تک محدود نہیں رہنا چاہئے۔ حضرت یہ جواب سن کر خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ "ہاں! جب کسی مسئلہ کے متعلق صریح جزئیہ نہ ملے تو اسی طرح جواب دینا چاہئے۔"

ایک مرتبہ احقر نے فتویٰ میں دلیل کے طور پر قرآن کریم کی آیت لکھ دی تو آپ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اچھا آپ مجتہد کب سے ہوگئے؟" پھر نصیحت فرمائی کہ نصوص کے معانی اور مطالب تک ہماری سطحی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے ہمیشہ صاف اور صریح فقہی جزئیہ کی تلاش و جستجو کرنی چاہئے۔ اور فتویٰ میں انہی کا حوالہ دینا چاہیے۔ آپ فقہی بصیرت رکھتے بدائع الصنائع، البحر الرائق، فتح القدیر اور بالخصوص رد المحتار (فتاویٰ شامی) سے استفادہ کا مشورہ دیتے تھے۔ اور خود آپ کو فتاویٰ شامی کے متعدد بار بالاستیعاب مطالعہ کا امتیاز حاصل تھا۔

غالباً ۱۴۰۹ھ سے ذمہ داران دارالعلوم کے اصرار پر آپ نسائی شریف کا درس بھی دینے لگے۔ احقر کو بھی اس میں شرکت کی سعادت ملی۔ پہلے دن کے درس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم کے پانچ درجے ہیں۔ (۱) استماع (۲) انصات (۳) حفظ (۴) عمل (۵) نشر۔ پھر ہر ایک درجہ کی ضرورت و اہمیت کو بیان کیا تھا۔ نسائی شریف کے درس کا یہ سلسلہ الحمدللہ اخیر تک جاری رہا۔ اور اس مرتبہ بھی افریقہ تشریف لے جانے سے قبل آپ نے نسائی شریف کے درس سے مشرف فرمایا۔

شوال ۱۴۱۰ھ میں احقر مدرسہ شاہی مراد آباد میں خدمت تدریس و افتاء پر مامور

ہو گیا، اور اس طرح حضرت کی مجالس اور صحبتوں میں مستقل شرکت سے انقطاع ہو گیا لیکن حضرت کی عنایات اور شفقتیں بدستور جاری رہیں، جب بھی دیوبند جانا ہوتا اور حضرت سے ملاقات ہوتی تو احوال پوچھتے اور دل سے دعائیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی کتاب "طحطاوی علی مراقی الفلاح" عنایت فرمائی جس میں کتاب کے تمام اہم جزئیات کی تفصیلی فہرست آپ نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر لگا رکھی ہے۔ احقر نے یہ سمجھا کہ یہ کتاب اس لئے دی ہو گی کہ احقر فہرست نقل کر لے چنانچہ احقر نے فوٹو اسٹیٹ کرا کر کتاب واپس بھیجدی، بعد میں جب ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ "میں نے تو تمہیں کتاب ہی دیدی تھی تم نے واپس کیوں کر دی وہ تم ہی لے لو" چنانچہ حضرتؒ کی یہ عظیم نشانی اور یادگار احقر کے لئے قابل فخر سرمایہ ہے۔

مراد آباد آنے کے دو ایک سال بعد احقر کے دارالعلوم میں تقرر کی بات شروع ہوئی۔ تو احقر نے حضرت مفتی صاحبؒ سے حالات بتائے اور حضرت کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ آپ نے ایک جملہ میں ساری بحث ختم فرمادی۔ کہ "بھائی دین کی خدمت کرنی ہے، یہاں ہو یا وہاں ہو اس کی فکر نہ کرو" یعنی مقصود بڑی جگہ نہ ہو بلکہ مقصود دینی خدمت ہونی چاہئے۔

حضرت والا کے ضعف و نقاہت، اور کمزوری دیکھ کر دل چاہنے کے باوجود یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ حضرت والا سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں رونق افروز ہونے کی درخواست کی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ایسے اسباب پیدا فرمادیئے کہ آپ نے خود ہی مراد آباد تشریف آوری کا ارادہ فرمالیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ بعض قریبی خدام کے اصرار پر تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے آپ کا "ہلدوانی" کا سفر تجویز ہوا۔ راستہ میں مراد آباد بھی پڑتا تھا، اسلئے حضرت کی اجازت سے ایک دن درمیان میں یہاں قیام طے کیا گیا، آپ کے خادم خاص جناب مولانا ابراہیم صاحب افریقی زیدہ کرمہم نے مہتمم جامعہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب حمیدی مدظلہ اور راقم الحروف کے نام اطلاع بھیجی کہ ہم لوگ حضرت کی معیت میں ۲۰ر شوال ۱۴۱۴ھ مطابق ۲ر اپریل ۱۹۹۴ء کو مراد آباد آرہے ہیں، اور مدرسہ شاہی میں قیام کریں گے، اس خبر سے پورے مدرسے میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس ضعیف العمری میں حضرت کی تشریف آوری کو ایک عظیم نعمت غیر مترقبہ تصور کیا گیا۔ حضرت والا حسب پروگرام ۲۰ر شوال کی صبح کو دیوبند سے چل کر دوپہر میں

مراد آباد تشریف لائے۔ حسن اتفاق کہ اسی سال مدرسہ کی جانب سے شاہی مسجد میں روزانہ عوامی ترجمہ قرآن کریم کی ذمہ داری احقر کے سپرد کی گئی تھی۔ اور اس کا آغاز ہونے ہی والا تھا، کہ حضرت کی تشریف آوری کا پروگرام بن گیا اور حضرت مہتمم صاحب کے مشورہ سے یہ بات طے ہوئی کہ ترجمہ کلام پاک اور بخاری شریف کے درس کا آغاز حضرت والا سے کرایا جائے، چنانچہ ۲۱ر شوال ۱۴۱۴ھ وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے بعد نماز فجر شاہی مسجد میں قرآن کریم اور بخاری شریف کے درس کا باقاعدہ آغاز فرمایا۔ اور دونوں موضوعات پر پر مغز خطابات ارشاد فرمائے۔ جو ندائے شاہی کے شمارہ (مئی ۹۴ء) میں شائع ہو چکے ہیں، ترجمہ کے متعلق بیان کے اخیر میں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا تھا ”یہاں ماشاء اللہ ترجمہ ہو تا رہا ہے۔ اس کی تفسیر بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اللہ سے مدد طلب کیجئے۔ انشاء اللہ مدد ہو گی اور ہوتی رہی ہے“ حضرتؒ کے اس ارشاد کی برکت آج بھی محسوس ہوتی ہے، اور قدم قدم پر اللہ کی مدد سے دستگیری ہوتی رہتی ہے ورنہ اپنے طبعی کسل اور لاپروائی کا حال تو یہ ہے کہ چند دن بھی کسی کام پر جمنا دشوار ہوتا ہے۔ خدا کرے یہ مدد برابر جاری رہے۔ آمین۔

احقر نے ”شرح عقود رسم المفتی“ کو سامنے رکھ کر فتویٰ نویسی سے متعلق ایک رسالہ ترتیب دیا ہے، جب اس کا مسودہ تکمیل کے قریب پہنچا تو احقر اصلاح کی غرض سے حضرت کی خدمت میں اسے لے گیا۔ حضرت والا نے انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے ہوئے کئی مجالس میں اس رسالہ کا اکثر حصہ پوری توجہ سے سنا، جابجا مشورے دئے۔ اور اپنی معلومات سے مستفید فرمایا۔ اور پھر ایک تقریظ لکھ کر عنایت کی جو انشاء اللہ رسالہ کے ساتھ شائع ہو گی۔

آخری رمضان آپ نے ”مالی باغ بنگلہ دیش“ میں گذارا، پھر دیوبند تشریف لائے اور نسائی شریف کا درس شروع فرمادیا۔ ۲۵ر ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ کو ظہر کے بعد آپ نے نسائی شریف کا آخری درس دیا اور دعا کرائی۔ احقر کو بھی اس میں شرکت کی سعادت مل گئی۔ درس کے بعد احقر قیام گاہ پر حاضر ہوا کافی دیر تک مختلف باتیں فرماتے رہے۔ احقر کا چونکہ حج و زیارت کا ارادہ تھا اسی مناسبت سے حضرت نے اپنا تحریر فرمودہ صلوٰۃ و سلام بھی سنایا۔ اور فرمایا کہ اب اپنی کمزوری کی وجہ سے حج کو جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ احقر نے عرض کیا کہ ”اگر حضرت تشریف لے جاتے تو آپ کے طفیل میں ہم جیسے لوگوں کا حج بھی قبول ہو جاتا“ تو

حضرتؒ ہنس کر خاموش ہو گئے۔ دوران گفتگو فرمانے لگے کہ آئندہ رمضان کے لئے لوگ مختلف مقامات کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ جن میں مراد آباد کا بھی نام لیا۔ احقر نے عرض کیا کہ "اگر مراد آباد قیام رہا تو ہم لوگوں کے لئے تو عید ہو جائے گی" پھر فرمایا کہ یہاں دیوبند میں تو بھائی صاحب (حضرت اقدس مولانا سید اسعد صاحب مدنی زید مجدہم) قیام فرماتے ہی ہیں اور ان کا فیض جاری ہے۔ اس لئے میں خود رمضان میں یہیں رہنے پر زور نہیں دیتا۔ کیا معلوم تھا کہ جس رمضان کی آپ کو فکر تھی اس کا موقع آنے سے قبل ہی آپ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

۲۶ ر ذی قعدہ بروز پیر احقر کی سفر حج کے لئے روانگی تھی۔ احقر الوداعی ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ کچھ دیر گفتگو فرماتے رہے اور چلتے وقت سہارے سے بدقت تمام کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا۔ اور احقر کی "ناتوانی" دیکھ کر ارشاد فرمایا "یار تو بھی میری طرح ہڈی ہی ہڈی رہا۔ تجھ پر بھی گوشت نہ چڑھا" پھر یہ فرما کر رخصت کیا کہ "جاؤ اللہ کے سپرد"

آہ! کیا پتہ تھا کہ یہ واقعی رخصتی اور جدائی کے الفاظ ہیں۔ اور اب کبھی زندگی میں آپ کی نورانی صورت کی زیارت نہ ہو سکے گی اور اب ۷ ار ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کو اس سچے محسن و مربی اور کامل رہبر شریعت و طریقت کی مفارقت کا وہ داغ لگا ہے جو برسوں نہ مٹایا جا سکے گا۔ احقر تو اپنی نااہلی اور تکاسل کی بنا پر حضرت مفتی صاحبؒ کی بے پایاں عنایات و توجہات عالیہ کے باوجود محروم ہی رہا۔ لیکن جن خوش نصیبوں کو آپ کی سالہا سال معیت اور آپ سے روحانی کسب فیض کا براہ راست موقع ملا ہے ان کو جب حضرت کی یاد آیا کرے گی اور آپ کی مبارک اور روحانی مجالس کا تصور سامنے ہو گا تو ایسی ٹیسیں اٹھا کریں گی جو قلب و جگر کو بے قابو بنا کر چھوڑیں گی، چھتہ کی مسجد کی یہ بے رونقی ان سے دیکھی نہ جا سکے گی، مسجد کی داہنی جانب ان کی صف کی طرف بے اختیار نگاہیں اٹھا کریں گی، گویا انتظار ہو کہ ابھی حضرت یہاں آکر تشریف فرما ہو نگے۔ نظریں ڈھونڈا کریں گی۔ کہاں گئی حجرۂ قاسمی کی رونق؟ کیا ہوئی مسند افتاء کی شان؟ کہاں گیا روحانیت کا سرچشمہ؟ کہاں گیا شیخ الاسلام کا لاڈلا؟ اور کہاں گیا شیخ الحدیثؒ کا نور نظر؟۔ لرزتی ہوئی غمزدہ زبانیں جواب دیں گی کہ نظروں کو جس گوہر آبدار کی تلاش ہے، اس امانت کو اللہ کے ازلی فیصلہ کے مطابق قیامت تک کے لئے افریقہ کی

سرزمین نے اپنے جلو میں رکھنے کی سعادت حاصل کرلی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اس قضاء وقدر کے انتظام میں بھی کوئی بڑی خیر اور حکمت پنہاں ہوگی گو کہ اس کی تہہ تک ہماری عقل نارسا رسائی حاصل نہ کر سکے۔ مگر اپنی بے قراری کا کیا ہو؟ جو مدتوں سوچ سوچ کر رلایا کرے گی۔ اب اللہ سے دعا کے سوا ہمارے پاس بچا ہی کیا ہے جو حضرت کی خدمت میں نذر کریں۔ سلام بھی پہنچانا ہوگا تو اپنے اللہ ہی سے التجا کریں گے کہ۔

اے اللہ! ہم اور ہم جیسے لاکھوں تشنگان زیارت کا سلام اپنے اس محبوب و محمود بندے تک پہنچادے جس کی ایک ذات میں وہ تمام نشانیاں موجود تھیں جو تونے اور تیرے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام نے نیک بندوں کی بیان فرمائیں ہیں۔ وہ داعی الی اللہ تھے (ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ (حم السجدہ) وہ طول عمر کے ساتھ حسن عمل کی دولت سے مالامال تھے (من خیر الناس قال: من طال عمرہ وحسن عملہ، ترمذی شریف ۲/۴۳۱) وہ اعلیٰ درجہ کے متواضع اور منکسر المزاج تھے (من تواضع للہ رفعہ اللہ (مشکوۃ شریف ۲/۴۳۴) وہ زاہد فی الدنیا تھے (الزھد فی الدنیا یحبك اللہ (مشکوۃ شریف ۳/۴۴۲) ان کی پوری زندگی علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت میں گذری اور فقہ و فتاوی میں وہ واقعی اپنے دور کے فقیہ الامت تھے (من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین مشکوۃ شریف ۱/۳۲) وہ سنتوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے والے تھے (من تمسك بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شھید مشکوۃ شریف ۱/۳۰) ان کا دل بغض وعداوت اور کینہ سے خالی تھا (یابنی ان قدرت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبك غش لاحد فافعل (مشکوۃ شریف ۱/۳۰) اور وہ ہمیشہ دوسروں کو اذیت دینے سے اپنے کو بچاتے رہے (...... وامن الناس بوائقہ دخل الجنۃ مشکوۃ شریف ۱/۳۰) الغرض وہ ذات جس نے اپنی پاک صاف زندگی کو پوری طرح شریعت کے رنگ میں رنگین کردیا تھا۔ اور شریعت ہی اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، ہمارے دل کی گہرائیوں سے اس ذات کی خدمت میں سلام عرض ہے! اے اللہ! تو ان تک ہمارا پر خلوص سلام پہنچادے، ہمیں ان کے نقش قدم پر چلا۔ اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرما۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد نسیم قاسمی بارہ بنکوی
استاذ تفسیر دارالعلوم دیوبند

شیخ المشائخ، جامع شریعت و طریقت، محدث کبیر، جنید وقت، عارف باللہ فقیہ الامت استاذی و مرشدی حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے ۹۲ سال کی عمر میں جنوبی افریقہ میں ۲ر ستمبر ۱۹۹۶ء بروز دوشنبہ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ اور اپنے تمام تلامذہ، متوسلین، متعلقین اور وابستگان کو غم و اندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ٥ اَللّٰھُمَّ اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بہت سے کمالات اور خصوصیات سے نوازا تھا۔ یہ چند سطریں حضرت مفتی صاحبؒ کے فضائل و کمالات کا احاطہ کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں۔ حضرت فقیہ الامت کے فضائل و مناقب کے لئے مفصل کتاب کی ضرورت ہے۔ اور آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر لکھنے والے حضرات تفصیل کے ساتھ لکھیں گے۔ ان چند سطروں کے ذریعہ میرا مقصد ایک مبارک ہستی کے ذکر جمیل سے ثواب حاصل کرنا اور اپنے غمزدہ دل کو تسلی دینا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ☆ نسیم صبح تیری مہربانی

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات حسرت آیات ایک المناک سانحہ اور ایک دردناک حادثہ اور ایک عظیم علمی نقصان ہے۔ جس کی تلافی بظاہر اسباب بہت مشکل ہے۔ جامع ہستیاں بہت مدت میں تیار ہوتی ہیں۔ اور جب اس دنیا سے چلی جاتی ہیں تو بڑی مدت تک ان کی جگہ خالی پڑی رہتی ہے۔

مصرع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

وہ مسجد چھتہ جس میں حضرت مفتی صاحب جلوہ افروز تھے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ اور عوام و خواص حاضر ہوتے۔ کوئی علمی پیاس بجھانے کے لئے آتا۔ کوئی باطنی امراض کے علاج کے لئے آتا، کوئی صرف زیارت و ملاقات کے لئے آتا، اور کوئی بیعت و اصلاح کے لئے آتا، ہر وقت چہل پہل رہتی تھی علم و ذکر کی نورانی فضا قائم رہتی تھی۔ مسجد چھتہ کئی بزرگوں کی قیام گاہ رہ چکی ہے۔ وہی رونق جو پہلے بزرگوں کے وقت میں تھی۔ حضرت مفتی صاحب کی برکت سے پھر لوٹ آئی، اور دوکان معرفت چمک اٹھی۔

مگر افسوس صد افسوس حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات حسرت آیات سے وہ ساری چہل پہل ختم ہوگئی۔ اور وہ چمک دمک رخصت ہوگئی۔ ع

وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے۔

حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب کا نام حضرت مولانا حامد حسن صاحبؒ ہے آپ کی ولادت باسعادت ۸ یا ۹ جمادی الثانیہ ۱۳۲۵ھ جمعہ کی شب میں مشہور مردم خیز قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے آپ کی بسم اللہ کرائی۔ پھر ابتدائی تعلیم اپنے وطن گنگوہ میں رہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے مظاہر علوم سہارنپور اور پھر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ بخاری شریف شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی پھر دوبارہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ ارشد بھی تھے اور خلیفہ اعظم بھی تھے۔ دارالعلوم اور مظاہر علوم کے اس وقت کے ماہر فن اساتذہ اور مشائخ سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔

حضرت مفتی صاحب کو علم تفسیر، اصول تفسیر، علم حدیث اور اصول حدیث، علم فقہ اور اصول فقہ اور علم کلام وغیرہ تمام دینی علوم میں کامل مہارت تھی۔ فقہی کلیات اور جزئیات کا پورا استحضار تھا۔ آپ کا حافظہ بہت قوی اور آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ کی ذات روشن ذہن اور مجتہدانہ بصیرت کی حامل تھی۔ آپ کا دل خدائے کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے لبریز تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی۔ علم و عمل، خلوص و للّٰہیت، تقویٰ و دیانت، خدمت خلق، تزکیۂ نفس، تعبیر خواب، فتویٰ نویسی اور اتباع سنت وغیرہ تمام اوصاف و کمالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے ماہر فن اساتذہ اور مشائخ کی علمی اور عملی یادگار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب اس بے دینی اور الحاد کے دور میں روشنی کا ایک مینار تھے۔ اور آپ اس شعر کے مصداق تھے۔

وَلَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ ☆ أَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِي وَاحِدٍ

آپ کی علمی اور عملی جامعیت سے لوگوں کو بہت فیض پہونچا۔ اور آپ کا فیض ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود نہیں۔ بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، لندن، افریقہ بلکہ ایشیاء و یوروپ میں ہر جگہ پہونچا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی محبوبیت اور مقبولیت عطا فرمائی، اور اللہ والوں کی مقبولیت اور محبوبیت صدیاں گزر جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی یادوں کے نقوش زندہ رہتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فراغت کے بعد سب سے پہلے مظاہر علوم میں تقریباً پچیس سال تک افتاء اور تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر جامع العلوم کانپور کی صدارت تدریس کے عہدہ جلیلہ کو آپ نے رونق بخشی اور چودہ سال تک کانپور، اور اس کے اطراف کے لوگ حضرت مفتی صاحب کے دریائے فیض سے سیراب ہوتے رہے۔ جامع العلوم تنزلی اور گمنامی میں پڑا ہوا تھا حضرت مفتی صاحب کی برکت سے شہرت اور ترقی کے بام عروج پر پہونچ گیا۔ پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بہت اصرار پر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔ اور یہاں کے دارالافتاء کی سرپرستی فرمائی۔ اسی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں بخاری شریف جلد ثانی اور نسائی شریف اور رسم المفتی وغیرہ کتابوں کا درس دے کر تشنگان علوم کو سیراب فرمایا۔ میں نے شعبۂ افتاء میں رسم المفتی حضرت مفتی صاحب ہی سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

فتاویٰ محمودیہ جلد اول کی تقریظ میں حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب دامت برکاتہم نے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

حضرت استاذی مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم کی شخصیت ملک اور بیرون ملک میں محتاج تعارف نہیں۔ حضرت والا کو عوام و خواص میں جو عظمت و مقبولیت حاصل ہے وہ اللہ پاک کا ایک خصوصی عطیہ ہے۔ حضرت اقدس کو تمام علوم عقلیہ اور نقلیہ میں دستگاہ اور عبور حاصل ہے۔ اکثر کتابوں کی پوری عبارتیں محفوظ اور ازبر ہیں۔

اسی فتاوی محمودیہ میں حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب مفتی وقاضی شہر کانپور نے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں تحریر فرمایا۔

فرق باطلہ کی تردید میں بھی حضرت مفتی صاحب ید طولی رکھتے ہیں۔ قادیانی اور رضاخانی مفتی صاحب کے نام سے کانپتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر کا گہرا مطالعہ فرمایا اور اس جماعت پر ایسا تبصرہ فرمایا کہ اس کا زیغ و ضلال واضح ہو گیا۔ حضرت مفتی صاحب کی فقیہانہ بصیرت کو علمائے زمانہ تسلیم کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب کو خوش طبعی اور بذلہ سنجی سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا ہے۔ جو اکثر ناواقفوں کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ لیکن مستفیدین کے لئے نعمت کبری ثابت ہوتا ہے۔ اگر شگفتگی اور خوش مزاجی نہ ہو تو رعب خداداد کی وجہ سے استفادہ کرنا دشوار ہو جائے۔ خدائے تعالی نے حضرت کو ایسی حکمت و بصیرت عطا فرمائی ہے کہ لاینحل مسائل منٹوں میں حل ہو جاتے ہیں۔ اور انداز تکلم ایسا کہ مشکل سے مشکل بات مخاطب کے دل نشین ہو جائے۔

آپ کی علمی یادگاروں میں سب سے ممتاز اور سب سے ضخیم فتاوی محمودیہ ہے جس کی اٹھارہ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اور ابھی کچھ جلدیں باقی ہیں اس کے علاوہ نغمۂ توحید، گلدستۂ سلام، حقوق مصطفیٰ اور وصف شیخ نیز حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات، ملفوظات اور خطبات کی بہت سی جلدیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت اقدس مفتی صاحب قدس سرہ کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائیں۔ ان کے درجات اور مراتب کو بلند فرمائیں اور اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین!

☆☆☆☆☆

طبقۂ علماء کا قیس وفرہاد

کتاب۔ "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک"۔ کے مصنف

(ولادت ۱۳۴۳ھ وفات ۱۴۱۷ھ)

از۔ قاری ابوالحسن اعظمی

یہ روایت اور طریقہ راقم الحروف کے نزدیک عجیب و غریب ہے کہ جب کوئی عظیم شخصیت دنیا سے چلی جاتی ہے تو اس کی حیات اور کارناموں سے متعلق مضامین اور تذکرے لکھے جاتے ہیں سوانح حیات مرتب کی جاتی ہے اسے شائع کیا جاتا ہے، رسم اجراء کے عنوان سے اس پر مقالے پڑھے جاتے ہیں، اس پر سیمینار و تذکار کا انعقاد ہوتا ہے اس کے مناقب و فضائل خصوصیات و کمالات پر دھواں دھار تقریریں اور بیانات آتے ہیں مگر کب؟ جب وہ اس دنیائے آب و گل سے کنارہ کش ہو کر اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے اس کی ذاتِ ستودہ صفات اور کمالات سے بھری پُری شخصیت سے استفادہ ناممکن ہو جاتا ہے ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایسی باکمال و نادر خصوصیات کی حامل شخصیات پر اس کی زندگی ہی میں بہت مفصل نہ سہی مضامین اور اس کی حیات و کارناموں پر مختصر سی ہی کتاب آجائے تاکہ ناظرین و قارئین اسے دیکھ پڑھ کر حسب صلاحیت اس سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں۔ معدودے چند ہی حضرات اکابر ایسے ہیں جنہوں نے یا تو خود آپ بیتی اور خود نوشت سوانح حیات مرتب کر دی یا کسی اور نے ان پر قلم ان کی زندگی میں اُٹھایا اور کچھ نہ کچھ لکھ لکھا دیا اس سے مذکورہ بالا فائدے کے ساتھ ایک بڑا اہم فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد میں لکھنے والوں کے لیے ایک آسان سی بنیاد اور معتبر ڈگر مل جاتی ہے۔

انھیں چند گنی چنی شخصیات میں ہمارے محبوب اور عزیز از جان قاضی صاحب بھی ہیں جنہیں آج مرحوم لکھتے ہوئے قلم پر کیا کچھ گذر رہی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ جنھیں راقم نے قیس و فرہاد سے تعبیر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک اشارہ ہے ورنہ کہاں قاضی صاحبؒ جیسا باکمال و کامیاب محقق اور کہاں یہ شہرت یافتہ مگر ناکام زمانہ قیس و فرہاد!

قاضی صاحبؒ کیا کچھ تھے آپ کی تہ داری میں کتنی گوناگونی اور بوقلمونی تھی، ہر ہر زاویہ سے اُن پر قلم افشانی ہوگی، آپ کی ذات سے والہانہ تعلق رکھنے والے اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ہے جو انشاء اللہ اسکا حق ادا کریں گے۔

آپ نے قلم کے ذریعہ اپنے علم و مطالعہ اور تحقیق و تجسس کے جواہر پارے کتابی شکل میں اہلِ نظر کے حوالے کیے اس کی حقیقی قدر و منزلت تو اس میدان کے رہرو ہی کچھ جان اور پہچان سکتے ہیں ان زاویوں اور گوشوں پر حضرت قاضی صاحبؒ کے رفیقِ قدیم مولانا اسیر ادروی، مولانا اعجاز اعظمی اور رسالہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر شہیر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی۔ اور ان جیسے دوسرے بہت سے اہل تحقیق و نظر، قلم اُٹھائیں گے۔ راقم الحروف کیا اور کیا اس کا ہیچ پوچ قلم!

قاضی صاحبؒ کی عربی اور اُردو کی ہمالیائی کتابیں "رجال السند والهند"۔ العقد الثمين في فتوح الهند و من ورد فيها من الصحابة والتابعين" اور "الهند في عهد العباسيين" اور اردو میں مستقل پچیسوں کتابوں کا ایک طویل سلسلہ۔ جو ہر پڑھنے لکھنے والے لوگوں کی نگاہوں کو بہر حال روک لیتا ہے، لیکن ناظرین تعجب کریں گے کہ کمترین حضرت قاضی صاحبؒ کی جس کتاب سے سب سے زیادہ متاثر ہوا اور جس کتاب کو سب سے زیادہ مؤثر سمجھا وہ آپ کی بظاہر ضخامت میں مختصر لیکن حقیقتاً بڑی ہی بھاری بھر کم اور رجال ساز کتاب "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" ہے یہ اپنا اپنا مزاج اور اندازِ نظر و فکر ہے راقم الحروف اصلاً ایک طالب علم ہے طالب علمانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اور تقریباً چھتیس سال سے اسی راہ کی خاک چھان رہا ہے اس کے دل کو تو یہی البیلی کتاب لگی بلکہ چپک کر رہ گئی تین سال پہلے اس کتاب کا لیتھو ایڈیشن ایک عزیز سے ہاتھ لگا، کیا لکھوں اور کس طرح بیان کروں کہ پڑھا اور کیا کچھ دل و دماغ پر بیت گئی دل کا ساتھ آنکھوں نے بھی دیا اور بارہا ایسا ہوا کہ آنکھوں کے پیالے آنسوؤں

کو چھلکنے سے نہ روک سکے آہ! کیا دل و جگر نکالکر رکھدیا ہے۔

انھیں ایام میں حضرت قاضی صاحبؒ کا دیوبند میں ورودِ مسعود ہوا مطالعہ کے بعد اپنے قلبی و دماغی تاثرات کو بیان کیا، سن کر مرحوم میرے تاثر سے خود بھی بہت متاثر ہوئے۔

عرض کیا، حضرت آپکی عربی اور اردو کی بڑی بڑی اور موٹی موٹی محققانہ کتابیں تو بڑے حضرات جانیں یہ طالبعلم تو یہ چاہتا ہے کہ اس کتاب پر جناب اضافہ فرمائیں اور تعلیمی مشقت اور جدوجہد سے بھری زندگی سے فراغت کے بعد کے علمی کاروانِ حیات نے اپنے پیچھے کیا کچھ نقوش چھوڑے ہیں اسے ضرور قلمبند فرمادیں پہلے تو کچھ عذر و معذرت اور ٹال مٹول سے کام لینا چاہا مگر میری طرف سے برابر اصرار بڑھتا رہا۔ ایک طرح کہنا چاہئے کہ اپر مسلط ہو گیا بالآخر میری طالب علمانہ ضد اور خواہش کو شرف قبول سے نوازتے ہوئے ایک مختصر سی تحریر عنایت فرمادی آپ کے اعتبار سے تو یہ مختصر ضرور ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کے لئے یہ ایک اہم اور بیش قیمت تحریر ہے۔

راقم الحروف نے اس کتاب کو آفسیٹ کی کتابت کرا کے اس اہم تحریر کے ساتھ بعنوان "فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات" پہلی ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ میں اپنے مکتبہ صوت القرآن دیوبند سے شائع کیا۔

"کتاب قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" کے شروع میں حضرت قاضی صاحبؒ کے رفیق درس اور قدیم ساتھی ایک باصلاحیت عالم، ادیب اور ملک کے منجھے ہوئے جانے مانے صاحب قلم مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس کے نوک قلم سے نکلا ہوا ایک بڑا ہی خوبصورت مقدمہ ہے اس ابتدائیہ سے حضرت قاضی صاحبؒ کی مشقت اور عسرت سے بھری زندگی کی طرف بڑا واضح اشارہ ہوتا ہے۔ ذرا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے!

"قاضی صاحب نے جوانی ہی میں کثرتِ مطالعہ کی دیوانگی میں قدرت کو آنکھوں کی روشنی کا بڑا حصہ دیکر اس کے بدلے میں علم کی دولت مانگی تھی میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بڑی بے دردی سے اپنی آنکھوں کی قیمتی روشنی لٹارہے ہیں میں یہ نہ سمجھ سکا کہ اس روشنی سے زیادہ قیمتی کون سی دولت ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ راز اس وقت فاش ہوا جب ان کی تصنیف نے ملک کے اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا۔

قاضی صاحب نے جن روح فرسا حالات میں اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا ہے اس نے

میرے دل میں ان کی عظمتوں کا چراغ روشن کردیا ہے جس کی روشنی میں ان کے علمی کمالات کے خدوخال کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں درس و تدریس کی عسرت بھری زندگی سے نکل کر امرتسر، لاہور، بھراَئچ، ڈابھیل، پھر بمبئی کے اسفار اور بھاگ دوڑ نے ان کے جسم کو ضرور تھکا دیا اور وہ قبل از وقت آنکھوں کی روشنی کا بڑا ذخیرہ کھو چلے، اور بالوں کی سیاہی نے شباب کی حکمرانی سے بغاوت کرکے اَمن کا سفید پرچم لہرا لیا لیکن مشکلات و شدائد کی بھٹی نے ان کے جسم کو جتنا تپایا ان کے جوہرِ علم کا سنہرا رنگ اور نکھرتا گیا، اور آج ان کے علمی مقام کی بلندیوں کی طرف سر اٹھایا جاتا ہے تو بڑے بڑے اہل علم کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں" (ص ۳، ۴)

آخری زیر خط جملے نری محبت اور عقیدت کے جذبے سے نہیں نکل گئے ہیں بلکہ یہ ایک ازہر من الشمس فی نصف النہار جیسی حقیقتِ واقعی ہے۔

جس کا جی جب چاہے جہاں چاہے دیکھ سکتا ہے۔

مقدمہ کا ایک ٹکڑا اور دیکھتے چلئے!

"قاضی صاحبؒ نے تاریخ کے جس پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے بلا شبہ وہ اچھوتا ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات کو عہدِ رسالت عہدِ صحابہ، عہد تابعین و تبع تابعین کے چھوٹے چھوٹے اور تنگ دائروں میں محدود کرکے قاضی صاحب نے اپنے لئے تحقیق کا راستہ دشوار بنایا اور اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھیں اس قسم کے تحقیقی کاموں کا تجربہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس موضوع پر علمی دنیا میں اب تک کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔

قاضی صاحب کو احادیث کے بہت بڑے ذخیرہ کے علاوہ تاریخ و سیر قدیم و جدید سفر ناموں تذکروں عربی شعراء کے دواوین اور محاورات و امثالِ عرب کا بڑا گہرا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا سیکڑوں صفحات پلٹنے اور پڑھنے کے بعد شاید چند سطریں موضوع سے متعلق دستیاب ہوئی ہوں گی آپ خیال کرسکتے ہیں کہ ہزاروں صفحات کی ترتیب میں کتنا خونِ جگر جلانا پڑا ہوگا، کتنی راتیں چراغوں کی لو میں بسر کرنی پڑی ہوں گی صبح و شام کی کتنی دلآویزیوں سے بے خبر رہ کر یہ ذخیرۂ معلومات فراہم کیا گیا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ کتاب کی ایک ایک سطر مستند، ایک ایک واقعہ حقائق کی کسوٹی پر کسا ہوا، ایک ایک حوالہ بذات خود سند، نہ معلوم کتنے سمندروں کو کھنگالا گیا ہوگا تب کہیں جاکر لالیِ آبدار کا یہ ذخیرہ آج اہل علم کی نگاہوں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔" ص ۵، ۶

قاضی صاحبؒ کا مقصود اپنی تعلیمی داستانِ حیات سے کیا تھا۔ مناسب یہ ہے کہ اس کی غرض وغایت خود حضرت قاضی صاحبؒ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں: قاضی صاحب اپنے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

"خود اعتمادی اور خود سازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلباء کی تشجیع و تشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے جو بہترین ذہن ودماغ لیکر دارالعلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں۔

مگر عام طور سے ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے ساتھ اپنی بدنامی اور نالائقی کی سند ملتی ہے، کیونکہ ان مدرسوں کے ذمہ داروں کیوجہ سے تعلیم وتربیت کا معیار حد درجہ ناقص بلکہ علم کش ہوتا ہے اور وہ لوگ سارا الزام طلباء کے سر رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ طلبہ اپنے طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انکی حوصلہ شکنی ہوتی ہے"۔ حضرت قاضی صاحب نے ان سطروں میں جو کچھ بیان کرنا چاہا ہے، کیا آج کے دور میں مدارس کا یہ المیہ نہیں ہے؟ ذرہ برابر کیا ان میں مبالغہ ہے؟ ساٹھ ستر سال پہلے کے ماحول کو ذرا چشم تصور میں لایئے اور آج کے تعیش پسند ماحول کا نظارہ کیجئے تو کھلی آنکھوں اس سے بڑھ چڑھ کر نظر آئیگا۔ پہلے اساتذہ کیا ہوتے تھے؟ بیحد معمولی اور قلیل مشاہرہ پر صبر وقناعت کر کے حسابِ کم وبیش سے یکسو ہو کر رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک دن میں دس، دس، بارہ بارہ، اسباق پڑھاتے تھے مدرسہ کے خارج اوقات میں طلبہ کو اپنے گھروں پر بلا کر عمدہ تعلیم اور بہترین تربیت دیتے تھے، خود محنت کر کے طلباء سے محنت کراتے تھے وہ حریص تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آجائے، شب وروز مردم گری اور رجال سازی کی فکر میں رہتے تھے اس کا نتیجہ تھا کہ طلبہ اپنے اپنے وقت پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکتے اور ایک عالم کو اپنی علمی ضیا پاشیوں سے منور کرتے تھے۔ آج اِکاّ دُکاّ اگر کہیں کوئی باقی ماندہ نظر آجاتا ہے تو وہ اسی شخصیت ساز دور کی یادگار ہے، ورنہ تن آسانیوں کا خدا ناس کرے، مدارس کی موجودہ فضاء مایوس کن ہے۔

قاضی صاحبؒ آگے ارقام فرماتے ہیں:

"ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لیکر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خود ستائی اور خود

نمائی کے لئے نہیں لکھی ہے، عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطۂ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں (ص ۸) آگے ص ۹ سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، پہلا عنوان ہے "خاندانی سلسلہ اور پیدائش"۔ اس عنوان کے تحت اپنی تاریخ پیدائش کے ساتھ خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے یہ سلسلہ صف ۱۱ تک ہے۔ دوسرا عنوان ص ۱۱ سے "باقاعدہ تعلیم کی ابتداء"۔ ہے یہ صف ۱۳ تک ہے، تیسرا عنوان صف ۱۳ پر "میرا تعلیمی ماحول" ہے۔ اس عنوان کے تحت اپنے علمی قصبہ مبارک پور اور سواد قصبہ کے متبحر علماء اور مدرسین و مصنفین کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ اس عنوان کے تحت قصبہ مبارک پور کی نامی گرامی ایک علمی شخصیت صاحب "تحفۃ الاحوذی" شرح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری (م ۱۳۵۳ھ) کا ذکر آیا ہے قاضی صاحب" آپ کے پاس بغرض علاج اور گاہے بگاہے ویسے بھی آمدورفت رکھتے تھے اسی عنوان کے تحت محدث مبارکپوری کی زبان سے عربی کا نہایت گرانقدر مقولہ سناتے ہیں۔ "مَنْ سَاوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ فِی الْخُسْرَانِ" یعنی جس انسان کے دونوں دن (کل اور آج) برابر ہوں وہ نقصان میں ہے، یعنی ہر اگلا دن پچھلے دن سے بڑھا ہونا چاہئے۔ اسی عنوان کے تحت نہایت معروف مشہور تصنیفی ادارہ مجمع العلمی، دارالمصنفین اور اس کی علمی تصنیفی سرگرمیوں کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔

چوتھا عنوان ص ۱۶ پر۔ "مدرسہ کا ماحول اور اساتذہ" ہے۔ اس عنوان کے تحت مقامی مدرسہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور اُس وقت کے اساتذۂ کرام کا تعارف کراتے ہوئے بڑے کام کی دوسری باتیں بھی آگئی ہیں۔

قاضی صاحب اس عنوان کے تحت فرماتے ہیں :

"طالب علم میں محنت و کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق و شوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہو سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا۔

آگے درس نظامیہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں!

"اس میں شک نہیں کہ درسِ نظامیہ میں بہت کچھ کتر بیونت کے باوجود اب بھی بہت مفید اور کار آمد ہے کئی مدارس نے اپنے یہاں نئے نصاب جاری کئے مگر نتیجہ کے طور پر ان سے ایسے علماء پیدا نہیں ہوئے جو درس نظامیہ کے فضلاء کی صف میں بیٹھ کر ٹھوس تعلیمی اور تصنیفی خدمات انجام دے سکیں اور دینی علوم و فنون میں مستند فکر اور معتبر نظر رکھتے ہوں

حالات اور زمانہ کے تقاضہ کے مطابق نصاب میں تغیر و تبدل ہونا چاہئے کیونکہ دینی مدارس کے وجود کا مقصد یہی ہے، اسی نام سے وہ جاری ہیں، اور یہی اُنکا اصل کام ہے، میں نے مجموعی طور سے اس درسِ نظامیہ کو پڑھا ہے اور مجھے جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔"

پانچواں عنوان "قوتِ مطالعہ کی برکت" صف ۲۰ پر ہے۔ اس عنوان کے تحت بھی بڑی اچھی باتیں آگئی ہیں۔ چھٹا عنوان "ذہن ساز کتابیں جن کا مطالعہ کیا۔ ساتواں عنوان ہے "مطبوعات کی خریداری اور مخطوطات کی فراہمی۔" ص ۲۵ سے ص ۳۳ تک اس عنوان کے تحت تحریر کا پھیلاؤ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس تحریر سے قاضی صاحبؒ کے ذوقِ مطالعہ، کتابوں سے عشق اور ان سے استفادہ اور فراہمیٔ کتب کے سلسلے میں ہر قسم کے مجاہدہ اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کا جذبہ وافر امنڈتا ہوا نظر آتا ہے، اس عنوان کے تحت تحریر قدرے تفصیل سے ہے، اور آپنے بڑی لذت سے مزہ لے لے کر لکھا ہے حقیقتاً یہ ہے بھی بڑی لذیذ تحریر اس میں نہایت نایاب کتابوں اور بڑے ہی بیش قیمت رسائل کا پتہ بھی ملتا ہے، بڑی خاصے کی چیز ہے۔

آٹھواں عنوان۔ "مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف"۔ ص ۳۳ سے ص ۳۹ تک ہے۔ قاضی صاحبؒ کے اصل ذوق کا یہ میدان ہے اور ہر لکھنے پڑھنے والے صاحبِ ذوق طالب علم کے پڑھنے کے لائق ہے۔ نواں عنوان۔ "مضمون نگاری، شاعری کے ابتدائی نمونے" ص ۳۹ سے ص ۴۴ تک، سب سے پہلا مضمون جو آپ نے لکھا اور اس زمانہ کے رسالہ 'مومن' بدایونی ۵۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۴ء میں چھپا۔ بعنوان "مساوات" یہ مضمون جناب قاضی صاحبؒ کا بنام جناب مولوی عبدالحفیظ (اصل نام) صاحب اعظمی متعلم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پوری" طبع ہوا، اس مضمون کی صرف ایک مختصر سی جھلک بطور نمونہ یہاں دی جاتی ہے:

"بنی نوع انسان میں مساوات و یکسانیت کا حدِ اعتدال پر قائم رکھنا اتنا ضروری اور لازمی امر ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی سلطنت کا نظام اچھی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی جماعت فروغ پاسکتی ہے جو مذہب یا قانونِ مساوات و یکسانیت سے خالی ہے سمجھ لو کہ وہ بالکل ناقص ہے اسی طرح جو جماعت یا سوسائٹی اپنے افراد میں مساوات و یکسانیت بدرجۂ اتم قائم و برقرار نہ رکھ سکتی ہو یقین کرلو کہ وہ آج نہیں تو کل دنیا سے فنا ہو جائے گی۔" قاضی صاحبؒ نے ابتدا میں شاعری بھی کی مگر جلد ہی طبیعت کو اس سے الگ کرلیا جامع مسجد مبارک پور کی تعمیر کے زمانہ

میں بسلسلۂ چندہ آپ نے ایک نظم لکھی تھی یہاں اس کا ایک ابتدائی بند پیش کیا جارہا ہے!

نظر جب جب اٹھائی جارہی ہے
جھلک کعبہ کی پائی جارہی ہے
نظر میں نور پیدا ہو رہا ہے ۔ یہ دل شاد تمنا ہو رہا ہے
زمیں پر عام چرچا ہو رہا ہے ۔ فلک پر شور برپا ہو رہا ہے
کوئی مسجد بنائی جارہی ہے

قاضی صاحبؒ کی پہلی نظم مشہور و معروف دینی اور علمی رسالہ ”الفرقان“ جو اس وقت بریلی سے شائع ہوتا تھا اس میں جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ میں ”مسلم کی دعا“ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ دسواں عنوان۔ ”طبعی رجحانات“ ص ۴۴ پر ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ نقل کردیا جائے تاکہ قارئین کو پتہ چلے کہ آج کے قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے میلاناتِ طبع اور رکھ رکھاؤ کا انداز کیا تھا! فرماتے ہیں ”طالب علمی کا تقریباً پورا دور عسرت اور تنگی میں گزرا کھانے پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی اس وقت آج کی طرح معاش و معیشت کی فراوانی و فراخی نہیں تھی، عام طور سے لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے اس لئے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی و خوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر و برکت تھی، میں بھی ہر معاملہ میں اپنے ذوق و شوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھا اور کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا سفید گزی گاڑھے کا کرتا پائجامہ عام لباس تھا شیروانی بہت کم پہنتا تھا اوپر صدری ہوا کرتی تھی، ٹوپی کشتی نما اچھے کپڑے کی ہوتی تھی، جوتا اس زمانہ کے لحاظ سے قیمتی ہوتا تھا عطر کی شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا، کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا، یہی وضع قطع آج بھی باقی ہے، مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مضر، موہم بخل، اور باعث تحقیر ہوجاتی ہے۔“

قاضی صاحب کے طبعی رجحانات کے سلسلے میں ایک اقتباس اور بھی پڑھتے چلیے:

”بعض اوقات قصبہ کے بڑوں کے یہاں طلبہ اور مدرسین کی دعوت ہوا کرتی تھی، میں کسی بہانے سے بچ کر انکے لقمہ تر کے مقابلہ میں اپنی نانِ جویں میں زیادہ لذت پاتا تھا مراد آباد گیا تو ابتدا میں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا ایک آدھ ہفتہ ضمیر پر جبر کرکے چھپتے چھپاتے یہ کام کیا پھر ڈھائی روپیہ ماہوار مدرسے سے وظیفہ لیکر اس سے نجات حاصل کرلی اور ایک معمولی

ہوٹل میں چھ پیسہ فی وقت کے حساب سے کھانا کھانے لگا قیام مراد آباد کی مدت میں پچاس ساٹھ روپے گھر کے خرچ ہوئے میری پوری تعلیم پر بہت ہی کم خرچہ ہوا ہے۔

آگے چل کر کفایت شعاری سادگی خود شناسی اور کم آمیزی نے بہت فائدہ دیا (اور اس سادگی خود شناسی اور کم آمیزی کو خود سے کبھی جدا نہ ہونے دیا آخر دم تک زندگی انھیں اداؤں کے ساتھ گذار دی) اسی کی برکت ہے کہ بمبئی جیسے شہر میں مدتِ دراز تک رہنے کے باوجود میں "بمبئی والا" بالکل نہیں بن سکا، بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا، تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسہ کی فضاء میں جو ذہن مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہو سکا اور الحمدللہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرہ میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی و تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے۔"

(ـــــ قدم یونہی تو نہیں منزلوں نے تھام لیا
جنوں سے کام یہاں ہم نے گام گام لیا!)

"میں نے اپنی کسی کتاب پر نہ کسی قسم کا معاوضہ لیا نہ رائلٹی کی بات کی اور نہ اس کے لئے کوئی تحریر لکھی بلکہ علم کی خدمت و اشاعت کے جذبہ سے لکھیں۔

اور اسی جذبہ سے ناشروں کو ان کی طباعت واشاعت کی اجازت دی۔"

آگے جی چاہتا ہے کہ اس قسمت بہتر کتاب کا وہ حصہ جسے قاضی صاحبؒ نے احقر راقم الحروف کی خواہش پر اضافہ کیا جس سے صحیح معنی میں کتاب کی تکمیل ہوئی، من و عن کسی حک واضافہ کے بغیر نقل کر دیا جائے!

فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات

بجا، زخارِ مغیلان پراست وادیٔ شوق
شفیقِ آبلہ پائی رَوَد، خدا حافظ!

دورِ جہدِ مسلسل تحصیل علم سے اضافی اور عرفی فراغت کے بعد تعلیم و تدریس سے ذمہ دارانہ زندگی شروع ہوئی، اور شوال ۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء) تک مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور سے منسلک رہا، اس درمیان میں رابطۃ الادباء کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تاکہ اساتذہ اور تلامذہ میں عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہو، مجلۃ رابطۃ الادباء کے نام سے دو تین نمبر بھی نکالا، مگر کام آگے نہ بڑھ سکا، اسی زمانہ میں شباب کمپنی بمبئی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی) کے لیے سید جمال الدین افغانی کے دو عربی رسالوں کا ترجمہ کیا، سہ روزہ زمزم لاہور، ہفتہ وار مسلمان لاہور اور ہفتہ وار العدل گوجرانوالا میرے نام مستقل طور سے آتے تھے ان میں میرے اشعار اور مضامین چھپتے تھے، مدرّسی کا یہ چارپانچ سال دور میرے حق میں صبر ایوب اور گریہ یعقوب کا دور تھا۔

۲۷/ نومبر ۱۹۴۴ء سے ۱۲/ جنوری ۱۹۴۵ء تک مرکز تنظیم اہلِ سنّت امرتسر سے وابستہ رہ کر ردِ شیعیت و قادیانیت میں مضامین لکھنے لکھانے اور چھاپنے میں وقت گذرا، اور اس سلسلہ میں سہ روزہ زمزم لاہور میں آمد ورفت رہی، جس میں میرے اشعار شائع ہوتے تھے، جب زمزم والوں کو کچھ دن کے بعد پتہ چلا کہ میں وہی ہوں تو مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ۱۳/ جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم جون ۱۹۴۶ء تک زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور سے منسلک ہوکر ساڑھے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی، قیام لاہور کے دوران والد صاحب مرحوم حج کے لئے گئے تو شوال ۱۳۶۶ھ سے صفر ۱۳۶۷ھ (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء) تک مدرسہ احیاء العلوم میں عارضی مدرّسی کی، اور ۱۷/ جنوری ۱۹۴۷ء سے سہ روزہ زمزم، روزنامہ ہوا تو میں نے اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب مرحوم کی زیرِ تربیت اس سے

منسلک ہو کر ان سے صحافت اور اخبار نویسی سیکھی، اور تقسیم ملک سے کچھ پہلے ہم دونوں اپنے اپنے وطن اس خیال سے آگئے کہ تقسیم کے ہنگامہ کے بعد واپس آجائیں گے، الغرض جنوری ۱۹۴۵ء سے مئی یا جون ۱۹۴۷ء تک لاہور میں قیام رہا۔

اس درمیان میں یہ کتابیں لکھیں (۱) منتخب سیر جس کی کتابت تیرہ پاروں تک ہو چکی تھی (۲) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں جس کو جناب احسان دانش مرحوم مکتبہ دانش مرتک لاہور سے شائع کرنے کے لئے چار سو صفحات تک کتابت کرا چکے تھے (۳) ائمہ اربعہ کی پوری کتابت مرکز تنظیم اہلِ سنت امرتسر نے کرائی تھی (۴) الصالحات کو ملک دین محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور نے طباعت واشاعت کے لئے لیا تھا، مگر افسوس کہ ان سے کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکی اور تقسیم ملک کی نذر ہو گئی۔

نیز اسی درمیان حیاتِ امام ابن حنبل، حیاتِ امام لیث بن سعد مصری، الطبابۃ عند العرب، اور دوسرے موضوعات پر متعدبہ معلومات جمع کیں، نیشنل لائبریری لاہور کا ممبر بن کر وہاں سے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سبکی، خلاصہ تاریخ ابن عساکر اور دوسری کتابیں لاکر پڑھا اور ان سے اقتباسات جمع کئے اور مندرجہ ذیل کتابیں خریدیں تہذیب التہذیب ابن حجر بارہ جلدوں میں، دیوان الحماسہ ابن شجری التبیان فی اقسام القرآن ابن قیم، شرح الفقہ الاکبر، الصراع بین العلم والدین وغیرہ، مولانا محمد عثمان فارقلیط، جناب احسان دانش، مولانا حبیب الرحمٰن برادر زادہ مولانا محمد سلمان منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، جناب ابو سعید بزمی، پروفیسر خان عبدالحمید خان، پروفیسر جھنگ کالج و مصنف جدید آلات جنگ، یہ سب حضرات چاہتے تھے کہ میں لاہور میں رہ کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کردوں، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، لاہور کی یادگاروں میں تین کتبے ہیں جو جامع مسجد احیاء العلوم کی محراب میں کندہ ہیں میں نے ان کو لاہور میں عبدالرشید محبوب الرقم سے لکھوایا تھا۔ ۱۹۴۸ء کی ابتداء میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم سکریٹری حکومت یوپی کی زیر نگرانی بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار انصار جاری کیا جس میں شریک ادارت مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم مصنف مصباح اللغات تھے، مولانا اس زمانہ میں جامعہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ میں مدرس تھے یہ اخبار حکومت کے عتاب کی وجہ سے ساتھ آٹھ ماہ کے بعد بند ہو گیا، قیام بہرائچ دوران میں نے تذکرہ علمائے مبارکپور کے لئے ابتدائی معلومات جمع کیں

اورابو العلا معری کا دیوان سقط الزند خریدا۔

شوال ۱۳۶۷ھ سے شعبان ۱۳۶۸ھ تک (۱۹۴۸ء) جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تعلیمی خدمت انجام دی، یہاں کے عظیم الشان کتب خانہ سے خوب خوب استفادہ کیا، مختلف موضوعات پر اقتباسات نقل کئے اور یہیں رجال السند والہند کی تدوین کی ابتداء کی، یہیں کے دوران قیام میں پہلی بار بمبئی گیا، تو شرف الدین الکتبی کے یہاں سے امام ابن قیم کی کتاب الجواب الکافی عن سائل عن الدواء الشافی خریدی۔

الغرض فراغت کے بعد ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۹ء تک مبارکپور، امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل کے درمیان آٹھ سال تک "گو میں رہارہینِ ستم ہائے روزگار" مگر اپنے خیال سے غافل نہیں رہا۔

بمبئی میں آمد، اور مصروفیات

آٹھ سال تک صحرانوردی کے بعد جمعہ ۲۸ ر ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ (نومبر ۱۹۴۹ء) کو بمبئی پہونچا جو میرے علمی سفر کی آخری منزل تھی، ابتداء میں دفتر جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی میں افتاء اور دوسرے تحریری کام کرتا رہا، ۱۵ ر جون ۱۹۵۰ء میں روزنامہ جمہوریت کا اجراء ہوا، میں اس میں نائب مدیر بنایا گیا اخبار اپنے لوگوں کا تھا، پالیسی جمعیۃ علماء کی تھی، مگر بعض خاص لوگوں کی کی طرف سے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ مجھے از خود علیحدہ ہونا پڑا، اور میں ۲۳ ر فروری ۱۹۵۱ء سے روزنامہ انقلاب سے منسلک ہو گیا، اور جواہر القرآن اور احوال و معارف کے عنوان سے ہر قسم کے علمی، دینی، سیاسی، تاریخی مضامین روزانہ دو دو تین تین کالم میں لکھتا رہا، سفر اور حضر ہر حال میں یہ سلسلہ جاری رہا، اور مارچ ۱۹۹۱ء میں چالیس سال سے زائد مدت تک لکھنے کے بعد خود بند کر دیا، صحافت کی تاریخ میں یہ ایک ریکارڈ ہے، ۱۹۵۲ء میں انجمن خدام النبی بمبئی کی طرف سے ماہنامہ "البلاغ" اور ہفتہ وار "البلاغ" جاری ہوا، میں دونوں کی ادارت میں شامل ہوا، ہفتہ وار چھ ماہ کے بعد بند ہو گیا اور ماہنامہ "البلاغ" میری ادارت اور ذمہ داری میں پچیس سال سے زائد مدت تک جاری رہ کر بند ہو گیا، نیز اسی دوران ۱۲ ر نومبر ۱۹۶۰ء سے دس سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں دینیات و اخلاقیات کی تعلیم دی، اور دوبار دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں جزوقتی مدرسی کی، ۱۹۵۱ء میں بھیونڈی میں مدرسہ مفتاح العلوم کی بنیاد رکھی جو

ماشاء اللہ اب علاقہ مہاراشٹر کا عظیم دینی و علمی ادارہ بن گیا ہے اور کامیابی سے جاری ہے۔

تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم "کنار آبِ چوپاٹی و گل گشتِ اپالو" کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے، انکے ایک ہموطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکز علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دورِ شباب گذارا میں نے بڑے بڑے عقید تمندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیشکش کا شکریہ ادا کر کے شہر کی چمک دمک میں کھوجانے کے مقابلہ میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی، میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ و احباب اس معاملہ میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقلمند سمجھتا تھا بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لئے میں نے دولت و ثروت کے اس "اندرونِ قعر دریا" میں تیس سال سے زائد "تختہ بند" ہونے کے باوجود اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا، اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر بلکہ ایک بڑے خلا کو پُر کیا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے "خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان" کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا کہ "اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے" اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

اردو تصانیف

(۱) عرب و ہند عہد رسالت میں (۲) خلافت راشدہ اور ہندوستان (۳) خلافتِ امویہ اور ہندوستان (۴) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (۶) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۷) تاثر و معارف (۸) دیارِ یورپ میں علم و علماء (۹) آثار و اخبار، یہ سب کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں اور پہلی پانچ کتابوں کو تنظیم فکر و نظر سکھر سندھ پاکستان نے دوبارہ شائع کیا، عرب و ہند عہدِ رسالت میں اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں کو مکتبہ عارفین کراچی نے دوبارہ شائع کیا عرب و ہند عہد رسالت کا ترجمہ عربی زبان میں مصری عالم ڈاکٹر عبد العزیز عبد الجلیل عرب نے کیا اور الھیئۃ المصریہ مکتاب مصر نے اس کو چھاپا نیز موصوف نے ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں کا ترجمہ عربی زبان میں کر کے اسلام آباد یونیورسٹی کے مجلّہ "الدراسات الاسلامیہ" میں قسط وار

شائع کیا، پھر مکتبہ آل مدظلہ، بکریہ ریاض نے کتابی شکل میں شائع کیا، اور "عرب ہند عہدِ رسالت میں" کا سندھی ترجمہ تنظیم فکر و نظر سے شائع ہوا۔ (۱۰) مختصر سوانح ائمہ اربعہ (۱۱) تدوین سیر و مغازی (۱۲) خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت شیخ السند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہوئی (۱۳) بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات شرف الدین الکتبی و اولادہ بمبئی نے چھاپا (۱۴) معارف القرآن تاج ایجنسی بمبئی سے شائع ہوئی (۱۵) علی و حسین (۱۶) طبقات الحجاج (۱۷) تذکرہ علماء مبارکپور (۱۸) تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں (۱۹) افادات حسن بصری (۲۰) اسلامی نظامِ زندگی (۲۱) حج کے بعد (۲۲) مسلمان (۲۳) اسلامی شادی (۲۴) قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک، یہ کتابیں مختلف اوقات میں مختلف اداروں سے شائع ہوئیں آخر کے چند رسائل متعدد بار طبع ہوئے۔

عربی تصانیف

(۲۵) رجال السند والہند پہلی بار محمد احمد میمن برادران کے زیرِ اہتمام مطبع حجازیہ بمبئی میں چھپی، دوسری بار حک و اضافہ کے بعد دو اجزاء میں دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوئی (۲۶) العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین پہلی بار ابناء مولوی محمد بن غلام السورتی بمبئی نے شائع کیا، دوسری بار دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوئی۔ (۲۷) الہند فی عہد العباسیین دارالانصار قاہرہ میں طبع ہوئی۔

تحقیق و تعلیق عربی میں

(۲۸) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول لابی الفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی کو شرف الدین الکتبی و اولادہٗ بمبئی نے شائع کیا، اس کے بعد الدار السلفیہ بمبئی نے چھاپا اور مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے اس کو شائع کر کے عام کیا، معلوم ہوا کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے (۲۹) تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین بغدادی کو شرف الدین الکتبی و اولادہ نے طبع کیا (۳۰) دیوانِ احمد میں نے اپنے جد مادری مولانا احمد حسین صاحب کے عربی اشعار و قصائد کو مرتب و مدوّن کر کے شائع کیا۔

ان مستقل تصنیفی و تالیفی کاموں کے علاوہ پچاسوں علمی و تحقیقی مضامین و مقالات معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، صدق لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند اور دیگر اخبارات و رسائل میں لکھے ہیں، بلکہ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، اخبار "انقلاب" میں چالیس سال تک جو مضامین

مختلف موضوعات پر لکھے ہیں اگر ان کو علیحدہ علیحدہ عنوان سے جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ سینکڑوں جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

دینی و علمی اسفار اپنے کاموں میں انہماک کی وجہ سے اِدھر اُدھر آنے جانے سے بچنے کے باوجود اندرونِ ملک کے مختلف شہر اور مقامات کا بہت زیادہ سفر ہوا، غیر ملکی اسفار کی ابتداء حج و زیارت کے مبارک سفر سے ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پانچ بار، حج و زیارت اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، پہلا حج ۱۳۷۵ھ میں، دوسرا حج ۱۳۸۵ھ میں، تیسرا حج ۱۳۹۳ھ میں، چوتھا حج ۱۳۹۷ھ میں اور پانچواں حج ۱۴۰۲ھ میں کیا اب کے بار امیر الحج بنایا گیا تھا، چوتھے حج ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۶ء) کے بعد عزیزم مولوی خالد کمال سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاد عرب و افریقہ کا چھ ماہ تک ذاتی سفر کیا، اور جن مقامات میں گیا وہاں کے اہلِ علم اور کتب خانوں سے استفادہ کرتا رہا اس سفر میں سعودی عرب میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، الخبر، دمام، ریاض، درعیۃ گیا، دمام سے ریاض تک ریل سے سفر کیا، یہاں سے کویت گئے جو ملک بھی ہے اور شہر بھی، قیام مرکز دعوت وارشاد میں تھا، امیر کویت کے انتقال کی وجہ سے عام بندی تھی، بعض اہلِ علم سے ملاقات ہوئی اور بعض کتب خانوں میں جانا ہوا، ادارۃ التراث العربی میں نہیں جاسکا میں جس کا مشیر علمی تھا۔ دو دن کے بعد دمشق گئے مگر دہاں کے حکام نے ہوائی اڈہ سے باہر نہیں جانے دیا، اور شام کو مصر کے لئے روانہ ہوگئے اور قاہرہ کے میدان عتبہ میں کرنک ہوٹل میں کئی دن قیام رہا جامعہ ازہر اور وہاں کے علماء اساتذہ تلامذہ سے ملاقاتیں رہیں، قاہرہ سے متصل فسطاط اور جیزہ کے علاوہ حلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا، پورا شہر قاہرہ دارالعلم اور دارالکتب معلوم ہوتا تھا، متحف قبطی (قبطی عجائب خانہ) کی کئی منزلہ شاندار عمارت میں فراعنۂ مصر کے مجسمے، ان کے استعمالی سامان اور حنوط کی ہوئی ان کی لاشیں رکھی ہیں اوپر کی منزل میں چودہ فرعونوں کی لاشیں شیشے کے صندوقوں میں قطار سے پڑی ہیں جن میں فرعون موسیٰ کی لاش بھی ہے، اہرام اور ابوالہول عبرت گاہ ہیں۔ فسطاط کی جامع عمرو بن عاص میں نماز پڑھی اس کے ایک گوشے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا مزار لکڑی کے حظیرے میں ہے، اسی علاقہ میں امام شافعی کا مزار بھی ہے، کشتی میں بیٹھ کر دریائے نیل پار کیا، مصر سے گھانا (مغربی افریقہ) کا سفر ہوا جہاں عزیزی مولوی خالد کمال دارالافتاء کی طرف سے مبعوث تھے، اس کے دارالحکومت اکرا میں کئی ماہ قیام رہا اور وہاں کی بام

یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ عربی سے خوب خوب استفادہ کیا، امام سمعانی کی کتاب الاملا والاستملاء نقل کی، ابن موقل کی کتاب صورالارض، ابن اخوہ کی کتاب معالم القربہ فی احکام الحسبۃ وغیرہ سے اقتباسات نقل کئے علمائے اندلس کی کئی کتابوں کے عکسی فوٹو کی زیارت کی، مشہور ماہر بحریات ماجد مجدی کی متعدد کتابیں یہاں موجود ہیں، کوماسی، کیپ، کوسٹ، تمالے اور شمالی علاقوں کا ہفتوں تک دورہ کیا۔ اسی سے متصل ٹوجو (لومی) کی سیاحت کی، واپسی پر قاہرہ آکر رجال السند والہند کی طباعت کا معاملہ دارالانصار سے طے کیا ہوٹل لوسکی میں کئی روز قیام رہا طبقات المفسرین داؤدی، کتاب البرہان والتمیان جاحظ اور بعض دوسری کتابیں خریدیں، قاہرہ میں فضیلۃ الاستاذ عبدالمنعم التمر مرحوم، شیخ صلاح ابواسمٰعیل مقری اور ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے بار بار ملنا جلنا ہوتا تھا اکثر وقت جامع ازہر کے اداروں اور کتب خانوں میں گذرتا تھا، قاہرہ سے اردن کے لئے روانہ ہوئے، دارالسلطنت عمان پہاڑوں کے نشیب و فراز میں آباد ہے، یہاں فندق ابراہیم میں قیام رہا یہاں سے بھی ملکِ شام کے لئے کوشش کی مگر ناکامی رہی حکومت اردن کی اجازت سے بیت المقدس میں حاضری کا ارادہ کیا اور ارضِ محتلہ میں داخل ہوگئے، مگر اسرائیل نے واپس کردیا، اردن یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی اورادۂ شؤنِ اسلامیہ والاوقاف نے اپنی مطبوعات دیں۔ ایک دن رقاء جانا ہوا، وہاں کوئی مسجد نظر نہیں آئی اور گرجے کئی دیکھے، اردن میں رومیوں کے قدیم مدرج اور آثار بہت زیادہ ہیں، عجائب خانہ میں اموی خلفاء و امراء کے لباس اور استعمالی ظروف موجود ہیں۔

یہاں سے بذریعہ ٹیکسی سعودی عرب کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں معان، قلعہ کرک وغیرہ آئے عصر اور مغرب کے درمیان مقامِ حجر سے گذرے جو قوم ثمود کا مسکن تھا سلسلہ کوہ دور تک چلا گیا ہے۔ درمیان میں سڑک ہے پہاڑوں میں قومِ ثمود کے مساکن کے آثار نظر آتے تھے، رمالِ متحرکہ جگہ جگہ تودے کی شکل میں تھے، سرِ شام سعودی عرب کی سرحد حالۃ عمار سے گذرے، تبوک سے دوسری ٹیکسی پر چلے رات میں مقام العُلا سے گذرے جو بارونق شہر ہے، اس علاقہ کو کتابوں میں، "قُرٰیٰ عربیہ" سے تعبیر کیا گیا ہے، خیبر سے گذرتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے، دوچار دن قیام کرکے مکہ مکرمہ اور وہاں سے جدہ آئے، یہاں استاذ عبدالقدوس انصاری مرحوم مدیر مجلہ المنہل نے اپنی جملہ تصانیف ہدیہ میں عنایت کیں، ریاض پہونچکر فندق التاج الجدید میں دارالافتاء کی طرف سے قیام ہوا، مورخ الجزیرۃ استاذ

محمد الجاسر نے دار الیمامہ کی مطبوعات و منشورات ہدیۃً دیں دار عبدالعزیز کے مدیر محترم نے اس کی مطبوعات پیش کیں اور فضیلۃ الشیخ العلامۃ عبدالفتاح ابو غدہ نے اپنی تصانیف و مطبوعات کا ایک معتدبہ حصہ عنایت فرمایا، وہاں کے بعض کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

ریاض سے کراچی آئے مکتبہ عارفین جاکر اپنی کتابیں طلب کیں جن کو انھوں نے چھاپا تھا تو دونوں کتاب کا ایک ایک نسخہ دیا، اور اس پر "حقِ تصنیف" لکھا مجھے یہ دیکھ کر طیش آیا اور اس تحریر کو کٹولیا، دو دن وہاں رہ کر لاہور آئے مگر میرے دور کا لاہور مجھ کو نہیں ملا، گرمی سخت تھی دوسرے دن دہلی آگئے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر و نظر سکھر کی دعوت پر ہندوستان کے ایک علمی وفد کے ساتھ سندھی ادبی میلہ کے اجلاس میں شرکت ہوئی اور جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان مرحوم کی زیرِ صدارت جلسہ ہوا، جس میں صدرِ محترم کے ہاتھوں سندھ کی روایتی چادر اور ٹوپی اور تنظیم فکر و نظر کا اعزازی نشان دیا گیا، اور ان کے حکم سے ارکانِ وفد پاکستان کا سرکاری مہمان کی حیثیت سے دورہ کرایا گیا، اس سلسلہ میں کراچی، ٹھٹھ، دیبل، لاہور، اسلام آباد، ٹیکسلا، پشاور، بلوچستان، کوئٹہ، لاڑکانہ، موہن جوداڑو (موئن جودڑو یعنی موت کا ٹیلہ) سکھر، اڑور، نواب شاہ، حیدر آباد وغیرہ کی سیر و سیاحت کی۔ اڑور (جس کو عربی تاریخوں میں لور لکھتے ہیں) اور کراچی اور ٹھٹھ کے درمیان دیبل دونوں کے کھنڈروں میں حضرت محمد بن قاسم کی مسجد کی جگہ نمایاں تھی دونوں مقام پر دو دو رکعت نماز پڑھی، اس بار بھی لاہور جانے کے باوجود اپنی قیام گاہ اور اخبار زمزم کا آفس نہ پاسکا۔ ۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں شرکت ہوئی دونوں کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم شریک تھے، ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، مرحوم سے جو شخص دو ایک بار ملتا تھا محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے خاص تعلق رکھتے ہیں، یہ مرحوم کے اخلاق کی خوبی تھی، میں بھی یہی محسوس کرتا تھا، انھوں نے مجھے ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلّی اور ایک حمائل شریف ہدیہ دیا ہے، ان سے خصوصی مجلسوں میں بار بار ملاقات ہوتی رہی۔ اگست ۱۹۸۷ء میں تنظیم فکر و نظر سندھ نے میری کتابیں چھاپیں اور ان کے رسم اجراء میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مجھے دعوت دی، وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت میں تاج محل ہوٹل کراچی میں نہایت شاندار جلسہ ہوا، جس میں پاکستان کے مشہور ماہر قانون جناب خالد ایم اسحاق پروفیسر

سراج منیر مرحوم ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، پروفیسر پریشان خٹک چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور، ماہر سندھیات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر ایاز کراچی یونیورسٹی وغیرہ نے ان کتابوں اور اس کے مصنف کے بارے میں اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا، اسی سلسلہ کا دوسرا جلسہ تنظیم فکرونظر کے صدر مقام سکھر میں ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت ہوئی۔

جن اداروں سے تعلق تھا اب بھی ہے

جن دینی علمی اداروں سے پہلے تعلق رہا ہے اور ان میں رہ کر مفوضہ خدمت انجام دی ہے وہ یہ ہیں۔ معتمد انجمن تعمیرات ادب مزگنگ لاہور، مشیر علمی ادارہ التراث العربی دولت کویت، صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر بمبئی، صدر دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر، رکن انجمن خدام النبی بمبئی، رکن رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی، اور فی الحال رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ، مشرف شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ، اعزازی مدیر برہان دہلی۔ رکن مجلس شوری درالعلوم تاج المساجد بھوپال، رکن مجلس شوری دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور (بہار)

حکومت کی قدر شناسی

۱۵/اگست ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی زبان اور علمی شغف پر توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپے سالانہ تاحیات کی پیش کش ہوئی ۱۹۸۸ء سے یہ رقم دس ہزار ہوگئی ہے۔

اردو زبان میں رجالِ قراءات پر کوئی مکمل کام تاحال نہیں ہوا، المقری کرنل بسم اللہ بیگ نے تذکرہ "قاریان ہند" مرتب کرکے کم از کم ہندوستان کی حد تک ایک بڑا اہم کام ضرور کردیا ہے، ضرورت اور شدید ضرورت تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین سے لے کر اب تک کے کم از کم منتخب اور مشہور خدام قرأت کا ایک تذکرہ مرتب ہوجائے، یہ کام اتنا آسان نہ تھا، اس میں گوناگوں موانع تھے، مگر راقم الحروف نے محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر اعتماد کرکے بنام خدا اس سال گذشتہ کام کا آغاز کردیا، حضرت قاضی صاحبؒ حسن اتفاق سے اس وقت یہیں دارالعلوم دیوبند میں تشریف فرما تھے، آپ سے اس کام کا ذکر آیا، چونکہ یہ موضوع قاضی صاحبؒ کی تصنیفی و تحقیقی زندگی کا محبوب ترین موضوع تھا، سن کر بیحد خوش ہوئے، دیر تک حوصلہ افزائی فرماتے رہے، راقم الحروف نے عرض کیا کہ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ قراء کے اس تذکرہ کی تکمیل کے بعد اس پر مبسوط مقدمہ جناب ہی کے قلم سے ہونا چاہئے،

فرمایا! ضرور، یہ تو میرا موضوع ہے، ضرور لکھوں گا۔

مگر انسان کی سوچ کچھ ہوتی ہے اور مشیت الٰہی کی کار فرمائی کچھ اور ہی ہوتی ہے، دیوبند میں جناب قاضی صاحبؒ کی کسی ایسی علالت کی کوئی اطلاع نہیں تھی جس سے کوئی تشویش ہوتی، بالکل اچانک یہ معلوم ہو کر کہ قاضی صاحبؒ اب اس دنیا میں نہیں رہے، قلم کی آبرو، علم وتحقیق کی دنیا کا قیس د فرہاد، اپنے پیچھے اولاد واعزہ اور ہم جیسے بیشمار چاہنے والوں کے سر دل پر رنج وغم کا بھاری پہاڑ توڑ کر، دنیا اور اس کے سارے خرخشوں سے خود ہلکا ہو کر ۲۸ر صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء دن گذار کر شب میں واصل بحق ہو گیا۔ شاعر خوشنوا، فخر ہند اقبال سہیل اعظمی مرحوم نے خدا جانے کس عالم میں یہ شعر کہا تھا ؎

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر

جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

مگر وائے افسوس تصنیف وتالیف اور علم وتحقیق کا یہ نیّر تاباں، قرطاس وقلم کے ذریعہ دماغ ودل کے افق پر علمی ضیاپاشیاں کرتا ہوا بعمر تراسی سال غروب ہو گیا۔ زبان سے بیساختہ کلماتِ استرجاع نکلے، دل ودماغ پر تاحال سناٹا چھایا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے پر فضل وانعام کی بیشمار بارش برسائے، بال بال مغفرت فرمائے، مراتبِ اعلیٰ سے سرفراز فرمائے، جملہ متعلقین خاص طور پر، مولانا خالد کمال صاحب، مولانا ظفر مسعود، مولانا سلمان وحسان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین!

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے سانحۂ ارتحال کے بعد جناب قاضی صاحبؒ کا اس دنیا سے کوچ کر جانا بلا مبالغہ موت العالم موت العالَم کا مصداق ہے ؎

وماکان قیسٌ هلكهٗ هلكَ واحدٍ

ولكنهٗ بنيان قـوم تهـدّمَا

کمپیوٹر کے ذریعہ عربی، اردو (نوری نستعلیق) کتابت کا مرکز

نواز پبلی کیشنز بالمقابل نئی مسجد دار العلوم دیوبند

مسجد چھتہ کی رونق آہ! اب جاتی رہی

از- محمد سلمان منصورپوری

حاملِ دین و شریعت، ماہر و یکتائے فن　　منبع رشد و ہدایت، شیخ محمود الحسن
آفتابِ علم و حکمت، فقہ کے ماہِ مبیں　　حضرتِ محمود تھے نور نظر "حامد حسن(۱)"
نسبت "امداد(۲)" و "قاسم(۳)"، فیضِ دربار رشید(۴)　　جذبۂ احقاقِ مدنی(۵) فکرِ "محمود(۶) الحسن"
تھانوی(۷) فہم و ذکاء اور ورع و تقوائے خلیل(۸)　　جی بھر کر لیے تھے "شیخ(۹)" سے درِّ عدن
سادگی "عبد قادر(۱۰)" کے تھے وہ عکس جمیل　　جن کی رگ رگ میں بسا تھا "شاہ الیاسی(۱۱)" چلن
شان تھے اسلاف کی اس دورِ پرآشوب میں　　فکرِ امت تھی ہر اک پل، اور دعوت کی لگن
وہ مدرس، مفتیٔ اعظم، فقیہ عصر تھے　　قاسمی گلشن میں تھے وہ زینتِ صد انجمن
عاجزی و انکساری جن پہ تھی ہر دم نثار　　عظمتِ حق پر تھا قرباں، جن کا اپنا جان و تن
زہد و استغنا تھا جن کا کامل ایمانی شعار　　جن کی ٹھوکر میں ہمیشہ سے رہا گنجِ زمن
ان کے جانے سے فضائیں ہوگئی ہیں اشک بار　　ہر طرف چھائی اداسی غم میں ہے ہر مرد و زن
رو رہے ہیں لوگ کیسے آج ان کی یاد میں　　عشق محمود الحسن ہے ان کے دل میں موج زن
وہ ظرافت، نکتہ سنجی اور ذکاوت اب کہاں　　ڈھونڈتے رہ جائیں گے اب لوگ وہ عہد کہن
اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں وہ مبارک مجلسیں　　جن میں لٹتے تھے کبھی وہ درہائے علم و فن
مسجد چھتہ کی رونق آہ اب جاتی رہی　　کیا خبر تھی وقت دکھلائے گا یہ رنج و محن

غمزدہ سلمان کی رب سے یہی ہے التجا
کردے ہم کو راہِ محمود الحسن پر گامزن

(۱) آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حامد حسن گنگوہی (۲) سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۳) حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۴) امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (۵) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۶) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی (۷) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (۸) محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۹) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی (۱۰) عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (۱۱) داعی الی اللہ حضرت شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

ماہ جمادی الثانی، رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۱۱، ۱۲	فی شمارہ۔ /۶	سالانہ۔ /۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند، سہارنپور۔ یو۔پی

سالانہ بدل اشتراک	سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ۔ /۴۰۰ روپے پاکستان سے ہندوستانی رقم۔ /۱۰۰ بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم۔ /۸۰ ہندوستان سے۔ /۶۰

Ph. 01336-22429 Pin-247554

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

(۶) یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

کمپیوٹر کتابت نواز پبلی کیشنز دیوبند

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

۱۸۵۷ء کی تیز و تند سیاسی آندھی نے جب ہندوستان میں صدیوں سے روشن اسلامی سلطنت کے چراغ کو گل کردیا اور سرزمین ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہوگیا تو اس عہد کے اہل دل علماء نے اپنی بصیرت سے مستقبل کے اس عظیم الحادی فتنہ کو دیکھ لیا جو اس سیاسی اور مادی انحطاط کے پس پردہ برق رفتاری کے ساتھ ملت اسلامیہ کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا، وہ اپنی فراست ایمانی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر اس سیلاب بلاخیز کے آگے بند نہیں باندھا گیا اور اس کے رُخ کو پھیرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو اسلامی عقائد و افکار اور دینی اخلاق و کردار اس طوفان کی موجوں سے ٹکراکر پاش پاش ہوجائیں گے اور وہ مسلم معاشرہ جو صدیوں کی سعی پیہم اور انتھک کوششوں کے بعد وجود میں آیا ہے تشتت وانتشار کی نذر ہوجائے گا۔

ان حضرات نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر فیصلہ کیا کہ اس ایمان سوز فتنہ کا مقابلہ جو ایک زبردست اور مستحکم سلطنت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا ہے طاقت و قوت سے نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان اللہ کے بندوں نے تحفظ دین اور بقائے ملت کی اس جنگ میں آہنی اور آتشیں اسلحہ کے بجائے علم وللہیت کے ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اسباب وذرائع سے یکسر محرومی کے عالم میں اللہ کے اعتماد اور بھروسہ پر الحادو

زندقہ کے اس باد صرصر کے بالمقابل قصبہ دیوبند میں علم و عرفان کا ایک چراغ روشن کردیا، ہندوستان میں تحفظ دین کی اسی اولین کوشش کا مظہر جمیل "دارالعلوم دیوبند" ہے جس کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں محض اللہ کے اعتماد پر ہوا تھا، پھر اسی قندیل معلق اور چراغ توکل سے مسلسل چراغ روشن ہوتے گئے، یہاں تک کہ علم و نور کا یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے پورے برصغیر پر چھاگیا اور اس کی ضیاپاش کرنوں نے مسیحی مشنری کی برپا کی ہوئی ظلمتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اور اسلامیان ہند کو ایک ایسے مہیب اور خطرناک فتنے سے بچالیا جس سے اس کا تشخص و امتیاز ہی نہیں وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند ایک تحریک بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا تو شاید برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ و محرف ہوچکی ہوتی یا اس کا نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔

دارالعلوم کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے برٹش امپائر میں برپا الحاد و اسلام کے معرکہ میں قیادت کا کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و اقدار اور اسلام کی مقدس شخصیتوں کے خلاف برصغیر میں جتنی تحریکیں بھی وجود میں آئی ہیں خواہ وہ مسیحیت کے نام سے آئی ہوں یا شدھی و سنگھٹن کے عنوان سے، چاہے وہ قادیانیت و بہائیت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہوں، یا رافضیت و رضاخانیت اور مودودیت کے لباس میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کے درپے ہوئی ہوں، دارالعلوم دیوبند نے ایسی ہر باطل اور گمراہ تحریکوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا ہے اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کرکے دین کے تحفظ کی اہم ترین خدمت انجام دی ہے۔

ان دفاعی جدوجہد کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک سو تیس سالہ زندگی میں ہزاروں ایسے افراد پیدا کئے جنھوں نے تعلیم دین، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتاء، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، مناظرہ، حکمت، طب وغیرہ فنون علم میں بیش بہا خدمات انجام دیں، پھر ان خدمات کا دائرہ کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے بلکہ

بر صغیر کے ہر ہر گوشہ اور دیگر بلاد بعیدہ کے ہر ہر حصہ میں پہونچ کر انھوں نے دین خالص کا پیغام پہونچایا، خلقِ خدا کو جہل کی تاریکی سے نکال کر نور علم کی دولت سے ممتاز کیا اور تحفظ دین کی تحریک کو آگے بڑھایا اور دینی و علمی موضوعات پر لٹریچر کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ تیار کر دیا کہ بغداد و قرطبہ کی علمی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

چنانچہ مولانا محمد الحسنی لکھتے ہیں۔

" اس حقیقت سے کوئی ہوش مند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دار العلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس میں ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا و استحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔" (پیام ندوہ)

دار العلوم دیوبند کا یہ امتیاز بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی چندہ سے تعلیمی نظام چلانے کا طریقہ اسی کا ایجاد کردہ ہے، دار العلوم کے قیام سے پہلے بر صغیر میں جتنے دینی ادارے تھے ان کا وجود و بقا حکومت یا امراء و رؤسا کی داد و دہش کا مرہون منت ہوتا تھا، ان مدارس کا عوام سے براہ راست کوئی ربط نہیں ہوا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ختم ہوتے ہی جونپور، لکھنؤ دہلی وغیرہ کی علمی انجمنیں اُجڑ گئیں، علماء و طلبہ نانِ شبینہ کے محتاج ہو کر کسب معاش کے لئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، اس کے برخلاف دار العلوم نے کبھی کسی حکومت یا ریاست کے در پر جبہ سائی کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا سرمایۂ حیات توکل علی اللہ اور خدا کے صالح بندوں کے مخیرانہ جذبات کو قرار دیا اور آج تک وہ اپنے اس امتیاز و کردار پر پامردی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور ایک نہیں متعدد بار حکومت وقت کے عظیم عطیات کو شکریہ کے ساتھ رد کر چکا ہے۔

بر صغیر کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے میں بھی دار العلوم کا بنیادی کردار رہا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں آزادیٔ کامل کا جذبہ پیدا

کرنے والے اکابر دارالعلوم اور اس کے فضلاء ہی ہیں، اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا منصور انصاریؒ، حضرت مولانا عزیز گلؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ وغیرہ کی جدو جہد اور مساعی جمیلہ سے کون انکار کر سکتا ہے۔

غرضیکہ دارالعلوم دیو بند نے کتاب وسنت کی اشاعت، اسلامی تہذیب وثقافت کے بقاو تحفظ اور مذہبی وسیاسی فتنوں سے ملت اسلامیہ کو خبر دار رکھنے میں جو ہمہ گیر د حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے وہ مدارس اسلامیہ کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

دارالعلوم دیو بند کی انھیں مساعی جمیلہ کا یہ اثر ہے کہ آج برصغیر میں اسلام کا قدم دیگر بلادِ اسلامیہ کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم ہے، مسجدیں آباد ہیں، اسلامی علوم و فنون کے چرچے ہیں اور دینی مدارس کا پورے ملک میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ عالم اسلام کے علماء انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دارالعلوم اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ آج بھی کتاب وسنت اور تحفظ دین کی کوششوں میں مصروف ہے، چنانچہ بعض طالع آزماسیاسی بازیگروں کے درپردہ اشارے پر جب قادیانیت کے مردہ لاشے میں پھر سے جان ڈالنے اور ایک سوئے ہوئے فتنہ کو جگا کر مسلمانوں میں بے دینی وانتشار برپا کرنے کی سازش رچی گئی تو دارالعلوم نے بروقت اس فتنہ کا سر کچلنے کے لئے اپنی فوج میدان میں اتار دی، ایرانی انقلاب کے زیر سایہ رافضیت نے جب اپنا دام تزویر بچھایا تو دارالعلوم نے آگے بڑھ کر امت مسلمہ کی رہنمائی کی، بابری مسجد کی تاریخی وشرعی حیثیت سے قوم کو باخبر کرنے میں بھی دارالعلوم نے قابل قدر کردار ادا کیا، بابری مسجد کی شہادت کے بعد امت کی صحیح رہنمائی کے لئے بھی دارالعلوم نے کامیاب جدوجہد کی، غرضیکہ دارالعلوم اپنی بساط اور حدود میں رہ کر ملت کی علمی فکری اور تعمیری خدمت میں مصروف عمل ہے، لیکن اگر کسی کو دارالعلوم کی یہ خدمات نظر نہیں آتیں تو اس میں دارالعلوم کا نہیں خود اس کی بصارت وبصیرت کا قصور ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو عالم اسلام نے بارہویں صدی کا مصلح و مجدد تسلیم کیا کیونکہ بعد ملۃ شاہ صاحب نے اسلام کے چشمہ صافی کو بدعات و محدثات سے پاک صاف کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی۔

تصوف و طریقت کے نام پر شرکِ جلی اور شرک خفی کی جو رسمیں اور جو بدعی افکار و تصورات مذہب توحید اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی طاقت اور قوت تاثیر کو کمزور کررہے تھے ان کی پرزور تردید فرمائی۔

ہندوستان کے رضائی فرقہ نے اس مجدد خاندان سے اسی بنیاد پر اپنے آپ کو الگ رکھا اور شاہ صاحبؒ کے پوتے حضرت شہیدؒ کو خاص طور پر اپنے لعن وطعن اور تکفیر بازی کا نشانہ بنایا۔

اعلیٰ حضرت بریلوی کی کتابوں میں مولانا محمد اسماعیل شہید کے ساتھ جو گستاخانہ رویہ اختیار کیا گیا وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن ان کے جد امجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بارے میں بھی ایک جگہ اعلیٰ حضرت صاحب یہ فقرہ تحریر کرگئے کہ سارے فتنے کی جڑ یہی ایک شخص ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو امت مسلمہ نے جو عظمت و عقیدت دی اور علماء کے اصحاب فکر و تقویٰ طبقہ میں شاہ صاحب کو جو مقبولیت ملی اس فرقہ کی حاسدانہ سازشوں نے اسے نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ یہ فرقہ خود ہی راسخین اہل علم کی نظروں میں علم و ثقاہت کے

پہلو سے گر گیا۔

اس فرقہ کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی اس بے وزنی و بے قدری کا احساس تھا چنانچہ اس طبقہ نے اپنے آپ کو شاہ صاحب کے مصلحانہ افکار سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے یہ کوشش شروع کی کہ شاہ صاحب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا جائے۔ اس کوشش کا آغاز پاکستان کے رضائی مکتب فکر سے ہوا۔ اور اب اس کوشش کو باقاعدہ ایک تحریک اور ایک محاذ بنانے کی جدوجہد کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ شاہ صاحب کی سوانحی کتاب انفاس العارفین کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور مترجم (مولانا محمد فاروق) نے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا کہ ولی اللہی فکر سے تعلق کا دم بھرنے والوں نے اب تک شاہ صاحب کی بعض اہم کتابوں کو دبا رکھا تھا اور انفاس العارفین کا اردو ترجمہ ان اہم کتابوں کو منظر عام پر لانے کی پہلی کوشش ہے پھر اس کے بعد شاہ صاحب کی ایک کتاب القول الجلی کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا، اس کے مترجم مولوی تقی انور صاحب ہیں، اس کا مقدمہ مولانا ابوالحسن صاحب زید فاروقی نے لکھا اور مولانا مرحوم نے چھپانے اور دبانے کی داستاں کو اور زیادہ دراز کیا اور حکیم محمود صاحب برکاتی کے حوالہ سے لکھا کہ۔

شاہ صاحب کی کتابوں کو نایاب کر کے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اپنے مصنفات کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا گیا اور اپنے نظریات کی تبلیغ شاہ صاحب کے نام سے کی گئی (القول الجلی ص ۳)

ایک کثیر التصانیف عالم کے ساتھ دو ایک معمولی کتابوں میں ایسا ہونا ممکن ہے اور ہوسکتا ہے کہ شاہ صاحب کے معاملہ میں بھی ایسا ہوا ہو۔ لیکن اس داستاں کو اتنا بڑھانا کہ ہر اس عبارت کو الحاقی قرار دیدینا جو اپنے خیال و مسلک کے خلاف نظر آئے کہاں کی تحقیق ہے؟ اس کوشش سے تو شاہ صاحب کی تمام تصنیفات ہی شک واشتباہ کی نذر ہو جائیں گی۔

جن کتابوں کے بارے میں مولانا زید صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہابیہ اور اصحاب توحید نے انہیں چھپایا وہ کتابیں شاہ ولی اللہؒ کے کشف اور قلبی کیفیات اور روحانی واردات سے متعلق ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ شاہ صاحب نے ان کتابوں میں تصوف کے احوال بیان کرنے کے لئے اس وقت کی مروج صوفیانہ زبان اور صوفیانہ اصطلاحوں سے کام لیا ہے اور پھر ان کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ عام صوفیہ کے خیالات سے مختلف ہے۔

جیسا کہ تکلیف شرعی کے سقوط کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے (فیوض الحرمین ص ۲۴۳) پھر حضرت شاہ صاحب نے کشفی حالات وعلوم کے بارے میں جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے۔

"کشف وکرامات اور علوم مکاشفات یہ سب آنے جانے والے ہیں، صبح کو آتے ہیں اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ یہ علم نہ حصولی ہے اور نہ علم حضوری ہے" (القول صفحہ ۳۱۸)

حضرت شاہ صاحب نے کشف وکرامات کی حقیقت کو چند لفظوں میں بیان کر کے اپنی تمام کشفی تصنیفات کی اصل حیثیت کو واضح کر دیا کہ کشوف وکیفیات عارضی اور وقتی باتیں ہیں۔ علوم شریعت (کتاب وسنت) زندگی کا دائمی اور مستقل ہدایت نامہ ہے۔ اور انہیں علوم کی تبلیغ واشاعت دینی فریضہ ہے۔ کشوف اور کیفیات کی تبلیغ واشاعت نہ دین کا فریضہ ہے اور نہ دین حق کی عظمت ان عارضی کیفیات سے وابستہ ہے۔

امام الصوفیہ شیخ ابن عربی کے شارح امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی مشہور کتاب الیواقیت میں لکھا ہے۔ "ہمارے نزدیک کشف کو وحی پر مقدم کرنا بے حقیقت ہے کیوں کہ اہل کشف پر اکثر اشتباہ واقع ہوتا ہے (ص ۴۴)

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "کسی ولی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسی معصیت کے ارتکاب میں سبقت کرے جس کے متعلق اسے بذریعہ کشف یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس معصیت میں مبتلا ہونا اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے مثلاً کسی ولی کو اس بات کا کشف ہوا کہ وہ رمضان شریف کی فلاں تاریخ کو بیمار پڑ جائے گا، اس نے اپنے اس کشف کا وجہ سے اس دن کا روزہ ہی نہ رکھا تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہے"

علماء حق نے شاہ صاحب کی انہی تصنیفات وتحقیقات کو عام کیا جو وحی الٰہی کے یقینی علوم کی تشریحات پر مشتمل ہیں۔

امام شعرانی فتوحات مکیہ کے ایک اقتباس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "کسی ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر امر الٰہی نازل ہوا یا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ امر کیا، اور اگر کوئی ایسا کہے تو وہ تلبیس ابلیس میں مبتلا ہے (۱۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مجددانہ عظمت کشف وکرامات کے ان واقعات وحالات سے وابستہ نہیں جو آپ نے انفاس العارفین، القول الجلی اور تصوف کی

دوسری کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ بلکہ علوم وحی (کتاب وسنت) کی ان تشریحات وتحقیقات سے وابستہ ہے جن کی شاہ صاحب نے عقل وحکمت کی خداداد صلاحیت کے ذریعہ اشاعت کی۔ اور اپنی ایمانی فراست سے آنے والے سائنسی دور کے عقلی تقاضوں کے مطابق انہیں مرتب کیا،

شاہ ولی اللہؒ کے کشف وکرامت کی وہ باتیں جو آپ نے اپنے والد اور چچا اور اپنے متعلق بیان کی ہیں ان سب کی حیثیت روحانی تفریح کی ہے۔ آپ کی حقیقی کرامت یہ ہے جس کے متعلق شیخ اکبر اپنی فتوحات میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان اعظم الکرامات ان یصل العبد الی حدٍّ لو غفلَ العالم کله من الله لقام ذکر ذالك الولی مقام ذکر الجمیع (الیواقیت ۲۵۲)

سب سے بڑی کرامت کسی ولی کی یہ ہے کہ بندہ ذکر الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ اگر سارا عالم خدا سے غافل ہو جائے تو تنہا اس بندہ کا ذکر اس عالم کے ذکر کے قائم مقام ہو جائے۔

یہاں لفظ ذکر اپنے وسیع شرعی مفہوم میں بولا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ عمل صالح جو زبان، قلم اور جسمانی اعضاء سے صادر ہو وہ ذکر الٰہی میں شامل ہے (مکتوبات امام ربانی دفتر دوم ص ۶۱)

قانون شریعت کی مشہور تشریحی تصنیف۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ہے جس میں کسی صاحب کو بھی الحاق واضافہ کا شبہ نہیں ہوا، اس میں شاہ صاحب نے ایک باب قائم کیا۔

من ابواب الاحسان۔ یعنی احسان کے مباحث۔ یہاں شاہ صاحب نے صوفیاء کرام کی عام اصطلاح تصوف وطریقت کے الفاظ سے گریز کیا اور حدیث جبریل کا لفظ احسان استعمال کیا۔ یہ مباحث احسان (۳۶) صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں جس میں شاہ صاحب احسان کی حقیقت، اخلاص، حضور قلب، خدا اور اس کے رسول کی محبت، اخلاق حمیدہ اور ان کی حقیقت اور آخر میں روحانی احوال کی تفصیل بیان کرتے ہیں، لیکن کسی جگہ تصوف وطریقت کے الفاظ اور صوفیانہ احوال ومراسم کا حوالہ نہیں دیتے۔ نظری بحث میں کوئی مثال صوفیائے وقت کی پیش نہیں کرتے، بلکہ ایک جگہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران شاہ صاحب کے قلب میں جو القاء ہوا اسے بیان کرتے ہیں۔

"۱۴۴۳ھ میں جب مجھے مدینہ منورہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے بے شمار مرتبہ اس امر کا مشاہدہ کیا کہ آپ فرمارہے ہیں۔

لاتجعلوا زیارة قبری عیداً ۔ میرے مزار مبارک کی زیارت کو عید (کے تہوار) کی طرح نہ قرار نہ دینا۔ پھر لکھتے ہیں۔

هذا اشارة الی سدِّ مَدْخلِ التحریف کما فعل الیهود والنصاری بقبور الانبیاء علیهم السلام وجعلوها عیداً وموسماً بمنزلة الحج.

(حجۃاللہ مصری جلد دوم ص ۷۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں دین بر حق کے اندر ہر قسم کی تحریف کا راستہ بند کرنے کی طرف اشارہ فرمایا، جیسے یہود و نصاری نے اپنے انبیاء کے مزارات کے ساتھ معاملہ کیا اور ان مزارات کو عید کا میلہ بنادیا اور اس زیارت کو حج بیت اللہ کے اجتماع کی طرح قرار دے لیا۔

انفاس العارفین اور القول الجلی کے مکاشفات اور عرس و چہلم کی محفلیں منعقد کرنے کے واقعات کو کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی طرح زور دے کر بیان کرنے والے حضرات کو حجۃ اللہ البالغہ کے اس روحانی کشف والہام کا علم کیوں نہیں ہے۔؟

کیا یہ بھی الحاق ہے ؟

مولانا زید صاحب رقم طراز ہیں"

شاہ ولی اللہ کو گروہ اسماعیلیہ، وہابیہ، غیر مقلدین اور اہل حدیث نے تحریفات و تزویرات کر کے اپنے رنگ میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے (مقدمہ القول الجلی ص ۱۸)

ایک عام قاری کس طرح شاہ صاحب کی اصلی تعلیمات اور حقیقی افکار اور وہابی جماعت کے الحاقات اور تحریفات کے درمیان فرق و امتیاز قائم کر سکتا ہے ؟

اس کی کوئی کسوٹی ان حضرات کو بیان کرنی چاہئے جو شاہ ولی اللہ کے نظریات کا اپنے آپ کو حقیقی ترجمان قرار دے رہے ہوں۔

شاہ صاحب فرقہ ناجیہ (نجات یافتہ فرقہ) کی تشریح کرتے ہوئے نجات کی جو کسوٹی تحریر فرمارہے ہیں وہ یہ ہے،

الفرقة الناجیة هم الآخذون فی العقیدة والعمل جمیعاً بما ظهر من الکتاب

والسنة وجری علیه جمهور الصحابة والتابعین (حجۃ اللہ ۱۷۰)

شاہ ولی اللہ کے یہ نئے ترجمان اور بخیال خود حقیقی وکیل یہ بتا سکتے ہیں کہ کشف وکرامات اور عرس وچہلم اور مزارات سے علمی اور روحانی استفادہ کرنے کے جو واقعات ان حضرات کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیا عہد رسالت اور عہد صحابہ وتابعین میں ان باتوں کا عام چلن اور عام چرچا تھا۔ ایک واقعہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ان حضرات کو مل گیا کہ انہوں نے اپنا رخسار قبر مبارک پر رکھ کر اظہار غم کیا۔ لیکن کیا عہد صحابہ میں ایسا بھی ہوا کہ روزانہ صبح وشام عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مزار پاک پر آکر قدم بوسی کرتے ہوں۔ قبر مبارک پر مراقبہ کرکے حضورؐ سے علمی اور روحانی فیض حاصل کرتے ہوں؟

کیا صحابہ وتابعین کے عہد مبارک میں وفات پانے والے بزرگوں کے مزارات پر اس قسم کی تقریبات کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ کیا اس عہد مبارک میں مزارات پر ہزاروں روپے صرف کرکے بلند گنبد اور قبے تعمیر کیے جاتے تھے۔؟

شاہ صاحب کے ان خود ساختہ وکیلوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ روحانی قوتوں کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن روحانی قوتوں کی وہ کرشمہ سازیاں جو امت کے عہد زوال میں نمایاں ہوئیں انہیں واجب الاتباع شریعت وسنت میں کوئی اہم مقام دیا جائے۔؟

اسے کوئی صاحب علم وایمان تسلیم نہیں کرسکتا، کسی ولی اور قطب کے کشف کو وحی الٰہی اور علم نبوت کی طرح بے چوں وچرا تسلیم کرنا شریعت حقہ کے ساتھ مذاق ہے۔ اس کی ایک مثال شاہ صاحب ہی کی زندگی میں یہ ملتی ہے کہ ایک طرف حضرت شاہ صاحب کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ آپ نے اپنے استاذ شیخ ابو طاہر صاحب کی فرمائش پر حضرت مجدد صاحب سرہندی کی کتاب "ردّ روافض" کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا اور شیعیت کی تردید میں حضرت امام ربانی نے جو قوی دلائل پیش کئے ان پر شاہ صاحب نے مجدد صاحب کی تعریف وتحسین کی۔ دوسری طرف جس شہر مبارک (مدینہ منورہ) میں بیٹھ کر یہ کتاب تحریر کی اسی شہر مقدس میں روضہ پاک پر شاہ صاحب کو یہ کشف حاصل ہوا۔؟

وعلم باطن ہیچ احدی بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از ائمہ اثنا عشری رضی اللہ عنہم قوی ترنیست یعنی حضور علیہ السلام کے بعد علم باطن اثنا عشری اماموں سے زیادہ کسی کا قوی نہیں ہے (صفحہ ۲۶)

یہی وہ تصور ہے جس پر شیعیت کی ساری عمارت قائم ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر رفض و شیعیت کی تردید میں اتنازور لگانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

مولانا زید صاحب فیوض الحرمین صفحہ (۶۳) کے حوالہ سے ائمہ اہل بیت کے بارے میں شاہ صاحب کاایک کشف تحریر فرماتے ہیں۔ "میں ائمہ اہل بیت کی طرف متوجہ ہوا، میں نے ان کاایک خاص طریقہ پایااور وہی اصل ہے اولیاء کے طریقوں کی"

تعجب ہے کہ مولانا زید صاحب شاہ صاحب کی کتابوں میں تصرف کے لئے وہابیہ اور اسماعیلیہ کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کی نظر شیعہ فرقہ کی طرف نہیں اٹھتی، جس فرقہ کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے تحفہ اثنا عشریہ میں الحاق کیااور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ موضح قرآن کے حاشیہ میں الحاق کیاجس کا نمونہ راقم کے پاس موجود ہے۔

یہ موضح قرآن کا وہ پہلا ایڈیشن ہے جو مطبع احمدی کلکتہ میں (۱۲۴۵ھ) کو چھپا، مولانا زید صاحب نے مولانا برکاتی کے حوالہ سے ایک مقام پر یہ تسلیم ضرور کیا ہے کہ قرۃ العینین فی ابطال شہادۃ الحسینؓ اور البنۃ العالیہ فی مناقب المعاویہؓ دونوں کتابیں ارباب تشیع نے شاہ صاحب کی طرف منسوب کردی ہیں۔ (صفحہ ۴)

مولانا زید صاحب اس کشف کا مطلب سمجھنے میں خود حیران و پریشان نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں "حضرت شاہ ولی اللہ کو نیا طریقہ حضرات ائمہ اہل بیت سے ملا ہے، اس نئے سلسلہ (تصوف) کا تفصیلی بیان عاجز کی نظر سے نہیں گذرا۔"

مولانا صاحب کو اس کی تفصیلی تشریح شیعہ علماء کی کتابوں میں مل سکتی تھی، اور ایران کے علامہ خمینی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں شیعی تصوف کی تشریح اسی اصل کے تحت کی ہے۔ مولانا زید صاحب نے القول الجلی کے ایک کشف کے بارے میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کشف جب ایک رسالہ میں شائع ہوا تو بعض علماء (جو زید صاحب کے ہم مسلک ہی ہوں گے) نے کہا کہ شاہ صاحب نے اس کشف میں ستاروں کی تاثیرات پر بحث کی ہے (بلکہ ستاروں کی تاثیرات کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو معمول قرار دیا ہے) اسے کتاب سے خارج کردیا جائے۔ لیکن زید صاحب نے بعض علماء اور فضلاء کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔

وہ علماء حق جن کے سینوں کو اللہ تعالی نے توحید و نبوت کے خالص علوم سے روشن کیا ہے اگر انہوں نے شاہ صاحب کی طرف منسوب ایسی کتابوں کو اہمیت دینے سے گریز کیا جن کے ذریعہ رواجی تصوف کے تصورات اور مراسم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو ان کا وہ جذبہ یقیناً توفیق الٰہی کے تحت صادر ہوا اور اس میں دین برحق کی عظیم مصلحت پوشیدہ رہی ہے آخر آج اس حلقہ تصوف میں بھی بعض ایسے علماء و فضلاء نکل آئے جنہوں نے بعض کشوف کو کتابوں سے خارج کرنے کا مشورہ دیا؟۔

یہ الگ بات ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ وہابیہ کی ضد میں جن حضرات کو اپنی نجات آخرت نظر آتی ہے وہ رکیک سے رکیک تاویلات کے سہارے ان کشوف کو عوام کے سامنے پیش کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔

اس طالب علم کو اس حقیقت کے اظہار میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ان کشوف و کیفیات کو موضوع بحث بنا کر عوام میں انھیں اچھالنا اور طبقہ خواص میں محصور و محدود رکھے جانے والے روحانی احوال کو نااہل عوام تک پہونچانا نہ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ زیادتی و گستاخی ہے بلکہ شریعت حقہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ اور شریعت کو مذاق کا موضوع بنانے کے لئے اہل ضلالت کو دعوت دینا ہے۔

ان اہل تحقیق پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ حضرات شاہ صاحب کی تصنیفات میں جب کوئی عبارت بدعات و محدثات کی تردید میں دیکھتے ہیں، تو اسے فرقہ وہابیہ کا الحاق و تزویر قرار دے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ اور جب کوئی عبارت ایسی ملتی ہے جو کتاب الٰہی اور احادیث صحیحہ کی واضح تعبیرات کے خلاف ہوتی ہے تو اسے اسرار حقیقت کا نام دے کر اس کی تاویلات کی جاتی ہیں اور انہیں صحیح قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلی بات کی مثال یہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے حاجت بر آری کی نیت سے بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔

کل من ذهب الى بلدة اجمير او الى قبر سالار مسعود او ماضاهاها لاجل حاجة يطلبهافانه آثم اثماً اكبر من القتل والزناء. اليس مثله الا مثل من كان يعبد المصنوعات او مثل من كان يدعوا اللأت والعزّى (تفهيمات الهيه مطبوعه

حیدر آباد سندہ جلد دوم ص ۴۹)

یعنی ہر وہ شخص جو کسی حاجت کے لئے شہر اجمیر یا سالار مسعود غازی کے مزار بہرائچ جائے یا ان سے مشابہ کسی دوسری جگہ جائے تو اس نے گناہ کیا ایسا گناہ جو قتل بدکاری کے گناہ سے بڑا ہے کیا وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو بنائی ہوئی چیزوں کی عبادت کرتا ہے یا جو لات وعزیٰ کو پکارتا ہے۔

مولانا زید صاحب کے خیال میں یہ عبارت شاہ صاحب کی عبارت میں ملائی گئی ہے اور اس کی دلیل مولانا کے نزدیک یہ ہے۔

"اس (ملانے والے کو) معلوم نہیں کہ کسی فعل کے ثواب کو فرض قطعی کے ثواب سے یا حرام قطعی کے گناہ سے زیادہ اور بڑا اقرار دینا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے، اس شخص کو یہ نہیں معلوم کہ قتل کرنے اور زناء کرنے کے گناہ کا منکر کافر ہے اور اجمیر شریف اور بہرائچ شریف کسی حاجت کی طلب کے لئے جانے والا اگر کہتا ہے کہ اس میں گناہ نہیں ہے تو وہ کافر نہیں ہے۔ (مقدمہ القول الجلی صفحہ ۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار پر پوری نظر رکھنے والا اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ عبارت باطل نہیں بلکہ حق ہے اور اس عبارت کے مصنف خود شاہ صاحب ہی ہیں اور شاہ صاحب کو دلائل شرعی کی روشنی میں اچھی طرح معلوم ہے کہ غیر اللہ کو حاجت روا سمجھ کر ان کے پاس جانا، وہ فوت شدہ بزرگ ہوں یا اصنام شرک جلی ہے اور شرک جلی کے گناہ کا انکار کرنے والا اپنے آپ کو کفر کے اندھیرے میں پہنچادیتا ہے۔ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

شاہ صاحب کے سامنے اس وقت مزارات پرستی کا پورا نقشہ واضح تھا، ان حضرات کو شاہ صاحب کی آخری وصیت کا مطالعہ کرنا چاہئے، جسے تاریخی تحقیق کے ساتھ جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس وصیت میں شاہ صاحب نے صاف طور پر لکھا ہے۔ "صوفیہ کے ساتھ تعلق ونسبت بہت غنیمت ہے لیکن ان کی مروجہ رسموں کی کوئی قیمت نہیں میری بات بہت تلخ ہے لیکن مجھے جو حکم ملا ہے میں اسے بجالانے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تم مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو اور یہ تمہارے بدترین افعال ہیں" حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کا طواف آج تک کرلیا جاتا ہے۔ اور اس فعل کو طواف

ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

شاہ صاحب نے جس دور میں قبر پرستی کی اس شدت سے مذمت کی ہے وہ دور عالم گیرؒ کی وفات کے بعد کا دور ہے جسے خلیق نظامی صاحب نے مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی گراوٹ کا بدترین دور قرار دیا ہے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے دوسرے پروفیسر ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے اس کی مثالیں دی ہیں اور بتلایا ہے کہ اس دور میں مساجد ویران نظر آتی تھیں اور مزارات پررونق تھی، یہاں تک کہ دہلی جامع مسجد کے حوض پر ہندو اور مسلمان دونوں کی دکانیں لگتی تھیں اور اس بازار کو مولانا محمد اسماعیل شہید نے بادشاہ وقت کو توجہ دلاکر ہٹوایا تھا۔

اور جامع مسجد کے آثار میں موئے مبارک کے ساتھ بزرگوں کی تصویریں بھی تھیں جن کی زیارت کرائی جاتی تھی، ان تصویروں کو حضرت مرزا جان جاناں نے بادشاہ کو توجہ دلاکر ہٹوایا تھا۔

دوسری بات کی مثال یہ ہے:

علم نجوم بحیثیت ایک علم کے ضرور موجود ہے لیکن حسب ذیل صحیح حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستاروں کی تاثیر کو اہمیت دینے کے بارے میں جو وعید ارشاد فرمائی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

عَن زَيْدِ بن خَالد الجهني رَضِيَ اللهُ عنهُ قَالَ: صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلّٰى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبحِ بِالحُدَيبِيةِ، عَلَى إثرِ سمَاءٍ (۱) كَانَت منَ اللَّيْلَةِ فَلَمَّا انصَرَفَ النَّبِيُّ صَلى الله عليه وَسَلَمَ اَقبلَ عَلَى النَّاس فَقَال لَهُم" هَلْ تَدرُون مَاذا قَال ربكم؟ قالوا اللّٰه و رسوله عالم، قَالَ أصبَحَ مِنَ عِبَادِى مؤمن بى و كَافر، فامَّا مَن قَالَ: مُطِرنَا بفَضْلِ الله وَرَحْمَتِه، فَذالكَ مُؤمِن بِى، كَافِر بالكَوكَبِ وَاَمَّامَنْ قَالَ: مُطِرنَا بنَوءِ (۱) كذَاو كَذا ، فَذلِكَ كَافِر بِى ، مومِن بِالكَوكَبِ" رواه البخارى (وكذالك مالك والنسائى)

زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: اللہ کے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مقام حدیبیہ میں فجر کی نماز پڑھائی رات میں بارش ہوئی تھی آپ نماز سے فارغ ہوکر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور سوال فرمایا تمہیں پتہ ہے؟ تمہارے پروردگار نے کیا کہا؟ لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کے پیغامبر (صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ جانتے ہیں کہا کہ

میرے بندوں نے میری تصدیق کر کے یا میرا انکار کرتے صبح کی جس نے کہا ہم پر بارش اللہ کے فضل ورحمت سے ہوئی ہے وہ میری تصدیق کرنے والا اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے لیکن جس نے کہا فلاں فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے وہ میرا انکار کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔ (بخاری، موطا، نسائی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص مسلمان ہو کر واقعات عالم کو ستاروں کی تاثیر کی طرف منسوب کرتا ہے وہ اپنا ایمان گنوا دیتا ہے۔ حدیث مطلق ہے لیکن محدثین نے اس وعید کو خاص کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص ستاروں کو موثر حقیقی (نہ کہ صرف ایک سبب) سمجھ کر ایسا کہتا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے۔

مولانا زید صاحب نے القول الجلی کے حوالہ سے شاہ صاحب کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک میں دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں جو کہیں زہرہ ستارہ کی قوت کار فرما تھی اور کہیں مشتری اور عطارد کی قوت کا اثر تھا اور کہیں ان ستاروں کی قوت آفتابی قوت سے مل کر دو گنی ہو گئی تھی۔ اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر

وہم چنیں روز حجۃ الوداع قوت مشتری با قوت شمسیہ و قوت قمر و قوت زہرہ و قوت زحل و قوت عطارد در ہم آمیخت من کل واحد منہا جزء واحد تا آنکہ یک چیز شد، در عالم تخمہ تسخیری و تالیفی و فرمانی و تشریعی منتشر گردانید (ص ۳۶۱۔ ۳۶۲)

حجۃ الوداع کے موقعہ پر ایسا ہی ہوا کہ مشتری ستارہ کی قوت دوسرے سیارات، آفتاب وماہتاب زہرہ، زحل اور عطارد کی قوتیں آپس میں مل کر ایک قوت بن گئی اور اس قوت نے دنیا کو فتح کرنے اور مانوس کرنے، حکم جاری کرنے اور شریعت کو پھیلانے کا تخمہ دیا،

اس سے پہلے لکھا ہے کہ ان ستاروں کی قوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس نفیس سے جوش مار کر نکلی اور دشمنوں کو زیر کر لیا، (مقدمہ صفحہ ۷۴)

اول تو اس قسم کی باتوں کو شاہ صاحب جیسی محدث، فقیہ اور مفسر قرآن ہستی کے حوالہ سے عوامی رسالوں میں چھاپنا انتہائی بے احتیاطی بلکہ جسارت بے جا معلوم ہوتی ہے۔

مولانا زید صاحب نے اس تحقیق کی تشریح و تاویل میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو لیکن جس ذات اقدس کے کمالات کو قرآن کریم صفات الٰہی کا ظہور کہتا ہو اور رسول

پاک کو مظہر صفات کے طور پر پیش کرتا ہو اس ذات اقدس کو سیاروں اور ستاروں کا معمول بنا کر پیش کرنا کیا اس ذات اقدس کی تقدیس و عظمت کے مطابق ہے ؟

قرآن کریم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کو رحمت الٰہی کا مظہر کہا۔ فبما رحمة من الله لنت لهم (آل عمران ۱۵۹)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ خدا کی رحمت کے سبب رحم دل اور نرم مزاج واقع ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے آپ کی فاتحانہ قوت کو اپنی قوت کا ظہور کہا۔ وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى (انفال ۱۷)

اے نبی ! آپ نے مٹی نہیں پھینکی جب آپ نے پھینکی لیکن در اصل اللہ تعالی نے پھینکی۔

یہ قرآنی تعبیر ہے اور اسی تعبیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پوشیدہ ہے۔ صرف وہابیہ اسماعیلیہ کی ضد میں اس قسم کی بحثوں کو عوام میں لانا اور پھر یہ دعوی کرنا کہ رسالت کی عظمت کے علم بردار ہم ہیں۔ یہ وہابیہ اسماعیلیہ کورے گستاخ ہیں۔ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے ؟

کسی مصنف کی تصنیف میں الحاق و اضافہ کا دعوی کرنا تو آسان ہے لیکن اسے ثابت کرنا آسان نہیں محض کسی بات کو اپنے مذاق و مسلک کے خلاف پاکر اسے الحاق کہنے لگے تو اس کو کون اہمیت دے سکتا ہے۔

صوفیائے چشت میں حضرت سید گیسودراز کے ملفوظات جوامع الکلم کے بارے میں اہل علم نے یہ لکھا ہے کہ ملفوظات صوفیہ میں اس مجموعہ کو مستند حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ مجموعہ سید صاحب کے صاحبزادے نے اپنے والد کی حیات میں مرتب کیا اور سید صاحب نے اس کی تصحیح کی اور پھر اسے چھاپا گیا،

ان ملفوظات میں سید صاحب فرماتے ہیں

"نوعا آخر چند سالکے عارفے و چند مالکے ہالکے بسیار دین اسلام رازیاں کار آمدند، چناں کہ فرید عطار، جلال رومی، محی الدین ابن عربی سخنے مزخرف و بذاتہ منحرف اصحاب الفضول" یعنی چند عارف اور صوفی ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ملمع شدہ کلام (سچ اور غلط کا

مرکب) اور اصحاب شریعت سے انحراف کرنے والی باتوں سے دین اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اور ان صوفیوں میں فرید الدین عطار، مولانا جلال الدین رومی مصنف مثنوی، شیخ ابن عربی شامل ہیں صوفیائے چشت کے حلقہ میں ان مشائخ کی حیثیت اور ان کے کلام کا مرتبہ درجہ استناد رکھتا ہے اور تصوف کے خیالات کا ماخذ و مرجع ان حضرات کی مشہور کتابیں ہیں۔

سید محمد گیسو دراز کوئی معمولی آدمی نہیں، حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی کے جانشیں ہیں اور سرزمین دکن میں سید محمد صاحب کے ذریعہ تصوف کی بڑی اشاعت ہوئی ہے۔

بعض اہل قلم کو اس عبارت کے بارے میں شبہ ہوا ہے کہ شاید یہ کلام الحاقی ہو، لیکن جب اس عظیم چشتی بزرگ کے عام افکار و خیالات اور اس کا ماحول سامنے آتا ہے اور اس پر غور کیا جاتا ہے تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی اصلاحی تحریک ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالعزیز صاحب دبیلی کے ذریعہ ہندوستان پہنچی اور اس وقت کے مسلم حکمراں محمد ابن تغلق پر اس کا اثر پڑا۔

محمد ابن تغلق نے تصوف کے مروجہ غالیانہ خیالات و اعمال سے بے زاری کا اظہار کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ صوفیہ کی ایک جماعت کو دہلی سے چلے جانے پر مجبور کر دیا،

ابن تیمیہ کی تحریک کو آج طنزیہ زبان کے مطابق وہابی تحریک کہہ لیجئے اس وہابی تحریک کے پھیلتے ہوئے اثرات کا مخدوم چراغ دہلوی نے جائزہ لیا اور اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ چشتی مشائخ کی محنت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

حضرت محبوب الٰہی و شیخ نظام الدینؒ کے مریدوں میں مخدوم صاحب کا مزاج شروع ہی سے بالکل علحدہ تھا، مخدوم صاحب نے مسجد قوت الاسلام مہر دلی میں سالہا سال حدیث شریف کا درس دیا تھا، مخدوم صاحب پر اتباع سنت کا غلبہ تھا،

مخدوم صاحب کے اسی مختلف رنگ سے عام صوفی لوگ بیزار معلوم ہوتے تھے، چنانچہ ایک نادان صوفی نے آپ پر چاقو سے حملہ کر کے آپ کو زخمی کر دیا تھا۔

صوفیا کے تذکرے اس حملہ کا سبب بیان نہیں کرتے لیکن اس کے سوا اس کا اور کیا سبب ہو سکتا تھا کہ آپ صوفیاء کے عام طریقوں سے الگ تھلگ رہ کر اتباع سنت پر زور دیتے

تھے، اور یہ بات عام صوفیوں کو ناپسند تھی،

مخدوم صاحب کے جانشین سید محمد گیسو دراز تھے اور یہ اپنے شیخ کی راہ میں ان سے دو قدم آگے تھے۔ سید صاحب کھلم کھلا اعلان کرتے تھے۔

مشرب پیر حجت نمی شود، دلیل از کتاب و حدیث مے باید (اخبار الاخیار ص ۱۸۱)

پیر کا مشرب مرید کے لئے حجت شرعی نہیں ہے، ہر عمل کے صحیح ہونے کے لئے کتاب اللہ اور حدیث نبوی سے دلیل دینا ضروری ہے۔

سید محمد گیسو دراز کا یہ اعلان وعقیدہ مروجہ تصوف کے بنیادی اصول کی نفی کرتا ہے تصوف کا بنیادی کلمہ یہ ہے۔

بے سجادہ رنگین کن، گرت پیر مغان گوید

سید محمد صاحب چشتی صوفیاء میں وہ پہلے اور آخری صوفی ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کے ہر شعبہ پر کتابیں تصنیف کیں، سید صاحب شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم کے افکار کی تردید میں بھی ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتے تھے مگر اس دور کے مشہور قادری بزرگ سید اشرف جہاں گیر سمنانیؒ نے انہیں روک دیا۔ (مشائخ چشت ۲۳۴)

صوفیائے چشت کے مشہور مصنف اور مبصر پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی حکمت عملی نے چشتی تصوف کو ابن تیمیہ کی اصلاحی تحریک کے سیلاب میں بہنے سے بچالیا۔

ان دونوں بزرگوں نے تصوف کو شریعت سے قریب کیا اور صوفیاء اور علماء کے درمیان جو دوری تھی اسے ختم کیا،

اور یہ وہ جدوجہد تھی جو حضرت مخدوم صاحب کو ان کے مرشد کامل حضرت محبوب الٰہی سے ورثہ میں ملی تھی، حضرت شیخ المشائخ کے ملفوظات (فوائد الفواد) کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس ناچیز نے فوائد الفواد کے علمی مقام کے بارے میں کتاب میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

پرفیسر خلیق نظامی صاحب نے اس اہم موضوع پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے، اصل میں یہ موضوع امام ابن تیمیہ پر قلم اٹھانے والے اہل علم کی توجہ کا طالب تھا، لیکن ہندوستان کے تصوف پر ابن تیمیہ کی تحریک اصلاح کا کیا اثر پڑا، ؟۔ اس بحث سے مولانا ابو

الحسن علی صاحب ندوی کی اہم کتاب دعوت و عزیمت حصہ دوم بھی خالی نظر آتی ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مجدد و مصلح امام ابن تیمیہ اور پھر گیارھوی صدی ہجری کے عظیم مجدد امام ربانی سرہندی اور پھر بارھویں صدی ہجری کے مجدد شاہ ولی اللہؒ اور ولی اللہی مشن کی تکمیل کرنے والے ان کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید نے اپنی ٹھوس دعوتی، تعلیمی اور اقدامی جدوجہد کے ذریعہ اسلام کے مقدس چشمہ کو یونانی، عجمی اور ہندی تصورات سے پاک صاف کر کے تصوف کے غلو اور افراط پسندی کو ختم کیا اور ایک اعتدال کی راہ ڈالی۔ جو حدیث کی اصطلاح میں احسان کی راہ ہے،

بڑے تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ جن مصلحین امت نے تصوف کو بچایا اور صوفیاء کرام کی لاج رکھی انہیں تصوف کا دشمن کہا جاتا ہے۔

مولانا زید صاحب کی چھینٹے بازی

مولانا زید صاحب مرحوم کا یہ مقدمہ جو ۵۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں مولانا نے امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کو تصوف کے احوال و رموز پر مشتمل بعض کتابوں کے حوالوں سے عرس اور سماع، مزارات سے فیض حاصل کرنے اور روحانی مستی و بے خودی سے وابستہ صوفی ثابت کرنے کی کوشش کا نہایت اہم خوشگوار، مسرت انگیز اور انقلابی فرض ادا کیا ہے۔ لیکن آخر میں مولانا فاروقی صاحب نے اس مقدمہ کے اصل موضوع سے ہٹ کر شاہ ولی اللہؒ کے ایک کشفی قول کے حوالہ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی شخصیت کو مطعون کرنے کی مبارک سعی بھی فرمائی ہے۔

مولانا صاحب کی اس کوشش کا علمی تجزیہ چونکہ ایک ناگوار بحث چھیڑ دیتا اس لئے اس عاجز نے اس سے صرف نظر کرنا ضروری ہے۔

صرف اس تصور کے حامی علماء و صوفیاء کی توجہ کے لئے اشارۃً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اصحاب روحانیت کے ہاں امیر، امام، مجدد، سلطان وقت اور فاتح عصر اور نہ جانے کیسے کیسے عجیب و غریب دعوے ملتے ہیں، اس لئے شاہ ولی اللہؒ کے اس قول "از درویشے اگر میل سلطنت و رغبت ست سر بزند و ایں رغبت بہ الہام حق ظاہر نماید کہ برائے اعلائے کلمۃ اللہ بودہ است قبول نہ باید کرد و سخن او را معتبر نہ باید داشت کہ مفتون تسویل نفس و شیطان شدہ

است۔" کا مصداق اگر حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ ہو سکتے ہیں تو حضرت مجدد الف ثانی بھی ہو سکتے ہیں اور خود شاہ ولی اللہؒ بھی ہو سکتے ہیں۔

میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ان دعووں کو نقل کر کے عام اور کم علم قارئین کے عقیدہ کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تحریک بالا کوٹ کے قائدین کرام، سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ دہلوی کی طرف سے اگر روحانی سرمستی و بے خودی کے جوش میں کوئی دعویٰ زبان پر جاری ہوا تو ان حضرات نے اس دعوی کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔

اسلامی تاریخ کے آخری دور میں نہی عن المنکر کے لئے حدیث پاک کے پہلے درجہ **فلیغیر ہ بیدہ**۔ کی تعمیل کا یہ نظارہ ایثار، قربانی، شہادت حق کے لئے بے قراری امیر کی اطاعت کا صادق جذبہ۔ ہتھیلی پر سر رکھ کر ظلم کی ننگی تلواروں کا سامنا، زخموں میں چور ہو کر بھی نعرۂ حق بلند کرنا، خون میں نہائی ہوئی لاشوں کو چوم چوم کر سپرد لحد کرنا۔ بدر و احد کے واقعات کی یاد تازہ کر گیں۔

مولانا زید صاحب نے اس سے زیادہ بے اصولی پن کا مظاہرہ کیا ہے، جب موصوف نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے اس کو محترم ایڈیٹر صاحب سے پوچھ لیا جائے کے جاسوس کی ڈائری کا ذکر کر کے حجاز کے محمد ابن عبد الوہاب کو انگریزوں کا ایجنٹ ثابت کیا ہے۔

آخر سید احمد بریلوی کے تذکرہ کے بعد اس بحث کے چھیڑنے کا تک کیا تھا۔؟

کیا زید صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تحریک شہیدین (بالا کوٹ) بھی انگریزوں کے اشارہ پر چلائی گئی اور اس تحریک کے مجاہدین بھی (وہابی ہونے کے رشتہ سے) انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔؟

پاکستان کے ایک مشہور عالم (مولانا پروفیسر مسعود صاحب ابن مفتی مظہر اللہ صاحب مرحوم امام مسجد فتحپوری) نے ادھر ادھر کی بے سند باتوں اور غیر معقول حکایات کو جڑ کر اس موضوع پر ایک کتاب ترتیب دی شاید مولانا زید مرحوم اپنے مقدمہ کے آخر میں ایک بے جوڑ اور بے موقع بات لکھ کر اسی بے بنیاد تصور کی تائید کرنا چاہتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

(حافظ محمد اقبال رنگونی۔ مانچسٹر)

اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب

ملیشیا کے وزیر اعظم جناب مہاتر محمد نے بوسنیا میں مظالم کے خلاف بطور احتجاج اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کی تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا ہے اور کہا ہے کہ اقوام متحدہ میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں کہ جسکی خوشی منائی جائے۔ انہوں نے صحافیوں کو بتایا کہ یہ ممکن ہے کہ اگر ملیشیا نے بوسنیا کو اسلحہ کی فراہمی کی پابندیوں کی خلاف ورزی کی تو بعض مغربی ممالک شاید اس کے خلاف قدم اٹھائیں لیکن انہیں اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے (جنگ لندن ۲۷ جولائی ۹۵)

ان دنوں اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات منانے کی تیاریاں بڑے زور شور سے جاری ہیں امریکی ذرائع ابلاغ اپنی نشریات میں اقوام متحدہ کی اس تقریب کے بڑے چرچے کر رہے ہیں اور پوری دنیا کے حکمرانوں کو اس تقریب میں شامل ہونے کی نہ صرف دعوت دی جا رہی ہے بلکہ اسکی ترغیب و تاکید بھی ہو رہی ہے تاکہ سب یہاں جمع ہو کر بیک آواز اس ادارے کی پچاس سالہ خدمات کو خراج تحسین پیش کریں اور آئندہ کے لئے یہ ادارہ جو جو خدمات سر انجام دے اسکی تائید و تصویب ہوتی رہے۔

اقوام متحدہ کی خدمات عالیہ سے کسے انکار ہے۔ انکے اپنے کہتے ہیں کہ اس ادارے نے اپنے پچاس سالہ دور میں بڑی خدمات انجام دی ہیں اور اس ادارے سے ناراض حکمراں بھی کہتے ہیں کہ اس ادارے کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انکی خدمات وسیع بھی ہیں اور منظم بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ادارے کے پانچ پیارے جس کے حق میں فیصلہ کر دیں یہ

ادارہ رات دن اسکی خدمت میں مصروف و مشغول ہو جاتا ہے اور انکی ہر ناجائز خواہشات کا نہ صرف احترام کرتا ہے بلکہ ان خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی تک لگا دیتا ہے۔ اسے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ خواہشات انصاف کے ترازو پر پوری اترتی بھی ہیں یا نہیں؟ اس سے کہیں دوسروں کے حقوق تو ضائع نہیں ہو رہے؟ ان خواہشات پر عمل کرنے میں کہیں اپنے ہی بنائے ہوئے اصول و قواعد تو پامال نہیں ہو رہے؟ ہاں اسے فکر صرف ان پانچ پیاروں کی ہوتی ہے کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔ اسی طرح یہ پانچ پیارے جس کے خلاف فیصلہ سنا دیں وہ جو فتوی دے دیں مجال ہے کہ اس ادارے کو اسکی خلاف ورزی کی جرأت ہو سکے۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے یہ ادارہ اپنے پانچ پیاروں کے حکم کی لاج رکھنے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھتا۔ پوری جرأت اور بے شرمی سے آگے بڑھ جاتا ہے اور عظیم الشان تاریخی خدمات سر انجام دیے بغیر واپس لوٹنے کا نام تک نہیں لیتا۔

کہنے والے کہتے ہیں اور بالکل صحیح کہتے ہیں کہ یہ ادارہ اس لئے نہیں بنایا گیا کہ دنیا کی ہر قوم اور ملک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب۔ مسلم ہو یا غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا اور جو اصول و قواعد ترتیب دئے گئے ہیں اسی اصول پر ہر ایک کو پرکھے گا اور سب کو ایک ہی ترازو میں تولے گا۔ بلکہ اس ادارے کا بنیادی مقصد جہاں اپنے ان پانچ پیاروں کے مفادات کی نگرانی کرنا ہے وہاں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اسلامی ممالک اور اہل اسلام کی کڑی نگرانی کرنا۔ ان ممالک کو ہر پہلو سے بدنام و بدکام بتلانا، انہیں ہر جگہ دبانا اور موقع ملتے ہی انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنا ہے، اور مزیدار بات تو یہ ہے کہ یہ سارا کام انٹر نیشنل کمیونٹی (INTERNATIONAL COMMUNITY) کے نام پر کیا جائے تاکہ کسی کو اس ادارے کے پانچ پیاروں کو بدنام کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

اس ادارے کی پچاس سالہ خدمات عالیہ کو فی الحال ایک طرف رکھئے گزشتہ چند سالوں میں سرانجام دی جانے والی خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے تو آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اس ادارے نے اپنوں کو خوش کرنے اور دوسروں کو دکھ دینے کے سوا اور کیا کیا ہے؟ آخر کیا بات ہے کہ اس ادارے کے پانچ پیاروں کا پیارا ظلم و ستم کی انتہا کرتا ہے۔ کھلے عام انسانی حقوق کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی ادارے میں پاس کی جانے والی قراردادوں کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے پھر بھی وہ اس ادارے کے نزدیک مظلوم ہی ہے۔ شفقت و

کرم کا مستحق ہے۔ اسکی ہر ضد پوری کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ امداد و تعاون کے ہر راستے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بر عکس ایک اسلامی ملک اس سے بہت ہلکی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس ادارے کی رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے دن کا سکون لٹ جاتا ہے۔ مجلس پر مجلس لگائی جاتی ہے اور پھر اس ملک کو سبق سکھانے کے لئے نہ صرف بنفس نفیس میدان عمل میں کود پڑتا ہے بلکہ ساری دنیا کے پہلوانوں کو حکم دیتا ہے کہ اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ اس وقت اسے انسانی حقوق یاد آجاتے ہیں۔ دوسروں کی آزادی کا خیال آتا ہے۔ انصاف پسندی کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مظلوم کی حمایت کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ سب کچھ اس تیزی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دیکھنے اور سننے والا اس ادارے کی خدمات عالیہ کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس ادارے میں بظاہر امن کے قوانین بنتے ہیں لیکن یہاں امن و سکون کے نام پر تباہی و بربادی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں۔ ظلم کے خلاف بظاہر آواز اٹھتی ہے لیکن انصاف کے نام پر ظلم کے خاکے بنتے ہیں۔ محبت کا سبق رٹایا جاتا ہے لیکن عداوت و نفرت کا بیج بونے کی اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ بات کھری کھری کرنے کے اصول سمجھائے جاتے ہیں لیکن تضاد کے وہ معرکے لگتے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی لیبیا، کشمیر، فلسطین، عراق، چیچنیا، الجزائر، سوڈان، اور بوسنیا وغیرہ میں اس ادارے کی خدمات عالیہ کے کتنے بہترین نقشے اور نمونے موجود ہیں اور ہائے افسوس کہ کتنے نقشے ایسے ہیں جنہیں تیار کرنے میں خیر سے ہمارے اسلامی ممالک بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے چکے ہیں۔

مبارک باد کے مستحق ہیں جناب مہاتر محمد صاحب جنہوں نے اس ادارے کی خدمات عالیہ کا حقیقی رخ پیش فرمایا ہے اور کھل کر کہا ہے کہ اس ادارے نے کون سی ایسی خدمات انجام دی ہیں جس کی خوشی منائی جائے۔ اس ادارے کی ایک ایک اینٹ پر ان گنت مظلوموں کے خون کے داغ موجود ہیں۔ یہاں خوشی کے بجائے ماتم کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ صرف موصوف کے ہی جذبات نہیں کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی آواز ہے۔ اسلامی ممالک کے تمام حکمرانوں کو جناب مہاتر محمد کے اس جرأت مندانہ بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا ساتھ دینا چاہئے اور ان کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملانی چاہئے۔ اور اس ادارے کے چہرے سے نقاب الٹ کر اس کا حقیقی چہرہ دکھانا اور اس کی حقیقی خدمات کو منظر عام پر لے

آنا چاہئے تا کہ دنیا پر یہ بات اور واضح ہو جائے کہ اس ادارے کا اصلی چہرہ کس قدر بد صورت اور بھیانک ہے اور اس کے گھناونے کردار نے دنیا کے کتنے خطوں، ملکوں، شہروں، محلوں اور گھروں کو تباہ و برباد کیا ہے، و علینا الا البلاغ للمبین (1/8/95)

بوسنیا کی تقسیم کا کروشیائی منصوبہ اور مسلم وزرائے خارجہ کا فیصلہ

مسلم ممالک نے بوسنیا کے بحران پر ہونے والی لندن کانفرنس کے نتائج کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ مسلم ممالک بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلحہ کی فراہمی پر عائد پابندی کا مزید احترام نہیں کریں گے اور یہ کہ بوسنیا سے اقوام متحدہ کی امن فورس کے انخلاء کی صورت میں فورس میں شامل مسلم ممالک کے فوجی وہیں تعینات رہیں گے اور بوسنیا کے مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ (۲۲ر جولائی کو) جنیوا میں میں مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کے اجلاس کے بعد جاری کئے گئے اعلامیہ کہا گیا ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلحہ کی سپلائی پر عائد پابندی بلا جواز اور غیر قانونی ہے جس کا مزید احترام نہیں کیا جائے گا اسلامی کانفرنس تنظیم کے وزراء نے بوسنیا کے مسلمانوں کو اپنے دفاع میں مدد دینے اور سرب مظالم روکنے کے لئے مدد کی پیشکش کی ہے...... انھوں نے کہا کہ لندن کانفرنس زیپا اور بہاج کے علاقوں کے عوام کو کسی قسم کی مدد فراہم کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ بوسنیا کے مسلمانوں کی دفاعی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کریں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ آج مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ثالثی کرانے والی طاقتوں کے کھوکھلے وعدوں کا نتیجہ ہے، انھوں نے سربوں کے زیر قبضہ مسلمانوں کے تمام علاقوں کو واپس لینے کے لئے طاقت کے استعمال پر زور دیا۔ (جنگ لندن ۲۳ جولائی ۹۵)

اس وقت بوسنیا کے تین فریق (سرب، کروٹس اور مسلمان) کے درمیان سخت کشیدگی اور لڑائی جاری ہے کروشیا کے فوجی سربوں کی بری طرح پٹائی کرتے ہوئے ان علاقوں پر قابض ہو رہے ہیں جن پر سربوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف سرب فوج مسلمانوں کے علاقوں پر مسلسل گولہ باری اور حملے میں مصروف ہے اور کوئی دن نہیں جاتا جہاں مسلمانوں کے خون سے زمین رنگی نہ جاتی ہو، کروٹس کی خواہش ہے کہ سابق یوگوسلاویہ کے

زیادہ سے زیادہ حصے پر قابو کرلیا جائے اور وہاں کروشیا کے باشندوں کو لابسلیا جائے، سرب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قبضے میں جو جو علاقے بچے ہیں وہ بھی چھین لئے جائیں اور وہاں سربوں کو آباد کردیا جائے۔ اور رہ گئے مسلمان تو وہ اس وقت اپنے اور اپنے بچے کچھے علاقوں کے دفاع کے لئے سردھڑ کی بازی لگارہے ہیں۔ جو علاقے اقوام متحدہ کی نگرانی میں تھے وہ یکے بعد دیگرے سربوں کے قبضے میں جاچکے ہیں۔ تازہ نقشہ پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سابق یوگوسلاویہ کے اکثر حصہ پر کروٹس کا قبضہ ہے اس کے بعد سربوں کا، مسلمانوں کے پاس نہایت ہی کم حصہ رہ گیا ہے۔

بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ سربوں کی سفاکی اور درندگی، اقوام متحدہ (امریکہ اور مغربی ممالک) کی عیارانہ پالیسی اور ان مظالم پر پراسرار خاموشی نیز ظالموں کی کھلے عام حوصلہ افزائی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ یہ سارے حقائق منظر عام پر آچکے ہیں۔ گو یہ رہنما اس کی مختلف تاویلات کیوں نہ کریں لیکن حقائق کو جھٹلانا اب ان کے بس کی بات نہیں رہا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ مہذب ترقی یافتہ اور انصاف پسندی کا دعوی کرنے والی قومیں کس طرح بے انصافی پر تلی ہوئی ہیں اور نام نہاد تہذیب و شرافت کے پردے میں بدتہذیبی اور ظلم وزیادتی کے کتنے نمونے پیش کررہی ہے۔ دن دھاڑے آگ و خون میں تڑپتی لاشیں دیکھ کر اور مظلوموں کی آہیں سنکر بھی ان مہذب قوموں کے ماتھے پر بل نہیں پڑتے۔ ان کے رپورٹر اور ان کے کئی وزراء نسلی تطہیر (ETHNIC CLEANSING) ہو رہی ہے کے کتنے بیان دے چکے ہیں لیکن مجال ہے کہ اسے روکنے کے لئے ان کے ہاتھ اٹھے ہوں یا کسی اور کو اس کی اجازت دینے پر راضی ہوئے ہوں دنیا کے سارے ممالک (بشمول اسلامی ممالک) اس آگ و خون کے کھیل کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں پر کوئی نہیں جو اس وحشیانہ کھیل کو بند کرانے کے لئے میدان عمل میں کود پڑے

جہاں تک کروٹس اور سربوں کی آپس کی لڑائی کا تعلق ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو شائد کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے یا مستقبل میں پہونچے گا نہیں۔ کروٹس سرب کی پٹائی اس لئے نہیں کررہے ہیں کہ انھوں نے بوسنیا کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور نہ سرب اس لئے کروٹس کے مقابل آرہے ہیں کہ کروٹس نے مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیا تھا۔ ان کی آپس کی لڑائی محض اس لئے ہے کہ یہ دونوں فریق اس کوشش میں

لگے ہوئے ہیں کہ کون سابق یوگوسلادیہ کے کتنے حصے پر قابض ہو سکتا ہے ایک طرف کروٹس سربوں سے علاقے چھین رہے ہیں تو دوسری طرف سرب مسلمانوں سے انکے وہ علاقے (جو اقوام متحدہ نے محفوظ علاقے قرار دیکر اپنی نگرانی میں لے لئے تھے) چھین رہے ہیں اور ان علاقوں پر بھی گولہ باری کررہے ہیں جہاں ابھی مسلمان آباد ہیں تاکہ یہ علاقے بھی خالی ہو جائیں۔ کروٹس اور سرب کی لڑائی میں گو جانی اور مالی نقصان بھی ہورہاہے اور اقوام متحدہ کے لئے مہاجرین کا مسئلہ بھی پریشانی کا سبب بن رہاہے تاہم یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہ لڑائی زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنے کے لئے ہورہی ہے۔ اور ان دونوں کا مقصد ایک ہے وہ یہ کہ سابق یوگوسلادیہ صرف ان دو قوموں کے زیر اقتدار رہے مسلمانوں کو اس سے کوئی حصہ نہ مل پائے۔

کچھ دن پہلے بی بی سی اور اسکائی کی نشریات نے اپنی خبروں میں اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بتلایا کہ مئی میں لندن میں ہونے والی یورپی رہنماؤں کے اجلاس کے بعد کھانے کی میز پر کروشیا کے صدر تجمان نے اپنے ہاتھوں سے ایک کارڈ پر سابق یوگوسلادیہ کا ایک نقشہ تیار کیا اور پھر اسے صرف دو حصوں میں منقسم کیا، ایک کروشیا کے لئے جبکہ دوسرا سربیا کے لئے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی۔ اس انکشاف اور کارڈ پر بنے ہوئے نقشے کی اشاعت نے برطانوی سیاست دانوں میں ایک ہلچل پیدا کردی اس دن بی بی سی کے نیوز نائٹ کی نشریات میں اس موضوع پر اچھی خاصی بحث بھی ہوئی۔ لبرل پارٹی کے رہنماء پیڈی ایشڈ اون نے اس پر خاصی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ صرف مذاق ہے یا اسے عملی شکل دینے کے لئے بھی مسٹر تجمان کے ذہن میں کوئی خاکہ ہے انھوں نے کہا کہ کروشیاء کے صدر کی طبیعت اور ماضی میں کیئے جانے والے اشارات نے یہ بتلادیا ہے کہ موصوف اپنے منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نہایت اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس پر یورپی حکومتوں کو پوری سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ لیکن تاحال یورپ کے کسی حکمراں نے اس کا نوٹس لیا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی ہے۔ موجودہ صورت حال بتلارہی ہے کہ کروشیا کے صدر اپنے ترتیب دیے ہوئے نقشے کی تکمیل میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔

اخبار بیں حضرات سے یہ مخفی نہیں کہ کروشیا کی فوج نے جب سرب علاقوں پر حملے

کئے اور انہیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا تو سربوں نے کچھ زیادہ مزاحمت نہیں کی مبصرین حیران ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ وہی تو سرب ہیں کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے گولی بھی چلے تو سینکڑوں کی تعداد میں آگ کے گولے برسانا ان کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ اس معاملے میں نہ انہوں نے اقوام متحدہ کا لحاظ کیا نہ نیٹو کی کسی دھمکی کو خاطر میں لائے۔ لیکن جب کروٹس فوج ان کے علاقوں کی طرف پیش قدمی کرتی ہے ایک لاکھ سے زیادہ سرب جلاوطن ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں پھر بھی نہ ان کی طرف سے کوئی قابل ذکر مقابلہ ہوتا ہے اور نہ اس طرح گولہ باری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہی سرب مسلمان علاقوں پر بمباری کرتے ہیں ان کے علاقے چھین رہے ہیں اور ان علاقوں میں سرب باشندوں کو آباد کرنے کے منصوبے بناتے ہیں کیا یہ سب حقائق اس بات کی دلیل نہیں کہ کروٹس اور سرب رہنماء اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ نہ ان کی کوئی ریاست ہو گی اور نہ اسے کسی صورت قبول کیا جائے گا۔

بوسنیا کے مسلمانوں کے متعدد علاقے اقوام متحدہ اور مغرب کی عیارانہ پالیسی کے نتیجے میں سرب فوجوں کے ہاتھوں ڈھیر ہو چکے ہیں دارالحکومت سرائیوو پر سرب فوج کی گولہ باری جاری ہے ان کا اگلا نشانہ گورازدہ شہر ہے یہ وہ تمام علاقے ہیں جنہیں اقوام متحدہ نے محفوظ علاقے قرار دیکر اپنی حفاظت میں لینے کا وعدہ اور دعوی کر رکھا تھا لیکن ان میں ایک علاقہ بھی ایسا نہیں جس کی اقوام متحدہ نے حفاظت کی ہو بلکہ عمداً ایسی پالیسی اختیار کی گئی کہ سرب فوج ان پر قابض ہو جائیں۔ انہیں علاقوں میں سے ایک برانیکا بھی ہے سرب فوج کے شدید حملہ کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی فوج کو رخصت کر دیا گیا یہاں کے مسلمان مردوں کو گرفتار کر لیا گیا عورتوں کی عصمت دری کی گئی خاندان کے ایک ایک فرد کو دوسرے سے جدا کر دیا گیا برانیکا سے گرفتار کئے گئے ہزاروں مسلمان ابھی تک لاپتہ ہیں جن کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ سرب فوج نے انہیں قتل کر دیا ہے۔

سقوط برانیکا نے جہاں عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو تڑپا دیا ہے وہیں یورپ اور امریکہ کے عوام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے انھوں نے اپنی اپنی حکومتوں پر زور ڈالا کہ بوسنیا کا مسئلہ جلد از جلد حل کیا جائے۔ چنانچہ لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی گئی جس میں تقریباً سولہ ممالک کے رہنماء شریک ہوئے زیادہ تر کا تعلق مغربی ممالک سے تھا گو

اس کانفرنس میں سب نے سرب جارحیت پر کڑی تنقید کی لیکن برانیکا اور زیپا کے المناک حادثہ کے سلسلے میں ان مغربی رہنماؤں کی زبانیں خاموش تھیں اس سے ان رہنماؤں کی انصاف پسندی کا اندازہ کرلیں۔ اس اجلاس میں صرف یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر سرب فوج نے گورازدہ شہر کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا تو نیٹو کارد عمل پہلے سے بہت مختلف ہوگا اور سرب کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ اس فیصلے میں مغربی رہنماؤں نے بظاہر بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا لیکن درحقیقت یہ سربوں کے لئے کھلا اعلان تھا کہ اس علاقہ کے سوا اور جتنے علاقے ہیں ان پر حملے کی صورت میں امریکہ اور مغرب خاموش رہے گا۔ بوسنیا کے وزیراعظم حارث سلاجک نے لندن کانفرنس کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :

مغربی ممالک نے سربوں کو کھلی چھٹی دے دی ہے وائس آف امریکہ سے باتیں کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ لندن کانفرنس میں صرف گورازدہ کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے جبکہ زیپا اور بہاج پر سرب جارحیت جاری ہے اور برانیکا کو غارت کردیا گیا ہے ان تمام شہروں اور ان کے مکینوں کے تحفظ کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ اقوام متحدہ اور خصوصا مغربی ممالک نے سربوں کا ساتھ دیا ہے انھوں نے کہا کہ ہمارا خیال تھا کہ اقوام متحدہ جو ہمیشہ جارح کا ساتھ دیتی آئی ہے اس مرتبہ شاید اپنے رویے میں تبدیلی کرے گی لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ اس بار بھی اس نے ہمارا ساتھ نہیں دیا (جنگ لندن ۲۳ جولائی)

لندن کانفرنس کے اس فیصلے نے عالم اسلام کے رہنماؤں پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر ان حالات میں بوسنیا کے مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیا گیا تو اس علاقہ سے مسلمانوں کا وجود ہی مٹ جائے گا چنانچہ لندن کانفرنس کے دوسرے دن جنیوا میں مسلم وزرائے خارجہ کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں بوسنیا کی انتہائی تشویشناک صورت حال اور مغربی ممالک کی ظالمانہ اور اسلام دشمن پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے جو فیصلہ کیا گیا وہ آپ ابتدائی سطور میں ملاحظہ فرماچکے ہیں۔

مسلم وزرائے خارجہ کی یہ تنظیم اس سے پہلے کئی اجلاس منعقد کرچکی ہے اور ان میں کئی قراردادیں بھی منظور کی گئیں لیکن شائد ہی کسی قرارداد کو عملی شکل دینے کی ان حضرات کو جرأت ہوئی ہو۔ لیکن یہ متفقہ اعلان اور فیصلہ جس جوش وجذبہ اور گھن گرج کے ساتھ کیا گیا

ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ان وعدوں کو نبھانے، ان قراردادوں پر عمل کرنے اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کی ہمت عطا فرمائے ان کا یہ اعلان اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ہے۔ اگر ان رہنماؤں نے پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ اپنے ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنادیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اندھیروں کے یہ بادل چھٹ جائیں گے پھر یہاں روشنی ہی روشنی ہوگی ۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ---- اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

اور اگر خدانخواستہ مسلم وزراء خارجہ کا یہ متفقہ فیصلہ صرف فیصلہ ہی رہا کوئی عملی شکل نہ پاسکا تو پھر بوسنیا (بلکہ ساری دنیا) کے مسلمان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ آج مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ ان مسلم ممالک کے حکمرانوں اور مسلم وزرائے خارجہ کے بے درد کھوکھلے وعدوں کا نتیجہ ہے اور جب تک کوئی عملی انقلاب نہیں آتا یہ بے درد حکمراں کبھی خواب غفلت سے نہ جاگیں گے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

(۵ر اگست ۹۵ء)

تہذیب جدید کے تماشے

کسی قوم اور معاشرے کے صحت مند ہونے کا پتہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس قوم اور معاشرے کا مذہب سے کتنا تعلق ہے۔ جس قوم کا مذہب سے گہرا تعلق ہوگا وہ قوم اچھے اخلاق و کردار اور اعلیٰ صفات کی حامل ہوگی۔ اور جس قوم کا مذہب سے تعلق رسمی طور پر بھی باقی نہ رہے بلکہ اسے ایک دقیانوسی خیالات کہہ کر اس کا مذاق اڑلیا جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ قوم شرافت و دیانت، صداقت و امانت اور شرم و حیاء سے بالکل عاری ہوچکی ہے۔ اب ان کے نزدیک ہر برائی اور بدی اچھائی کے زمرے میں آجاتی ہے۔ ہر بے انصافی انصاف کے نام پر قبول کرلی جاتی ہے، ہر بے حیائی و بے شرمی کو تہذیب جدید اور مہذب دنیا کا تقاضا کہہ کر اسے نہ صرف گوارا کرلیا جاتا ہے بلکہ اسے قانونی شکل دینے کے فیصلے بھی کرلئے جاتے ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں اگر ہم آج یورپ کے ماحول پر ایک نظر دوڑائیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یورپ کا معاشرہ مذہب اور مذہبی خیالات سے کچھ اس قدر دور جاچکا ہے کہ واپس آنا ان کے لئے ناممکن بن چکا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر مذہب کے مطابق زندگی چلے تو دور

جدید کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اور دور جدید کے تقاضے پورے کئے جائیں تو پھر مذہب کو لازماً خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دور جدید کو مذہب پر غالب کردیا جاتا ہے اور زندگی گزارنے کے نئے اصول و قواعد وضع کرلئے جاتے ہیں۔ ان میں کوئی نہیں جو اپنے معاشرے کو مذہب کی طرف راغب کرنے کے لئے اپنا قدم اٹھائے اور اس معاشرے کو بد اخلاقی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچالے۔ یورپی معاشرے نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ان کے ملک اور شہر میں مذہب کے نام پر کوئی آواز نہ اٹھنے پائے اور جہاں سے مذہب کے نام پر کوئی آواز اٹھے اور اخلاق و شرافت کا درس دیا جائے۔ مذہب کے اصولوں پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے تو یہ معاشرہ اسے مذہبی جنونی اور بنیاد پرستی کا طعنہ دیتا ہے۔ تاکہ مذہب اپنا حلقہ وسیع نہ کرپائے اور یورپ کی اس بدکتی دنیا کو کوئی پڑاؤ نہ مل سکے۔

برطانیہ اور یورپ کے اس آزاد ماحول میں جہاں مذہب بیزاری ایک فیشن کی صورت اختیار کرچکی ہے ان کے اپنے مذہبی رہنما بھی اسی ڈگر پر چل پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے نوجوانوں کو مذہب سے تعلق پیدا کرانے یا ان میں مرنے کے بعد کی زندگی کا یقین راسخ کرانے میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیا نہ انھیں یہ یاد دلایا کہ مرنے کے بعد ایک زندگی ہے جہاں برائی کا بدلہ برائی کی صورت میں اور بھلائی کا بدلہ بھلائی کی شکل میں سامنے آنے والا ہے۔ ان کی عبادت گاہوں میں کبھی یہ آواز نہ اٹھی کہ عمل اور رد عمل کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے بجائے یہ ہی کہا گیا کہ مسیح ہم سب کی طرف سے کفارہ کی صورت میں آگے بڑھ چکے ہیں اور ہمارے ہر گناہ معاف کرا چکے ہیں۔ جس سے مذہب بیزار طبقہ اس بات پر مطمئن ہوگیا کہ اگر مذہب نام کی کوئی شئ ہے بھی، تو بھی فکر کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مسیح ہمارے گناہ تو معاف ہی کرا چکے ہیں پھر پکڑ کس بات پر ہوگی۔ ؟اس عقیدے کی بناء پر یہ نوجوان (خواہ وہ اسکول سے فارغ ہوکر آوارہ گردی کرتا ہے خواہ ابھی اسکولوں میں تعلیم حاصل کررہا ہے) ہر وہ کچھ کر گذرتا ہے جس سے شرافت انسانی سر پیٹ کر رہ جاتی ہے حال میں روزنامہ ٹائم میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں برطانیہ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعلیمی اور اخلاقی معیار کا ایک جائزہ لیا گیا۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ برطانیہ میں نوجوانوں کی تعلیمی اور اخلاقی معیار ناقابل بیان حد تک گر چکا ہے۔

رہی بات برطانیہ کے مسیحی مذہبی رہنماؤں کی تو انھوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ

نوجوانوں کی دن بدن گرتی ہوئی اخلاقی پوزیشن کو بحال کرنے کا بس ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے وہ یہ کہ حالات کو مذہب کے تابع کرنے کے بجائے مذہب کو ہی حالات کے تابع بنادو۔ خواہ پھر مذہب کے کتنے ہی اصولوں کا خون کیوں نہ ہوتا ہو۔ وہ نوجوان جسے اتوار کے دن چرچ آنا گوارا نہیں۔ مذہب کی کوئی پابندی قبول نہیں آخرت اور حیات بعد الممات کا کوئی یقین نہیں۔ اخلاق و شرافت کا کوئی احساس نہیں۔ یہ اگر مذہب کی روسے چرچ میں نہ آئے تو کیا ہوا۔ کیوں نہ ہم ان نوجوانوں کے پسندیدہ مشغلوں کو چرچ میں لے آئیں (شراب خانہ سے لوگ چرچ نہیں آتے تو کیوں نہ شراب خانہ میں ہی چرچ کو لے لیا جائے) یہاں ہی رقص و سرود کی محفل سجائی جائے۔ ساز و طبلے کے ذریعہ انھیں مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ چرچ اور گرجاگھر تو کم از کم آباد رہیں۔

نوجوانوں کی مذہب بیزاری اور اپنی مذہبی عبادت گاہوں سے بالکل دوری یہاں کے مذہبی رہنماؤں کے لئے ایک سامان عبرت بن گئی۔ انھوں نے اس پر قابو پانے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے اور نئے نئے طریقے وضع کئے لیکن کامیابی نہ مل سکی بلکہ اس نئے طریقے میں شرف انسانیت کی جو تذلیل ہوتی رہے اس سے برطانیہ کے باشندے بے خبر نہیں ہیں۔ حال ہی میں شیفلڈ کے ایک پادری کا شرمناک کردار سامنے آیا ہے۔ جس نے نوجوانوں کو مذہب کے سایے میں لانے کے عنوان پر نائن او کلاک سروس (NINE 'O' CLOCK SERVICE) کے نام سے ایک سروس شروع کی (اس سروس میں عیسائی مذہب کے کون کون سے اصول پامال ہوئے اس سے بحث نہیں یہاں کے دوسرے مذہبی رہنما اس پر بیانات دے چکے ہیں) جس میں موجودہ دور کے نوجوانوں کے تقاضے سامنے رکھے گئے۔ ابتداءً اس سروس نے اپنا حلقہ وسیع کیا اور لڑکوں لڑکیوں نے اس گروپ میں شرکت کرنا پسند کیا۔ لیکن یکایک برطانیہ کے صف اول کے اخبارات اور ٹیلی ویژن کی عالمی خبروں میں یہ انکشاف کیا گیا کہ اس سروس کا مذہبی رہنما کئی جنسی اسکنڈلوں میں ملوث پایا گیا اور اس نے چندے میں آنے والی رقوم اپنی عیاشیوں میں صرف کی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ انکشاف خود اس کے چرچ گروپ نے کیا (یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آخر وہ کونسی وجوہات تھیں جس کی بناء پر چرچ گروپ کو یہ انکشاف کرنا پڑا اور پچھلے دو سالوں میں چرچ گروپ نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کیا تھا) اس انکشاف سے چرچ آف انگلینڈ کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

اخبارات میں تبصرے اور ٹی وی پر مذاکرات اور تبادلہ خیالات کی مجلسیں قائم کیں۔ بعض مذہبی رہنماؤں نے اس سلسلے میں دوسرے چرچوں کی بھی تحقیقات پر زور دیا جبکہ دیگر رہنماؤں نے شیفلڈ کے اس پادری کو ذہنی اور روحانی مریض قرار دیکر اس کے کردار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور کہا گیا کہ اس پادری کو روحانی علاج کی سخت ضرورت ہے۔ روزنامہ جنگ لندن کی خبر کے مطابق

"جنسی اسکنڈل میں ملوث پادری کرس برین کو روحانی رہنمائی کی پیشکش کی گئی ہے شیفلڈ میں چرچ کے حکام ایسے پادریوں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو اس پادری کی روحانی مدد کرسکیں۔ کرس برین آج کل ہسپتال میں نفسیاتی علاج کے لئے داخل ہے۔ اس کے چرچ گروپ نے الزام لگایا تھا کہ کرس برین انھیں جنسی اور ذہنی طور پر تکلیف پہنچاتا تھا اور چندے میں آنے والی پوری رقوم اپنے ذاتی عیش و آرام پر خرچ کردیتا تھا۔" (جنگ ۳۰/ اگست ۹۵ء)

یہ نہ سمجھئے کہ یہ اپنی قسم کا شاید پہلا واقعہ ہے۔ نہیں۔ برطانیہ میں ہر آئے دن کسی نہ کسی پادری اور مذہبی رہنماؤں کے شرمناک رازوں کا پردہ فاش ہوجاتا ہے۔ ابھی کئی پادریوں کے خلاف جنسی اسکنڈل میں مقدمات چل رہے ہیں جن میں نوعمر لڑکوں پر مبینہ جنسی حملے کے کیس بھی ہیں اور پولیس ان سب کی تحقیقات کررہی ہے اور کئی اس قسم کے کردار کے باعث استعفاء دینے پر مجبور بھی ہوئے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ کالی بھیڑیں صرف ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے مذاہب میں بھی اس قسم کی کالی بھیڑیں ہیں۔ ہمیں افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس قسم کے افسوسناک کردار کو نہ صرف یہ لوگ گوارا کرتے ہیں بلکہ اسے روحانی مرض کے کھاتے میں ڈال کر اس پر تاویلات کا سیاہ پردہ ڈال دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ مذہبی رہنما اس قسم کی غیر اخلاقی حرکت کے خلاف کھل کر میدان عمل میں آئیں اور اسے مذہب سے بغاوت قرار دینے کے ساتھ ساتھ خلاف قانون اور اس پر سخت سزا کا مطالبہ کریں۔ یہ اعلان کررہے ہیں کہ یورپ اور برطانیہ میں زنا جیسے خبیث فعل کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرنا تہذیب کے خلاف ہے بلکہ اس سلسلے میں مفاہمانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جسم فروشی کے خلاف قانون نہ قرار دیا جائے بلکہ اسے قانونی شکل دے دی جائے تو یہ بیماری آسانی سے ختم ہوجائے گی۔ ایڈنبرا کے بشپ ریورنڈ رچرڈ ہالووے جب اپنے

عہدے پر آئے اور اسے چند ماہ ہی گذرے کہ انھوں نے کھلے عام یہ بیان دیا کہ :

"زنا کے بارے میں زیادہ مفاہمانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایڈز کے پھیلاؤ کو روکنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ منشیات اور جسم فروشی کو قانونی تحفظ فراہم کردیا جائے۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں بشپ نے کہا کہ منشیات اور جسم فوشی کو جرم قرار دے کر ان کو کنٹرول کرنا مشکل بنادیا گیا ہے۔ اگر ان کو (جسم فروشی کو) قانونی بنادیا جائے تو ان پر قابو پانا آسان ہوجائے گا انھوں نے کہا کہ یہ کہنا کہ ایڈز ہم جنس پرستوں پر خدا کا عذاب ہے غلط اور غیر منطقی ہے۔" (جنگ لندن ۱۸ / مئی ۹۵ء)

غور کیجئے کہ جب بشپ اور اعلیٰ درجے کے مذہبی رہنما جسم فروشی کو قانونی قرار دینے کے مطالبے کریں اور قوم کو گندگیوں میں دھکیلنے کے لئے اپنی ساری کوششیں بروئے کار لائیں تو وہ قوم اور معاشرہ کتنا صحت مند ہوسکے گا۔ اور اس قوم کی اخلاقی حالت کیا ہوگی جس کے رہنماء جسم فروشی کی کھلے عام اجازت طلب کریں اور اسے قانونی تحفظ دینے کے مطالبے کریں۔

بشپ کے اس بیان کو بعض مذہبی رہنماؤں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا لیکن مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ کے اکثر مذہبی رہنما اس بیان کی تائید میں کھڑے ہیں۔ اور وہ یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ غیر شادی شدہ مرد و عورت کا ازدواجی تعلق نہ اخلاقاً کوئی جرم ہے نہ مذہباً اسے کوئی گناہ کہا جاسکتا ہے۔ ایڈنبرا کے بشپ نے اس جسم فروشی اور زنا کاری کو قانونی تحفظ دینے کے لئے آواز اٹھائی جبکہ چرچ آف انگلینڈ نے اعلان عام کردیا کہ غیر شادی شدہ لوگ اگر ازدواجی زندگی گزاریں تو کوئی گناہ کی بات نہیں اور نہ ایسے لوگ مذہب کی رو سے کوئی گنہ گار سمجھے جائیں گے۔ روزنامہ جنگ لندن کی خبر کے مطابق :

"چرچ آف انگلینڈ کے رہنماؤں نے کہا ہے کہ بغیر شادی کئے اکٹھے زندگی بسر کرنا گناہ نہیں ہے لہٰذا ایسے افراد کے لئے آئندہ گناہ کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ ان دنوں جو عورتیں اور مرد بغیر شادی اکٹھے رہ رہے ہیں ان کی تعداد شادی شدہ لوگوں کے قریب پہنچ گئی ہے۔ یہ بات خاندانوں کے بارے میں چرچ آف انگلینڈ کی ایک رپورٹ میں کہی گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۰ء تک یہ صورت حال ہوگی کہ ہر پانچ میں سے چار جوڑے بغیر شادی کئے اکٹھے رہ رہے ہونگے اور ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کی زندگی کو گناہ کی زندگی کہنا جائز

نہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہم جنس پرستوں مردوں اور عورتوں کو اس مذہب میں شامل ہونے پر خوش آمدید کہنا چاہیئے۔" (روزنامہ جنگ لندن ۸ر جون ۹۵ء)

اب آپ ہی سوچیں کہ جب کسی بگڑے معاشرے کا سختی سے محاسبہ کرنے اور اسے راہ راست پر لانے کے بجائے قانون اور مذہبی طور پر یہ اجازت دے دی جائے کہ شادی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بغیر شادی کئے جنسی تعلقات پر نہ قانونی گرفت ہوگی نہ مذہبی طور پر اسے گناہ سمجھا اور کہا جائے گا تو اس کا نتیجہ کس خوفناک شکل میں سامنے آئے گا۔؟ کیا ان مذہبی رہنماؤں کے اس اعلان کے بعد بگڑے نوجوانوں کو اور زیادہ کھلی چھٹی نہ مل گئی کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ ان پر کوئی پابندی نہیں۔ عفت و عصمت کا جب چاہیں سودا کریں اور جب چاہیں اس سودے کو ختم کریں۔ چرچ آف انگلینڈ کے رہنماؤں اور بشپ کے ان بیانات سے آئندہ کتنی خطرناک صورت حال سامنے آئے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن اس وقت جو نقشہ ہمارے سامنے ہے اسے مندرجہ ذیل دو خبروں میں ملاحظہ فرمایئے۔

"برطانیہ میں ۱۹۹۲ء کے دوران ۴۴ فیصد خواتین شادی شدہ زندگی سے باہر حاملہ ہوئیں دس سال قبل یہ تعداد ۳۰ فیصد تھی محکمہ مردم شماری کے مطابق ان میں سے ایک تہائی سے قدرے زیادہ حاملہ خواتین نے اسقاط حمل کر لیا اور ہر دس میں سے چھ یا ۸ بچے شادی شدہ زندگی سے باہر ہوئے جو ۱۸ فیصد اضافہ تھا محکمہ کے مطابق ۱۹۹۲ء کے دوران ۸ لاکھ ۲۸ ہزار خواتین حاملہ ہوئیں جو سابق سالوں کی بہ نسبت ۳ فیصد یا ۲۷ ہزار کم تھیں ۸ لاکھ ۲۸ ہزار میں سے ۱۹ فیصد اسقاط حمل ہوئے ۱۶ سال سے کم عمر کی ۵۱ فیصد لڑکیوں نے اسقاط حمل کرائے۔ (جنگ لندن ۲۷ر جولائی ۹۵ء)

۱۹۹۲ء میں بغیر شادی کے اکٹھے رہنے اور اس کے نتیجے میں خواتین کے حاملہ ہونے کی تعداد ۴۴ فیصد تھی۔ اور اب ۱۹۹۵ء کے وسط تک اس میں اور اضافہ ہوگیا۔ محکمہ مردم شماری کی ایک رپورٹ کے مطابق

برطانیہ میں نصف سے زیادہ خواتین بغیر شادی کئے حاملہ ہو گئی ہیں یہ تناسب ۱۹۹۲ء میں ۴۴ فیصد اور دس سال قبل ۳۰ فیصد تھا........ اور شادیوں کی تعداد گھٹ کر تین لاکھ سے بھی کم ہو گئی (جنگ لندن ۲۶ر اگست ۹۵ء)

اب غور فرمایئے کہ جب مذہبی رہنماؤں نے بغیر شادی کئے اکٹھے رہنے کو جائز قرار

دیکر ایسے زناکاروں کو گنہ گار سمجھنے سے بھی انکار کر دیا ہے کیا اس تعداد میں اضافے کا باعث نہیں بنے گا؟

یاد رکھئے کہ برائی کو اگر برائی سمجھا جائے تو وقت آتا ہے اس برائی سے بچنے کی فکر کی جاتی ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھ ہی آتی ہے لیکن اگر کسی معاشرے میں برائی کو برائی نہ سمجھا جائے بلکہ اس برائی کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو قانونی اور مذہبی طور پر دبانے کی کوشش کی جائے تو پھر اس معاشرے میں بداخلاقی اور بد تہذیبی، بے شرمی و بے حیائی کے کتنے ہی مظاہرے کیوں نہ ہوں اور طرح طرح کی روحانی و جسمانی بیماریاں انھیں اپنے گھیرے میں کیوں نہ لے لیں پھر بھی کم ہے۔

آج کا یوروپی اور امریکی معاشرہ جس طرز زندگی کو مہذب تہذیب قرار دیکر اسے قانونی اور مذہبی تحفظ دے رہا ہے اس کا انجام خود ان کے سامنے ہے۔ اہل اسلام اور اسلامی ممالک کو اس تہذیب جدید اور اس کے خوفناک انجام سے بچانے کے لئے کہنے والے سچ کہہ گئے ہیں۔

اٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

مغربی ممالک کے یہ سیاسی زعماء اور مذہبی رہنما اگر مسلمان مفکروں سے متفق نہیں تو انھیں کم از کم شہرہ آفاق برطانوی مفکر اور مورخ آرنلڈ جے ٹائن بی کا یہ بیان پڑھ لینا چاہئے جو اس نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

مجھے ہم عصر مغربی تہذیب سے غصہ آتا ہے۔ اسلئے نہیں کہ یہ مغربی تہذیب ہے بلکہ اس لئے کہ مجھ پر اس کی خرابیاں آشکارا ہیں۔

اسلامی انقلاب... ایک تنقیدی جائزہ

از ڈاکٹر سہیل آذر نینی تال روڈ تالپورہ۔ بہیڑی۔۲۴۳۲۰۱

اسلام، دین فطرت ہے جو اللہ تعالی نے ہمارے لئے پسند کیا ہے۔ یہ عبد و معبود کے رشتوں کی تشریح اور خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتا ہے یہ ہمیں دنیا میں بھی سکون و چین اور عزت و آبرو سے جینے کا ڈھنگ بتاتا ہے اور آخرت میں بھی دائمی فلاح وکامرانی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام۔۔۔۔ جس کے معنی ہی "گردن بہ اطاعت نہادن" ہیں۔ جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے سلامتی اور فلاح وکامرانی کا منشور حیات ہے جس سے بے رغبتی اور لاپرواہی، رب کائنات کی ناراضگی اور دنیا و آخرت میں ذلت وناکامی کا باعث ہے۔۔۔ اسی اسلام کے ساتھ اس کے پیروکار عرصہ دراز سے، محض چند روزہ دنیوی مفاد کے حصول کی خاطر جس طرح "ظالمانہ مذاق" کرتے رہے ہیں۔ اس کی داستان المناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔!

بلاشبہ مسلمان آج دنیا بھر میں ایمان و عمل کے لحاظ سے انتہائی ناکارہ اور تہی دست ہیں۔ کوئی برائی اور ذلت ایسی نہیں جو ان میں موجود نہ ہو۔ انبیاء سابقین کی امتوں میں جو گناہ عظیم متفرق طور پر موجود تھے اور ان کی پاداش میں ان میں سے بیشتر پر عذاب الٰہی نازل ہوا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ بد قسمتی سے وہ ساری برائیاں امت محمدیہ میں اکٹھی اور یک جا طور پر موجود ہیں۔۔ اب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل کہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی تاثیر کہ ساری گمراہیوں کے باوجود ہم پر دوسری امتوں کی طرح عذاب الٰہی نازل نہیں ہوتا، نہ ہم پر آسمان سے پتھر برستے ہیں اور نہ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں ہماری بستیوں کو الٹ کر تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی ان بداعمالیوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ کی کھلی نافرمانیوں کا کچھ تو وبال ہم پر آنا ہی تھا۔ چنانچہ ہو اپنی شامت اعمال کو آج اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، بھگت رہے ہیں اور نہ جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔۔۔؟؟

امت مسلمہ میں بگاڑ کی اصلاح اور انہیں صراط مستقیم کی طرف گامزن کرنے کے لئے ہر دور میں مصلحین امت، بزرگان دین اور علماء کرام اپنے اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق کوششیں کرتے رہی ہیں۔ اور یہ سلسلہ رشدوہدایت اور اصلاح احوال کی کوششیں آج بھی مختلف شکلوں میں جاری ہیں۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی اس قسم کی کوششیں اور جد جہد جاری رہے گی۔ البتہ: ہر زمانے کا ماحول، حالات اور لوگوں کی قوت فکر و عمل اور ادراک و شعور کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اس لحاظ سے ہر دور کے بزرگان دین اور مصلحین امت کی مساعی فکر و عمل اور تبلیغ واصلاح کا طریقہ کار جداگانہ اور اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق رہا ہے تاہم انہوں نے قرآن وسنت کے رہنما خطوط اور اسلام کے عمومی مزاج سے بال برابر بھی ہٹنے کی کوئی شعوری کوشش کبھی نہیں کی۔ وہ اسلام کو اپنے ذہنی سانچے میں ڈھالنے کے بجائے اپنے اور دوسروں کے قلوب واذہان کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی سعی و جد وجہد میں ہمہ تن مصروف رہے تھے۔۔۔!!

شکر اللہ سعیہم

موجودہ دور میں ایک مخصوص مکتب فکر کی جانب سے امت مسلمہ کے زوال اور ان کے باہمی انتشار و پراگندگی کا "شافی علاج" کرنے کے لئے "اسلامی انقلاب" کے نام سے جو "تیر بہدف نسخہ" اور لائحہ عمل تجویز کیا جارہا ہے اس کی افادیت اور حسن وقبح کا بے لاگ جائزہ لینا، برصغیر ہندوپاک کے موجودہ حالات کے تناظر میں ضروری بھی ہے اور ایک اہم دینی فریضہ بھی۔ سطور ذیل میں ہو اپنی بساط کے مطابق "اسلامی انقلاب" کے مزعومہ نعرے کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اظہار خیال کریں گے۔۔۔!

انقلاب۔۔۔۔ خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔۔۔ نام ہے ایک شدید ردّ عمل (Reaction) کا اور ردّ عمل کا مزاج یہ ہے کہ وہ برپا ہونے کے بعد کسی حد پر نہیں رکتا اور تمام حدود توڑ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ صورتحال اسلام کے عمومی مزاج کے لئے تباہ کن ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں نظریاتی بنیاد پر آئے ہوئے انقلابات کی تاریخ اور تجربات ان کی معرتوں کی شہادت دیتے ہیں چاہے وہ کمیونزم کا باطل نظریاتی انقلاب ہو یا ایران کا نام نہاد

اسلامی یا دوسرے لفظوں میں "شیعی انقلاب" روس اور ایران میں انقلاب کی "برکات" سے ہر پڑھا لکھا اور باشعور انسان بخوبی واقف ہے جس کی تشریح و وضاحت کی ضرورت نہیں۔!
لفظ انقلاب کے معنی اور اسکی ہیئت ترکیبی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ چھ حرفی لفظ اپنے اندر ہوش مندی اور تدبر کے بجائے جوش و جذباتیت، اور تحمل و فکر کے برعکس، سطحیت پسندی اور عاقبت نااندیشی جیسی رکیک صفات کا ایک سیل عظیم پوشیدہ رکھتا ہے۔۔۔! انقلاب کے لغوی معنی ہی کسی چیز کے الٹ پلٹ کر دینے اور پہلے سے "برعکس" بنا دینے کے ہوتے ہیں۔
ہر قوم اور ہر معاشرے کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جو تدریجی طور پر صدیوں کے فعل وانفعال، کسر و انکسار اور تاثیر و تاثر کے طبعی اصولوں کے مطابق پیدا ہو کر اس کی "فطرت ثانیہ" بن جاتا ہے۔ اس مخصوص مزاج کو آپ اگر فطری اصولوں کے مطابق، افہام و تفہیم، ترغیب و ترہیب اور اپنے صالح اصول و نظریات کے خود اپنی زندگی میں مخلصانہ عملی مظاہرے سے متاثر اور مرعوب کر کے بتدریج اپنے ڈھب پر لے آئیں تو بلاشبہ یہ آپ کی عظیم ترین کامیابی ہوگی۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی چیز کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ بد قسمتی سے آج مسلمانوں میں امر بالمعروف کا مفہوم لفظی طور پر لوگوں کو بھلائی کا حکم دینے اور نہی عن المنکر کا مطلب دوسروں کو برائی سے روکنے کی حد تک ہی رائج ہے۔ خود اپنی زندگی میں معروف کا مخلصانہ مظاہرہ اور اپنے نفس کو منکرات سے روکنے کا جذبہ آج کے دور میں مفقود نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ دین کی بے شمار کوششوں اور رسل و رسائل کے جدید ترین وسائل میسر ہونے کے باوجود اسلام موجودہ دور میں امت مسلمہ کے لئے "اجنبی اور عجوبہ روزگار" بن کر رہ گیا ہے۔۔۔!

انقلاب۔۔۔۔ جو اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے جوش و جذباتیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ محض فلک شگاف نعروں اور "زندہ باد" و "مردہ باد" کی پرجوش صداؤں سے کبھی برپا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک مخصوص حکمت عملی (Stratgy) اور پالیسی و پروگرام طے کرکے شب و روز اس کے نفاذ کی کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ کسی بھی قوم یا ملک کا "تختہ پلٹنا" آسان کام نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ انقلاب کے لئے اختیار کردہ مخصوص حکمت عملی اور وضع کردہ پالیسی و پروگرام سے عملی طور پر وہی گروہ ہمہ تن متفق اور متاثر ہوتا ہے جو پہلے سے ان نظریات پر ایمان اور اس کے حسن و قبح پر آنکھ بند کر کے یقین رکھتا ہو۔ مزعومہ

انقلاب کے برپا ہونے کے بعد قوم یا ملک کی اکثریت جو پہلے سے ان نظریات سے اتفاق نہیں رکھتی اور ان پر عمل پیرا ہونے سے گریزاں ہوتی ہے اسے قابو میں رکھنے اور اپنے وضع کردہ انقلابی اصول و نظریات پر چلانے کے لئے لازمی طور پر جبر و تشدد اور ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں انقلاب کی کوکھ سے مطلق العنانی اور ڈکٹیٹر شپ کا ظہور ہونا ایک لازمی امر ہے آگے چل کر یہی مطلق العنانی یا ڈکٹیٹر شپ عوام میں حقوق کے استحصال اور ظلم و زیادتی کا باعث ہوتی ہے کیونکہ دولت و اقتدار کا نشہ شراب کے نشے سے کہیں زیادہ تیز بلکہ سر آتشہ ہوتا ہے۔ طاقت اور اقتدار کے حصول کے بعد اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور خلفاء راشدین جیسے مستحکم اور ٹھوس ایمان اور اسی طرح کی بے نفسی اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے جو جو اس دور پر فتن میں ناممکن ہے۔۔۔! ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آج جو گروہ اسلامی انقلاب اور ''اقامت دین'' کا دعوی دار ہے، خود اس گروہ کے افراد و ارکان کی عملی زندگیوں میں جذبہ ایمان اور اسلامی اخلاق کا کتنا عمل دخل ہے۔ ؟ جو لوگ اپنے گھروں میں اور خود اپنے نفس پر اسلام اور اس کی تعلیمات و نظریات کو عملی طور پر نافذ نہیں کر سکتے ان کے ان کمزور ہاتھوں میں اگر قوم و ملت کی باگیں دیدی گئیں تو پھر اسلام کا تو خدا ہی حافظ ہے۔۔۔!! کسی بھی انقلاب کے ذریعہ آپ ظاہری طور پر اپنے نظریات کے مطابق ایک نظام کا ڈھانچہ تو کھڑا کر سکتے ہیں مگر اس نظام کو چلانے کے لئے اور زندگیوں میں خلوص کے ساتھ نافذ کرنے کے لئے عوام الناس کے ذہنوں کو رضاکارانہ طور پر ڈھالنا اور اپنے ڈھب پر لے آنا ایک دشوار امر ہے۔ کیونکہ جو دلدلیں صدیوں کے طبعی عمل سے بنتی ہیں، انہیں ریت کے چند بوروں سے پاٹنا ناممکن ہوتا ہے اسکے لئے ایک طویل جد و جہد اور لامتناہی عزم و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔!

ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا نعرہ حقیقت میں ایک ''سیاسی اسٹینڈ'' اور مسلم عوام کے جذباتی استحصال کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ انقلاب اسی وقت موثر ہوتا ہے جبکہ اقتدار کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہوں۔ ہندوستان جنت نشان میں مسلمانوں کا ''جمہوری طور پر'' اور ''پرامن طریقے سے'' اسلامی انقلاب کی باتیں کرنا ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس ملک میں جو جمہوریت کا دعویدار ہے اکثریت اسی ۸۰ رفیصد غیر مسلموں خصوصاً ہندؤں کی ہے۔ ملک کے موجودہ جمہوری نظام کے تحت پارلیمنٹ اور

اسمبلیوں میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ان کے "نمائندے" نہیں پہونچ پاتے کجایہ کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ساری سیٹوں پر مسلمان قابض ہو جائیں اور ملک میں اسلامی نظام نافذ کردیں جو کہ ایک غیر ممکن بات ہے کیونکہ شروع ہی سے ملک کو کچھ اسطرح انتخابی حلقوں میں جان بوجھ کر تقسیم کیا گیا ہے کہ محض مسلمانوں کے ووٹ کی بنیاد پر ان کے نمائندوں کا کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے۔۔۔ اس سے وہ معدودے چند حلقے مستثنیٰ ہیں جہاں اسطرح کی تقسیم ناممکن تھی۔۔۔ غیر مسلم حلقوں سے وہی مسلمان کامیاب ہو سکتے ہیں جن کو سیکولر پارٹیوں نے کھڑا کیا ہو۔۔ اور سیکولر پارٹیوں کا مطلب اس وقت ہندو اکثریت کی ترجمانی کرنے والی پارٹیاں ہیں۔ ان پارٹیوں کے ٹکٹ پر جو "مسلمان" نام کے افراد کامیاب ہوتے ہیں۔ انہیں پارٹی کی قیادت اور ہائی کمان کے سامنے اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی وہ بیچارے اسلام یا مسلمانوں کی فکر کہاں سے کر پائیں گے۔۔۔ ؟؟

ایسی صورت میں "پرامن" اور جمہوری طریقے سے ہندوستان میں "اسلامی انقلاب" آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انقلاب کی دوسری صورت عسکری تنظیم و صلاحیت، قوت و شوکت کا مظاہرہ اور "جذبۂ جہاد" ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کم از کم ہندوستان میں فی الحال ناممکن نظر آتا ہے، کیوں کہ یہاں مسلمانوں میں جو باہمی خلفشار، انتشار و افتراق، گروہی عصبیت اور قائدانہ صلاحیت کا فقدان پایا جاتا ہے اس کی روشنی میں یہ توقع رکھنا کہ وہ "اسلامی انقلاب" کے خوبصورت الفاظ کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے باہمی اختلاف بھلا دینگے اور باطل کے خلاف ایک سیسہ پلائی دیوار کے مانند کھڑے ہو جائیں گے محض ایک دیوانے کا خواب ہے۔۔۔ !!

آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ باہمی خلفشار بے عملی، اخلاقی گراوٹ، جہالت اور دین سے دوری نے انہیں رسوائی اور ذلت و پستی کے عمیق غار میں پہونچادیا ہے۔ باہمی بغض و عناد اور تعصب کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے پر کفر و تفسیق کے پتھر اچھالنے اور اسے ملت اسلامیہ سے خارج کرنے میں ہمہ وقت لگے ہوئے ہیں۔ بریلوی مکتب فکر کے لوگ جو بر صغیر میں بہت بڑی تعداد میں، بلکہ زیادہ تر مقامات پر "اکثریت" میں ہیں۔ اپنے حریف دیوبندیوں اور اہلحدیث حضرات کو کھلے عام کافر کہتے ہیں ان کیساتھ سلام و کلام اور سماجی روابط رکھنے سے نفرت رکھتے

ہیں۔ان کا ذبیحہ حرام قرار دیتے ہیں۔اسی طرح دیوبندی حضرات بریلویوں کی بدعات اور قبور پرستی سے نہ صرف یہ کہ متنفر اور بے زار ہیں بلکہ شب و روز انکی خرافات کے ردّ واستیصال میں لگے ہوئے ہیں۔سالہا سال سے دونوں میں یہ کشمکش جاری ہے۔دوسری طرف جماعت اسلامی والے ہیں جو صرف خود کو اصلی اور شعوری مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنے علاوہ دیگر سب ان کے نزدیک "نسلی" اور سرکاری رجسٹر میں درج شدہ نام کے مسلمان ہیں۔اول الذکر دونوں بڑے گروہ یعنی بریلوی اور دیوبندی، جماعت اسلامی کے افراد کو ان کے "جدید طرز عمل" اور دینی معاملات میں "مغربی انداز فکر" کی بنا پر "ضال و مضل" اور ان کے نظریات کو دین میں فتنہ" اور مغربی افکار کا چربہ کہتے ہیں۔۔۔۔! یہی حال کم و بیش مسلمانوں کے دیگر مکاتب فکر کا ہے۔ سب ایک دوسرے سے متنفر اور گریزاں نظر آتے ہیں۔ان کی نفرت وعداوت کی جڑیں اتنی گہری اور دور تک چلی گئی ہیں کہ انہیں اکھاڑ کر پھینک دینا، کسی مصلح وقت اور مجدد زماں کے بس کی بات نہیں۔الّا یہ کہ وہ مقلب القلوب جو ہم سب کا پروردگار ہے خود ہی ان کی قلب ماہیت فرمادے اور ان سب کو اتفاق و اتحاد کی نعمت سے فیض یاب فرمائے۔ بلاشبہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔۔۔۔!!

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے اندر کسی اجتماعی انقلاب کی بات کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مصداق ہے۔البتہ : انقلاب کا انفرادی عمل فرداً فرداً ہر شخص کو اپنی ذات میں مسلسل جاری رکھنا چاہئے۔اپنی عادات واطوار کو تبدیل کر کے اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، فرائض وواجبات اور سنت نبوی ﷺ پر حتی الامکان شدت سے عمل پیرا ہونے کی خود بھی کوشش کرنا اور اپنے گھر والوں کو بھی ان اعمال کی ترغیب دلانا۔اپنے عزیز و متعلقین اور دوست احباب تک اسلام کی دعوت پہونچانا، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی بجا آوری کا عزم وعمل اور اسلام کی سر بلندی کے لئے ہر قسم کی جانی، مالی اور جذبات کی قربانی دینے کا جذبہ خود میں پیدا کرنا۔یہ ساری باتیں جو شریعت کا مطلوب و مقصود ہیں دراصل ایک عظیم انقلابی عمل ہے جو ہر فرد پہلے اپنی ذات میں، پھر اپنے گھر والوں اور عزیز واقارب میں برپا کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔اسی کو قرآن میں اصطلاحاً "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کہا گیا ہے اور اس کی ذمہ دار ہر مسلمان مرد اور عورت پر ڈالی گئی ہے۔اس عظیم ذمہ داری کو قرآن مجید میں مختلف پیرایوں اور مختلف الفاظ و انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہیں اسے قُوا انفسکُمْ

وَأَهْلِيكُمْ نَاراً" کے الفاظ میں ذکر کیا ہے تو کہیں" اَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الأَقْرَبِيْن" کا لطیف پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ کسی جگہ اسے" بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ اِلَيكَ اور عَلَيْكَ البلاغُ وَعَلَيْنَاالحِسَاب" کے حکیمانہ تاکیدی الفاظ میں بیان کیا ہے تو دوسری جگہ اسے ادع الی سبیل ربک کے حکیمانہ پیرائے میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے تذکیرو تبلیغ کی یہ ساری ہدایتیں اور احکامات کیا"انقلاب ذات"کا پیغام نہیں ہیں ؟، لیکن مومن کی ان تمام انقلابی کوششوں کا نتیجہ بھی دنیا میں اسکی توقعات کے مطابق نکل آئے، قرآن وحدیث نے اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی ہے اور نہ بندے کو اس کا مکلف کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو لازماً بدل کر رہے ورنہ اسکی ساری سعی رائیگاں شمار کی جائے گی۔ بلکہ فوزو فلاح کو سراسر اللہ کی مرضی کے تابع بتایا گیا ہے من یھدی اللہ فھو المھتدی ومن یُضْلِلِ اللہ فلا ھادی لہ کے دوٹوک الفاظ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کرنا اور انہیں اللہ کی طرف پھیر دینا کسی انسانکے بس کی بات نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی توفیق و تائید سے ایسا ہو سکتا ہے۔ اور ہدایت یافتہ وہی کہلائے گا جسے اللہ تعالی ہدایت کے نور سے نوازدے اور جسے اللہ راہ حق سے بھٹکادے اسے ہدایت دینے والا کائنات میں کوئی فرد بشر نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ رائج الوقت لفظ"انقلاب" اور قرآنی اصطلاح "ہدایت" کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ اور اس لفظ کا تعلق ہر فرد بشر کی اپنی ذات سے ہے اور یہ ہدایت یاانقلاب ذات سراسر اللہ تعالی کی توفیق وارادہ کا مرہون منت ہے کسی انسان کے بس کا روگ نہیں کہ وہ کسی کو نور ہدایت سے سرفراز کرے یا بلا تائید خداوندی کے کسی کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔ البتہ: جب افراد کی کثیر تعداد اپنے آپ کو بدلنے یا دوسرے لفظوں میں اپنے اندر انقلاب لانے کی سعی میں خلوص نیت کے ساتھ لگ جاتی ہے تو اللہ تعالی ان لوگوں پر نظر کرم فرماتا ہے اور ان کی پستی وبدحالی کو بدل کر عزت واقتدار سے سرفراز فرماتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

انّ اللہ لاَ یغیرّ ما بقوم حتی یُغیّروا ما بأنفسھم۔ یعنی اللہ تعالی کسی قوم کی حالت اس وقت تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ اس قوم کے افراد واعیان پہلے خود کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔

اسلام بلا شبہ ایک مکمل دین، بے مثال ضابطہ حیات اور زندگی کے ہر شعبے پر محیط قواعد و قوانین کا مجموعہ ہے۔ یہ اسی لئے دنیامیں بھیجا گیا ہے کہ اس دنیامیں ہر جگہ رائج و نافذ ہو اور اللہ کے تمام بندے اس سے فیض و ہدایت پائیں۔ ہر مسلمان کی دلی تمنا ہے کہ اسلام دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل جائے اور اس کے قوانین حقہ ہر جگہ جاری و ساری ہوں۔ اور یہ تمنا ہمارے ایمان کا ثبوت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کا نتیجہ ہے۔ یہ ساری باتیں درست، مگر مجرد تمناؤں سے کام نہیں چلتا۔ جب تک ہم اسکے دین حنیف کو خود اپنی زندگیوں میں جاری نہیں کریں گے جب تک ہمارے اعمال، رہن سہن باہمی تعلقات اور کاروبار لین دین وغیرہ میں اسلام کی کار فرمائی نہیں ہو گی اور ہم اپنے آپ کو مومن صادق بننے کی اور دوسروں کو بھی مومن بنانے کی مخلصانہ جدوجہد نہیں کریں گے اس وقت تک اسلام پوری طرح دنیامیں نافذ نہیں ہو سکتا اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ اللہ کی یہی سنت ہے اور اللہ اپنی سنت میں تبدیلی نہیں کرتا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِيْ الزبُورِ من بَعد الذكر ان الارْضَ يَرِثُهَا عباد ى الصَالِحُون۔

اللہ تعالیٰ کسی فرد کو اسکی وسعت اور ظرف سے زیادہ کسی ذمہ داری کا مکلّف نہیں بناتا۔ لایکلفه الله نفسا الا وسعها۔ اس نے ہم پر قوا انفسکم واھلیکم نارا کے ذریعہ یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ ہم اپنی ذات میں اور اپنے گھر والوں کے اندر اسلام نافذ کریں ہم ابھی تک یہی ذمہ داری پوری کرنے کے اپنے آپ کو اہل ثابت نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ ہم چاہے خود پر اور متعلقین پر اسلام نافذ کریں یا نہ کریں مگر اللہ پورے ملک یا دنیامیں اسلام کے قواعد و قوانین ضرور رائج نافذ کر دیں بلاریب کوئی ذی فہم اس قسم کے تصور میں مبتلاء نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ہم سب اپنے آپ اور عزیز و متعلقین کو بدلنے کا عزم لیکر جب کام شروع کریں گے اور اس کے خاطر خواہ نتائج معاشرے میں دکھائی دینے لگیں گے تو پھر انشاء اللہ اس کی مدد آئے گی اور مومنوں کو فتح و نصرت کیساتھ دنیاوی جاہ و حشم اور حکومت سے بھی نوازا جائیگا۔ اس کے بعد ہی آپ اس بات کے ذمہ دار اور مکلّف ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اس کے نازل کردہ قوانین اسلام کا نفاذ کریں۔ یہی فطری طریقہ ہے اور یہی اسلام کی تعلیمات بزرگان دین اور علماء امت کا انداز فکر اور عمل ہے اور اسی پر چلتے رہنے

میں ہماری بھلائی ہے۔

ان معروضات کے بعد ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بر صغیر اور خاص طور پر ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا تصور موجودہ حالات کے تناظر میں اگر اتنا ہی غیر ممکن اور ناقابل عمل ہے تو پھر کیا ہم بالکل ہی مایوس اور اسلام کے آفاقی قوانین، بے مثال ضابطہ حیات اور اصول و نظریات سے قطعی طور پر دست بردار ہو جائیں اور اس ملک کو فاشسٹ طاقتوں، اور کفار و فجار اور لامذہبی سیاست کے علمبر داروں کی من مانی کرنے کے لئے یونہی چھوڑ دیں اور خود تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ جائیں۔ ؟ کیا موجودہ نظام طاغوت اور کفر و ظلم کے تحت زندگی گذارتے ہوئے ہم اسلام کی مکمل تعلیمات اور نظام حیات پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ ؟ فرائض وواجبات حرام و حلال، عائلی قوانین اور اصول و ضوابط کی پاسداری نظام باطل کے تحت ہم سے کس حد تک ممکن ہو سکتی ہے۔ ؟ اس طاغوتی نظام کے عواقب و مضرات سے ہم کس طرح اپنا دامن بچا سکتے ہیں۔ ؟ سودی بینک کاری کی لعنت سنیما، ٹی وی وڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فحاشی اور جنسی انارکی کی نشر واشاعت، یہ اس قسم کے سیکڑوں فواحش و منکرات سے دامن بچا کر اسلام پر عمل پیرا ہونے کی کیا تدابیر ہونگی۔ ؟ ان باتوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ؟

مذکورہ بالا سوالات کو حل کرنے کیلئے ہمیں بہر صورت قرآن و سنت کے اوراق کو الٹ کر دیکھنا ہوگا۔ سیرت نبوی ﷺ اور عہد صحابہ کے زریں دور پر عمیق نگاہ ڈالنی ہوگی۔ تابعین اور تبع تابعین کے طرز عمل اور انداز فکر کا جائزہ لینا ہوگا۔ اگر ہمیں خیر القرون میں اس قسم کے حالات کی نظیر مل جاتی ہے تو ٹھیک ہے۔ اسی کے مطابق ہم بھی اپنا طرز عمل اختیار کرلیں گے ورنہ بصورت دیگر ہمیں قرآن سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ان حالات کا جائزہ لیکر اپنے لئے ایک راہ عمل متعین کرنی ہوگی۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو اسلام پیدائش سے لیکر موت اور مہد سے لحد تک کے کل مراحل اور زندگی کے ہر زاویے اور ہر موڑ کیلئے ہمیں واضح ہدایات فراہم کرتا ہو۔ جس میں اکل و شرب سے لیکر بیوی سے مقاربت، وضو، نماز اور دیگر عبادات کے مسائل سے لیکر عائلی زندگی کے احکامات، سیاست تمدن، معیشت، معاشرت اخلاق و معاملات، غرض زندگی کے ہر گوشے اور ایک ایک لمحہ کے لئے واضح احکام وہدایات ملتی ہوں۔ وہی اسلام اس قسم کے غیر معمولی حالات میں ہماری رہنمائی کرنے سے

قاصر ہو۔ اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔! اگر اسلام نے ہمیں اس قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے واضح طور پر کچھ ہدایات دی ہیں اور ہمارے لئے کوئی راہ عمل متعین کی ہے تو اس کے مطابق عمل کرنا ہی ہمارے لئے دنیاو آخرت کی فلاح اور کامرانی کی ضمانت ہے۔ اس سے ہٹ کر ہم جو بھی طرز عمل اختیار کریں گے وہ ہمارے لئے نقصان دہ اور باعث پریشانی ہوگا۔۔۔؟

ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ زندگی "اسوہ حسنہ" قرار دی گئی ہے۔ آپکی رسالت کے ابتدائی تیرہ سال یعنی مکی دور پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو اسلام کے قافلہ کے افراد نظام باطل کے تحت آج سے کہیں زیادہ خطرناک اور نازک حالات کا شکار دکھائی دینگے۔ ان پر مکہ میں ظلم وستم کے جو پہاڑ ڈھائے گئے ان کا عشر عشیر بھی ہمارے اس دور میں نظر نہیں آتا۔ اس پر آشوب دور میں آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا طرز عمل اپنایا تھا اور نظام باطل کے تحت کس طور پر زندگی گذاری۔ اس کی شہادت ہمیں تاریخ کے صفحات پر ملتی ہے۔ ٹھیک انہیں خطوط پر چل کر ہم بھی اس باطل نظام حیات سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کسی دوسرے فارمولے کو اپنا کر نہیں۔۔۔! پھر یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مکی دور میں ایک مرحلہ یہ بھی آگیا تھا جبکہ عتبہ بن ربیعہ کے ذریعہ قریش مکہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھیجوایا تھا کہ اگر آپ ﷺ اسلام کی دعوت سے باز آجائیں تو ہم آپ کو ہر قسم کی مراعات اور قدر و منزلت دینگے، یہاں تک کہ عرب کی حکومت تک آپکو تفویض کرنے کو تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ سنہرا موقع حضور ﷺ کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ ان سے حکومت حاصل کرتے اور پھر مسند اقتدار پر بیٹھنے کے بعد قانون اور ڈنڈے کے زور سے ان پر اسلام نافذ کر دیتے اللہ اللہ خیر صلیٰ۔ اسطرح کفر واسلام کی کشمکش کا خاتمہ نہایت آسانی سے ہو سکتا تھا۔ مستقبل میں نہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی جاں سپاری کی ضرورت پیش آتی نہ جنگ اُحُد میں زخم کاری کی اذیت سے سابقہ پڑتا۔ احزاب حنین اور خیبر و تبوک کے معرکے کالعدم ہی ہو جاتے۔۔۔!!

آپ ﷺ نے حکومت کی پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر جو طرز عمل اختیار کیا تھا، آج ہمیں بھی اس اسوۂ حسنہ کی شدید ضرورت ہے آپ نے اپنے اس فیصلے اور مبارک اقدام سے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اسلامی نظام حکومت، طاغوت سے سمجھوتہ کر کے یا

طاغوتی نظام کے درمیان رہ کر قائم نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کو اپنی خداداد صلاحتیں اور توانائی دعوت و تبلیغ کے بجائے سیاسی اکھاڑ، پچھاڑ میں صرف کرنی چاہئیں۔ بلکہ صبر واستقامت اور ہجرت کے جانگداز مراحل سے گزرنے کے بعد ہی انھیں اپنی منتشر طاقت کو یکجا کرنے کے بعد مناسب موقع پر جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ دارالاسلام سے مراکز طاغوت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی سعی وجدوجہد کرنی چاہئے تاکہ اسلامی نظام کو اپنے پاؤں جمانے اور مظلوم انسانیت کو اس کے مبارک ثمرات سے مستفیض ہونے کا موقع مل سکے۔۔۔!

آج ہم اگر اپنی موجودہ حالت پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ صبر واستقامت جیسی مومنانہ صفات سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم چاروناچار طاغوتی نظام کے تحت غلامانہ زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی سیاست وقوانین کے تحت ہجرت کا راستہ ہم پر بند ہو چکا ہے اور اگر بالفرض یہ راستہ کھل بھی جائے تو ہم اپنے مشاغل وکاروبار اور زمین وجائیداد چھوڑ کر محض اللہ کی خاطر کسی دوسرے خطہ یا ملک میں جانے پر آمادہ اور تیار بھی نہ ہونگے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ تو ظاہر ہے کہ دارا لکفر میں رہتے ہوئے ہم پر فرض نہیں ہو سکتا۔۔!ایسی صورت میں ہم کیا کریں۔۔؟ لادینی جمہوری نظام کے تحت زندگی گذارتے رہنے سے ہمارا طرز فکر بھی اب مغربی جمہوری نظام کے تابع ہو گیا ہے غلبہ اسلام کے جذبہ سے قطع نظر اپنے مادی حقوق کے حصول کے لئے اب ہم بھی مروجہ ہڑتال، احتجاج، مظاہروں جلسہ جلوس اور محض قراردادوں پر انحصار کرنے کے قائل ہو گئے ہیں۔۔ مجالس آئین یعنی اسمبلی وپارلیمنٹ میں اصلاح ورعایت وحقوق کے مطالبات ہمارا مرکز فکروعمل بن چکے ہیں۔ ہمارے وہ دانشور جو سائکل کے کارخانے سے ہوائی جہاز کے پرزے ڈھل کر نکلنے کی توقع نہیں رکھتے تھے وہ بھی آج اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ غیر اسلامی جمہوری عمل سے کوئی اسلامی قیادت وجود میں آسکتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ غیر اسلامی نظام کا ڈھانچہ غیر اسلامی قیادت کو ہی وجود میں لا سکتا ہے۔ اسی طرح موجودہ انتخابی یا جمہوری طرز عمل سے کسی تبدیلی کی توقع کے معنی ہیں کہ ہم کفر کے زینہ سے اسلام تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ کفر کا راستہ صرف وادی کفر کی طرف لیجا سکتا ہے اسلام کی طرف نہیں۔۔۔!!

بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آجاتی ہے کہ آخر ان حالات میں مسلمان کیا کریں۔۔؟ ہندوستان میں اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہ سہی مگر ہمیں اپنی بقا اور ملی تشخص کے لئے آخر کچھ تو کرنا ہی ہے۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور محض تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھ رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

ہماری خاموشی اور بزدلی اغیار کی ہمت افزائی کا سبب بنتی ہے اور دنیا کا اصول ہے کہ جو دبتا ہے اسے اور زیادہ دبایا جاتا ہے۔ اس ملک میں ہمارے ساتھ بھی عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے۔

بات بالکل درست ہے۔ موجودہ دور میں ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق سے حالات کی سنگینی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور من حیث القوم ہمیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہم اس ملک میں اطمینان و اعتماد اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ مسلمانوں کی کامیابی ان کے باہمی اتفاق و اتحاد میں مضمر تھی مگر بد قسمتی سے ان کے درمیان یہ عظیم صفات اس دور میں جنس نایاب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ذات و برادری اور مسلکی اختلافات سے دست بردار ہو کر اللہ کی رسی کو مل کر مضبوطی سے پکڑ لینا ان کے لئے فی الحال ناممکن ہے۔ باہمی بغض و نفاق اور گروہی عصبیت نے ایک دوسرے کے دلوں کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے ان کو دوبارہ جوڑنا ایک دشوار امر ہے۔ ان حالات میں اتفاق و اتحاد کی کوششیں کس حد تک بار آور ہو سکتی ہیں اس کا اندازہ ہر سنجیدہ اور سمجھدار شخص بخوبی لگا سکتا ہے۔ یہ خلیجیں دلوں میں اب سے نہیں بلکہ برسوں اور صدیوں پہلے سے موجود ہیں ان کو پاٹنا کوئی آسان کام نہیں۔۔۔ اور نہ ہی اتحاد اور باہمی بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے کوئی لگا بندھا فارمولا پیش کر دینا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ملت کا درد رکھنے والے ہر مسلک و گروہ کے مخلص اور چیدہ افراد اگر ذاتی مفاد اور "لیڈری" کی ہوس سے دامن بچاتے ہوئے آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور پھر امرہم شوری بینھم کے حکم ربانی کے مطابق باہمی صلاح و مشورہ سے ملت میں اتحاد و عمل کی راہیں تلاش کریں تو شاید اس بحران کا کوئی مثبت حل نکل سکے گا۔ لیکن ایسا ہونا فی الجملہ آسان اور ممکن نظر نہیں آتا۔ فی الحال تو یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر تلاش کرنے کے لئے شاید صدیاں درکار ہوں گی۔۔۔!!

☆ ☆ ☆

رئیس المتغزلین

جناب جگر مرادآبادی

اور ان کے مذہبی رجحانات

عبدالحی فاروقی صدر شعبہ اسلامیات، جامعہ ہمدرد نئی دہلی

چند روز ہوئے ایک غیر ملکی رسالہ میں ایک مضمون نظر سے گذرا جس میں رئیس المتغزلین جناب جگر مرد آبادی (م ستمبر ۱۹۶۰ء) کے بارے میں کچھ غلط اور بے بنیاد باتیں ایک خاص مذہبی جذبہ کے تحت لکھی گئی تھیں جن میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ تاعمر لامذہب اور دہریت پسند رہے اور اور اگر کبھی کسی مذہب کی طرف مائل بھی ہوئے تو انہوں نے شیعی مسلک کو اپنالیا۔ جو لوگ اس قسم کی تحریروں کو پڑھیں گے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہونگے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تردید کی جائے اور جو حقائق ہیں انہیں سامنے لایا جائے اسی لئے یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں، ایک متوازی اسلام کے دعوی دار اسلام دشمن طبقہ کی ہمیشہ اس بات کی کوشش رہی ہے کہ وہ اکابر واعاظم اہل سنت پر رفض کا لیبل چسپاں کر کے اپنے ہم مذہبوں کے روصلے بلند کرے اور اہل سنت عوام کو تذبذب وانتشار میں مبتلا کرے یہ شیوہ اسکے متقدمین علماء کا بھی رہا ہے اور متاخرین کا بھی ہندوستان میں یہ سعی نامشکور قاضی نوراللہ شوستری نے خاص طور سے خوب انجام دی ہے۔

مذہبی ماحول جگر صاحب اردو غزل کی آبرو تھے اور اردو زبان کے محسن تھے ان کے کلام میں تغزل، سلاست، روانی اور سوز و گداز کا ایک حسین امتزاج ہے۔ وہ مشاعروں میں جب اپنے مخصوص ترنم سے اپنا کلام پیش کرتے تھے تو سارا مجمع سر دھنتا

تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو مشاعروں کے ذریعہ مقبول بنانے میں جگر صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ ایک قادر الکلام اور ہر دلعزیز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سی شخصی خوبیوں کے مالک تھے۔ فطرتاً وہ بیحد منکسر المزاج فیاض، غیبت اور لغو گوئی سے مجتنب، دوسروں کے کام آنے والے اور سب سے بڑی بات یہ کہ معصیت کو معصیت سمجھنے والے انسان تھے۔ اکثر یہ خیال آتا تھا کہ ایک بادہ خوار اور آزاد خیال شاعر ہوتے ہوئے ان میں یہ خوبیاں کیسے آئیں چنانچہ مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، انسان کی سیرت اور طرز فکر پر خاندان اور اسکے ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ جگر صاحب کے مذہبی رجحانات کا اندازہ انکی ابتدائی تعلیم اور انکے گھریلو ماحول سے بخوبی کیا جاسکتا ہے چنانچہ ان کے خاندان کے بارے میں جناب احمر رفاعی تحریر کرتے ہیں:

جگر اس خاندان سے متعلق ہیں جو مرادآباد میں مولویوں کے خاندان کے نام سے مشہور تھا۔ یہ خاندان تین وجوہیت کی بنا پر ممتاز رہا ہے، امارت، صداقت اور علم و ادب۔ اس خاندان کے مقابلے میں ایک قاضیوں کا خاندان تھا جس سے اس خاندان کی قرابت داری بھی تھی۔ یہ دونوں خاندان اپنی تہذیبی و ثقافتی روایات کی بنا پر ایک ایسی امتیازی شان کے مالک تھے جو مرادآباد میں کسی اور خاندان کو نصیب نہ تھی۔ (۱)

مذہبی تعلیم جگر صاحب نے سب سے پہلے مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب امروہوی (۱۹۴۸ء) سے الف، ب، ت، شروع کی اور پھر کچھ دنوں مولوی اسماعیل بیگ صاحب کے مکتب میں بھی پڑھا (۲) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انکے والد محمد علی نظر مولانا محمد صدیق صاحب مرادآبادیؒ (م ۱۹۲۸ء) کے مرید اور معتقد تھے جو بیک وقت حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مجاز تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بھی بیعت تھے۔ جگر صاحب نے بھی اردو، فارسی، عربی اور قرآن مجید کی تعلیم مولانا محمد صدیق صاحبؒ سے بھی حاصل کی تھی۔ جگر صاحب کے قریبی عزیز جناب راہی مرادآبادی کا کہنا ہے کہ:

"جگر صاحب نے (کچھ دنوں) حافظ قاری عبدالرشید صاحبؒ (م ۱۹۰۴ء) کے آگے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا، قاری صاحبؒ ہماری خاندانی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ

۱۔ جگر کی شاعری کا ثقافتی پس منظر، احمد حسین خاں احمر رفاعی، ایم اے۔ ص ۱۳۹۔ ۱۴۰ مشمولہ رسالہ اردو، کراچی ۱۹۵۹ء۔

۲۔ جگر مرادآبادی۔ حیات اور شاعری، مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام، ص: ۵۲، لکھنؤ ۱۹۶۲ء۔

جگر صاحب کے والد نے قاری صاحبؒ کی شہرت اور لیاقت کے باعث جگر صاحب کو ان کے حضور پیش کیا تھا۔"(۱)

حسن اتفاق سے مذکورہ بالا اساتذہ میں سے اکثر حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد سے وابستہ تھے۔ اس مدرسہ کے روحانی ماحول اور ان حضرات کے مبارک فیض صحبت کا ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنی دینی تعلیمی سرگرمیاں ادھوری چھوڑ کر بعض نامناسب صحبتوں میں پڑکر شراب نوشی کی عادت قبیحہ میں مبتلا ہوئے تو اُس دور میں بھی ان کی شخصی خوبیاں، علماء و بزرگوں کا احترام اور سب سے بڑھ کر گناہ کو گناہ سمجھنے کی صلاحیت ان میں بہر حال باقی رہی۔ انھوں نے بحالت سرشاری بھی کسی طرح کی ناشائستگی کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت کبھی ان سے سرزد ہوئی جس پر بعد میں انھیں ندامت اٹھانی پڑتی، وہ ہمیشہ مدہوشی میں، خاموش ہو جایا کرتے تھے اور سوا مشاعروں یا محفلوں میں شعر سنانے کے کوئی دوسری گفتگو نہ کرتے تھے، اسی گمراہی اور معصیت کے دور میں کچھ دنوں کے لئے ان میں لامذہبیت اور پھر شیعیت کا بھی اثر ہو گیا تھا جس کا اثر جلد ہی ختم بھی ہو گیا تھا اور وہ اپنے آبائی مذہب و مسلک پر واپس آگئے تھے۔ اس طرح ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں جو روحانی فیوض و برکات شامل تھے ان کا کچھ نہ کچھ اثر ان کی تمام زندگی میں غالب رہا حتی کہ اس زمانے میں بھی جب ان پر رندی و سرمستی کا غلبہ تھا۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ واضح ہو چکا کہ جگر صاحب کا خاندانی ماحول دینی اور مذہبی تھا اور انھوں نے علماء حق سے دینی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ چنانچہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کی طرف سے شائع شدہ ایک کتابچہ میں مدرسہ کے تربیت یافتہ مشاہیر میں جگر صاحب کا نام بھی تحریر کیا گیا ہے۔(۲)

ترک مے نوشی

ڈاکٹر ضیاء الدین لکھتے ہیں:

"جگر شراب پینے کو کبھی اچھا نہیں سمجھتے تھے، ہمیشہ اپنی شراب نوشی پر نادم رہتے تھے اور اس سے چھٹکارا پانے کی دعائیں کرتے رہتے تھے اور مخلصین سے بھی دعائیں کرنے کیلئے التجا کرتے، بار بار اسے ترک کرنے کی کوشش کرتے مگر کامیاب نہ ہوتے ــــ بالآخر

۱۔ ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، ص: ۳۳-۳۴، فروری / مارچ ۱۹۶۱ء

۲۔ اغراض و مقاصد مرتبہ دفتر اہتمام مدرسہ شاہی مراد آباد مطبوعہ ۱۹۸۸ء۔

۱۹۳۹ء میں احباب کی دعائیں رنگ لائیں اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ ایکی بار ج ہوئے۔ ایکی بار جو چھوڑی تو پھر کبھی نہیں پی اور ہمیشہ کیلئے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ یہ ان کی قوت ارادی اور عزم مصمم کی بہترین مثال ہے۔"(۱)

ترک مے نوشی میں جہاں جگر صاحب کے دینی جذبہ کا دخل تھا وہیں اسمیں مشہور صوفی منش غزل گو شاعر جناب اصغر گونڈوی کی کوششوں اور نصیحتوں کا بھی بہت زیادہ دخل تھا انہوں نے ہی دور گمراہی میں انکی رہنمائی کی اور انہی کے فیض صحبت سے جگر نے اپنی زندگی سنواری اور عقائد کی اصلاح کی اور انہی کے ایما پر ضلع سہارنپور کے مشہور و مقبول بزرگ حضرت قاضی عبدالغنی صاحب منگلوریؒ (م ۱۹۲۸ء) کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ جگر صاحب خود بھی اسکے معترف تھے اور انہوں نے اصغر گونڈوی مرحوم کے اس احسان کو بھی کبھی نہیں فراموش کیا بلکہ ہر موقع پر اسکا اظہار بھی کرتے تھے چنانچہ اپنے ایک قریبی دوست کو ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ:

"اگر حضرت اصغر کے توسط سے مجھے آستانہ منگلور سے شرف غلامی حاصل نہ ہو جاتا تو یقیناً یا تو خودکشی کر چکا ہوتا ورنہ بقول میرے ایک دوست کے زینت صحرا ہوتا۔ میری تربیت اصغر گونڈوی کے نفوس قدسیہ کی رہین منت ہے اور صحیح معنوں میں موصوف ہی کی ذات گرامی میری اصلاح شعری کی ذمہ دار ہے۔"(۲)

اس طرح اصغر گونڈوی نے اپنی خاموش تربیت کے ذریعہ انھیں صحیح راستہ پر لگا دیا اور ایک مرشد کامل کے آستانے پر پہونچا دیا جس سے ان کے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل گئی۔

سعادت حج

جگر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۴ء میں حج کی سعادت بھی عطا فرمائی اس سفر سے پہلے ہی انہوں نے اپنی سیرت اور صورت دونوں کو مومنانہ قالب میں ڈھال لیا تھا۔ اور اعمال حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کر لیا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کرنے کی تمنا جگر صاحب کو عرصہ سے تھی چنانچہ لکھنؤ کے ایک مقبول و معروف نعت گو شاعر زائر حرم جناب حمید صدیقیؒ (م ۱۹۶۵ء) جو جگر صاحب کے شاگرد بھی تھے انہوں نے ایک بار زائرین حرم کی آمد پر ایک نظم کہی جس میں موقع و محل کے اعتبار سے اور بہت سے دعائیہ

۱۔ جگر مرادآبادی۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد ضیاءالدین انصاری، ص ۱۲، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۸۱ء۔

۲۔ جگر کے خطوط، مرتبہ محمد اسلام، ص ۱۵۹، لکھنؤ ۱۹۶۵ء۔

اشعار کے ساتھ ایک شعر جگر صاحب کیلئے بھی منظوم ہو گیا ۔

حاضر در نبی پہ جگر بھی ہوں اے خدا
آنکھوں میں جوش اشک ندامت لئے ہوئے

ایک موقع پر ہمت کر کے یہ نظم حمید صاحب نے جگر صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کر دی۔ مذکورہ بالا شعر پر جب انکی نظر پہونچی تو ان پر اتنا اثر ہوا کہ زار و قطار رونے لگے اور پھر بولے دل دکھانے کی چیز نہیں ہے ورنہ دکھاتا کہ تمہاری اس مخلصانہ محبت اور دعا کا میرے اوپر کتنا اثر ہوا ہے۔ (۱)

راقم الحروف سے ایک بار حمید صدیقی مرحوم نے خود ذکر کیا تھا کہ ایک دفعہ جگر صاحب لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور یہ زمانہ ان کی بادہ نوشی کا زمانہ تھا۔ میں اپنی چند نعتیں لیکر بغرض اصلاح ان کی قیام گاہ پر پہونچ گیا، اس وقت جگر صاحب سرشار تھے انہوں نے میرا حسب معمول پرتپاک استقبال نہیں کیا اور کچھ اپنی حالت چھپانے میں لگ گئے، میں سمجھ گیا اور فوراً واپس چلا آیا۔ اگلے روز جگر صاحب نے مجھے خود بلوایا اور بڑی لجاجت سے کہا کہ "میاں آپ ایسی حالت میں جبکہ میں ہوش میں نہ رہوں میرے سامنے نہ آیا کریں، مجھے آپ کو دیکھ کر بہت غیرت آتی ہے اور اپنی حالت زار پر سخت افسوس ہوتا ہے اور پھر خود ہی فرمائش کر کے میری نعتوں پر اصلاح دی "معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں جگر صاحب کا حج مقبول ہو گیا اور اسکا قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار لکھنؤ کے مشہور کارخانہ "اصغر علی محمد علی تاجران عطر و تیل" کے مالک حاجی اصطفا خاں صاحب مرحوم کے بقول مدینہ منورہ کے ایک بزرگ مولوی عبدالوہاب انصاریؒ نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ جگر گنبد خضرا کے سامنے کھڑے ہیں اور خوب لہک لہک کر اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ خواب اصطفا خاں صاحب سے ذکر کیا تو خاں صاحب مرحوم نے پوچھا کہ آپ نے کبھی جگر کو دیکھا اور سنا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کبھی نہیں اس پر اصطفا خاں صاحب نے دریافت کیا کہ اچھا ذرا انکا حلیہ تو بیان کیجئے تو انہوں نے بتلایا۔ پستہ قد، سیاہ رو، بدہیئت، سر کے بال بکھرے ہوئے، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، مست اور لاابالی سے ـــــ یہ واقعہ حاجی اصطفا خاں صاحب نے جگر صاحب سے بیان کیا۔ جب جگر صاحب حج کو گئے تو فرمائش کر کے ان بزرگ سے جا کر ملے اور کچھ دیر بیٹھ کر ان کو اپنا کلام

۱۔ ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۱ء۔

بھی سنایا۔ اس کے بعد ان بزرگ نے فرمایا۔ واللہ (خواب میں) یہی شکل وصورت اور اسی حلیہ کا شخص اسی لہجہ میں اپنا کلام سنارہا تھا۔ (۱)

جگر صاحب انتہائی مذہبی اور شریف الطبع آدمی تھے۔ مے نوشی جو کہ ام الخبائث ہے اسکی وجہ سے بری صحبتوں میں پڑکر وہ کچھ دنوں کے لئے وذہب ومسلک کے لحاظ سے گمراہ ہوگئے تھے مگر اس گمراہی کا بھی انہیں کافی احساس تھا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے انہیں ہدایت کا راستہ دکھایا جس پر وہ آخر دم تک ثابت قدم رہے اور انکا انجام بخیر ہوا۔ اصل چیز یہی ہے کہ آخری زندگی کیسی گذری اور خاتمہ کس طرح ہوا۔ قاضی عبدالغنی صاحب منگلوریؒ سے بیعت پھر ترک مے نوشی اور پھر ۱۹۵۴ء میں حج کی سعادت ان سب باتوں سے انکی زندگی میں انقلاب آیا اور اعمال خیر کی توفیق ملی، اسطرح جگر صاحب دوبارہ اپنے آبائی مذہب پر آکر ایک سچے پکے مسلمان ہوگئے۔

مسلک کے لحاظ سے جگر صاحب نہایت پکے سنی عقیدہ کے حامل تھے اور اس عقیدہ کا اظہار وہ بے دھڑک کرتے تھے اور کسی کی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ان کو لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مشاعرہ میں مدعو کرنے گئے، وہ خود جگر صاحب سے اچھی طرح واقف تھے مگر جگر صاحب انکو نہیں جانتے تھے اسی لئے وہ اپنے ساتھ شوکت تھانوی کو لیتے گئے۔ شوکت تھانوی سے جگر صاحب کے اچھے تعلقات تھے، ان کے آنے کی خبر سنکر وہ فوراً باہر چلے آئے لیکن بیٹھتے ہی شیعہ سنی کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا، شوکت صاحب! یہ شیعہ کیا عدل عدل کیا کرتے ہیں۔ اس موقع پر شوکت صاحب کی عجیب حالت ہوئی وہ نہ تو جگر صاحب کی سے انکار کرسکتے تھے اور نہ ہی انکی ہاں میں ہاں ملا سکتے تھے، جگر صاحب اس بات سے واقف نہیں تھے کہ احتشام صاحب شیعہ ہیں، بہر حال کسی نہ کسی طرح شوکت تھانوی نے موضوع کو بدلا اور مشاعرہ میں شرکت کا وعدہ لیکر چلے گئے۔ (۲)

اسی طرح ایک واقعہ منشی درگا پرشاد صاحب شاد سلطانپوری نے بھی نقل کیا ہے، انہیں جگر صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک بار کسی شیعہ کا ذکر جگر صاحب کے سامنے ہوا تو شاد صاحب نے کہا کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں اس پر جگر صاحب نے جواب دیا کہ اگر وہ اچھے آدمی

۱۔ جگر مرادآبادی، مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، ص ۳۴۔۳۵ بحوالہ تذکرۂ جگر، مرتبہ محمود علیخاں جامعی، ص ۹۰، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء۔

۲۔ جگر فن اور شخصیت، مرتبہ شارب ردولوی، ص ۳۱، الہ آباد ۱۹۶۱ء۔

ہیں تو انہیں ضرور بہت اچھا کہنا چاہئے اسلئے کہ وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اچھے آدمی کہاں ہوتے ہیں(۱)

جگر صاحب کے بارے میں خود ان کے ایک سابق ہم وطن اور اہل علم بزرگ مولوی سید علی مظہر نقوی امروہوی تو کراچوی تحریر کرتے ہیں جگر صاحب کا بیان ہے کہ :

"میں اپنی شیعیت کے دور میں خلفاء ثلاثہؓ کے اسمائے مبارک لکھ کر اپنے جوتوں میں رکھتا تھا مگر آج تک اپنی اس ملعون اور ضامن جہنم حرکت پر دل کی بے قراریوں کے ساتھ بے حساب آنسو بہا چکا ہوں بدرگاہ الٰہی سیکڑوں سجدے بجا لا چکا ہوں مگر اپنے زمانہ جاہلیت کی غضب الٰہی کو دعوت دینے والی اس حرکت نے میرے دل کے سکون کو اڑا رکھا ہے۔ کاش اللہ مجھے معاف کردے اور میرے قلب کو سکون دیدے۔(۲)

جگر صاحب کی مثالی فراست ایمانی اور خودداری کی ایک ادنی مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک مشاعرہ میں شرکت کا وعدہ کرلیا، وہاں پہونچے تو کیا دیکھا کہ جو صاحب بھی تشریف لائے ہیں انکی غزل پانچ یا بارہ اشعار پر ہی مشتمل ہوتی ہے کم و بیش کا سوال ہی نہیں، وہ اس منصوبے کو فوراً تاڑ گئے مگر آخر تک اپنے وعدہ اور محفل کے لوازمات و تقاضوں کو باوجود گھنٹوں کی کبیدگی و دل برداشتگی کے اور وہ بھی حساس ترین اور خوددار ترین جان مشاعرہ بلکہ ملک الشعراء ہونے کی حیثیت سے پوری خوبصورتی سے نبھاتے رہے مگر اپنا جب نمبر آیا تو پھر کیسا بھرپور انتقام لیا کے ایک ایک منصوبہ بند نے اپنا سر ہی پکڑ لیا یعنی وہ صرف چار شعر سنا کر اسٹیج سے باوجود ہزار چیخ و پکار اور منت و سماجت کے یہ کہتے ہوئے نیچے اتر آئے کہ پانچ اور بارہ کا جواب یہی چار ہیں۔(۳)

جگر صاحب اور علماء دیوبند

جگر صاحب کو علماء و مشائخ دیوبند سے بڑی عقیدت اور محبت تھی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو باضابطہ نہ سہی مگر بدل اپنا مصلح سمجھتے تھے۔ سہارنپور یا اسکے اطراف میں کہیں آنا ہوتا تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں

۱۔ جگر فن اور شخصیت، مرتبہ شارب ردولوی، ص ۴۲

۲۔ ملخص از تحریر مولوی علی مظہر نقوی جنہوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کے ایک مضمون "افسانہ تحریف قرآن" کو کراچی سے شائع کیا تھا اور اس مضمون کے آخر میں صفحہ ۷۳ سے ۷۵ پر اپنی یہ تحریر شائع کی تھی۔

۳۔ ملخص از تحریر مولوی مظہر علی نقوی

دیوبند ضرور آتے اور حضرت بھی انکی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ فرماتے تھے اور اکثر ان سے کچھ سنانے کی فرمائش بھی کرتے تھے جسے جگر صاحب بخوشی پورا کرتے تھے۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ جیسی ایمان افروز اور علم بخش کتاب کو وہ اپنے زیر مطالعہ رکھتے تھے اور اسی کو اپنا حاصل حیات باور کرتے تھے۔ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کے خصوصی کفش برداروں میں سے تھے اور بڑی ہی نیاز مندانہ حیثیت سے انکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ امام اہل سنت علیہ الرحمہ بھی ان سے خصوصی شفقت اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ یہاں تک آپکی قدر کرتے تھے کہ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ میں دو روزہ آل انڈیا مدح صحابہ مشاعرہ کی صدارت سے بھی انہیں نوازا تھا جہاں انہوں نے اپنی وہ مشہور نعت بھی اپنے ترنم سے پڑھی تھی جس کے ایک ایک لفظ سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ سے عشق و محبت کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ اس چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک رند اور مدحت سلطان مدینہ
ہاں کوئی نظر رحمت سلطان مدینہ
اے خاک مدینہ تری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے تو جنت سلطان مدینہ
اسطرح کہ ہر سانس ہو مصروف عبادت
دیکھوں میں در دولت سلطان مدینہ
اس امت عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرت سلطان مدینہ
کچھ اور نہیں کام جگر مجھکو کسی سے
کافی ہے بس اک نسبت سلطان مدینہ (1)

اسی موقع پر انہوں نے منقبت کی جو نظم سنائی تھی اسکے چند بند یہ ہیں :

ہر زمانے میں پیمبر بھی نبی بھی آئے
مصلح ملی و ملکی بھی ریشی بھی آئے

ل۔ گلدستہ نعت و منقبت مرتبہ ساجد صدیقی لکھنوی، ص ۷۔۸، لکھنؤ ۱۹۹۰ء

حق کے جو ئندہ بھی اور حق کے ولی بھی آئے
واقف محرم اسرار خفی بھی آئے
آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بنکر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بنکر
کس نے جام مئے توحید پلایا سبکو
کس نے پیغام مساوات سنایا سبکو
راستہ کس نے حقیقت کا دکھایا سبکو
کس نے اس حسن کا دیوانہ بنایا سب کو
تم نے دیکھا ہے بہت دفتر پیغام اسکا
اور ایسا کوئی گذرا ہو تو لو نام اسکا
کوئی صدیقؓ سا گذرا ہو تو للہ دکھاؤ
تم نے فاروقؓ سا دیکھا ہو تو للہ دکھاؤ
کوئی عثمانؓ سا آیا ہو تو للہ دکھاؤ
کوئی حیدرؓ کا سا پایا ہو تو للہ دکھاؤ
ثانی احمد بے میم تو کیا لاؤ گے
اسکی امت کی مثالیں بھی نہیں پاؤ گے (۱)

جگر کی مذہبیت مشاہیر کی نظر میں :۔ جگر صاحب کے معاصرین نے ان کے بارے میں جب بھی اور جو کچھ بھی لکھا ہے اسمیں ان کی دینداری اور مذہبی حمیت کا ضرور ذکر کیا ہے چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جن کے جگر صاحب کے گہرے مراسم تھے اور جب وہ علیگڈھ جاتے تھے تو اکثر و بیشتر رشید صاحب ہی کے حیات ہی میں ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا :

جگر بڑے مذہبی آدمی ہیں ـــــ وہ ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ، رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں (۲)

ا۔ ہفت روزہ حرم لکھنؤ، سیرت نمبر، مرتبہ مولانا عبدالمومن صاحب فاروقی، ص ۱۳
۲۔ جگر صاحب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، نقوش، لاہور جنوری ۱۹۵۵ء۔ شخصیات نمبر، ص ۳۱۸، ۳۱۹، ۱۹۶۳ء۔

عربی ۔ سید ناجی
ترجمہ ۔ وارث مظہری

اسلامی معاشرے میں قاضی کی اہمیت

ماضی میں مجلس قضا کو انتہائی معزز اور عظیم الشان مقام حاصل تھا، لوگوں کے دلوں میں اس کا دبدبہ و شکوہ حد سے سوا تھا، قاضی وقت کی وہ حیثیت ہوتی تھی کہ امرا اور بادشاہ وقت بھی اس کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرتے نظر آتے تھے، یہ وہ مجلس تھی کہ جس میں شاہی فقیری کی بنیاد پر کسی طرح کی کوئی تمیز نہیں برتی جاتی تھی، بلکہ عدالتی نقطہ نظر سے قاضی کی نظر میں دونوں کی پوزیشن یکساں تھی، لیکن اس رعب و دبدبے اور شوکت و جلال کے باوجود وہ اللہ کا ایک مخلص اور خاکسار بندہ ہوتا تھا، جس کے شب و روز کا اکثر حصہ طاعت و عبادت میں بسر ہوتا تھا، پیش آمدہ مسائل و معاملات میں اپنے قلب و نظر کے تمام تر دروازے کھلا رکھتا تھا، تاکہ حق و انصاف کی اس عدالت میں ظالم و مظلوم کے درمیان امتیاز قائم ہوسکے اور مظلوم کو اس کا حق اور ظالم کو اسلام کی مقرر کردہ سزا مل سکے، قاضی کی زندگی اسلامی علوم، حلم و شجاعت اور ایثار و قربانی کا ایک نمونہ ہوتی تھی وہ اسلام کی ایک متحرک تصویر ہوتا تھا، اس کی شخصیت کی جڑیں اسلامی معاشرہ میں اتنی وسعت اور گہرائی لئے ہوتی تھیں کہ جس کا آج اندازہ لگانا از بس مشکل ہے، انسان جس قدر غور و تحقیق سے کام لیتا ہے اسلامی نظام عدالت کی خوبیاں اسے اتنی ہی نمایاں واضح اور روشن تر نظر آتی ہیں۔ بہر حال علمی دینی نقطہ نظر سے قاضی کی حیثیت کا یہ پہلو اس کے لئے سب سے اہم اور قابل فخر بات تھا کہ وہ اپنا فیصلہ کسی ایسی ویسی ذات کے نام پر نہیں بلکہ اس منصف حقیقی کے نام پر جاری کرتا ہے جس کا فیصلہ وقتی مصلحتوں اور مکانی بندشوں میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا۔

منصب قضا کی ذمہ داریاں اپنے اندر ایسی نزاکتیں رکھتی ہیں جو اسے شیشہ گری کے مماثل کردیتی ہیں۔ کہ ذرا سی غفلت و کوتاہی سے ایک آن میں حق و انصاف کا شیشہ چکنا چور

ہو جائے۔ اسی بناء پر قاضی کو وہ تمام سہولیات میسر تھیں جو اسے فیصلے کے اجراء میں مکمل اختیار اور حریت رائے کے لئے مناسب ماحول فراہم کر سکیں اور وہ اپنے ضمیر کو ہر قسم کے بے جا تحفظات سے آزاد رکھ سکے۔

حکومتیں بدلتی رہیں حالات انقلابات سے دوچار ہوتے رہے لیکن کئی صدیوں تک منصب قضا کے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آیا، قاضی کی نیک نفسی و پاکیزہ قلبی لوگوں کو کسی قسم کے قیل و قال اور شبہات سے روکتی تھی، تاریخ ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کسی قاضی نے جان بوجھ کر کوئی کوتاہی کی ہو، یا اگر نادانستہ کوئی لغزش ہوگئی ہو تو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ چونکہ شعبہ عدلیہ میں قاضی مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور تنہا ہی مقدمات سے متعلق سارے امور انجام دیتا ہے۔ چنانچہ وہ مقدمات کی سماعت کرتا ہے مناقشے اور جرح کرتا ہے۔ معاشرے کے احوال و کوائف پر نظر رکھتا ہے اور غیر اسلامی سرگرمیوں کے استیصال کی کوشش کرتا ہے۔ اس بناء پر اس کے لئے جمعیت خاطر از حد ضروری ہے۔ اور فکری پراگندگی و ذہنی انتشار سے کنارہ کشی اس منصب کا اولین تقاضا ہے، چنانچہ اسلام نے اس کا اس حد تک خیال رکھا ہے کہ قاضی کو غصے بھوک یا پیاس کے عالم میں فیصلے صادر کرنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، **لایقضی حاکم بین اثنین وھو غضبان (متفق علیہ)** (غصے کے عالم میں قاضی کو فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہئے۔) **لا یقضی القاضی والاً وھو ریان شبعان (اخرجہ البیھقی)** اچھی طرح سے کھانا لینے کے بعد ہی قاضی کو فیصلے صادر کرنے چاہئیں۔ چونکہ معاش کا مسئلہ انسان کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ جو دائمی فکر و تردد کا باعث ہوتا ہے اور ایک آدمی کو جب تک اس جانب سے فکری آزادی اور فارغ البالی حاصل نہ ہو وہ کوئی کام یک سوئی اور جی لگا کر نہیں کر سکتا اس لئے فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ قاضی کو بہر صورت فارغ البالی اور فراخ دستی حاصل ہونی چاہئے اور اسے ان تمام عوامل سے رکھنا چاہئے جو اس کے جسمانی و روحانی امن و سکون میں خلل انداز ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ اور علیؓ کے مکتوبات میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اس کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں، حضرت عمرؓ نے معاذؓ ابن جبل اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کو شام کی ولایت پر روانہ کرتے ہوئے اپنے فرمان میں لکھا تھا "اپنے میں سے صالح ترین لوگوں کا انتخاب کر کے ان کو قضا پر مامور کرو۔ اور انہیں معاشی کشادگی بہم پہونچاؤ اور اللہ کے مال سے انہیں اتنا ضرور

دو جوان کی بہر طور کفایت کر سکے۔ حضرت علیؓ نے مالک بن حارث بن اشتر نخعی ولی مصر کو لکھا "قضا کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرو۔ جو کس نوع کی پریشانی کا شکار نہ ہو، بدخو اور جھگڑالو نہ ہو معاصی سے اجتناب کرتا ہو، غلطی پر مطلع ہو جانے کے بعد حق کی طرف رجوع کرنے میں مطلق تامل نہ کرتا ہو، نیز حرص و آز سے پاک ہو" آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "امور عدالت پر پوری توجہ صرف کرو۔ قاضی کے انتظام معاش میں جہاں تک ہو سکے وسعت و کشادگی سے کام لو۔ تاکہ روزی کی فکر اسے دامن گیر نہ ہو اور لوگوں کے روبرو اسے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اپنے پاس اسے ممتاز اور خصوصی مقام دینے کی کوشش کرو تاکہ تمہارے حضور میں لوگ اس کا استحصال نہ کر سکیں"۔

قاضی ماضی میں

قاضی بجاطور پر احساس برتری بھی رکھتا تھا اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ولله العزة ولرسوله وَللمُؤمنين (سورہ المنافقون ۸)۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔ حجاج بن ارطاۃ ایک مسجد میں داخل ہوئے جہاں لوگ حلقہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے، وہ ایک کنارے بیٹھ گئے کسی نے کہا آگے تشریف لائیے اللہ نے قاضی کو فوقیت بخشی ہے۔ انہوں نے جواب دیا "میں مجلس میں جہاں بھی رہوں فائق ہی رہوں گا۔" خالد بن عبد اللہ فرماتے ہیں "ہم مسجد میں بیٹھے تھے اتنے میں حجاج بن ارطاۃ تشریف لائے لوگوں نے کہا آپ ہمارے آگے تشریف لے آئیں" انہوں نے جواب دیا "میں جہاں بھی بیٹھ رہوں میری حقیقت صدر مجلس کی ہوگی" اسلامی معاشرے میں قاضی کا مقام و مرتبہ بہت رفیع و بلند سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تین طرح کے لوگوں کی خصوصی تعظیم و قدر افزائی کرنی چاہئے، (۱) علماء (۲) اہالیان عدالت (۳) اور بھائی علماء کی اہانت سے دین اور اہالیان عدالت کی اہانت سے دنیا برباد ہو جاتی ہے، اور بھائی کی اہانت اس کی مروت کو ختم کر دیتی ہے۔

فقہی یا سیاسی اختلاف خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ اور کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو۔ قاضی کی رائے اس میں آخری اور قطعی ہوتی تھی۔ اہل سمرقند نے اپنے عامل سلیمان بن ابو السری سے شکایت کی کہ قتیبہ نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے ہم پر ظلم کیا ہے اور ہماری زمین ہم سے چھین لی ہے۔ اس لئے ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم میں سے ایک وفد امیر المومنین کی خدمت میں

جائے اور اس صورت حال سے انہیں آگاہ کرے، کیوں کہ اگر ہم حق پر ہیں تو بہر حال ہمیں حق ملنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی اجازت دے دی، اور جب وفد نے امیر المؤمنین عمرؓ بن عبدالعزیز کو اپنی فریاد سنائی تو انہوں نے سلیمان بن ابوالسری کو لکھا "اہل سمرقند نے شکایت کی ہے کہ قتیبہ نے ان پر ظلم کیا ہے اور انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا ہے۔ تمہیں جب میرا یہ خط ملے تو قاضی کو اس پر مامور کرو کہ وہ ان کے احوال سنے اور ان کے معاملے میں غور کرے۔ پھر اگر وہ ان کے معاملہ میں فیصلہ دیں تو انہیں ان کے ٹھکانوں پر بھیج دو" چنانچہ ایسا ہی ہوا، سلیمان نے قاضی جمیع بن حاضر کو اس پر متعین کیا۔ انہوں نے فیصلہ سنایا کہ اہل سمرقند اپنے سابق ٹھکانوں پر واپس جائیں اور اہل سندھ سے اعلان جنگ کریں پھر یا تو دوبارہ صلح ہو جائے یا وہ ان پر غالب آجائیں، لیکن اہل سندھ نے اہل سمرقند کو ان کی زمین واپس کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اور یوں معرکہ آرائی کی نوبت نہ آسکی۔

یہ وہ عدل وانصاف پروری تھی جس کے سامنے آج کی عقلیں حیران سرافگندہ ہیں اور تاریخ جس کی نظیر پیش کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔

مجلس قضاء مجلس قضا انتہائی باوقار اور محترم مجلس ہوا کرتی تھی، جس میں اسلامی آداب کا پورا خیال رکھا جاتا تھا، یہ اسلامی تہذیب ومعاشرت کی خاموش تبلیغ کا ایک اہم ذریعہ تھی، عوام کے پردۂ ذہن پر اس کے اثرات ونقوش بڑے پختہ اور دیرپا ہوتے تھے وہاں شور وشغب اور آواز بلند کرنا ممنوع تھا، ایک فریق کے لیے دوسرے فریق کی رعایت اور اس کی عزت وشرافت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا تھا، اگر کسی شخص کے بارے میں اس کے خلاف کا جرم ثابت ہو جاتا تھا، تو قاضی اس کے مناسب زجر توبیخ کرتا تھا۔ ابن حربویہ قاضی تھے اور مرکب شاہی میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ نہ ہی امراء کی مجالس میں شریک ہوتے تھے اور نہ ہی ان کی آمد پر ان کی تعظیم میں کھڑے ہوتے تھے۔ نیز انہیں بھاری بھرکم آداب والقاب کے بجائے صرف نام سے یاد کرتے تھے۔ علامہ سیوطی نے "حسن المحاضرہ" میں ان سے متعلق ایک واقعہ قلمبند کیا ہے ایک شخص ان کی مجلس میں زور سے ہنس پڑا، یہ بات ان کو ناگوار گذری انہوں نے ٹوکا، تم مجلس قضا میں بھلا کیوں کر ہنسنے کی جرأت کرتے ہو، جب کہ تمہارا قاضی اس دوران جنت وجہنم کے درمیان ہوتا ہے۔ اس جملے کا اس شخص پر اتنا اثر ہوا کہ جیسے خوف سے اس کا خون منجمد سا ہو گیا، اور اس پر بے ہوشی کی کیفیت

طاری ہو گئی، اور وہ صاحب فراش ہو گیا، جب لوگ اس کی عیادت کے لئے جاتے اور اس کی مزاج پرسی کرتے تھے۔ تو وہ کہتا تھا، قاضی کی ڈانٹ نے میری آنکھوں کی نیند اڑادی اور کہیں میں اس کے زیر اثر مر نہ جاؤں۔

ایک مرتبہ شعبی نے ایک فیصلہ سنایا لیکن دوسرے فریق کو وہ فیصلہ پسند نہ آیا، اور اس نے اس فیصلہ کو اپنے اوپر ظلم تصور کیا، اس ضمن میں اس نے کچھ اشعار بھی کہے جس میں اس فیصلے کی مذمت کی۔ جب اس کا علم شعبیؒ کو ہوا تو انھوں نے اس شخص کی سخت باز پرس کی اور تعزیر سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تاکہ وہ آیندہ عدالت کا احترام کرے اور اس قسم کی مفسدانہ حرکتوں سے باز رہے جب عبدالملک بن مروان تک یہ بات پہونچی اور اس نے مذکورہ شخص سے متعلق سوال کیا تو آپ نے بے خوف ہو کر جواب دیا، میں نے اس کو اس کے کئے کی سزادی ہے جناب! کیوں کہ اس نے میری توہین کی، اور مجھ پر افترا باندھا جو کسی طور پر معقول و مناسب نہیں تھا، مروان نے اس کی تائید کی اور کہا کہ، آپ نے صحیح کیا۔

قاضی ابو حازم مقدمات کی سماعت کے لئے تشریف فرماتھے۔ چنانچہ دو فریقوں میں سے ایک اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے دوسرے فریق سے الجھ پڑا، اور ناشائستہ حرکات شروع کر دیں، یہ بات مجلس قضاء کے عین منافی تھی، چنانچہ قاضی ابو حازم نے تادیبی کاروائی کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں اس کا اسی وقت انتقال ہو گیا۔ ابو حازم نے مجلس قضاء سے ہی شاہ وقت (معتضد باللہ) کو خط روانہ کیا، جس میں مرقوم تھا "امیر المؤمنین کو معلوم ہونا چاہئے کہ دو فریق میرے سامنے پیش ہوئے اور ایک نے دوسرے سے ہاتھاپائی شروع کردی جو سراسر مجلس قضاء کے منافی اور اس کے اصول و آداب کے برعکس تھا، اس لئے میں نے تادیبی کاروائی کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ تو اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تادیبی کاروائی مصلحت مومنین کی خاطر کی گئی اور یہی قانون اسلامی کا مقتضٰی تھا، تو دیت تمام مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال سے ادا کی جانی چاہئے۔ تو کیا ہی اچھا ہو کہ جناب خوں بہا دیئے جانے کا حکم صادر فرمائیں۔ اور میں اسے متوفی کے ورثاء کے حوالہ کردوں" چنانچہ بادشاہ نے دس ہزار درہم دیئے جانے کا حکم کیا۔ جسے قاضی ابو حازم نے متوفی کے ورثاء کو سونپ دیا۔ قاضی سمنون مالکی سے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ اگر کوئی فریق دوسرے فریق یا گواہوں کو نامناسب اور بے ہودہ کلمات سے زک پہونچاتا اور بدتہذیبی سے پیش آتا تھا تو وہ اس کی پٹائی شروع

کردیتے تھے، نیز وہ طلاق وعتاق اور اس جیسی غیر مشروع قسموں پر بھی تادیب کیا کرتے تھے۔

ابراہیم بن مہدی اور طبیب بختیشوع کے درمیان ایک زمین کے سلسلے میں تنازع ہوگیا، ابراہیم بن مہدی نے کچھ ایسا سخت ودرشت لہجہ استعمال کیا جو قاضی کو کسی طور پسند نہیں آیا، چنانچہ انہوں نے زجر وتوبیخ کے لہجے میں فرمایا۔

"اے ابراہیم:۔ اگر تم مجلس قضا (عدالت) میں ہو اور کسی کا کوئی معاملہ تمہارے ساتھ درپیش ہو تو تم اس پر اپنی آواز بلند مت کرو، اس کو ہاتھ مت دکھاؤ تمہاری نیت مستقیم اور تمہارا طرز عمل بہتر ہونا چاہئے نیز تمہیں غصے سے دور جنگ وجدل سے باز رہنا چاہئے، اور عدالت کی توقیر وتعظیم کو اپنا فریضہ تصور کرنا چاہئے مزید برآں قاضی کو مناسب موقع وماحول فراہم کرنا چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھا سکے، یہی بات تمہارے لیے بہتر اور تمہاری شان کے موافق ہے، جلد بازی سے کام نہ لو، اس لئے کہ بسا اوقات جلد بازی تاخیر کا باعث ہوتی ہے، خدا تمہاری لغزشوں اور بدزبانیوں کو درگذر فرمائے، اور تمہیں بھی اپنی نعمتوں سے نوازے جو نعمتیں اس سے قبل تمہارے والدین کو مل چکی ہیں، یہ نصیحت ابراہیم پر اس قدر اثر انداز ہوئی کہ وہ بختیشوع کے لئے اپنے حق سے دست بردار ہوگیا۔

قاضی: طبقاتی مساوات کا علمبردار

قاضی ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے اور حق گوئی وبے باکی اور جرأت آزمائی آپ کا خصوصی وصف تھا، غربت وامارت اور سماجی اونچ نیچ ان کے فیصلے پر مطلق اثر نہیں ڈال سکتی تھی، امراء وقت کو بھی اس کا احساس تھا اور وہ آپ کے مداح تھے، آپ کی حق گوئی اور صاحب حق کو حق دلانے کی بھرپور کوشش کے ایک سے زائد واقعات تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں، اور آپ کی دیانت داری اور گہری سوجھ بوجھ کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔

(ایک باغ کے بارے میں)۔

قاضی ابو یوسف کی مجلس میں ھادی بن الرشید اور ایک دوسرے شخص کا مقدمہ پیش ہوا۔ ھادی بن الرشید کا دعوی تھا کہ یہ باغ میرا ہے جب کہ دوسرا شخص مدعی تھا کہ اصلاً یہ باغ میرا ہے اور ہادی نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ قاضی ابو یوسف بھانپ گئے کہ اس باغ کا اصل مالک یہ دوسرا اعای شخص ہے، لیکن چونکہ ھادی بن الرشید کے حق میں گواہی دینے والے بہتیرے افراد تھے۔ اس لئے گواہوں کی صداقت کا پتہ چلانے کے لئے انہوں نے ایک

ترتیب آزمائی انھوں نے ھادی سے کہا کہ دوسرا فریق چاہتا ہے کہ آپ حلف لیں کہ آپ کے تمام گواہ سچے ہیں، اس پر ہادی نے اعراض کیا، نیز اپنی توہین کے خیال سے قسم کھانے سے انکار کردیا، اور صاحب باغ کو اس کا باغ واپس کردیا۔

ایک مرتبہ قاضی ابویوسف نے رشید کو حلف دے دیا جب کہ وہ امیر المومنین تھے، اور فضل بن ربیع نے خلیفہ کی طرف سے گواہی دی تو آپ نے اسے رد کردیا، خلیفہ کو یہ بات ناگوار گذری۔ ابویوسف نے فرمایا، کہ میں نے خود سنا ہے کہ فضل بن ربیع کہہ رہا تھا کہ وہ آپ کا غلام ہے تو اگر یہ سچ ہے تو غلام کی گواہی معتبر نہیں اور اگر جھوٹ ہے تو اس کا جھوٹا ہونا۔ خود اس کی گواہی کو باطل کردیتا ہے۔

امام محمد بن الحسن شیبانی کو رشید نے عہدہ قضا پر مامور کیا تھا۔ ایک مجلس میں وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، تبھی خلیفہ بھی وہاں آپہونچا اسے دیکھ کر وہاں موجود تمام لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہوگئے لیکن امام محمد اپنی جگہ سے نہ اٹھے، یہ بات خلیفہ کو ناگوار گزری، اس نے آپ کو بلایا لوگ خوف زدہ تھے کہ پتہ نہیں امام محمد کے ساتھ کیا سلوک کرے، جب آپ خلیفہ کے حضور پہونچے تو اس نے آپ سے نہ اٹھنے کا سبب دریافت کیا، آپ نے جواب دیا، مجھے یہ بات نہایت ناگوار گزری کہ میں علم و شریعت کو پس پشت ڈال کے جس کی بنا پر آپ نے مجھے یہ منصب سونپا ہے۔ وہ کروں جو اس کے تقاضے سے باہر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، من أحب أن يتمثل له الناس قياماً فليتبوأ مقعده من النار (جو شخص یہ پسند کرے کہ لوگ اس کی تعظیم و تکریم میں کھڑے ہو جائیں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے) تو تعظیم و احترام میں کھڑا ہو جانا دشمنوں کی مرعوبیت کا ذریعہ ہو تو ہو، تاہم سنت کی اتباع بہر حال اسی میں ہے کھڑا نہ ہوا جائے اور یہ سنت آپ کے ہی خاندان سے ہم تک پہونچی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہی آپ کا دین ہے یہ سن کر خلیفہ نے کہا، کہ آپ نے بالکل سچ فرمایا۔

شرف الدین ابن عین الدولہ مصر کے قاضی تھے ایک دفعہ آپ نے الملک الکامل کی شہادت رد کردی، بادشاہ بولا کہ جب سلطان حاکم وقت ہو سکتا ہے تو بھلا گواہ کیوں نہیں بن سکتا، لیکن شرف الدین (معروف با بن عین الدولہ) اپنے موقف پر مصر رہے۔ یہاں تک کہ خلیفہ نے صراحتاً دریافت کیا کہ آپ میری گواہی قبول فرمائیں گے یا نہیں، ابن عین الدولہ

نے پوری جرأت و بے خوفی سے ساتھ جواب دیا "ہرگز نہیں"۔ ایک مرتبہ دقیق العید خلیفہ کے پاس تشریف لائے خلیفہ آگے بڑھ کر آپ کی دست بوسی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

ان الأكابر يحكمون على الورى
وعلى الاكابر يحكم العلماء

(باشاہ رعایا پر حکومت کرتے ہیں جب کہ علماء بادشاہوں پر حکمراں ہیں) بسا اوقات خلیفہ کو بذات خود قاضی کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، تمام تر شاہانہ کروفر اور جاہ و حشمت سے دور اس وقت اس کی حیثیت محض مقدمے کے ایک فریق کی ہوتی تھی، اس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، بڑے بڑے امرائے وقت اور رؤسائے شہر اور خاندان شاہی سے تعلق رکھنے والے جو روز مرہ کی زندگی میں اگر کسی مجلس میں پہنچ جاتے تھے تو لوگوں کا ناطقہ بند ہو جاتا تھا، گھر سے نکلتے تھے تو راہیں خالی ہو جاتی تھیں، جن کی ہیبت و شکوہ سے دنیا لرزہ براندام رہتی تھی، وہ بھی اس مجلس میں آکر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے، ان کی نظریں بھی یہاں آکر جھک جاتی تھیں، ان کو بھی یہ بخوبی احساس رہتا تھا کہ قاضی کی عظمت و شوکت کے آگے ان کا رعب و دبدبہ محض کھوکھلا اور ان کے اقتدار شاہی کا رہین منت ہے۔ قاضی کی مجلس سے نکلنے کے بعد بھی ان کا دل قاضی کے تئیں کسی قسم کی بدگمانی، یا بغض و عداوت سے بالکل پاک و منزہ ہوتا تھا، وہ بہر صورت قاضی کے معتقد اور اس کی عقیدت و احترام کے پابند ہوتے تھے۔

بہر حال اسلامی حکومتوں میں قاضی کی ذات اس چشمہ فیاض کی سی تھی جس سے تشنہ لبوں کو سیرابی حاصل ہوتی تھی، اور جس کی جدولیں اسلام کی کھیتیوں سے گزرتی تھیں، اور اسے سرسبزی و شادابی بخشتی تھیں، یہ وہ "دوحة" (تناور درخت) تھا جس کے نیچے آکر ہر کوئی شدت تپش کو بھول کر سکون و طمانینت کا احساس کرتا تھا۔

بشکریہ "الفیصل" (اگست ۸۸ء)
ریاض، سعودی عرب

رویت ہلال کیلئے گواہی لینے کا طریقہ

از ضمیرالدین قاسمی برنلے
چیئر مین مون ریسرچ سینٹر یو۔ کے۔

رویت ہلال کا مسئلہ اس وقت عالمی طور پر پیچیدہ ہو گیا ہے۔ مصر اور اس کے ہمنوا ملکوں نے رویت سے ایک دن مقدم کیلنڈر بنالیا ہے، وہ حضرات اسی پر اصرار کرتے ہیں اور اسی پر رمضان و عید کا اعلان کرتے رہتے ہیں، وہ حضرات صاف کہتے ہیں کہ چاند کا آنکھوں سے دیکھنا ضروری نہیں ہے حساب کے ذریعہ علم ہو جائے کہ چاند پیدا ہو گیا ہے (یعنی نیو مون New Moon ہو گیا ہے) بس رمضان و عید کرنے کے لئے اتنا کافی ہے۔ واضح رہے کہ نیو مون اجتماع شمس و قمر کا وقت ہے اس کے تقریباً ۲۰، ۲۲ گھنٹے بعد چاند ہلال بنتا ہے اور نظر آنے کے قابل ہوتا ہے۔

سعودی عرب نے اگلے ۴۳ سال کیلنڈر (۱) رویت سے ڈیڑھ دن مقدم وقت پر بنادیا ہے، اس کیلنڈر کے پہلے صفحے پر لکھا ہوا ہے کہ کیلنڈر کو رویت سے ڈیڑھ دن مقدم پر بنارہا ہوں (گیرین وچ نیو مون پر مرتب کررہا ہوں) اس وقت پر دنیا میں کہیں بھی چاند تو کیا نظر آئے گا ابھی چاند پیدا ابھی نہیں ہوا ہوتا ہے۔ سعودی عرب کے ذمہ دار دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم گواہی لیتے ہیں لیکن چاند ابھی پیدا ابھی نہیں ہوا ہے تو کیسی گواہی لیتے ہیں۔؟

گواہی کی بنیاد پر اس کیلنڈر سے بھی مقدم کرتے ہیں تو رویت سے ڈھائی دن مقدم ہو جاتا ہے اور یورپی ممالک میں تین تین عیدوں کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور اگر مؤخر کرتے ہیں تو صرف ایک دن مؤخر کرتے ہیں پھر بھی رویت میں آدھا دن باقی رہتا ہے، اور کیلنڈر پر عمل کرتے ہیں تو رویت حقیقی سے ڈیڑھ دن کا فاصلہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، سعودی عرب سے ہمیشہ ایک دن بعد یا دو دن بعد چاند دیکھ پاتے ہیں۔ اگر وہ صحیح

۱۔ (نوٹ) یہ کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں میرے پاس سعودیہ کیلنڈر، مصر کیلنڈر اور دیگر دلائل موجود ہیں۔

رویت کریں تو دس مہینوں میں انڈیا، پاکستان کے ساتھ ساتھ ہی رویت کریں گے، صرف دو ماہ میں ایک دن مقدم کریں گے، دو دن پہلے تو کسی حال میں رویت نہیں کر پائیں گے۔ ہمیشہ دو دن اور ایک دن مقدم کرنا رویت نہیں ہے بلکہ اسی ڈیڑھ دن مقدم کیلنڈر کا کرشمہ ہے۔

مقدم کیلنڈر کیوں بنا؟

تقریباً سارے عرب ملکوں میں ایک دن اور ڈیڑھ دن مقدم کیلنڈر بنے اور بن رہے ہیں انکی وجوہات یہ ہیں۔

اہل فتویٰ کی بے احتیاطی انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ساؤتھ افریقہ میں حنفی مذہب کے ماننے والے حضرات موجود ہیں اس لئے وہ اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے مطلع صاف ہو تو رویت عامہ کو شرط قرار دیتے ہیں، مطلع صاف ہونے پر رویت عامہ نہ ہو تو وہ گواہوں پر ہرگز فیصلہ نہیں کرتے وہ تیس پورا کرتے ہیں، اس لئے گواہوں کو جھوٹی گواہی یا وہمی گواہی دینے کا موقع نہیں ملتا، رویت عامہ کی شرط کی وجہ سے بالکل صحیح رویت پر ہی رمضان و عیدین منعقد ہوتے ہیں۔

مطلع ابر آلود ہو تو گواہی کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن گواہوں کی چھان بین بے پناہ کرتے ہیں، گواہ قرائن کے خلاف گواہی دیں تو ہرگز انکی گواہی قبول نہیں کرتے۔ مثلاً۔

(الف) اگر صبح آخری چاند نظر آیا ہے تو لازمی طور پر درمیان میں دو راتیں محاق کی ہونگی، اس لئے اگر صبح چاند دیکھا گیا ہے اور دو راتیں محاق کی گذرنے سے پہلے رویت کی گواہی آتی ہے تو اس کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ۲۷ کی صبح کو بھی آخری چاند دیکھنے کا اہتمام فرماتے ہیں تاکہ اگلا ماہ صحیح تاریخ پر شروع کرنے کا اہتمام ہو، بدقسمتی سے عرب ملکوں میں ان تاریخوں میں چاند دیکھنے کا کوئی اہتمام نہیں ہے جس کی وجہ سے وہاں کی تاریخیں مقدم ہو گئیں۔

(ب) پچھلا مہینہ ۲۹ کا ہوا ہے تو لازمی طور پر یہ ماہ تیس کا ہو گا اس لئے اس ماہ میں ۲۹ پر گواہی آتی ہے تو اس کو جلدی قبول نہیں کرتے۔

(ج) مغرب سے عشاء تک گہرا بادل رہا ہے اور گواہ رویت کی گواہی دے تو قبول نہیں کرتے کیونکہ مغرب کے وقت کٹا پھٹا بادل ہو تو کسی کو چاند نظر آسکتا ہے لیکن گہرا بادل ہے تو کسی کو چاند کیسے نظر آیا۔

(د) آج کل فون اور ٹیلی ویژن کا زمانہ ہے اس لئے معلوم کر لیتے ہیں اور جگہ بھی رویت عام ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر اور جگہ اور خاص طور پر اس سے مغربی ممالک میں رویت عامہ نہیں ہوئی ہے اور صرف یہی ایک دو گواہ گواہی دے رہے ہیں تو ان کی گواہی قبول نہیں کرتے کیونکہ اتنے بڑے ملک میں چاند اور جگہ بھی کسی کو نظر آنا چاہئے۔ اگر کسی اور کو نظر نہیں آیا تو اس کا مطلب ہے کہ ان گواہوں کو وہم ہوا ہے۔ یا جھوٹ بول رہے ہیں۔

(ر) گواہ کو دوبارہ چاند نظر آیا یا نہیں کیونکہ جس کی نگاہ ایک بار چاند پر جم جاتی ہے دوبارہ دیکھنے پر انکو دوبارہ چاند نظر آتا ہے۔ لیکن گواہ کہتا ہے کہ میں نے دوبارہ چاند دیکھنے کی کوشش کی لیکن نظر نہیں آیا، یا میں نے چاند دوبارہ دیکھا ہی نہیں تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کو چاند نظر نہیں آیا ہے، یا چاند کا وہم ہوا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے، اسلئے ایسی گواہی کو رد کر دیتے ہیں۔

(ز) گواہ چاند دیکھنے کا وثوق کا اظہار نہیں کر رہا ہے بلکہ تذبذب کا شکار ہے تب بھی گواہی رد کر دیتے ہیں۔

راقم السطور نے ہندوستان کے رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین قاضی مجاہد الاسلام قاسمی امارت شرعیہ پٹنہ بہار، پاکستان کے رویت ہلال کمیٹی کے چیرمین حضرت مولانا ارشاد الحق تھانوی، ساؤتھ افریقہ کے رویت ہلال کمیٹی کے ممبر شیخ الحدیث مولانا فضل الرحمٰن اعظمی، امریکہ رویت ہلال کمیٹی کے چیرمین مولانا ڈاکٹر عمر افضل صاحبان سے گواہوں کی چھان بین کے بارے میں گفتگو کی ان تمام حضرات نے فرمایا کہ ہم لوگ مذکورہ بالا تفصیلات کی طرح پوری چھان بین کرتے ہیں، اگر گواہ مذکورہ قرائن کے خلاف ہوں تو گواہی رد کر دیتے ہیں اور حدیث کے مطابق ۳۰ ر پوری کرتے ہیں، ان حضرات کی انہیں سخت احتیاط کی وجہ سے ان ملکوں کی رویت صحیح جارہی ہے نہ حساب کے خلاف ہوتی ہے اور نہ قرائن کے خلاف اعلان رویت کرتے ہیں۔

اس کے بر خلاف عربی ملکوں اور خصوصاً سعودی عرب کے مفتیوں کا فتویٰ یہ ہے کہ مطلع صاف ہو یا ابر آلود ہر حال میں ایک گواہ کی گواہی کافی ہے، رویت عامہ کے تکلف کرنے کی حاجت نہیں، اور نہ ہی گواہ کی بہت چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، صرف وہ ظاہری طور پر دیندار ہو گواہی قبول کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے وہ حضرت ابوداؤد شریف اور ترمذی شریف کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، کہ ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس آئے، انہوں نے کہا کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیتے ہو، دیہاتی نے فرمایا "ہاں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ صحابہ میں اعلان کردیں کہ کل سے رمضان المبارک کا روزہ رکھیں۔ (مشکوٰۃ ص ۱۷۴)

اس حدیث سے عرب کے مفتیان کرام استدلال کرتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہاتی کی ظاہری دینداری پر ان کی گواہی قبول کرلی اس سے زیادہ تحقیق و تفتیش نہیں کی، نیز ایک ہی گواہی پر رویت کا فیصلہ صادر فرمادیا، اس لئے وہ حضرات اس حدیث کی بنا پر صرف ایک گواہی کے قائل ہیں۔ عیدالفطر میں دو کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ رویت عامہ کی ضرورت نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ گواہ کتنے ہی قرائن کے خلاف کیوں نہ گواہی دیں رویت کے بارے میں ان کی چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ظاہر ہے کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود ایک گواہی پر اعلان رویت کا مدار رکھیں گے اور کوئی چھان بین نہیں کریں گے، صرف ظاہری دینداری پر قبول کرلیں گے، قرائن کے خلاف گواہی دے تب بھی رد نہیں کریں گے تو ملک کے کروڑوں آدمیوں میں سے ایک دو گواہوں کا آجانا کیا بعید ہے، آج کل کے لوگ صحابی رسول کی طرح پاکباز اور پاکدامن تو ہوتے نہیں، خصوصاً عید کی جلدی میں تو کتنے گواہ کھڑے ہوجاتے اور اگر گواہی رد نہ کریں تو اس کے پیچھے ایک بڑی ٹولی بھی لگ جاتی ہے۔ چنانچہ عرب ملکوں میں اور خصوصاً سعودیہ میں یہی ہوتا رہا اور ہورہا ہے کہ صبح کو مشرق میں چاند دیکھا اور شام کو رویت کی گواہی آگئی اور ذمہ داروں نے اس کو قبول کرلیا، ابھی پہلے مہینے کا چاند ختم بھی نہیں ہوا، دو راتیں محاق کی بھی نہیں گذریں اور اگلے چاند کی گواہی آگئی، اور بلا کسی ردوقدح کے اس کو قبول کرلیا اور اعلان رویت کردیا یہ سلسلہ ایک زمانے تک وہاں چلتا رہا، کبھی چاند کی پیدائش (نیو مون، اجتماع شمس و قمر) سے بھی پہلے، کبھی نیو مون کے فوراً بعد گواہی آتی رہی اور قبول کرتے رہے، اور رویت عامہ یا محقق رویت بصری کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

مرتب کیلنڈر کی کوتاہی

تقدیم کے اس ہنگامے سے اہل مصر اور ان کے ہمنوا تنگ آگئے اور اس بات سے بہت پریشان ہوتے کہ چاند کی پیدائش سے پہلے بھی لوگ کیسے ہلال دیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے عاجز آکر انہوں نے فیصلہ کردیا کہ مغرب

سے پہلے نیو مون، پیدائش قمر ہو تو مغرب کے بعد پہلی تاریخ شروع ہو گی اب اس سے نہ مقدم کی گواہی قبول ہو گی نہ مؤخر کی، اس کے لئے وہ مغرب سے پہلے نیو مون حساب پر کیلنڈر مرتب کر لیتے ہیں اور اسی پر وہ رمضان و عید کا اعلان کرتے ہیں، ان حضرات نے سرے سے رویت ہی ساقط کر دی ہے، یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مصری کیلنڈر رویت سے ایک دن مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری تاریخ انڈیا و پاکستان کی تاریخ سے ہمیشہ ایک دن مقدم رہتی ہے۔

سعودیہ میں مرتب تقویم نے دیکھا کہ رویت کی گواہی پیدائش قمر سے بھی پہلے آجاتی ہے اس لئے انہوں نے اپنی ۳۲ سالہ تقویم پیدائش قمر (نیو مون) سے بھی آٹھ گھنٹے مقدم وقت پر مرتب کر دیا اور پہلے صفحے پر لکھ دیا کہ اس کو گرین وچ نیو مون ٹائم پر مرتب کر رہا ہوں، جو نیو مون سے بھی آٹھ گھنٹے مقدم ہو جاتا ہے یہ اس لئے کیا تاکہ پیدائش قمر سے بھی پہلے گواہی آجائے اور ذمہ دار اس کو قبول کر لیں تو گواہی میرے کیلنڈر کے خلاف نہ ہو۔ سعودیہ اور اس کے ہمنوا ملکوں میں یہی کیلنڈر رائج ہے اور ان کی گواہی اسی کیلنڈر کے گرد گھومتی ہے۔

راقم السطور سعودیہ گیا اور وہاں کے پاکستانی علماء سے دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا ہم پچیس پچیس سال سے یہاں رہتے ہیں لیکن کبھی پہلے کا چاند نہیں دیکھا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ صبح مشرق میں چاند دیکھا اور شام کو اگلے ماہ کے چاند دیکھنے کا اعلان ہو گیا اور ہم لوگ ورطہ حیرت میں پڑ گئے۔ ہم لوگ تو رمضان و عید ریڈیو کے اعلان پر کرتے ہیں۔

کمیٹیوں کی کوتاہی

عرب کے تمام ملکوں میں رویت ہلال کمیٹیاں قائم ہیں لیکن اکثر ملکوں میں دیندار اور متقی علماء ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ دفتری قسم کے لوگ کمیٹی کے ذمہ دار ہیں جو دین سے زیادہ دنیا نواز ہیں۔

مصر اور اس کے ہمنوا ملکوں کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں کہ وہاں گواہی لینے اور اس کی چھان بین کرنے کے جھمیلے میں نہیں پڑتے وہ اپنے یہاں کے مرتب شدہ مقدم کیلنڈر پر اعلان کر دیتے ہیں۔ مصری علماء نے پیدائش قمر پر اعلان رویت کرنے کی تائید میں بہت سی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

سعودی عرب میں رویت ہلال کمیٹی (مجلس القضاء الاعلیٰ) قائم ہے اس کے رئیس ڈاکٹر صالح محمد اللحیدان ہیں، وہ رمضان کے لئے رجب اور شعبان سے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھ کر تاریخ متعین نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے سعودیہ کا ڈیڑھ دن مقدم والا کیلنڈر

ہوتا ہے، اس پر جو تاریخ ۲۹ شعبان لکھی ہوتی ہے وہ حقیقت میں ۲۷ یا ۲۸ کی تاریخ ہوتی ہے لیکن وہ حضرات کیلنڈر میں لکھی ہوئی ۲۹ تاریخ پر گواہی لینے کے لئے مجلس منعقد کر لیتے ہیں، گواہی آئی تو اعلان کر دیتے ہیں اور نہیں آئی تو ۳۰ پوری کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے حدیث پر عمل کیا رویت نہیں ہوئی تو ۳۰ پوری کرلی۔

لیکن اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا کہ جس ۳۰ کو پورا کیا ہے حقیقت میں وہ تو ۲۸ یا ۲۹ تاریخ ہے اور اس ۳۰ پر بھی چاند کا نظر آنا ممکن ہے کیونکہ اس کا کیلنڈر ڈیڑھ دن مقدم ہے، انہوں نے صرف ایک دن مؤخر کیا ہے رویت کے لئے ابھی آدھا دن باقی ہے۔

کیا کیا جائے کہ وہاں کے حضرات مفتیان کرام نے یہ فتویٰ دے دیا کہ رویت عامہ کی کوئی ضرورت نہیں، صرف ایک گواہی کافی ہے چاہے وہ قرائن کے خلاف ہو، اس کی چھان بین کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، صرف اس کی ظاہری دینداری کافی ہے۔

اس فتویٰ سے سارے عرب کی رویت درہم برہم ہو گئی، حدیث صوموا لرویته و افطروا لرویته ترجمہ "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو" پر عمل مفقود ہو گیا، پورے عرب میں ایک روز اور ڈیڑھ روز مقدم پر کیلنڈر بن گیا اور علی الاعلان اس پر عمل ہونے لگا۔

بلبل ہمہ تن خون شد گل شد ہمہ تن خاک

انڈیا، پاکستان کے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ بدلہ دے کہ انہوں نے سختی کے ساتھ گواہی کے لئے مندرجہ ذیل قواعد پر عمل کیا اور امت کو اس پر عمل کرو لیا۔

(۱) مطلع صاف ہو تو رویت عامہ لازمی ہے۔
(۲) مطلع ابر آلود ہو تب ہی گواہی کی طرف توجہ کی جائے گی۔
(۳) قرائن کے خلاف ہو تو گواہی رد کر دی جائے گی۔
(۴) گواہی دھمی یا جھوٹی ہے اس کی پوری چھان بین کی جائے گی۔
(۵) رجب اور شعبان کا چاند اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ۲۹ یا ۳۰ متعین کریں گے، مقدم کیلنڈر یا جھوٹی گواہی پر اس کا مدار نہیں رکھیں گے۔

ان قواعد پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے برصغیر کی رویت صحیح چل رہی ہے، امکان رویت حساب کے بھی مطابق ہوتی ہے اور قرائن کے بھی خلاف نہیں ہوتی۔

حضرت اقدس محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا

آخری سفر افریقہ، مرض وفات اور انتقال

از: ابوالقاسم نعمانی

حضرتؒ کا آخری سفر افریقہ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۶ء سے شروع ہوا۔ ۱۸ر اپریل کو دیوبند سے دہلی روانگی ہوئی۔ دوروز دہلی میں حاجی عبداللہ صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ ۲۰ر اپریل کو دہلی سے براہ راست جوہانسبرگ کے لئے پرواز ہوئی۔ روانگی مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم کے مدرسہ سے ہوئی۔ ۲۱ر اپریل کو معہ مولانا ابراہیم صاحب افریقہ پہونچے۔ اور اپنی قدیم قیام گاہ رٹ فن ٹین RIETFONTEIN میں قیام فرمایا۔ بفضلہٖ تعالیٰ طبیعت اچھی رہی۔ دارالعلوم آزادویل شہر لینیشیا LENASIA دارالعلوم زکریا اور اطراف کے مدارس کا دورہ فرمایا۔ تبلیغی مرکز بھی تشریف لے گئے۔ اسپرنگز SPRINGS میں مفتی اسمٰعیل عبدالرحیم صاحب کے مدرسے جامعہ محمودیہ میں بھی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ قیام گاہ پر حسب معمول روزانہ مجلس ہوتی رہیں۔ علماء کرام اور متوسلین آتے رہیں۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حضرتؒ کو ہندوستان ہی سے گردہ کی کچھ تکلیف تھی گردہ سے مثانہ کی طرف جانے والی نالی میں غدود پیدا ہوگئے تھے۔ جو کینسر کی شکل اختیار کررہے تھے۔ اور مثانہ تک پھیل گئے تھے۔ جس سے پیشاب کا راستہ بند ہوکر گردہ متاثر ہورہا تھا۔ حضرتؒ کے معالج خاص ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا امریکہ سے خاص سفر کرکے افریقہ تشریف لائے۔ معائنہ کیا اور یہاں کے معالج خاص ڈاکٹر محمد لیر سے مشورہ کرنے کے بعد یہاں کے گردہ کے ماہر ڈاکٹر محمد خاں کے تعاون سے غدود کا کامیاب آپریشن کیا۔ پھر چار ہفتے تک ہر ہفتہ اس کی صفائی ہوتی رہی۔ اسی دوران ۱۶ر جولائی کو حضرتؒ صوبہ نٹال کے شہر دربن تشریف لے گئے اکثر قیام مدرسہ تعلیم الدین

اسپکو بیچ رہا تبلیغی مرکز کے علاوہ مختلف اداروں اور مدارس میں تشریف لے گئے۔ نظام یہ تھا کہ دربن سے واپسی پر علاج مکمل ہو جائے۔ تو عمرہ کے لئے سفر ہو۔ اور ساتھ ہی کچھ اور بھی پروگرام تھا۔ ہرارے HARARE میں حضرتؒ کی نواسی رہتی ہیں۔ ان کی ملاقات کرنی تھی۔ ہرارے کے مدرسے میں ملاوی MALAWI کے مدارس میں اور چپاٹا کے مدرسہ میں تشریف لے جانا تھا۔ ری یونین RE-UNION مولانا بدر عالم صاحبؒ کی مسجد کا افتتاح کرنا تھا۔ جس کا سنگ بنیاد بھی حضرتؒ ہی نے رکھا تھا۔ ۱۶ر جولائی کو مولانا ابراہیم صاحب کے چچازاد بھائی حاجی ابراہیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے دربن سے ایلسبرگ ELSBURG تشریف لائے۔ یہاں سے دربن DURBAN پہونچے تو حضرتؒ کو اسٹینگر STANGER میں کھانسی شروع ہو چکی تھی۔ دربن سے ہیزل دین HAZELDENE واپسی ہو گئی۔ دربن سے واپسی پر حضرتؒ کی قیام گاہ تبدیل ہو گئی۔ پہلے مولانا ابراہیم صاحب کے بھائی حاجی یعقوب صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ پھر مولانا موسیٰ صاحب کے مکان پر پھر بھائی مفتی سلیمان صاحب کے مکان پر اور اخیر میں بھائی محمود صاحب کے نئے مکان پر تشریف لائے۔ دربن سے واپسی پر حضرتؒ کا قیام مولانا ابراہیم صاحب کے نئے مکان میں طے تھا۔ جہاں حضرتؒ کے قیام کے لئے ایک مستقل کمرہ تعمیر ہو رہا تھا۔ مکان خریدنے کے بعد سب سے پہلے حضرتؒ اس نئے مکان میں تشریف لے آئے اور یہاں پر چار نمازیں ادا کیں اور کچھ دیر آرام بھی فرمایا۔ ابھی تعمیری کام باقی تھا اس لئے دوسرے بھائیوں کے مکان میں قیام ہوتا رہا۔ (مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس گھر میں حضرت کی تشریف آوری بعد از وفات ہوئی۔ گویا ہسپتال سے حضرتؒ اپنے گھر آگئے) حضرتؒ کے خاص معالج ڈاکٹر محمد لیبر کے ذریعہ علاج جاری رہا۔ ڈاکٹر لیبر فون کے ذریعہ ڈاکٹر بلبلیا سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ خود ڈاکٹر لیبر بار بار آتے تھے ۷ راگست کو حضرتؒ کی صحت خراب ہونے لگی اور اس کے بعد سے ضعف میں اضافہ ہونے لگا۔ کچھ فالج کا بھی اثر ہو گیا جس کی وجہ سے غذا کا نگلنا اور کھانسی کے وقت بلغم کا نکالنا مشکل ہو گیا۔ گلے کے پٹھے ڈھیلے ہو گئے غذا اور پانی۔ کھانے کی نالی کے بجائے پھیپھڑہ میں جانے لگے جس کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اور کھانسی میں شدت پیدا ہو گئی۔ مشین کے ذریعہ گلے اور پھیپھڑہ کی صفائی کی جاتی رہی۔

حضرتؒ کے یہاں تین مجلسیں بڑی اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ ایک ذکر کی مجلس صبح کو ایک عام مجلس عصر کے بعد۔ اور صلوۃ وسلام کی مجلس شام کو۔ حضرتؒ صلوۃ وسلام کی مجلس کے بعد ہمیشہ خود دعا فرمایا کرتے تھے لیکن ۷ار اگست کو بذات خود آخری بار دعا فرمائی

۱۸ر اگست اتوار کے روز کچھ علماء عیادت کی غرض سے تشریف لائے تھے انہوں نے حضرتؒ سے حسن خاتمہ کے لئے کچھ عمل دریافت کیا تھا۔ حضرتؒ نے چند لمحات سکوت فرماکر پھر یہ حدیث سنائی تھی۔ من کان آخر کلامه لااله الا الله دخل الجنة یہ آخری حدیث ہے جو حضرتؒ نے اپنے زبان مبارک سے فرمائی تھی۔ اسی شب میں صحت زیادہ خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر لہیر آئے پانی وغیر نکالا۔ دوسرے کن کچھ افاقہ رہا اس درمیان غنودگی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ عموماً خاموش بیٹھے رہتے یا زبان پر ذکر جاری رہتا یا تلاوت فرماتے۔ کبھی کبھی سلام کرنے والوں کے سلام کا جواب بھی مرحمت فرماتے۔ اسی وقت راقم الحروف ابوالقاسم نے دربن جانے سے قبل حضرتؒ سے سلام کیا تو حضرتؒ نے جواب مرحمت فرمایا۔ مدرسہ کی خیریت پوچھی اور دعادے کر رخصت فرمایا۔ افسوس کہ وہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی اور پھر حضرتؒ کے جنازہ ہی میں شرکت ہو سکی۔

۲۷ر اگست منگل کی رات میں صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ دوبارہ پھیپھڑہ میں پانی جمع ہوگیا۔ ڈاکٹر محمد لہیر کے آنے تک مولانا مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز ڈاکٹر اسماعیل منگیرہ دیکھ بھال کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر محمد لہیر آئے اور انہوں نے بھی پانی وغیرہ نکالا۔ پھر ڈاکٹروں کے مشورہ سے اگلی صبح ۲۸ر اگست کو پارک لین کلینک PARKLANE CLINIC میں داخل کئے گئے اور خصوصی نگرانی کے شعبہ INTENSIVE CARE UNIT میں رکھے گئے مشین کے ذریعہ پانی نکالا گیا اور علاج جاری رہا بظاہر تکلیف میں کچھ کمی رہی فالج کے اثر کی بنا پر گفتگو نہیں فرما سکتے تھے۔

۳۱ر اگست کو امریکہ سے ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا صاحب خاص طور پر حضرتؒ کو دیکھنے کیلئے آئے۔ کھانے کے لئے جو نلکی ناک سے داخل کی گئی تھی وہ نکال کر باہر سے ایک نلکی پیٹ میں لگائی گئی تاکہ کھانا براہ راست پیٹ میں پہنچتا رہے۔ یہ عمل یکم ستمبر کو شام پانچ بجے ہوا۔ اسی نلکی سے کچھ کھانا بھی کھایا۔ بظاہر افاقہ نظر آتا تھا۔ پیر کو پھر پانی جمع ہوگیا جو نکالا گیا۔ ڈاکٹر بلبلیا صاحب نے قدرے اطمینان ظاہر کیا کہ اب ان شاء اللہ مرض آہستہ آہستہ کم ہوگا۔

لیکن طاقت بہت گھٹ چکی تھی۔ اور اسی شام کٹ ڈاکٹر بلبلیا صاحب کی واپسی تھی۔ ان کو روانہ کرنے کے لئے شام کے وقت مولانا ابراہیم صاحب ایرپورٹ (ہوائی اڈہ) تشریف لے گئے۔ وہیں ان کو فون ملا کہ حضرتؒ کی صحت اچانک بے حد کمزور ہو گئی دل کی رفتار انتہائی دھیمی ہو گئی۔ نبض بھی ڈوبنے لگی۔ وہ فوراً ہسپتال آئے۔ آخرکار تقریباً ساڑھے سات بجے حرکت قلب بند ہو گئی۔ اور حضرت اقدسؒ نے ۲ر ستمبر ۱۸ار ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ پیر کا دن گذار کر شام ساڑھے سات بجے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون. انا للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل عندہ باجل مسمی اسی طرح علم و معرفت کا وہ مہر عالم تاب جو ۱۳۲۵ھ میں طلوع ہوا تھا اور جس نے پون صدی تک علم و معرفت اور احسان و سلوک کی روشنی بکھیری۔ آخر کا ۱۹ار ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کی شام بر اعظم افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں غروب ہو گیا۔ آناً فاناً یہ خبر نہ صرف پورے ملک میں بلکہ پورے عالم میں تیزی سے پھیل گئی جس نے سنا اس پر غم و اندوہ کے پہار ٹوٹ پڑے۔

لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ دیکھتے دیکھتے ہسپتال کے پاس سوگواروں کا ہجوم اکھٹا ہو گیا۔ زیارت کراتے ہوئے نعش ہسپتال سے باہر لائی گئی اور نیو ٹاؤن کے مدرسہ میں لے جا کر وہاں غسل اور کفن دیا گیا۔ غسل میت میں مولانا ابراہیم صاحب پانڈور ان کے بھائی مولانا یوسف۔ مفتی سلیمان قاسم۔ مفتی احمد میاں۔ مولانا شبیر صالوجی۔ مولانا عبدالرحیم متالا۔ قاری اسماعیل اسحاق۔ مولان محمد گاڑوی۔ مولانا احمد درویش۔ مولانا موسیٰ میمی اور بہت سے خدام نے حصہ لیا۔ مولانا ابراہیم صاحب کے بھائی مفتی سلیمان صاحب کفن کی تیاری میں مشغول ہوگئے چنانچہ ساڑھے دس بجے شب تک غسل و کفن سے فراغت ہو گئی۔ تھوڑی دیر زیارت کے لئے اسی جگہ رکھا گیا دو ختم قرآن مکمل ہوا۔ تقریباً بارہ (۱۲) بجے شب میں نعش مولانا ابراہیم صاحب کے مکان پر لا کر رکھی گئی۔ ہر جگہ سے متعلقین و محبین زیارت اور تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے ہیزل دین-HAZEL-DENE روانہ ہوگئے۔ راقم الحروف (ابوالقاسم) کو حضرت کے انتقال کی اطلاع جوہانسبرگ سے تقریباً پانچ سو (۵۰۰) کلو میٹر دور شہر پی ترمیر ٹزبرگ-PIETERMARITZ-BURG میں مفتی اسماعیل ویسائی کی مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد وعظ کے دوران ہوئی۔ ہم لوگ حافظ ایوب ان کے والد حاجی یوسف ان کے خالو رشید احمد اور راقم الحروف ساڑھے نو

بجے وہاں سے ہیزل دین کے لئے روانہ ہوئے اور ڈیڑھ بجے شب میں مولانا ابراہیم صاحب کے مکان پر پہونچ کر حضرتؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت تک کافی لوگ آچکے تھے اور آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ افریقہ میں مقامی قانون کے پیش نظر قبرستان میں رات کے وقت قبر کھودنے کا عمل نہیں کیا جاسکتا اس لئے مجبوراً صبح کا انتظار کرنا پڑا اور صبح ہونے کے بعد قانونی کاروائی کر کے قبر کھودنے میں ہاتھ لگایا گیا اور حیرت انگیز طور پر انتہائی سخت اور پتھریلی زمین ہونے کے باوجود ۱۵۔ ۲۰ منٹ میں قبر تیار ہوگئی جب کہ قبر تقریباً چھ فٹ گہری تھی۔

صبح ۹ بجے جنازہ روانہ ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن وار دین وزائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ جنازہ بمشکل سوا نو بجے اٹھایا جاسکا۔ آخری دیدار میت کا منظر انتہائی غمناک تھا۔ مولانا ابراہیم صاحب شب ہی سے بے قابو تھے جنازہ اٹھتے وقت حضرتؒ کے قدم مبارک میں ہاتھ لگایا تو بالکل ہی بے قابو ہوگئے اور ان کی حالت بہت ہی غیر ہوگئی۔ فوراً ڈاکٹر محمد لہیر نے لٹادیا۔ دل کا مساج کیا اور شکر کا پانی پلایا۔

حضرتؒ کی تدفین ہیزل دین سے ۴ کلو میٹر کے فاصلہ پر ایلسبرگ ELSBURG کے قبرستان میں ہوئی جہاں مولانا ابراہیم صاحب کے والدین مرحومین اور اہل خاندان کی قبریں ہیں۔ حضرتؒ کی قبر مولانا ابراہیم صاحب کی والدہ کی قبر کے دائیں جانب بنائی گئی۔

گھر سے جنازہ کا جلوس روانہ ہوا۔ گاڑیوں کی قطار اس طرح تھی اگلا سرا قبرستان پہونچ چکا تھا۔ لیکن آخری سرا ابھی گھر پر ہی تھا۔ کنٹرول کرنے والی پولیس گاڑی اور ہیلی کاپٹر پریشان تھے آخر میں انہوں نے ہتھیار رکھ دئے۔ اس کے علاوہ کتنی گاڑیاں پہلے ہی قبرستان پہونچ چکی تھیں۔ مجمع کا اندازہ ۸۔ ۱۰ ہزار کے قریب تھا۔ بہت سے حضرات جنازہ میں شریک ہی نہیں ہوسکے۔ قبرستان پہونچ جانے کے بعد بھی اپنے اپنے ٹھکانوں سے براہ راست قبرستان پہونچنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ آخر کار سوا دس بجے نماز جنازہ کی نوبت آسکی تمام لوگوں کی خواہش تھی کہ نماز جنازہ مولانا ابراہیم صاحب پڑھائیں کیوں کہ وہی اس منصب کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ لیکن غم واندوہ کی تصویر بنے ہوئے مولانا ابراہیم صاحب خود اس امر کے لئے تیار نہ ہوسکے آخر کار مشورہ سے نماز جنازہ راقم الحروف (ابوالقاسم نعمانی) نے پڑھائی۔ نماز جنازہ کے دوران مجمع بے قابو تھا لوگوں کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ مولانا عبدالحق عمرجی

صاحب اسی طرح حاجی بھائی پاڈیا صاحب جو جنوبی افریقہ کے امیر جماعت ہیں سال گذشتہ ایک شدید کار کے حادثہ (ا کسیڈنٹ) میں زخمی ہونے کے بعد معذور ہو گئے تھے حضرتؒ سے بے حد تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بھی علی الصباح دربن سے یہاں پہونچ گئے تھے۔ جنازہ کے قریب صف اول میں تھے۔ وہ بھی بالکل بے قابو تھے۔ نماز شروع ہونے سے قبل حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کے مطابق حضرتؒ کے متوسلین اور تلمیذ مفتی سلیمان قاسم صاحب نے صف کے آگے جگہ جگہ کھڑے ہو کر انگریزی میں یہ اعلان کیا اور دہرلتے رہے کہ جس شخص کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے کوئی تکلیف پہونچی ہو۔ کسی کو مارا ہو یا بہتان لگایا ہو یا کسی اور طرح کی تکلیف پہونچی ہو یا غلط مشورہ دیا ہو تو اللہ کے واسطے معاف کردیں۔ اور اگر کسی کا کوئی مالی حق حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذمہ رہ گیا ہو تو مولانا ابراہیم صاحب پانڈوریان کے بھائی مفتی سلیمان صاحب پانڈور سے وصول کرلیں۔ اس اعلان پر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ کئی لوگوں کی زبان سے نکلا کہ ہم اب حضرتؒ سے کس طرح معافی مانگیں۔

نماز جنازہ قبرستان پر ہی ادا کی گئی تھی اور قبر وہاں سے قریب ہی تھی لیکن ہجوم بے قابو تھا۔ بڑی مشکل سے راستہ بنا کر قبر تک جنازہ لایا گیا۔ قرب وجوار سے لوگ جنازہ میں شریک ہوئے ان کے علاوہ بیرونی ملک سے شرکت کرنے والوں میں زامبیا ZAMBIA آئے ہوئی مولانا عبدالرحیم صاحب متالا اور ان کے احباب اور ری یونین REUNEON سے آئے ہوئے مولانا بدر عالم صاحب بھی شامل تھے جو حضرتؒ کے انتقال سے قبل ہی یہاں پہونچ گئے تھے راقم الحروف بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شامل تھا جن کو حضرت اقدسؒ کے آخری سفر میں مشایعت کا شرف حاصل ہوا۔ ساڑھے دس بجے مٹی ڈالنے کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً ۱۲ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس قدر مجمع کے باوجود گرد وغبار کا نام نہیں تھا۔ حضرتؒ کی قبر میں اترنے والوں میں مولانا ابراہیم صاحب پانڈور ان کے بھائی مولانا موسیٰ پانڈور۔ مفتی ابراہیم صالح جی مفتی رضاء الحق صاحب اور مفتی اسماعیل عبدالرحیم شامل تھے۔

دفن سے فارغ ہونے کے بعد سرہانے پائنتی اوائل واواخر سورہ بقرہ پڑھنے کی خدمت مفتی محمد سعید متالا صاحب اور مولانا مفتی شبیر احمد سالوجی صاحب نے انجام دی۔ اور آخر میں دعائے مغفرت احقر ابوالقاسم نے کرائی۔

تقریباً ساڑھے ۱۲ بجے دفن سے مکمل فرصت ملی۔ قبرستان سے مکان پر واپسی ہوئی۔ مولانا ابراہیم صاحب کے بھائی مفتی سلیمان صاحب پانڈور کے مکان پر تمام مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام تھا۔

ہر شخص غم واندوہ کا مجسمہ بنا ہوا تھا ایک دوسرے کو صبر و تلقین کرتے تھے اور روتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب لاکھ صبر کے باوجود بے قابو بنے ہوئے تھے۔ انتقال کی اطلاع رات ہی میں بذریعہ فون پورے ملک میں اور دیگر ممالک میں بھی اہل تعلق کو ہو چکی تھی اس لئے رات ہی سے تعزیتی فون کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے متوسلین اور محبین کے مسلسل فون آرہے تھے۔ ہر شخص حادثہ کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ سب حضرات مولانا ابراہیم صاحب کو تسلی بھی دیتے تھے اور خود بھی اظہار غم کر رہے تھے دوسرے دن بھی بہت سے تعزیتی فون فیکس اور خطوط بھی آنے شروع ہو گئے۔ جو لوگ تدفین میں شامل نہ ہو سکے وہ بعد میں آکر مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جاتے رہے۔
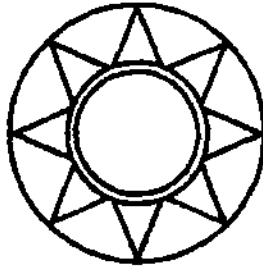
آہ! حضرت فقیہ الامت رحمہ اللہ تعالیٰ

ابو جندل قاسمی

جب احقر ایک چھوٹے مدرسہ (بحر العلوم کشن پور کرہیڑہ ضلع مظفر نگر یوپی) میں پڑھتا تھا تو اپنے ایک استاذ حضرت مولانا محمد ایوب سکندر پوری دام مجدہم سے حضرتؒ کا تذکرہ سنتا رہتا تھا۔ وہ انکی باتیں بہت مزے لیکر بیان فرماتے تھے۔ جب موقوف علیہ پڑھنے کیلئے دارالعلوم میں داخلہ کیلئے گیا تو رمضان دیوبند ہی میں گذارا۔ اور پرانے تذکرہ سے جو ایک شوق ہوا تھا اسکو پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا چنانچہ موقع غنیمت سمجھکر مشکوٰۃ پڑھتے ہوئے بعد عصر تفریح کے بجائے حضرتؒ کی مجلس میں جانے لگا۔ اور حضرتؒ کی مجلس مبارک کے معارف و برکات سے محظوظ ہونے لگا مجھ جیسا نااہل و نالائق بھی حضرتؒ کی مجلس میں ایک قلبی سکون محسوس کرتا تھا۔ زیر نظر مضمون میں حضرت کی سوانح اور حالات بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف وہ باتیں بیان کرنی ہیں جو حضرتؒ سے خود میں نے سوال کئے اور حضرت نے اس نااہل کو شفقت و محبت سے جوابات عنایت فرمائے۔ یا چند وہ واقعات بیان کرنا ہے جو حضرت سے میں نے مجلس میں اپنے کانوں سے سنے یہ بات شاید ناظرین پر مخفی نہ ہوگی کہ حضرت ظریف طبیعت رکھتے تھے اور حضرتؒ کی مجلس زعفران زار رہتی تھی۔ جس میں احادیث۔ مسائل۔ واقعات، لطائف و ظرائف اور تاریخ و تذکرہ اور بزرگوں کی باتوں کا حسین مرقع نظر آتا تھا۔ مندرجہ ذیل باتیں اکثر ۱۴۱۲ھ اور ۱۹۹۱ء کی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

پیدائش ایک مرتبہ احقر نے سوال کیا کہ آپنے حضرت گنگوہی کو دیکھا ہے؟

جواب:۔ ارشاد فرمایا کہ میری پیدائش حضرت گنگوہی کی وفات سے دو سال بعد کی ہے۔ اس حساب سے حضرت کی پیدائش ۱۳۲۵ھ کی ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت گنگوہی کی وفات ۱۳۲۳ھ کی ہے۔

حضرت شیخ الہند کی زیارت

سوال :۔ احقر نے سوال کیا کہ حضرت کیا آپنے حضرت شیخ الہندؒ کو دیکھا ہے ؟

جواب :۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ الہند نے میری بسم اللہ کرائی ہے ایکمرتبہ میں گھر سے باہر کھیل رہا تھا۔ تقریباً سات سال کی عمر تھی زنانہ مکان باہر کی بیٹھک میں چند مہمان تھے۔ والد صاحب مجھکو پکڑ کر لے گئے ایک صاحب نے میری بسم اللہ کرائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حضرت شیخ الہند تھے۔

عمر شریف

احقر نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حضرت آپکی عمر کتنی ہوگی (۱۴۱۲ھ میں) جواب :۔ ارشاد فرماتا کہ اس وقت میری عمر اتنی ہے جتنی عمر میں حضرت شیخ الحدیث صاحب کاانتقال ہوا۔ واضح رہے کہ حضرت شیخؒ کاانتقال ۸۷ رسال کی عمر میں (تقریباً) ہوا تھا۔ اس حساب سے حضرت مفتی صاحب کی کل عمر شریف ۹۲ رسال کی ہوئی۔ جس کی تائید سن ولادت اور سن وفات سے بھی ہوتی ہے۔ ۱۳۲۵ھ سے ۱۴۱۷ھ تک تقریباً ۹۲ رسال ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ احقر نے سوال کیا کہ حضرت! آپ حضرت شیخ الحدیثؒ صاحب کی خدمت میں

حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں کتنے سال

کتنے سال رہے ؟

جواب :۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے آپ بیتی میں خود لکھا ہے کہ "میں نے محمود کی چالیس سال رگڑائی کی ہے" اللہ اکبر اتنی لمبی مدت میں اللہ تعالی نے حضرت شیخ الحدیثؒ کے ذریعہ اور برکت سے آپؒ کو کیا کچھ بنادیا ہوگا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالی ہمکو بھی کوئی رگڑائی کرنے والا عطاء فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

لَمَّةُ الشیطان اور لَمَّةُ الملك میں فرق

راقم الحروف نے سوال کیا کہ لمۃ الملک (فرشتہ کا اثر) اور لمۃ الشیطان (شیطانی اثر) میں کس طرح فرق ہوگا ؟

جواب :۔ ارشاد فرمایا کہ دونوں میں فرق علم سے ہوگا۔ اسکے بعد فرمایا کہ پیران پیر سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کشف کی حالت میں ایسا لگا کہ میں اللہ تعالی کے بہت قریب ہوگیا ہوں۔ اسی حالت میں سخت پیاس محسوس ہوئی۔ فوراً ایک سونے کا پیالہ

دکھائی دیا جو میری جانب جرعہ حائل ہوا کہ پیوں یا نہ پیوں۔ کیونکہ سونے کا برتن استعمال کرنا ناجائز ہے۔ اسکے بعد خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی نے حرام کیا اور وہی دے رہے ہیں۔ پھر خیال ہوا کہ نہیں پیونگا۔ کیونکہ شریعت محمدی ﷺ میں نسخ نہیں ہے۔ یہ تعیّن کر لینے کے بعد "لاحول" پڑھا۔ پڑھتے ہی شیطان بھاگ گیا۔ لیکن بھاگتے بھاگتے بھی ایک ٹھگ مار گیا کہ "تو اپنے علم کے زور سے بچ گیا، ورنہ اتنوں کو میں نے اس مقام پر لا کر جہنم میں ڈالا ہے" میں نے کہا کہ "علم کے زور سے نہیں، ولکہ فضل خداوندی سے بچا ہوں، اس پر مولانا شاہ گنگوہی مدظلہ نے عرض کیا کہ حضرت معلوم یہ ہوا کہ اصل چیز فضل خداوندی ہے اور علم ذریعہ احساس ہے۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا، "جی ہاں"۔

ایک مشت ڈاڑھی کا ثبوت

راقم الحروف نے سوال کیا کہ حضرت ایک مشت ڈاڑھی کا ثبوت کہاں سے ہے؟۔

جواب :۔ ارشاد فرمایا کہ امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں ہے 'جا کے دیکھ لو، (یعنی دارالعلوم کے کتبخانہ میں) (چنانچہ دوسرے وقت میں کتبخانہ گیا اور تلاش کیا۔ تو یہ روایت ملی "محمد"

قال اخبرنا ابوحنيفه عن الهيثم عن ابن عمر رضى الله عنه انه كان يقبض على لحيته ثم يقص ماتحت القبضة، قال محمد وبه نأخذ وهو قول ابى حنيفة رحمة الله - ترجمہ : حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی داڑھی مٹھی میں لیتے اور مٹھی سے زائد کاٹ دیتے۔ (امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا عمل بھی یہی ہے۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اسمیں غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سنت کے سخت پابند تھے۔ لہٰذا یہ سنت بھی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی لی ہو گی۔ کما ھو الظاہر)۔

تشہد میں انگلی اٹھانیکا ثبوت

راقم الحروف کے استفسار پر ارشاد فرمایا کہ تشہد میں انگلی اٹھانیکا ثبوت مؤطا امام محمد کی ایک روایت سے ہے۔ مگر "خلاصہ کیدانی" میں اسکے مصنف نے نماز کے جتنے محرمات ہیں سبکو جمع کیا ہے اور اسمیں رفع سبابہ کو بھی محرم لکھا ہے اور کہا ہیکہ جو رفع سبابہ کرے اسکی انگلی کاٹ دو۔ اسکے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مکتوبات میں ہے کہ کسی شخص نے ان سے سوال کیا کے آپ رفع سبابہ کے قائل ہیں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اسکے منکر ہیں۔ انہوں

نے فرمایا کہ مجدد صاحب نے اجتہاداً یہ بات کہی ہے اگر انکو رفع سبابہ کی احادیث پہونچ جاتیں تو کبھی بھی انکار نہ کرتے۔ مگر مرزا صاحبؒ کے مکتوبات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحبؒ نے خود یہ بات اجتہاداً کہی ہے کیونکہ مجدد صاحبؒ نے اقرار کیا ہے کہ رفع سبابہ اگر چہ احادیث سے ثابت ہے لیکن ہم لوگ مقلد ہیں اور مقلدین کو اجتہاد کا حق نہیں۔ لیکن ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد معصوم صاحبؒ نے خود انکی تردید کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جو ان کے معاصر ہیں اور ایک ہی شیخ سے مستفید ہوئے ہیں انہوں نے بھی تردید کی ہے اور اسکی تردید میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ شرح سفر السعادہ میں وہ رسالہ موجود ہے۔ اللہ اکبر کتنا وسیع علم حضرت مفتی صاحبؒ کا۔)

صلعم یا ص لکھنا ارشاد فرمایا کہ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے بجائے صلعم لکھنے کو مجمع البحار میں ناجائز لکھا ہے۔ اور صرف ص لکھنا بخل ہے۔

امام ابو حنیفہ کو دھوکا ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں میں کبھی کسی کے دھوکہ میں نہیں آیا لیکن ایک بڑھیا کے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ چلے جارہے تھے۔ ایک دروازہ پر ایک بڑھیا کو دیکھا جو اسطرح بول رہی تھی جیسے گونگا آدمی۔ اور دروازہ کے سامنے ایک تھیلی پڑی تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ بڑھیا تھیلی اٹھوانا چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے تھیلی اٹھالی تاکہ اسکو دیدوں۔ وہ بڑھیا ایکدم بولی کہ "اب اسکو لیجائیے یہ لقطہ ہے (گری پڑی چیز) اور اسکا اعلان کیجئے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ یا تو اٹھائے نہیں۔ اور اٹھالیا تو وہی اسکا اعلان کرے)

بیٹھکر نماز پڑھنے کی حالت میں رکوع:۔ راقم الحروف نے سوال کیا کہ حضرت! جب بیٹھکر نماز پڑھیں تو بغیر اٹھے رکوع کرلیا جائے۔ یا پیچھے سے اٹھکر سر کو سرین کے برابر کیا جائے؟۔

جواب:۔ ارشاد فرمایا کہ بیٹھکر نماز پڑھنے کی حالت میں رکوع کرتے ہوئے سرین کو اوپر اٹھانا بہتر ہے اور سر تو اسکے برابر پھر خود ہی ہو جائیگا۔

غصہ کا علاج ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کی خلاف طبع بات پر غصہ آجائے تو یہ سمجھ کر رہنا چاہیے کہ یہ میرے گناہوں کا کفارہ ہے اور یہ شخص دھوبی ہے، جس طرح دھوبی کپڑے سے میل کو صاف کرتا ہے اسی طرح یہ شخص میرے قلب سے گناہوں کو صاف کررہا ہے۔

کھانے کے بعد برتن کو صاف کرنا

راقم الحروف نے سوال کیا کہ کھانے کے بعد برتن کو کیوں صاف کیا جاتا ہے؟ جواب :۔ ارشاد فرمایا کہ جب برتن کو صاف کیا جاتا ہے تو برتن دعاء دیتا ہے کہ اللہ تعالی جس طرح اسنے مجھکو صاف کیا تو بھی اسکو گناہوں سے اسی طرح پاک و صاف کردے۔
پھر ارشاد فرمایا کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں آیا ہے "بقّوا او نقّوا" یعنی یا تو برتن میں تھوڑا سا کھانا چھوڑ دو تاکہ اور کوئی کھالے یا بالکل صاف کر دو۔

شیعہ حافظ قرآن کیوں نہیں ہوتے

ایک صاحب کے استفسار پر فرمایا کہ جو شخص اپنے اساتذہ کیساتھ گستاخی کرتا ہے وہ علم سے محروم رہتا ہے۔ یہ شیعہ لوگ ان صحابہ کرام کو جنسے قرآن شریف ہم تک پہونچا ہے برا کہتے ہیں۔ انکی شان میں گستاخی کرتے ہیں اس لئے یہ حافظ نہیں ہوتے۔

حضرت گنگوہی کا تعلق مع اللہ

ارشاد فرمایا کہ ایک شخص حضرت گنگوہیؒ کی مجلس میں بہت روتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت نے معلوم کیا کہ بھائی تم اتنا کیوں روتے ہو۔ عرض کیا کہ حضرت دوزخ سے بہت ڈر لگتا ہے حضرت نے فرمایا کہ گھبرلو نہیں مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تیرے آدمیوں کو دوزخ میں نہیں بھیجا جائیگا۔

حضرت مدنیؒ کا ایثار

فرمایا کہ حضرت مدنیؒ جب مدینہ طیبہ رہتے تھے تو کھانا حضرت خود ہی بنایا کرتے تھے اور یہ پانچ بھائی تھے۔ پکانے کے بعد اسکو پانچ جگہ تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ حضرت کے چھوٹے بھائی محمود اپنا حصہ جلدی جلدی کھالیا کرتے اور پھر روتے۔ تو حضرت مدنیؒ انکو اپنا حصہ دیدیتے اور خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی مہمان کی خدمت

ایک مرتبہ حضرت مدنیؒ بخاری شریف کا سبق پڑھا کر اپنے مہمان خانہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت نے پوچھا کہ کیوں میاں تم سوئے نہیں؟ اسنے کہا کہ کیسے سوؤں نہ میرے پاس لحاف ہے اور نہ حقہ۔ حضرت اندر گھر میں تشریف لیگئے۔ اور خود حقہ بھر کر لائے نیز اپنا لحاف بھی دیا۔ اور آپنے پوری رات اپنی عباء میں

گذری۔

حافظ حسن علی گنگوہیؒ کا استحضار موت

ارشاد فرمایا کہ گنگوہ میں ایک حافظ حسن علی صاحب تھے وہ ایک مسجد میں رہتے تھے۔ انکا یہ حال تھا کہ جب وہ سجدہ میں چلے جاتے تھے تو بہت دیر میں اٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ انکے پیچھے سے کسی شخص نے لات ماری کہ سو گیا؟۔ تو سجدہ سے اٹھکر فرمایا۔ اِنا للہ وَانا الیہ راجعون۔ کیا میں سو گیا تھا۔ لوگوں میں سو گیا تھا۔ لوگوں کی میں نے نماز ہی خراب کر دی۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان سے اصرار کر کے پوچھا کہ آپ اتنی دیر سجدہ کیوں کرتے ہیں۔ تو فرمایا کہ جب میں سجدہ میں جاتا ہوں اور اٹھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ایک مرتبہ اور سبحان ربی الاعلی کہلوں۔ شاید پھر سجدہ کرنیکا موقع نہ ملے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانہ ہے استحضار موت کا۔ کاش ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ (آمین ثم آمین)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ گردن جھکائے بیٹھے تھے اور آپکے مریدین آپکے سامنے بیٹھے تھے۔ تو کچھ طالبعلموں نے انکی نقل اتاری۔ ایک پیر

میانجی نور محمد صاحبؒ کا ایک واقعہ

بنکر گردن جھکا کے بیٹھا اور کچھ لڑکے اسکے سامنے مرید بنکر بیٹھے۔ کسی شخص نے جاکر حضرت سے ذکر کر دیا۔ تو میانجی صاحبؒ نے انکو بلوایا اور پوچھا کہ تم میں سے کون پیر بنا تھا۔ انہوں نے بتادیا کہ حضرت یہ بنا تھا۔ اسکو کہا کہ تم بیٹھ جاؤ اور دوسروں سے کہا کہ تم سب چلے جاؤ۔ سب چلے گئے۔ پھر اس سے کہا کہ آنکھیں بند کر وانسے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن فوراً ایں ایں کر کے چلا اٹھا اور تڑپ گیا بعد میں اس سے پوچھا گیا کہ کیا ہو گیا تھا تو اسنے بتایا کہ جب میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تو فوراً ایسا لگا جیسے اندر آگ لگ رہی ہو کہ قلب پر ایک چنگاری رکھی گئی اور فوراً اٹھالی گئی جسکو میں برداشت نہ کر سکا۔ اپنے بڑھاپے میں وہ طالب علم کہتا تھا کہ اب میرا یہ حال ہے کہ اندھیری رات ہو، بادل چھایا ہو اور میں اندر کمرے میں لحاف اوڑھے ہوئے لیٹا ہوا ہوں تو باہر جو نیم کا درخت ہے اسکے پتے ہلتے ہوئے مجھے اس حالت میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس چنگاری کا یہ اثر ہوا۔

دارالقضاء کا صدر کون

ارشاد فرمایا کہ دیوبند میں جب دارالقضا قائم ہوا تو دارالعلوم کے ایک مفتی صاحب (مفتی سید احمد علی سعید صاحب) نے

مجھ سے کہا کہ اس دار القضاء کا صدر یا تو میں رہونگا یا آپ رہیں گے۔ میں نے کہا کہ کوئی بھلا نیک آدمی تھا۔ بیوی تیز مزاج تھی۔ ایکروزوہ صاحب نماز پڑھکر گھر پہونچے۔ بیوی نے کہنا شروع کیا کہ تو نے فلاں کام خراب کر دیا۔ ایسا کیا ویسا کیا۔ اسنے کہا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ بیوی نے کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اس پر شوہر نے دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے کہ "یااللہ یا تو میں مر جاؤں بس اتنا ہی کہہ پایا تھا (آگے کہنا چاہتا تھا کہ بیوی مر جائے) کہ بیوی نے پوچھا جو چولہے کے پاس بیٹھی تھی چمٹا اٹھا کر کہا کہ اور یا؟۔ اسنے کہا "بس یا بھی میں ہی مر جاؤں" اسی طرح دار القضاء کے صدر یا تو آپ ہونگے اور یا بھی آپ ہی ہونگے اللہ اکبر حضرت مفتی صاحبؒ عہدہ طلبی سے کس قدر دور تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی یہ چیز نصیب فرمائے۔ آمین۔

سیرت جگر مراد آبادی

اسی طرح مولانا ماہر القادری صاحب مدیر فاران کراچی بھی جگر صاحب کے معاصر تھے، وہ اپنا مشاہدہ اسطرح تحریر کرتے ہیں۔:

"سفر میں مصلیٰ جگر مرحوم کے ساتھ رہتا تھا، جب بھی اللہ توفیق دیتا نماز یکسوئی کے ساتھ پڑھتے۔ رکوع و سجود اور قیام و قعود میں خشیت جھلکتی تھی۔"(۱)

اب آخر میں شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے خیالات بھی پڑھتے چلئے وہ تحریر کرتے ہیں:

اخلاقی حیثیت سے بھی جگر اتنے شریف، وضعدار، بلند نظر اور عالی ظرف انسان تھے کہ اس دور کے شاعروں میں اسکی مثال ملنا مشکل ہے۔۔۔۔۔ایک زمانہ میں جگر ایسے رند بلانوش رہے کہ انکو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا لیکن دل انکا ہمیشہ مومن رہا اور ہر زمانہ میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان رہے۔ بزرگوں کی صحبت بھی پائی تھی، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب منگلوریؒ سے بیعت تھے۔۔۔۔۔ ادھر چند برسوں سے عملاً بھی دیندار ہوگئے تھے، شراب مطلق چھوڑ دی تھی، فرائض کے پابند تھے، حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے، چہرہ پر شرعی نورانی داڑھی بھی تھی اسلئے عملی اعتبار سے بھی ان کی زندگی کا آخری دور بہت اچھا گذرا اور اس پر جمعہ کے مبارک دن صبح صادق کے وقت انکا خاتمہ ہوا جو انشاء اللہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے۔(۲)

۱۔ ماہنامہ فاران کراچی، ص ۴۴، نومبر ۱۹۶۰ء

۲۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ شذرات، اکتوبر ۱۹۶۰ء

از :۔ ابن لئیق اعظمی
منڈیار۔ اعظم گڈھ۔ یوپی۔ انڈیا

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے اخذ و استفادہ کرنے والوں کی تعداد یوں تو سینکڑوں ہے لیکن ان سے خاص طور پر مستفید ہونے اور ایک مدت تک ان کے حلقہ درس میں بیٹھنے والوں میں چار شخصیات زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا عبد السلام اصلاحی اور مولانا نجم الدین اصلاحی۔

اوّل الذکر دونوں شخصیتوں نے خاص طور پر مولانا فراہی سے قرآن اور علوم قرآن میں استفادہ کیا اور اس سلسلہ میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ موخر الذکر دونوں بزرگوں نے مولانا فراہی سے بالخصوص فارسی زبان کا درس لیا اور زبان پر وہ قدرت پیدا کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے زبان داں بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی بفضل ایزدی باحیات ہیں۔ مولانا اختر احسن اصلاحی پر ڈاکٹر عنایت اللہ سبحانی صاحب کی ایک مستقل تصنیف ہے اور مولانا عبد السلام اصلاحی پر راقم السطور کا ایک طویل مقالہ ہے۔

زیر نظر مضمون میں مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی دانی پر اظہار خیال کا ارادہ ہے جن سے راقم کو شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔

فارسی کی ابتدا

مولانا مرحوم سے ان کی تعلیم کی ابتدا سے متعلق جو باتیں سنی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں کلاس

وائز فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی چنانچہ خود ان کا کہنا ہے کہ ان کے زمانے میں مدرسہ کے نصاب میں فارسی کی چند کتابیں داخل تھیں۔ جیسے گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ وغیرہ مگر مولانا فراہی یہاں استاذ نہیں تھے اس لئے کلاسوں میں ان سے فارسی پڑھنے کا سوال نہیں ہوتا۔

دوسری بات جو مبنی بر حقیقت ہے۔ کچھ یوں ہے۔

مولانا نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مادر علمی میں فارسی پڑھانے والا کوئی استاد نہیں رہا۔ کافی تگ ودو کے بعد بھی مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوئی استاد نہیں پاسکے۔ آخر کا مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور واقعہ کہہ سنایا اور اس وقت مولانا فراہی صاحب کے پاس ان کے تینوں مایہ ناز شاگرد۔ مولانا امین اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا نجم الدین اصلاحی۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا فراہی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد شفیع صاحب سے فرمایا:۔ "ان میں سے جن کو چاہیں اس کام کے لئے منتخب کرلیں"۔

مولانا کا اشارہ مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب کی طرف تھا کیوں کہ موصوف کے دادا فارسی زبان کے ماہر اوا شناس تھے۔

مولانا فراہی نے ان کو اس کام کا حکم دیا تو مولانا نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں فارسی نہیں جانتا۔ تدریس تو بڑی دور کی بات ہے۔ مولانا فراہی نے ان یہ کہہ کر تسلی دی کہ تم قدم بڑھاؤ میں تمہاری مدد کردوں گا مگر مولانا راضی نہیں ہوئے۔ مولانا نے ان کو یہ کہہ کر تیار کرلیا شام میں فارسی کی کوئی کتاب یا دیوان لے کر آؤ میں تمہیں فارسی پڑھاؤں گا۔ مولانا مجبور آگئے اور دوسرے دن عرفی کا دیوان لے کر حاضر خدمت ہوئے اس شعر سے ابتدا کی۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ
گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

اس طور پر مولانا فراہی ان کو روز صرف ایک شعر پڑھاتے اور اس شعر میں آئے ہوئے اصولوں کی طرف اشارہ فرماتے۔ شدہ شدہ وہ شخص جو اپنے کو کوچہ کا نا آشنا اور نابلد سمجھتا تھا فارسی کا ماہر اور اس کا ذوق آشنا بن گیا۔ اساتذۂ فن کے رنگ میں شعر کہنے لگا۔ اور اس زبان میں بعض تصانیف بھی چھوڑ گیا۔

گویا مولانا نے فارسی کی ابتدا اس وقت کی جب وہ نو عمر اور مبتدی تھے پھر ایک مدت تک یہ سلسلہ منقطع رہا اور ان کی توجہ عربی زبان اور دوسرے علوم پر مرکوز رہی۔ جس کی وجہ سے فارسی کی جو ابتدائی شدبد انھیں حاصل تھی وہ ذہن سے محو ہو گئی اسی لئے کئی برسوں کے بعد جب فارسی پڑھانے کی بات آئی تو انھوں نے اس سے عدم واقفیت کا عذر پیش کیا مگر مولانا فراہی کی جوہر شناس نگاہیں زنگ آلود ہیرے کو دیکھ رہی تھیں چنانچہ ان کی محنت و توجہ سے دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئیں اور قبائے فارسی پر ایک اور جوہر آبدار نمودار ہوا جس کی چمک دمک آج بھی نمایاں ہے۔

تلامذہ

مولانا اصلاحی سے استفادہ کرنے اور ان کے خاص حلقہ درس میں بیٹھنے والوں کی تعداد تو بے شمار ہے لیکن ان کے مشہور و معروف شاگردوں میں چار بزرگ شخصیتیں ہیں۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب "تیسیر القرآن" مولانا محمد عاصم اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی اور مولانا احتشام الدین اصلاحی سابق صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔

مولانا سے راقم کا استفادہ

میں نے مولانا کے سامنے اس وقت زانوئے تلمذ تہہ کیا جب میں عربی سوم کا طالب علم تھا اور یہی زمانہ ہے جب مولانا کو میں نے قریب سے دیکھا واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہم طلبہ نے ایک اردو قلمی رسالہ "شعاع" نام سے نکالنا شروع کیا میں اس کا مدیر تھا مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کے ہاں اسی رسالے کے کام سے جانا پڑا۔ اس کے بعد سے مستقل سلسلہ ہی جاری ہو گیا۔ ہفتے میں ایک روز ضرور جاتا اور اگر نہ پہونچ پاتا تو وہ ناچیز کو بلوا بھیجتے میں نے موقع کو غنیمت بلکہ نعمت جانا اور مولانا سے فارسی زبان پڑھانے کی درخواست کی۔ مولانا نے قبول کر لیا اور سلسلہ شروع ہو گیا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔

فارسی زبان کے علاوہ میں نے مولانا سے فراہیات اور ادب عربی میں بھی استفادہ کیا۔ مولانا نے مجھے قصیدہ "بانت سعاد" پڑھانے کو کہا تھا مگر افسوس مجھے اپنی مشغولیت کے سبب اس کا موقع نہ مل سکا۔

حوصلہ افزائی

مولانا موصوف میری ہمہ وقت حوصلہ افزائی کرتے اور مجھ کو اس بات پر ابھارتے کہ میں فارسی زیادہ سے زیادہ پڑھ ڈالوں وہ ہمیشہ فرماتے کہ علوم اسلامی کا بہت بڑا خزانہ فارسی زبان میں ہے کیوں کہ قدیم علماء مصنّفین نے زیادہ تر فارسی کو ہی وسیلہ اظہار بنایا تھا اور اس دور میں اس کا دور دورہ بھی تھا۔

ایک واقعہ

یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ ایک روز میں مدرسہ سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کا ایک شعر سنایا جس کو میں نے مادر علمی کے مجلّہ میں پڑھا تھا شعر یہ تھا۔

بیک جو ہر دو عالم رافرد شم
اگر روزے خریدارم تو باشی

میں نے لفظ "جو" پر زور دیا۔ مولانا نے فی البدیہہ ایک شعر سنایا جس میں وہ لفظ آیا تھا اور شاعر کا نام بھی بتایا۔ یہ ان کی فارسی دانی کی ایک معمولی مثال ہے۔

تصنیفات

مولانا موصوف نے فارسی زبان میں دو کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ایک "آموزگار پارسی" جو فارسی زبان کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اپنے استاد محترم کے اشارات سے کافی مدد لی ہے۔

دوسری تصنیف مولانا روم کی رباعیات کا انتخاب ہے جسے انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ایماء پر انجام دیا۔ اس انتخاب کو انھوں نے اپنے استاد کے نام منسوب کیا ہے۔ انتساب کا ہر جملہ محبت واحترام کے جذبے سے سرشار ہے۔ چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوتے چلیں۔

اے دوست بدوستی قرینیم ترا	ہر جا کہ قدم نہی زمینیم ترا
در مذہب عاشقی روا کے باشد	عالم بتو بینیم و نہ بینیم ترا

نیز :۔

بر رہگذر بلا نہادم دل را　　خاص از پے توپائے کشادم دل را
از بادمرا بوئے تو آمد امروز　　شکرانہ آں بباد دادم دل را

نیز :۔

بے یار نماند آنکہ بایار بساخت　　مفلس نہ شد آنکہ باخریدار بساخت
مہ نوراز اں گرفت کز شب نرمید　　گل بوئے ازاں یافت کہ باخار بساخت

مخطوطات

مولانا کے پاس بہت سے مخطوطے اور اہم کتابیں تھیں۔ قرآن مجید کا مخطوطہ، قرآن مجید پر مولانا فراہی کے قلمی حواشی، رسالہ عاشقیہ جس سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کے دولت خانہ پر آکر استفادہ کیا، لندن کی مطبوعہ مثنوی مولانا ردم اور دلائل الحسن والاثار پر اضافہ وغیرہ وغیرہ۔
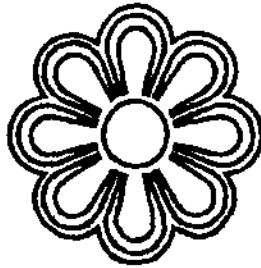
لغت قاموس میں ہے کہ شعبان ایک مشہور مہینہ ہے۔ شعبان کی جمع شعبانات اور شعابین وشعبانین آتی ہے، یہ باب تفعل تشعُّب سے ہے اور اس کے معنی ہیں تفرق پھیلانا اور شاخ در شاخ ہونا۔

رافع نے حضرت انسؓ کی زبانی لکھا ہے حدیث میں ہے کہ اس ماہ کا نام شعبان اس لئے رکھا گیا کہ روزہ دار کو اس ماہ میں شاخ در شاخ برابر بڑھتی رہنے والی خیر وخوبی میسر ہوتی ہے، تا آنکہ روزہ دار جنت میں داخل ہو جاتا ہے، ماہ شعبان کے مضامین کو تین مقالوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا مقالہ

بلحاظ احادیث صحاح ستہ فضیلت ماہ شعبان اور بغیر تخصیص پندرہویں شب کے روزے کی فضیلت۔

ماہ رجب ورمضان کے درمیانی مہینہ شعبان سے لوگ غفلت برتتے ہیں حالانکہ اس ماہ میں بندوں کے اعمال کا زیادہ ثواب دیا جاتا ہے، اور بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں، مجھے یہ امر زیادہ پسند ہے کہ میرے اعمال بارگاہ الٰہی میں اس طرح پیش ہوں کہ میں روزہ دار ہوں۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی اپنی شعب الایمان میں حضرت اسامہؓ کی زبانی تحریر کیا ہے۔

شعبان میرا اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ اسے دیلمی نے بھی اپنی فردوس الاخبار میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی تحریر کیا ہے۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ماہ رجب کی آمد پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، اے اللہ رجب وشعبان ہمارے لئے مبارک کر اور برکتیں نازل فرما اور رمضان ہمیں نصیب کر۔

اسے ابن عساکر وابن نجار نے بھی تحریر کیا ہے۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، وموطا میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی تحریر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تو ہمیں خیال ہوتا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے، اور روزے نہ رکھتے تو خیال آتا کہ اب کبھی روزے نہ رکھیں گے۔ یعنی گاہے آپؐ مسلسل روزے رکھتے اور گاہے عرصہ تک روزے نہ رکھتے، اور میں نے رسول اکرمؐ کو ماہ رمضان کے سوائے کسی دوسرے مہینہ کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا، البتہ دوسرے مہینوں کی بہ نسبت ماہ شعبان میں زیادہ تعداد میں روزے رکھتے تھے۔

مسلم و نسائی میں ابی سلمہؓ کی زبانی درج ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے رسول اکرمؐ کے روزوں کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ چند دن کے علاوہ باقی ماندہ پورے ماہ شعبان کے روزے رکھتے تھے۔

ترمذی میں یہ حدیث بھی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا دوسرے مہینوں کی بہ نسبت رسول اکرمؐ ماہ شعبان میں زیادہ دنوں تک روزے رکھتے تھے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ نے پورے شعبان کے روزے رکھے ہوں۔

ابوداؤد نے ایک روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی یہ لکھی ہے کہ رسول اکرمؐ کو دوسرے مہینوں کی بہ نسبت شعبان کے روزے بہت محبوب تھے تا آنکہ ماہ رمضان تک روزے رکھتے تھے۔

نسائی نے بھی ترمذی وابوداؤد کی یہ روایت نقل کی ہے، علاوہ ازیں نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی مرقوم ہے کہ سرور عالمؐ گاہے مسلسل روزے رکھتے اور گاہے عرصہ تک روزے نہ رکھتے۔ آپؐ شعبان میں قدرے کم اور کبھی زیادہ دن تک روزے رکھتے تھے اور ایک روایت یہ لکھی ہے کہ آپؐ چند دن کم باقی ماندہ ایام ماہ شعبان کے پورے روزے رکھتے تھے۔ اور ایک روایت یہ لکھی ہے کہ آپؐ پورے ماہ شعبان کے روزے رکھتے تھے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی مرقوم ہے۔ رسول اکرمؐ دیگر مہینوں کی بہ نسبت ماہ شعبان کے پورے روزے رکھتے تھے، اور فرماتے تھے اپنی طاقت کے موافق اعمال صالحہ کرتے رہو، اور بلا شبہ اللہ نہیں تھکتا بلکہ تم لوگ تھک جاتے ہو۔ (تا ختم حدیث)

اور ابوہریرہؓ کی زبانی بھی یہی حدیث مروی ہے۔

ابوداؤد میں ابوہریرہؓ کی زبانی تحریر ہے کہ رسول اکرمؐ چند دن کم ماہ شعبان کے اتنے

روزے رکھتے گویا پورے ماہ شعبان آپ کا روزہ دار ہونا معلوم ہوتا تھا۔

ترمذی نے حضرت ام سلمہؓ کی زبانی لکھا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کو دو ماہ کے پے در پے روزے رکھتے ہوئے صرف شعبان اور رمضان میں دیکھا ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ رسول اکرمؐ سال میں کسی ماہ کے پورے روزے نہیں رکھتے۔ البتہ ماہ شعبان کے پورے روزے رکھتے تھے، تا آنکہ رمضان کے روزوں سے ملا دیتے تھے۔

نسائی نے متذکرہ دونوں احادیث لکھی ہیں اور دوسری روایت کو بطور خاص لکھا ہے۔

نسائی نے حضرت اسامہؓ کی زبانی لکھا ہے میں (اسامہؓ) نے عرض کیا، یارسول اللہؐ میں نے آپ کو دوسرے مہینوں کی بہ نسبت ماہ شعبان میں زیادہ روزے رکھتے ہوئے دیکھا ہے، یہ کیا بات ہے! ارشاد عالی ہوا، یہ وہ مہینہ ہے جس سے لوگ عام طور پر غفلت برتتے ہیں، یہ مہینہ رجب و رمضان کے درمیان ہے اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں لوگوں کے اعمال بارگاہ الٰہی میں براہِ راست پیش ہوتے ہیں، ان امور کے پیش نظر میری خواہش ہے کہ میرے اعمال بارگاہ الٰہی میں اس صورت میں پیش ہوں کہ میں روزہ دار ہوں۔

دیگر احادیث فضیلت مندرجہ جامع کبیر

۲۔ صحاح ستہ کے علاوہ دیگر احادیث جو جامع کبیر میں درج اور شیخ الاسلام امام وقت، عارف باللہ ابوالحسن بکریؒ نے بیان کی ہیں حسب ذیل ہیں۔

شعبان وہ مہینہ ہے جو رجب و رمضان کے درمیان ہے اور لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں، حالانکہ اس ماہ کے اعمال براہِ راست بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں، اور مجھے یہ امر زیادہ پسند ہے کہ میرے اعمال اس صورت میں پیش ہوں کہ میں روزہ دار ہو، اس حدیث کو بیہقی نے بھی شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی مروی ہے کہ رسول اکرمؐ پورے شعبان روزہ دار رہتے تھے، ایک مرتبہ میری دریافت پر آپؐ نے فرمایا ایک سال میں مرنے والوں کے نام اللہ تعالیٰ ماہ شعبان میں تحریر کر دیتا ہے اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ میری مدت حیات ظاہری اس ماہ میں اس صورت سے لکھی جائے کہ میں روزہ دار ہوں' آپؐ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میرے روزہ دار ہونے کی حالت میں میری مدت حیات ظاہری کی کتابت فرمادی جائے،

اور اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ہر ایک کو اس کی لکھی ہوئی موت وقت مقررہ پر آتی ہے، اور ہر ایک خاتمہ بالخیر کا امیدوار ہے اسی لئے عبادت کے منجملہ روزہ بہترین عبادت ہے۔

دوسرا مقالہ

احادیث کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ پندرہویں شعبان کی فضیلت حکم الٰہی فیہا یفرق کلّ امرٍ حکیم (اس شب میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ دیا جاتا ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عکرمہؓ نے بیان کیا ہے کہ پندرہویں شعبان کی رات میں سال بھر کے تمام کاموں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس رات زندہ رہنے والے اور حج کرنے والے سب کے نام کی فہرست تیار کی جاتی ہے جس کی تعمیل میں کسی قسم کی ذرا سی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس روایت کو ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے بھی لکھا ہے۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ کتابت کا یہ کام لیلۃ القدر میں ہوتا ہے اگرچہ اس کی ابتداء پندرہویں شعبان کی شب سے شروع ہوتی ہے۔

قاسم بن محمد بن ابی بکر نے اپنے والد و چچا کی زبانی اپنے دادا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زبانی بیان کیا کہ رسول اکرمؐ فرماتے تھے "اللہ تعالیٰ پندرہویں شعبان کی شب میں آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے۔ اس شب میں ہر گنہگار کی بخشش ہوتی ہے البتہ مشرک اور کینہ ور کی بخشش نہیں ہوتی۔ (بیہقی)۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت علیؓ کی زبانی رسول اکرمؐ کا یہ فرمان تحریر کیا ہے کہ پندرہویں شعبان کو شب بیداری کرو اور دوسرے دن روزہ رکھو۔ کیوں کہ اس شب میں اللہ تعالیٰ مغرب کے وقت ہی سے آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور کہتا ہے، ہے کوئی مجھ سے طالب مغفرت تاکہ میں اس کی مغفرت کروں، ہے کوئی روزی مانگنے والا تاکہ اسے خوب روزی دوں، ہے کوئی مصیبت کا مارا عافیت کا خواہاں تاکہ اسے عافیت دے دوں، اور اسی طرح طلوع فجر تک اللہ تعالیٰ نوازنے کے لئے دریافت کرتا رہتا ہے۔

بندہ ضعیف (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ) عرض پرداز ہے کہ ہر شب اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر آتا ہے اور اس کا یہ نزول رات کے اخیری تیسرے حصہ میں ہوتا ہے لیکن پندرہویں شعبان کی شب میں اللہ تعالیٰ کا نزول رات کے اخیری تیسرے حصہ میں منحصر نہیں، بلکہ

سرِ شام مغرب ہی کے وقت سے صبح فجر ہونے تک آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتا ہے، اور اسی وجہ سے پندرہویں شعبان کی شب کی یہ فضیلت و برتری ہے۔ اور ایک حدیث کے جو یہ الفاظ ہیں کہ اس شب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عظیم تر عطیات سے سرفراز کرتا ہے اس کا ثبوت علمی متذکرہ بالا روایت ہے جس میں ارشاد ہے کہ اسی طرح طلوع فجر تک نوازنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔

نوفل بکالی کا بیان ہے ہے کہ حضرت علیؓ پندرہویں شعبان کی شب میں اکثر باہر آتے تھے۔ ایک مرتبہ پندرہویں شعبان کی شب میں باہر آئے اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر کہا کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام نے پندرہویں شعبان کی شب میں جانب آسمان نظریں کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جس شخص نے اللہ سے دعا مانگی اس کی دعا اللہ نے قبول کی، اور جس نے دعائے مغفرت کی اللہ نے اس کی مغفرت کردی، بشرطیکہ دعا کرنے والا عشار (دسواں حصہ لینے والا) جادوگر، کاہن، نجومی، جلاد، فال نکالنے والا، گویا اور باجہ بجانے والا نہ ہو، اس کے بعد حضرت علیؓ نے یہ دعا کی اے اللہ اے داؤد کے رب! اس شب جو شخص دعا مانگے یا مغفرت کا طالب ہو اس کی دعا قبول کرلے۔ کیونکہ اس رات تیرا خصوصی فضل وکرم کرنا زبان زد خاص وعام ہے اگرچہ دوسری راتوں میں بھی کرم کرتا ہے۔

اور پھر کہا اللہ تعالیٰ اسی رات میں تمام لوگوں کی مغفرت کرتا ہے البتہ مشرک کینہ پرور اور قاطع رحم کی دعا نہیں سنتا۔ (ابن ماجہ)۔

ابن ماجہ میں ابی موسیٰؓ کی زبانی مرقوم ہے کوئی رات، شب قدر کے بعد پندرہویں شعبان کی شب سے زیادہ افضل نہیں ہے اس شب میں اللہ آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے اور اپنے تمام بندوں کی مغفرت کرتا ہے۔ بشرطیکہ دعا کرنے والا مشرک کینہ پرور اور قاطع رحم وبدسلوک نہ ہو۔

(اور سعید بن منصور نے عطاء بن یسار کی زبانی بھی یہی بیان کیا ہے)۔

امام بیہقی نے معاذ بن جبلؓ کی زبانی لکھا ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میں اللہ تعالیٰ نزولِ اجلال فرماتا ہے، اور مشرک کینہ ور کے علاوہ تمام طالبانِ مغفرت کی مغفرت کرتا ہے۔

علامہ دینوری اپنی مسالک میں لکھا ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میں اللہ تعالیٰ اپنے مقرب فرشتہ ملک الموت کو بتادیتا ہے، کہ اسے اس سال ان ان لوگوں کی روح قبض کرنا ہے،

امام بیہقی نے راشد بن سعد سے مرسلاً روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ چار راتوں میں خیر و برکت کے دروازے کھول دیتا ہے، ایک بقر عید کی رات دوسری عیدالفطر تیسری پندرہویں شعبان کی شب جس میں مدت حیات ورزق اور حج کرنے والوں کے نام لکھے جاتے ہیں، اور چوتھی عرفہ کی رات ان چاروں راتوں میں شام سے صبح تک اللہ تعالیٰ خیر و برکت کے دروازے کھول دیتا ہے رسول اکرمؐ نے فرمایا جبریلؑ نے میرے پاس آکر کہا یہ شعبان کی پندرہویں شب ہے اس میں اللہ اپنے گنہگار بندوں کی جن کی تعداد قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں کے برابر ہو تب بھی مغفرت کرتا ہے۔

ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبانی لکھا ہے ایک شب رسول اکرمؐ میرے پاس نہ تھے، میں آپ کو تلاش کرنے چلی۔ اور آپؐ جنت البقیع میں اپنا سر مبارک آسمان کی جانب بلند کئے ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر فرمایا اے عائشہ کیا تم کو یہ خوف ہوا کہ اللہ اور اس کا رسول تم پر کوئی ظلم کرے گا؟۔ میں نے عرض کیا مجھے یہ خوف وہراس تو ہرگز نہیں البتہ گمان ہوا تھا کہ آپؐ کسی اور بی بی کے پاس گئے ہیں اس نوبت پر سرکار کونینؐ نے ارشاد فرمایا، پندرہویں شعبان کی شب میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں کے برابر لوگوں کی مغفرت کرتا ہے۔

امام بیہقی اور مؤلف جامع الاصول نے رزین کا یہ قول مزید لکھا ہے۔ کہ جو لوگ مستحق دوزخ ہیں، ان کے گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔

دنیا میں مستحقین دوزخ کو معاف کرنے اور الہٰ کی دنیا ہی میں مغفرت کرنے کے باب میں صرف متذکرہ بالا حدیث درج ہے۔ علاوہ ازیں متعدد احادیث اس مضمون کی وارد ہیں کہ پندرہویں شعبان کی شب میں اللہ اپنے بندوں کی جانب متوجہ ہو کر مسلمان مرد وزن کی مغفرت کرتا ہے۔ کافروں کی دعائیں قبول کرنے میں تاخیر کرتا ہے، اور کینہ وروں کو ان کی کینہ پروری کے سبب مہلت دیتا ہے تاکہ وہ کینہ وری ترک کر کے پھر دعا کریں۔ (بیہقی)۔

ابن قانع نے ابی ثعلبہ خشنیؓ کی زبانی روایت کی ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میں مشرک، کینہ ور، بدسلوک وقاطع رحم، پائچے لٹکا کر چلنے والے، والدین کو ستانے والے اور شراب خور کی طرف اللہ تعالیٰ نظر تک نہیں کرتا۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اسے تحریر کر کے اسے بھی ضعیف لکھا ہے۔

بیہقی نے عثمان بن عاصؓ کے ذریعہ حضرت صدیقہؓ کی زبانی لکھا ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب میں ندا آتی ہے، ہے کوئی طالب مغفرت تاکہ اس کی مغفرت کردوں، ہے کوئی سائل تاکہ اس کا دامن گوہر مراد سے بھر دوں، اور اللہ تعالیٰ ہر سائل کی دعائیں قبول کرتا ہے، اور زانیہ عورت و مشرک کی کوئی دعا سنتا ہی نہیں۔

طیبی نے لکھا ہے کہ حدیث میں جادو گر اور دسواں حصہ لینے والے کی عدم بخشش کا جو حکم ہے یہ اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔ اور عریف کے معنی عراف یعنی نجومی کے ہیں جو عالم غیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور نہایۃ میں یہ حدیث مذکور ہے کہ جس نے کسی نجومی یا کاہن کے پاس جاکر اس کے قول کی تصدیق کی تو گویا ایسے شخص نے رسول اکرمؐ پر نازل شدہ قرآن کریم کے احکام کی مخالفت کی اور کفر کیا، طیبی کا بیان ہے کہ عریف (نجومی) کہانت (غیب کی باتیں بتانے) کی وہ قسم ہے جو مالِ مسروقہ یا گم شدہ کی بر آمدگی کا اپنے قول وحال وغیرہ سے ثبوت دیتا ہے اور کہانت کرنے والا یعنی کاہن وہ دشمن ہے جو مستقبل کے حالات کی اٹکل پچو خبر دیتا ہے، شرط اور شُرطہ اس گروہ کا نام ہے جو حکام کے مددگار ہوتے ہیں، اور شرطی میں یائے نسبتی ہے جس کے معنی نہایۃ میں ہیں مقدمۃ الجیش یعنی فوج کا اگلا حصہ اور حاکم کے سامنے نفاذ حکم کے لئے چلنے والا، لیکن حدیث میں شرطی سے مراد ظالم وجفاجو ہیں، نیز وہ لوگ مراد ہیں جو ظالموں کے معین ومددگار ہوتے ہیں۔ علامہ نوویؒ نے قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جابی کے یہ معنی ہیں کہ گمان کی بناء پر مال نکال لینا۔ اور حدیث میں جابی سے مراد وہ شخص ہے جو بادشاہ وحاکم اعلیٰ کے پاس مال حرام لے کر آئے۔ کُوبہ کے معنی طبل و بربط وغیرہ یعنی باجے کے ہیں، اور یہی معنی نہایۃ میں علامہ جزری نے لکھے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ بلاشک وشبہ اللہ نے شراب اور کوبہ (باجہ) کو حرام قرار دیا ہے جامع الاصول کی شرح میں لکھا ہے کہ کوبہ وہ چھوٹا سا طبلہ ہے جو دو سر والا ہوتا ہے۔ (جسے ڈگڈگی بھی کہتے ہیں۔ از مترجم اقبال الدین احمد)۔

عرطبہ کے معنی قاموس میں عود، طنبورہ یا طبلہ کے ہیں، یعنی باجہ اور باجہ بجانے والا، اور مُسبِل کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے لمبے لمبے کپڑے زمین پر غرور وتکبر کے اظہار کے لئے لٹکائے۔

قاضی عیاض نے اپنی مشارق الانوار میں یہ حدیث نقل کی ہے اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے کلام نہیں کرے گا، ایک وہ جو ازار (تہبند، پاجامہ و پتلون) وغیرہ کو لٹکا کر چلے اور غرور و تکبر کے طور پر اپنے کپڑوں کو زمین پر گھسیٹ کر چلے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے ذریعہ رسول اکرم کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ روز محشر اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے کلام نہیں کرے گا، ان کی طرف نظر نہیں کرے گا، انھیں پاک نہیں کرے گا، اور ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے اس جملہ کو رسول اکرمؐ نے تین مرتبہ ادا فرمایا، اس پر میں (ابوذر غفاری) نے کہا رسول اللہؐ یہ نقصان و خسارے والے کون لوگ ہیں؟ ارشاد فرمایا، کپڑا لٹکانے والے، کچھ دے کر احسان جتانے والے، اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال تجارت کو رواج دینے والے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے ازار لٹکانے والے سے وہ شخص مراد ہے جو اپنے تہبند و پاجامہ وغیرہ کے پائچوں یا باقی ماندہ نچلے کپڑے کو ازراہ تکبر و غرور زمین پر گھسیٹ کر چلے۔ اور خیلاء کے معنی غرور و تکبر کے ہیں اور غرور کے ساتھ اپنے کپڑوں کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا یہ وعید ان لوگوں کے لئے جو غرور و تکبر کرتے ہیں، اور بلا شک و شبہ رسول اکرمؐ نے اس بارے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اجازت دی کہ وہ کپڑے گھسیٹ کر چل سکتے ہیں، کیونکہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو غرور و تکبر کریں۔ اور آپ کو اجازت ہے کہ آپ اپنا تہبند اسی طرح باندھ سکتے ہیں جو چلنے میں زمین پر گھسٹتا رہتا ہے، امام جعفر محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے کہ صرف ازار کو گھسیٹ کر چلنے کے الفاظ حدیث میں اس لئے ہیں کہ لوگ عموماً ازار ہی لمبی پہنتے ہیں۔

میں (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ) کہتا ہوں کہ صرف ازار لٹکانا حکم رسالتمآبؐ میں خصوصی حکم نہیں ہے بلکہ ہر کپڑے کو لٹکانے کی ممانعت ہے، جیسا کہ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد کی زبانی بیان کیا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ازار قمیص اور عمامہ بھی زمین پر گھسیٹا جاتا ہے اور جس نے اپنے جسم کا کوئی لباس بھی ازراہ غرور زمین پر گھسیٹا تو روز محشر اللہ تعالیٰ اس کی جانب نظر کرم نہیں کرے گا۔

اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی بہ اسناد حسن تحریر کیا ہے۔ (ختم شدہ کلام امام نوویؒ)۔

میں (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ) کہتا ہوں کہ اکثر احادیث میں صرف کپڑے گھسیٹ

کر چلنے اور بعض احادیث میں ازار گھسیٹ کر چلنے کی ممانعت کے الفاظ ہیں۔ اور گھسیٹ کر چلنے میں کسی خاص کپڑے کا ذکر کرنا شاید رلوی کے اپنے ذاتی فہم کی بات ہے ورنہ ہر وہ لباس جو پہنا جاتا ہے اسے ازراہ غرور گھسیٹ کر چلنے کی شارعؑ نے ممانعت فرمائی ہے، اگرچہ ازار گھسیٹنے کے الفاظ ہی زیادہ مشہور ہیں۔ باقی اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔

تیسرا مقالہ

پندرہویں شعبان کی شب میں شب بیداری، دن میں روزہ اور وظائف واعمال کے ثبوت درج ذیل ہیں، حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا پندرہویں شعبان کی شب میں شب بیداری کرواور دن میں روزہ رکھو(تا ختم حدیث)۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میری باری تھی، اور رسول اکرمؐ میرے گھر میں تھے، لیکن آدھی رات کے وقت میں نے دیکھا تو آپؐ کو نہ پایا اور میرے دل میں دوسری عورتوں والی بات آگئی چنانچہ میں چادر اوڑھ کر دوسری ازواج کے گھروں میں گئی لیکن وہاں آپؐ نہ ملے تو میں گھر لوٹ آئی اور میں نے آپؐ کو اپنے کمرہ میں اسی حالت میں سجدہ ریز دیکھا گویا کوئی کپڑا اکھنا پڑا ہو۔ آپؐ سجدہ میں یہ دعا کررہے تھے، اے اللہ میرے خیال وضمیر نے تجھے سجدہ کیا اور میرا دل بھی تیرے حضور سجدہ ریز ہے۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے بذات خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اے عظیم وبرتر! تو ہی ہر بڑے کام کا مرکز امید ہے میرے گناہ معاف کردے، اے اللہ میں اپنی اس پیشانی سے تجھے سجدہ کرتا ہوں، جس کا تو ہیں خالق وصورت گر ہے، اے اللہ تونے ہی آنکھ اور کان عنایت فرمائے ہیں، اس کے بعد رسول اللہؐ نے سر مبارک اٹھایا اور پھر دوبارہ سجدہ کیا اور سجدہ میں یہ دعا مانگی اے اللہ تیرے غصہ سے پناہ مانگتا اور تیری رضامندی کا طالب ہوں، تیرے عذاب سے پناہ مانگتا اور تیرے عفوورحم کا طالب ہوں، اے اللہ میں تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں، میں بیش ور بیش تیری ویسی تعریف وثنا کرتا ہوں، جیسی تونے خود اپنی تعریف کی ہے، اور جس طرح میرے بھائی داؤدؑ نے دعا کی تھی ویسی ہی میں بھی یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تیرے حضور میں اپنی پیشانی زمین پر رگڑتا ہوں اور سجدہ صرف تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔ اس کے بعد سر مبارک اٹھا کر یہ دعا کی اے اللہ مجھے وہ پاکیزہ دل عنایت فرما جس میں شرک کا بالکل شائبہ نہ ہو، جو فسق

دنجور اور سختی کرنے سے بلند ہو۔ پھر وہاں سے اٹھ کر میرے پاس آئے، اور میری چادر اوڑھ لی اور میری حالت یہ تھی کہ میری سانس پھول رہی تھی۔ یہ دیکھ کر فرمایا اے حمیرا کیا بات ہے؟ سانس کیوں پھول رہی ہے، ؟ میں نے پورا ماجرا کہا تو میرے گھٹنوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا (۱) واہ ان گھٹنوں نے آج کی رات ملاقات نہیں کی، حالانکہ آج پندرھویں شعبان کی شب ہے جس میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اور مشرک و کینہ ور کے سوائے اپنے بندوں کی مغفرت کرتا ہے۔ (بیہقی)۔

۱۔ قاموس میں ویس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ جملہ ہے جو از راہ مہربانی بچوں کو بہلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن میں مترجم نے اس کا ترجمہ "واہ" کیا ہے۔ **اللھم اغفرلی ذنوبی وخطیائی** (اقبال الدین احمد)۔

امام وقت عارف باللہ شیخ ابوالحسن بکریؒ کا بیان ہے کہ اس رات یہ بہترین دعا کرنی چاہئے، اے کرم پروردگار اللہ! عفوودرگذر تجھے محبوب ہے میرے گناہ معاف کردے۔ اے اللہ! میں تیرے حضور عفو و عافیت اور دین و دنیا میں دائمی امن و امان و عافیت کا طلب گار ہوں، اس کے بعد شیخ نے کہا اگرچہ متذکرہ دعا لیلۃ القدر میں کی جاتی ہے، لیکن شب قدر کے بعد شعبان کی پندرھویں شب افضل ہے جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔

شعبان کی پندرھویں شب میں

شب بیداری کا حکم

شعبان کی پندرھویں شب میں مختلف روایتیں ہیں۔

تابعین میں سے خالد بن معدان، مکحول اور لقمان بن عامر وغیرہ شب بیداری کے قائل ہیں۔ اور عطاؒ و ابن ملیکہ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے۔ اور علماء شافعی و مالکی کا بھی یہی مسلک ہے۔

خالد بن معدان، لقمان بن عامر اور اسحٰق بن راہویہ مسجد میں جمع ہو کر اس رات شب بیداری کرتے تھے۔ اور خالد و لقمان کی یہ حالت تھی کہ شعبان کی پندرھویں شب میں یہ دونوں عمدہ لباس زیب تن کرتے، سرمہ لگاتے اور رات بھر مسجد میں عبادت کناں جاگتے تھے۔

اب جو شخص شعبان کی پندرھویں رات کو شب بیداری کرے تو یہ امر احادیث کی

مطابقت میں بالکل مستحب ہے، اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جن احادیث سے کسی فعل کا جائز ہونا پایا جائے وہ فعل مستحب ہے، اور امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔

خلیفہ وقت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ بصرہ کے گورنر کو لکھا کہ سال بھر کی حسب ذیل چار راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان شبوں میں بہت زیادہ خیر و برکت نازل فرماتا ہے۔

اوّل یکم رجب کی شب، دوم پندرہویں شعبان کی شب، سوم عیدالفطر کی شب اور چہارم بقر عید کی شب۔

امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ پانچ راتیں ایسی ہیں جن میں دعا قبول ہوتی ہے ایک جمعہ کی رات، ایک عیدین کی رات، ایک یکم رجب کی رات اور ایک پندرہویں شعبان کی رات۔

امام احمد ابن حنبلؒ نے شعبان کی پندرہویں شب میں شب بیداری کے اثبات یا نفی کی بابت کوئی رائے نہیں دی ہے، حالانکہ عیدین کی شب میں جاگنے کی بابت دو روایتیں تحریر کی ہیں۔

رسول اکرمؐ کا یہ عمل ثابت ہے کہ پندرہویں شعبان کی شب میں مسلمان مرد و زن اور شہداء کی دعائے مغفرت کے لئے آپؐ قبرستان تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ ایک رات رسول اکرمؐ میرے گھر تشریف لائے اور لباس اتارنے لگے لیکن پورا لباس اتارا بھی نہ تھا کہ پھر کھڑے ہوگئے اور لباس زیب تن فرمایا۔ اس پر مجھے سخت رشک آیا اور گمان ہوا کہ آپؐ میری کسی سوکن کے یہاں جارہے ہیں آپؐ کی روانگی کے بعد میں تعاقب میں چلی یہاں تک کہ میں نے آپ کو بقیع غرقد میں اس حالت میں دیکھا کہ مسلمان مرد و زن اور شہداء کے لئے دعائے مغفرت کررہے تھے، یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ آپؐ اللہ کے کام میں مشغول ہیں اور میں دنیاوی کام میں لگی ہوں۔ اس کے بعد میں لوٹ کر اپنے گھر کمرہ میں آگئی، میں لمبی لمبی سانس لے رہی تھی کہ اتنے میں آپؐ تشریف فرما ہوئے، اور فرمایا اے عائشہ کیا بات ہے سانس کیوں پھول رہی ہے؟ میں نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ آپؐ تشریف لاکر لباس اتارنے لگے اور لباس اتارنے بھی نہ پائے تھے کہ کھڑے ہوکر دوبارہ لباس زیب تن کیا، اس پر مجھے رشک آیا اور گمان ہوا کہ آپؐ کسی اور ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جارہے ہیں، تاآنکہ میں نے

آپ کو قبرستان بقیع میں مشغول دعا دیکھا۔ اس پر ارشاد فرمایا، اے عائشہؓ کیا تمہیں یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اکرمؐ تم پر ظلم کرے گا، واقعہ یہ تھا کہ جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا آج شعبان کی پندرہویں شب ہے۔ جس میں قبیلہ بنوکلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مغفرت کرتا ہے، اور مشرک، کینہ ور، قاطع رحم وبدسلوک، غرور سے زمین پر لباس گھسیٹ کر چلنے والے، والدین کے نافرمان اور دوامی شراب خور کی طرف اس شب نظر کرم نہیں کرتا، اس کے بعد آپؐ نے لباس اتارا اور فرمایا، اے عائشہؓ شب بیداری کی اجازت ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، میرے ماں باپ آپ پر قربان! بصد شوق۔ چنانچہ آپ کھڑے ہو گئے اور عبادت کرنے لگے اندرون نماز آپؐ نے ایک بڑا لمبا سجدہ کیا جس پر مجھے آپؐ کی قبض روح کا گمان ہوا۔ میں اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے بھالنے لگی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں کو ہاتھ لگایا تو ان میں حرکت تھی، اس پر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے آپؐ کو اندرون سجدہ یہ دعا کرتے سنا۔ اے اللہ میں تیرے عفو وکرم کی طلب کے لئے تیرے مواخذہ کرنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری رضامندی کے لئے ناخوشی سے پناہ مانگتا ہوں اے اللہ تیرے جلال وجمال کی قسم میں تیری ہی پناہ وہی کا خواستگار ہوں، اور مجھ سے ویسی حمد وثناء ناممکن ہے جیسی تو نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

صبح کو میں (عائشہؓ) نے آپؐ سے ان دعاؤں کا تذکرہ کیا، فرمایا یہ دعائیں یاد کر لو اور دوسروں کو بھی تعلیم دو۔ کیونکہ جبریلؑ نے مجھے یہ دعائیں سکھائیں، اور کہا سجدہ میں یہ دعائیں مکرر سہ کرر پڑھی جائیں۔ (بیہقی)۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ شعبان کی پندرہویں شب میں نماز پڑھ رہے تھے اور بحالت نماز آپؐ نے ایک طویل سجدہ کیا کہ مجھے آپؐ کی قبض روح کا گمان ہوا چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر آپ کا انگوٹھا ہلایا جس میں حرکت معلوم ہوئی تو میں اپنی جگہ لوٹ آئی، پھر آپؐ نے نماز پوری کر کے کہا اے عائشہ اے حمیرا! کیا تمہیں یہ گمان ہوا کہ نبی اللہ نے تم پر زیادتی کی؟ میں نے عرض کیا جی نہیں یا رسول اللہؐ مجھے تو آپؐ کے طویل سجدہ سے روح قبض کا گمان ہوا تھا، اس پر ارشاد عالی ہوا جانتی ہو یہ کونسی رات ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسولؐ ہی زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا یہ شعبان کی پندرہویں شب ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مزید نظر کرم فرمانے کے لئے آسمان دنیا پر نزول اجلال کرتا ہے اور

غالیان کی مغفرت کرتا اور خواہان کرم پر رحم و کرم فرماتا ہے اور حاسد و کینہ ور کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ (بیہقی)۔

بدعتیں

ہندوستان کے اکثر شہروں میں لوگوں نے یہ رواج کرلیا ہے کہ پندرہویں شعبان کی رات کو اپنے گھروں کی دیواروں پر چراغ جلاتے اور فخریہ روشنی کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی روشنی کی ہے جو دوسروں سے اچھی ہے اور ہم اتنے آدمی ہیں جو روشنی کرتے ہیں فرداً فرداً اور اجتماعی حیثیت سے اس رات میں آتش بازی چھوڑتے اور دیگر کھیل کود کرتے ہیں، یہ وہ امور ہیں جن کی اصلیت احادیث کی معتبر کتابوں میں موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ کسی غیر معتبر کتاب میں بھی ان امور کے مسنون و سنت ہونے کی کوئی ضعیف یا موضوع حدیث پائی نہیں جاتی۔

ممالک عربیہ میں سے حرمین شریفین اور غیر عربی ممالک کے کسی دوسرے شہر میں (ہندوستان کے سوائے) ان امور کا کوئی رواج نہیں اس سے ثابت ہوتا ہے، عین ممکن یہ ہے بلکہ یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے دیگر رسوم انجام دینے کی طرح ہندی مسلمانوں نے اس رسم کی پیروی کی جیسے ہندو، دیوالی کے تہوار پر اپنے گھروں کی دیواروں اور طاقوں میں دیئے جلاتے ہیں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں کفر کی وجہ سے بدعتی امور بکثرت رائج ہیں، چونکہ مسلمانوں کے ہندوؤں سے بڑے اختلاط رہے۔ ہندوؤں نے اپنی عورتوں کے ساتھ مسلمانوں کی شادیاں کیں اسی اختلاط عام اور رہن سہن کے طریقہ اختیار کرنے کے سبب سے مسلمانوں نے بھی روشنی کرنے کی رسم ڈال لی ہے۔ بعض کہتے ہیں "ہم بھی کسی سیٹھ ساہوکار سے کم نہیں ہیں جس طرح وہ روشنی کرتے ہیں ویسی ہی بلکہ اس سے اچھی ہم کرتے ہیں۔

بعض متاخرین علماء کا بیان ہے کہ مخصوص راتوں میں بکثرت روشنی کرنا بدعت شنیعہ (گندی بدعت) ہے اس لئے کہ ضرورت سے زیادہ روشنی کرنے کے مستحب ہونے کا شریعت میں کوئی حکم نہیں۔

علی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ چراغاں اور روشنی کرنے کی ابتداء برمکیوں نے کی ہے جو نسلاً اور اعتقاداً آتش پرست تھے اور ظاہری اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے اپنے دہمی وخیالی امور کو اسلام میں جاری رکھنے کی حتی الامکان کوششیں کیں، کیونکہ اعتقادی طور پر ان کو قدیم رواج کے درست ہونے کا یقین تھا، نیز اسلام میں قدیم رواج ورسوم کو باقی رکھنے میں ان کی مصلحت یہ تھی کہ اسلام کے پردہ میں چراغ جلا کر اس کو سجدہ کرتے ہوئے آتش پرستی کی روح باقی رکھیں، اور طرہ یہ ہے کہ جاہل ائمہ مساجد نے چراغ وروشنی اور نماز رغائب کی آڑ میں لوگوں کو جمع کرنے کا طریقہ بنالیا ہے، تاکہ اپنی قیادت وسرداری جتا کر دولت گھسیٹ سکیں۔ ساتھ ہی قصہ خواں مجالس میں خوب قصے بیان کرسکیں۔ اور غریبوں سے روپے لیتے رہیں، اور حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام منکرات کے بطلان وابطال کے لئے اللہ نے ائمہ ہدیٰ پیدا کئے ہیں، کہ منکرات ناپید ہوجائیں۔ ان ائمہ ہدیٰ میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے دوسری صدی ہجری ممالک عرب وشام کے اندر منکرات کو اچھی طرح ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔

تذکرہ میں علامہ طرطوسی نے لکھا ہے کہ ختم قرآن کی شب میں اجتماع، منبروں کا قیام عورتوں مردوں کا میل جول اور کھیل کود وغیرہ میں باہمی اختلاط اور زمانہ حال کے اعمال وکردار ناگفتہ بہ یہ سب کے سب کام کوئی اصلیت نہیں رکھتے اور ان کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔(۱)۔

۱۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو امور بدعت انجام دینے سے محفوظ رکھے بدعت ہی وہ جرم عظیم ہے جو عقبیٰ کو خراب کرتی اور ملت اسلامیہ کی مرکزیت پارہ پارہ کرتی ہے۔(اقبال الدین احمد)۔

نالۂ غم

بیادِ حضرت الاستاذ مفتی محمود الحسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

از :- عبدالوحید القاسمی ایم اے

خزاں کی سخت تمازت ہے باغ جلتے ہیں
غم فراق ہے قلب وجگر پگھلتے ہیں

اندھیرا کیسا ہے یہ آتشیں دھواں کیوں ہے
یہ آہ کیسی ہے یہ نالہ دفغاں کیوں ہے

ہماری بزم سے روٹھی ہے کون جانِ سعید
اداس خرمنِ قاسم فسردہ باغِ رشید

وہ شخصیت کہ فروزاں تھی جس سے شمع وفا
وہ اک خلوص کا پیکر وہ روشنی کا دیا

تجھے علوم حسینی کا پاسبان کہوں
کہ دیوبند کی عظمت کا اک نشان کہوں

تو اک ستارہ تھا قائم تھی تجھ سے شانِ وطن
حدیث وفقہ وفتاویٰ کی انجمن روشن

تو تھا علومِ شریعت میں پیشوائے زماں
تو ایک مفتئ اعظم محدثِ دوراں

تو نحو وصرف وبیان وادب پر قادر تھا
تو دین ومسلکِ حق کا بڑا مناظر تھا

وفا شعار تھا تو صلح کل کا حامی تھا
رہ سلوک کا اک مرشد گرامی تھا

خوشا رہا میں ترے حاشیہ نشینوں میں
شمار ہے تیرے خرمن کے خوشہ چینوں میں

تمہاری ذات سے وابستگی پہ نازاں ہوں
تیری گلاب نشانی سے گل بداماں ہوں

خموش ہیں تیرے جانے کے بعد میخانے
غم فراق میں روتے ہیں جام وپیمانے

کسی کلی میں تیرا رنگ وبو نہیں ملتا
تمہارا ذکر تو ملتا ہے تو نہیں ملتا

چمن اداس تھا کل آبدیدہ شبنم تھی
وحید اس کی جدائی ہمالہ غم تھی

وہ روح رحمت غفار کے جوار میں ہو
دعا ہے جنت فردوس انتظار میں ہو

از :۔ مولانا سلمان صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

(۱) نام کتاب :۔ فتاویٰ نظامیہ اوندرویہ۔
تالیف :۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند۔
ترتیب :۔ مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب قاسمی۔
صفحات :۔ ۵۲۲ قیمت :نٹ ۰۰/۷۰روپے کتابت، طباعت معیاری۔
ملنے کا پتہ :۔ ساجدہ بک ڈپو محلہ دیوان دیوبند۔

زیر نظر کتاب "فتاویٰ نظامیہ اوندرویہ" حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صاحب دامت برکاتہم صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو حضرت موصوف نے مختلف اوقات میں، ملک وبیرون ملک سے آئے ہوئے سوالات کے جواب میں ارقام فرمائے ہیں، عصر حاضر میں جن علماء امت کو حق تعالیٰ نے فقہ وفتویٰ کی نازک اور اہم ذمہ داری انجام دینے کے لئے منتخب فرمایا ہے، ان میں حضرت مفتی صاحب کو نمایاں مقام حاصل ہے، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند جو جمہور امت کے درمیان نہایت معتمد ومستند اور مرکزی حیثیت کا حامل ہے اس کی سربراہی کا سہرا اس وقت مفتی صاحب ہی کے سر ہے، اور یقیناً وہ اپنی یہ ذمہ داری کو نہایت اعتماد کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ پر ہر دور میں اکابر علماء نے اعتماد فرمایا ہے، خود دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر افتاء اور ایک عالم کے مرشد ورہنما فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہ نئے مسائل میں جن کو حوادث الفتاویٰ کہا جاتا ہے مفتی صاحب موصوف کے فتاویٰ کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے تھے، بلاشبہ یہ امر واقعہ ہے کہ حوادث الفتاویٰ کے حل میں مفتی صاحب موصوف کو اللہ عزوجل نے خصوصی مہارت سے نوازا ہے

زیر نظر مجموعہ میں ایسی مہارت کے بے شمار نمونے جابجا ملتے ہیں۔ مثلاً۔

کتاب العقائد میں، رشدی کا دعویٰ اسلام اور اس کا شرعی حکم، غلام احمد قادیانی کو عالم ماننا، کتاب الصلوٰۃ میں، ان ممالک کے اندر نماز پنجگانہ کا حکم جہاں سورج صرف دو تین گھنٹے نظر آتا ہو، ڈی، ڈی اے کی زمین پر مسجد، کتاب الزکوٰۃ میں، بیت المال کا قیام، کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت اور ان سے نصاب زکوٰۃ کا حکم، دارالاسلام کی قسموں کا بیان، کمپنی کے حصص اور ہندوستان کی زمینوں کی شرعی حیثیت، کتاب الصوم میں مسئلہ رؤیت ہلال موجودہ دور میں، کتاب الحج میں کیا حج کی فرضیت قرعہ اندازی پر موقوف ہے؟ کتاب المعاملات میں، سیمنٹ کے کاروبار کا حکم، پھلوں کی بیع کا معاملہ، سرکاری طور پر مچھلیوں کی ٹھیکیداری کی شکل، بینک سے لون لینا، سودی رقم میں حیلہ کرنا، حق کرایہ داری پر معاوضہ لینا، کتاب الربوٰ میں ہندوستانی یا یورپی بینکوں سے ملنے والی سود کی رقم کا شرعی حکم، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کی ایک اسکیم کا حکم شرعی، پنشن فروخت کرنا، کتاب النکاح میں مسئلہ کفوء پر تحقیقی کلام، نکاح فسخ کون کر سکتا ہے؟ کتاب الطلاق میں شرعی کمیٹی کے حقوق، طلاق سکران میں قول مفتیٰ بہ کی تعیین، کتاب الفرائض میں، تقسیم انتظامی ہبہ نہیں، اپنی جائداد دوسرے کے نام لکھ دینا ہبہ ہے یا نہیں؟ ایکسیڈنٹ کے بعد حکومت سے ملنے والی رقم ترکہ ہوئی یا نہیں کتاب الوقف میں، قبرستان میں دینی مدرسہ یا مسجد تعمیر کرنا، غیر مسلم کا عیدگاہ کے لئے زمین وقف کرنا، کتاب الاضحیہ میں، قربانی میں اگر وکیل سے نام میں غلطی ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ کتاب الجنائز میں میت کے اعضا کٹ گئے ہوں تو غسل کا حکم، عورت کی نماز جنازہ کے لئے ولی اقرب باپ ہے یا بیٹا: ما یتعلق بالمساجد میں، مسجد میں پگڑی کی رسم لگانا، مسجد کی رقم سے شیرنی وغیرہ کی تقسیم، مسجد کے نیچے یا اوپر ہوٹل بنانا، ما یتعلق باحکام المدارس میں مدرسہ کے سفیر پر ضمان، مدرسہ کی رقم پر ملنے والے سود کا مصرف، کمیشن پر چندہ، مدرسہ سے پنشن لینا، کتاب الحظر والاباحۃ میں، کاغذ اور روپیوں کا سہرا، دوسرے کو خون دینا غیر مسلم کا معبد تیار کرنا، بہیمہ موطوءۃ کا حکم، بیمہ کرنے کا شرعی حکم، خنزیر کا علاج، عورت کے لئے ڈرائیوری کا شرعی حکم، مسائل متفرقہ میں الغول اور الکوحل کی شرعی تحقیق، نمونہ کے طور پر مسائل ذکر کئے گئے ہیں، ورنہ پوری کتاب ماشاءاللہ تحقیقات سے لبریز ہے۔

ایک حق پرست انسان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اگر اس کو اپنی رائے کی غلطی معلوم

ہو جائے تو وہ اس سے رجوع کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ حضرت مفتی صاحب زید مجدہم نے بھی دیانت کے تقاضے سے اپنی بعض آراء سے رجوع فرمایا ہے، جن کی فہرست شائع کردی گئی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب اہل فتاویٰ اور عام مسلمانوں کے لئے نہایت مفید اور پراز معلومات ثابت ہوگی۔

پیش نظر جلد، کتاب کی جلد اول ہے مرتب نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کا وعدہ کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ جلدیں اس سے بھی اعلیٰ معیار پر پیش کرسکیں گے، انشاءاللہ۔

(۲) نام کتاب :۔ چراغ محمد
(یعنی سوانح شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ۔)

تالیف :۔ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہ العالی۔

ضخامت :۔ چھ سو چوبیس (۶۲۴) صفحات۔

کتابت وطباعت :۔ معیاری۔

طبع باراول :۔ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ دسمبر ۱۹۹۴ء۔

قیمت :۔ تین سو (۳۰۰) روپئے)

حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی ان علمائے حق میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات وتوفیق سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے، مولانا موصوف کا علم پختہ بالخصوص کتاب اللہ کے علوم ومعارف میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اس کے ساتھ خدائے علیم وحکیم نے تصنیف وتالیف کا بڑا ستھرا ذوق مرحمت فرمایا ہے، چنانچہ آپ کے رواں دواں قلم سے اب تک ایک سو چودہ کتابیں منصۂ شہود میں آچکی ہیں، جن میں زیر تبصرہ کتاب "چراغ محمد یعنی سوانح حیات قطب الارشاد والتکوین شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد قدس اللہ سرہ" امتیازی شان کی حامل ہے مولانا موصوف حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے تلمیذ ومسترشد ہیں، استاذی وشاگردی کا رشتہ اپنے اندر ایک گونہ وسعت اور چون وچرا کی گنجائش رکھتا ہے۔ جب کہ پیری ومریدی کا رابطہ کامل انقیاد اور سرافگندگی کو چاہتا ہے۔ اس لئے بیک وقت ان دونوں تعلقات کی ذمہ

داریوں سے عہدہ بر آہونا کار شیشہ و آہن سے بھی نازک تر کام ہے اسے مولانا موصوف کی سعادت کہئے یا کرامت کہ بکمال حسن وخوبی وہ دونوں منزلوں سے گذر گئے جس کی زندہ شہادت ان کی یہ زیر نظر تالیف ہے۔

عصر حاضر کے علماء ومشائخ میں حضرت شیخ الاسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے حالات وسوانح میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں کسی اور پر اتنا کام نہیں ہوا ہے، اس لئے ایسی مرکز توجہ شخصیت پر قلم اٹھانا بظاہر بڑا آسان ہے لیکن در حقیقت یہ انتہائی مشکل اور پر خطر کام ہے، اس لئے کہ اس صورت میں صاحب قلم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیش رو کے مقابلے میں اپنی تالیف کو مواد ومضامین اور اسلوب ونگارش کے اعتبار سے اس لائق بنائے کہ اس کے مطالعہ سے تکرار محض کا احساس نہ ہو۔ مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ حضرت قاضی صاحب اپنی اس تالیف میں اس معیار کو قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کی جامع کمالات شخصیت کا پورا مرقع کتاب میں آگیا ہے، حضرت مدنی قدس سرہ کی شخصیت، اوصاف وکمالات اور خصوصیات وامتیازات کے تعارف کے لئے بلاشبہ یہ ایک چراغ راہ ہے۔ البتہ ترتیب مضامین میں مزید ژرف نگاہی کی ضرورت ہے امید ہے کہ اگلی اشاعت میں اس کی جانب مزید توجہ دی جائے گی، اسی طرح حضرت کے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ کے حالات وکوائف اور آپ کے وہاں کے درسی مشاغل نیز اس دور کے تلامذہ وغیرہ کا اضافہ بھی آئندہ ایڈیشن میں آجائے تو کتاب کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔

(۳) نام کتاب :۔ مسائل غیر مقلدین کتاب وسنت اور مذہب جمہور کے آئینہ میں۔
تالیف :۔ مولانا محمد ابو بکر غازی پوری۔
ناشر :۔ مکتبہ اثریہ قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور یوپی انڈیا۔
ضخامت :۔ چار سو چار (۴۰۴) صفحات۔
طبع بار اول :۔ ۱۹۹۶ء
قیمت :۔ ایک سو پچیس (۱۲۵/۰۰) روپئے۔

بر صغیر ہندوپاک کے علمائے غیر مقلدین اپنے آپ کو عامل بالحدیث اور رسول خدا

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح طریقہ پر چلنے والا اور دیگر تمام مسلمانوں کو (جو ائمہ حدیث مثلاً امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فہم قرآن وحدیث اور تفقہ وتدین پر اعتماد کر کے ان کی کتاب وسنت سے متعلق علمی وفقہی تشریحات کو درست مانتے اور اسلامی احکام ومسائل میں ان کی روشنی میں عمل کرتے ہیں) مخالف حدیث اور گمراہ بتاتے ہیں۔ اور اپنی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ امت کے سواد اعظم کی تفسیق وتضلیل میں اس طرح سرگرم عمل ہیں گویا دین کی سب سے بڑی خدمت ان کے نزدیک یہی ہے، جب کہ ان کی تفریق انگیز سرگرمیوں سے نہ صرف یہ کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہورہا ہے، بلکہ عام دیندار مسلم طبقہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر علمائے امت وسلف صالحین کی جانب سے سوئے ظن میں گرفتار ہورہا ہے۔

اس لئے عام مسلمانوں کو ان کے غلط پروپیگنڈے کے اثرات بد سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں دقیق علمی وفنی مباحث کی بجائے اس گروہ کے ان مسائل کو جو قرآن وحدیث اور مذہب جمہور کے خلاف ہیں جمع کردیا جائے تاکہ عام مسلمانوں پر واضح ہوجائے کہ اپنے آپ کو عامل بالحدیث اور سارے مسلمانوں کو سنت سے منحرف بتانے والے اس گروہ کا درونِ پردہ کیا حال ہے اور ان کے قول وعمل وگفتار وکردار میں کس قدر تفاوت ہے۔

خدائے علیم وقدیر تمام مسلمانوں کی جانب سے مولانا محمد ابو بکر غازی پوری فاضل دارالعلوم کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس گروہ کے اکابر علماء کی مستند ومعتبر کتابوں سے تقریباً پونے دو سو ایسے مسائل زیر نظر کتاب میں جمع کردئے ہیں جن میں وہ امت کے سواد اعظم سے ہٹ کر شذوذ وتفرد کی راہ پر گامزن ہیں، زیر نظر کتاب علم وتحقیق کے اعتبار سے دقیع ہونے کے ساتھ انداز بیان کے لحاظ سے بھی اس درجہ دل آویز ہے کہ زبان وبیان سے معمولی ذوق رکھنے والا بھی پڑھ کر جھوم اٹھے گا، اس لئے توقع ہے کہ طلبہ وعلماء کے علاوہ عام پڑھے لکھے حلقے میں بھی اسے قبول عام حاصل ہوگا۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایہ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دے کر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اس لئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عند اللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

176652

پتہ

ڈرافٹ و چیک کے لئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076

اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ 247554